گھر کے ہر فرد کے لئے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

اکتوبر 2013

نگران اعلیٰ

معراج رسول

عنیزہ سید اور رفعت سراج کے خوب صورت قسط وار ناول

نمرہ احمد کی دل پذیر کاوش "پارس" آپ کے اعلیٰ ذوق کی نذر

مکمل ناول [illegible] افسانے [illegible] دلچسپ اور معلوماتی سلسلے

مدیرہ اعلیٰ
عذرا رسول
مدیرہ
انجم انصار
معاون
آمنہ حماد

اداریہ

ناولٹ

افسانے

خصوصی مضامین

مستقل عنوانات

سلسلے وار ناول





پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ھاکی اسڈ...

منی ناول



مکمل ناول





شعبہ اشتہارات
منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789 نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
نمائندہ لاہور سید افراز علی نازش 0332-4214400 رانا لے حمید 0323-2895528
MEMBER APNS — CPNE
جلد 41 • شمارہ 07 • اکتوبر 2013 • زرسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com



یہ حقیقت ہے کہ زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اس تیر کے مانند ہوتے ہیں جو منہ سے نکلنے کے بعد واپس نہیں آتے۔ اکثر لوگوں کے تنازعات کی بڑی وجہ ان کے اپنے الفاظ ہوتے ہیں۔ عموماً لوگ گفتگو کرتے ہوئے احتیاط کا دامن ملحوظ نہیں رکھتے اور پھر مشکلات کا سامنا کرتے ہیں۔

آپ کی شخصیت میں جہاں کامیابی اور ناکامی کے ذمے دار آپ کے الفاظ ہوتے ہیں وہیں آپ کی شخصیت کو سحر انگیز یا جھگڑالو بنانے میں بھی ان ہی کا ہاتھ ہوتا ہے۔ آپ کی میٹھی بات آپ کے دشمن کو آپ کا دوست بنا سکتی ہے اسی طرح آپ کا کڑوا کسیلا جملہ آپ کے دوست کو آپ کا دشمن بھی بنا سکتا ہے۔ جب ہی بزرگ ہمیشہ نصیحت کیا کرتے ہیں کہ تول کر بولو...... یعنی بیکار کی بات کبھی مت کرو۔

ہمارے الفاظ ہمارے احساسات اور تاثرات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اگر کسی کے لیے ہمارے دل میں بغض ہے اور ہم مجبوراً مسکرا کر ملنے پر مجبور ہیں مگر کبھی نہ کبھی کوئی بات یا کوئی لفظ ہمارے منہ سے ایسا ضرور نکل جاتا ہے جو ہمارے دلی جذبات کا مظہر ہوتا ہے۔ اسی طرح مایوسی کے الفاظ دل میں کم ہمتی پیدا کرنے کے موجب ہوتے ہیں۔ ماہر نفسیات لوگوں کو مایوسانہ گفتگو اور بزدلانہ باتوں سے منع کرتے ہیں...... کیونکہ منفی الفاظ لاشعوری طور پر انسان کی ہمت توڑتے ہیں اور اسے کمزور کرتے ہیں۔ آپ نے خود ہی محسوس کیا ہوگا جب آپ یہ کہتے ہیں ''ہاں'' یہ ہوسکتا ہے۔ یہ کام ہو جائے گا، یا اس میں کوئی مشکل نہیں ہوگی تو درحقیقت آپ اپنی ہمت کی بیٹری چارج کر رہے ہوتے ہیں...... اپنی توانائی بڑھا رہے ہوتے ہیں۔

اور یاد رکھیے...... ہمیں اپنی ہمتیں توانا رکھنی ہیں کہ محنت کرنے والی قوم کے لیے ''نہیں'' کا لفظ نہیں بنا ہے۔ کیا خیال ہے!

مدیرہ
انجم انصار

اسی (واقعہ) کے سبب سے ہم نے بنی اسرائیل پر (یہ حکم) لکھ دیا کہ جو کوئی کسی جان کو بغیر کسی جان کے (عوض کے) یا زمین میں بغیر فساد کرنے کے قتل کرے تو گویا اس نے تمام آدمیوں کو قتل کر دیا (یعنی ایک آدمی کے بے سبب قتل کا اتنا بڑا گناہ ہے) اور جو کوئی ایک جان کو زندہ رکھے (یعنی قتل نہ کرے) تو گویا اس نے تمام آدمیوں کو زندہ رکھا (یعنی اسے اتنا بڑا ثواب ملے گا) اور بے شک یقیناً ان کے پاس ہمارے پیغمبر معجزوں کے ساتھ آ چکے تھے پھر بے شبہ اس کے بعد ان میں کے بہت لوگ زمین میں زیادتی کرنے لگے۔ (۳۲) (کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ) جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں (اور ان کے احکام کی مخالفت کرتے ہیں) اور زمین میں فساد کرتے پھرتے ہیں ان کی سزا یہی ہے کہ وہ قتل کر دیے جائیں یا دار پر چڑھا دیے جائیں یا ان کے ہاتھ پیر (اس طرح) کاٹ ڈالے جائیں (کہ جس طرف کا ہاتھ کاٹا جائے اس کے) خلاف (جانب) سے (پیر کاٹا جائے) یا وہ (اپنے وطن کی) سرزمین سے نکال دیے جائیں یہ ذلت (تو) ان کے لیے دنیا میں ہے اور آخرت میں (تو) ان کے لیے بڑا (ہی سخت) عذاب (تیار) ہے (۳۳) مگر جن لوگوں نے اس سے پہلے کہ تم ان پر قابو پاؤ (اپنے ناسزا فعل سے) توبہ کر لی ہو تو جان لو کہ (ان کا گناہ معاف ہو جائے گا کیونکہ) اللہ بے شک بخشنے والا مہربان ہے (۳۴) اے ایمان والو اللہ (کی نافرمانی) سے بچتے رہو اور اس سے تقرب چاہو اور اس کی راہ میں جہاد کرو تاکہ تم بامراد رہو (۳۵)



(سورۃ مائدہ آیت نمبر ۳۲ تا ۳۵)

سیدنا احمد ﷺ

اس قدر شد و مد سے تسبیح و عبادت میں مصروف رہتے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ فرمانا پڑا ”کہ رات کو قیام کرو مگر تھوڑی سی رات، نصف رات یا اس سے کچھ کم۔“ (۳۔المزمل) آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جو کام بھی سرانجام دینے کا حکم فرمایا۔ آپ ﷺ نے اپنی انتہائی جدوجہد اور انتہائی سخت مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے انتہائی بہترین صورت میں انہیں سرانجام دے کر ایسی اعلیٰ و بہترین مثالیں قائم کیں کہ قیامت تک آنے والی انسانیت کے لیے آپ ﷺ بہترین نمونہ قرار پائے ایسا بہترین نمونہ و مثال جس کی تلاش میں انسانیت کو نہ بھٹکنا پڑے گا، نہ ہی منتظر رہنا ہوگا۔ آپ ﷺ کی اسی جدوجہد، ریاضت، محنت و عبادت کا ثمر ہے کہ قیامت تک زمانہ آپ ﷺ کی ہستی کا معترف ہوگیا۔ ایسی عظیم کامیابی جو کسی اور انسان کی قسمت میں نہیں لکھی گئی اور آپ ﷺ کی اس عظیم جدوجہد کا سب سے بڑا قدر دان خود اللہ تعالیٰ ہے۔ جس نے قرآن میں فرمایا ہے۔ ”بے شک آپ ﷺ کے لیے بے انتہا اجر ہے۔“ (القلم)

۷۔ الفضائل:

۱۔ باوضو حالت میں ایک 100 مرتبہ یہ اسم پاک پڑھنے سے ذہنی پریشانی دور ہو جائے گی جو شخص ہر روز 100 مرتبہ پڑھے تو خلقت اس کی مطیع ہو جائے گی۔

۲۔ باوضو حالت میں 300 مرتبہ اس اسم پاک کو پڑھ کر بارگاہ ایزدی میں دعا مانگنے کے بعد جس کے پاس کسی کام کی غرض سے جائے وہ کام ہو جائے گا۔

نوٹ: ہر قسم کا ورد کرنے سے پہلے کسی مستند روحانی بزرگ کی اجازت ضروری ہے۔

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسماء النبی ﷺ سے اقتباس



امانت

رفعت سراج

قسط 10

لہو سے سینچنے پڑتے ہیں برگ و بار کے موسم
بظاہر یوں لگا دینا شجر آسان کتنا ہے
جنہوں نے دھوپ کی دشواریاں جھیلیں بتائیں گے
بدن پر سایۂ دیوار و در آسان کتنا ہے
شکستِ خاک سے لے کر نمو یابی کے منظر تک
ذرا دشوار ہے رستہ مگر آسان کتنا ہے

بات ایک امانت ہے، ذات ایک امانت ہے عفت ایک امانت ہے، زندگی خدا کی امانت ہے، زمین کے وجود پر سورج کی روشنی امانت ہے، تاروں کا نور...... چاند کی چاندنی امانت...... امانت کو خیانت سے بدل دیا جائے تو چہار سو اندھیروں کا راج ہے۔ اسی اندھیرے میں امانت کی تابانیاں پھر سے روشنی کی کرنیں بکھیرتے ہوئے چہار سو اجالا کردیتی ہیں۔

امانت و خیانت کو واضح کرتی ایک پُردرد مگر خوب صورت تحریر

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ڈاکٹر مہر جان نیورو سرجن تھیں۔ اپنی بہن گل جان اور بیٹیوں رابعہ اور رومانہ کے لیے ایک سخت گیر بہن اور ماں تھیں۔ وہ ہر کسی کو شک کی نگاہ سے دیکھتی تھیں...... اصیل خان ان کے گھر کا ایک ملازم اور معتمدِ خاص تھا۔ مہر جان، رابی کی شادی سہراب خان سے طے کرتی ہیں جو عمر میں رابی سے کافی بڑا ہے۔ کائناز اپنے دادا شاہ عالم کے ساتھ ڈاکٹر مہر جان کے پڑوس میں رہتی ہے وہ اور روما بیسٹ فرینڈ ہیں لیکن مہر جان کو روما کی اتنی دوستی بھی پسند نہیں۔ سب انسپکٹر جابر علی نے آج تک کبھی رشوت نہیں لی تھی۔ رزقِ حلال کی کمائی سے اپنے گھر کو چلایا اس کی بیوی صابرہ، بیٹا برہان اور بیٹیاں شبینہ اور ستارہ اسی کمائی میں گزارہ کر رہے تھے۔ ایس پی شیر زمان خان، جابر علی کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے اس کی بیٹی کی شادی کے لیے اپنے ایک شریکِ کاروبار وارث علی کا رشتہ دیتا ہے۔ مہر جان کو کمرے میں بے ہوش دیکھ کر گل جان، اصیل خان کے ساتھ انہیں اسپتال لے کر جاتی ہے، جابر علی، برہان کے انکار کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تو برہان گھر سے چلا جاتا ہے۔ رابی گھر چھوڑ کر مری چلی جاتی ہے۔ جابر علی ایس پی سے جہیز کے بارے میں بات کرتا ہے تو ایس پی کہتا ہے کہ وہ اس بارے میں پریشان نہ ہو۔ گل جان، شاہ عالم کی شکر گزار ہوتی ہے کہ انہوں نے روما کا خیال رکھا۔ صابرہ، جابر علی سے کہتی ہے کہ وہ برہان کو واپس لے آئے۔ مہر جان کا آپریشن ہو گیا لیکن انہیں ہوش نہیں آتا تو گل جان بہت پریشان ہوتی ہے لیکن نرس اسے تسلی دیتی ہے۔ روما، کائناز اور شاہ عالم کے ساتھ اسپتال آجاتی ہے۔ واسطی صاحب فون پر اصیل خان کو بتاتے ہیں کہ وہ لڑکی تک پہنچ گئے ہیں اور اب کسی بھی وقت وہ پولیس کی حراست میں ہوگی۔ جابر علی کہتا ہے کہ اب شادی شبینہ کی نہیں ستارہ کی ہوگی۔ برہان اخبار میں اشتہار دیکھ کر شاہ عالم کے پاس انٹرویو کے لیے جاتا ہے اور وہ اسے کائناز کو پڑھانے کے لیے رکھ لیتے ہیں۔ اصیل خان ماضی کے دنوں میں اپنے اور مہر جان کے گزرے یادگار لمحات میں گم ہوتا ہے کہ گل جان اسے مہر جان کے ہوش میں آنے کی اطلاع دیتی ہے۔ اصیل خان، گل جان کو بتاتا ہے کہ پولیس رابی کو کراچی لے کر آرہی ہے۔ وارث علی زیورات لے کر جابر علی کے گھر آتا ہے۔ ستارہ وہ زیورات دیکھنے کے لیے بے چین ہوتی ہے۔ کائناز، روما سے کہتی ہے کہ اب وہ اس کے ساتھ ٹیوشن پڑھے کیونکہ وہ ٹیوٹر سے بات کر چکی ہے روما اس کی بات پر متردد ہوتی ہے۔ پولیس اسٹیشن سے فون آتا ہے وہ اصیل خان سے کہتے ہیں کہ لڑکی کراچی پہنچ گئی ہے اب اس کو آکر لے جائیں۔ برہان اپنا موبائل شاہ عالم کے گھر بھول جاتا ہے۔ صابرہ، برہان کو فون کرتی ہے تو اس کی بات کائناز سے ہوتی ہے۔ صابرہ فون پر بات کر رہی تھی کہ جابر علی اٹھ جاتا ہے اور وہ صابرہ پر چیختا ہے۔ گل جان، مہر جان کے پاس اسپتال میں ہوتی ہے تو اصیل خان فون پر بتاتا ہے کہ پولیس رابی کو مری سے گرفتار... کر کے لے آئی ہے اب اسے گھر لاتا ہے۔ وارث علی اور ایس پی شاہ زمان اپنی فتح اور کامرانی پر خوش ہوتے ہیں۔ مہر جان فون پر اصیل خان کو کہتی ہے کہ رابی کو پہلے اسپتال لے کر آئے۔ فائزہ، احمر کے ساتھ شبینہ سے ملنے آتی ہے تو اس کے جانے سے پہلے ہی جابر علی آجاتا ہے اور وہ اس کے آنے پر اپنی ناراضی کا اظہار کرتا ہے۔ مہر جان، سہراب خان کو فون کرتی ہے کہ نکاح ہر صورت میں آج ہی کرنا ہے۔ شبینہ اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پا رہی تھی کہ ستارہ کو بتادے کہ شادی اس کی نہیں بلکہ ستارہ کی ہو رہی ہے۔ گل جان نے روما کو بتایا کہ رابی کی شادی ہو رہی ہے تو روما بھی پریشان ہو گئی۔ رابی اپنا کمرا بند کر کے بیٹھی تھی یہ بات گل جان کے لیے باعثِ تشویش تھی۔ برہان، شاہ عالم کے ہاں پہنچا تو اسے پتا چلا کہ وہ اپنا موبائل وہاں بھول گیا تھا۔ روما، گل جان سے پوچھتی ہے کہ وہ کائناز کو شادی میں بلا لے تو گل جان منع کر دیتی ہے۔ کائناز بخار کی شدت سے نڈھال تھی وہ دل بہلانے کے لیے روما کو فون کرتی ہے تو کوئی فون ریسیو نہیں کرتا۔ گل جان، رابی کو مہر جان کی دی ہوئی ساڑی دیتی ہے کہ وہ تیار ہو جائے۔ رابی نے ساڑی پہن کر اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا اور پھر بے ترتیبی سے اپنے بال کاٹ لیے اس کے بعد اس نے تیزاب میں روئی بھگو کر اس سے اپنے چہرے پر لائنیں کھینچنا شروع کر دیں۔ اندر کی جلن نے ہر تکلیف کے احساس کو ختم کر دیا تھا۔ کائناز کہتی ہے تو شاہ عالم اسے روما کے گھر لے جاتے ہیں، صابرہ کی برہان سے بات ہوتی ہے تو وہ کائناز کے بارے میں پوچھتی ہے۔ کائناز اور شاہ عالم، مہر جان کے گھر پہنچتے ہیں تو انہیں پتا چلتا ہے کہ رابی کی شادی ہو رہی ہے۔ رابی اپنے کمرے کا دروازہ نہیں کھول رہی تھی تو مہر جان سمجھیں کہ اس نے بالآخر اپنا کام تمام کر لیا لیکن سب کے بہت کہنے پر اس نے دروازہ کھولا تو سب اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ مہر جان، اصیل خان سے کہتی ہے کہ وہ رابی کو یہاں سے کہیں بھی لے جائے کیونکہ رابی نے ان کو شکست دی ہے اور انہیں سر جھکا کر جینا نہیں آتا۔ سہراب خان رابی کی شکل دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے۔ رابی، شاہ عالم کے ساتھ ان کے گھر چلی جاتی ہے۔

اب آگے پڑھیں

رابی کے جاتے ہی گل جان کو مہر جان کی پڑ گئی...... چاروں اور غیر معمولی سناٹے کا راج تھا...... بیٹی کے رخصت ہو جانے کے بعد کی خاموشی و بے رونقی...... شہنائیوں کے سُروں کا جب سراغ نہیں ملتا...... کہ خوشیوں کی پیامبر آوازیں سماعتوں سے دور چلی جاتی ہیں...... رونق کے بعد بے رونقی جیسے کاٹنے کو دوڑتی ہے۔

مہر جان کی وسیع و عریض کوٹھی میں کچھ اسی طرح کی صورتِ حال تھی جیسے دولت سے بہت سی برائیوں پر پردہ پڑا رہتا ہے اسی طرح اشرافیہ کی بستیوں میں برابر میں جنازے اٹھ جاتے ہیں اور پڑوسی کو خبر تک نہیں ہوتی، یہی صورتِ حال اگر عام سے محلے میں ہوتی تو مجمع لگ جاتا۔

کسی کو خبر نہ ہوئی کہ کوٹھی نمبر 62۔c میں کیا سے کیا ہو گیا، ایک عورت جو مردانہ وار زندگی جینے کی کوشش کر رہی تھی، خاندان کا تنکا، تنکا جوڑنے کی تگ و دو میں لگے، لگے اسپتال پہنچ گئی۔ اسی اسپتال جو کسی کے شاندار خواب کی عظیم الشان تعبیر تھا۔ بے ہوش مہر جان اپنے کمرے میں یوں پڑی تھیں کہ پہلی نظر میں یوں لگے کہ کوئی مُردہ وجود پڑا ہو۔

گل جان تو ان کے کمرے میں یوں گئی تھی جیسے کوئی سرِ مقتل جاتا ہو مگر مہر جان کو نیم مردہ حالت میں پا کر خود از سرِ نو اپنے وجود میں زندگی کی حرارت محسوس کرنے لگی۔

ڈاکٹر نے ابتدائی معائنے کے بعد خاصی مایوسی کا اظہار کیا تھا اور یوں ایک بار پھر مہر جان ICU میں داخل ہو گئی تھیں۔ مہر جان نے گل جان اور اصیل خان کو ایک بار پھر اس سرخ آندھی سے بچا لیا جو اس کے اپنے وجود سے ہر آن اٹھتی رہتی تھی۔

☆☆☆

رابی پہلے مرحلے سے گزر کر اسپتال سے گھر آ گئی تھی۔ شاہ عالم اور کائناز جیسے دم دم اس کے ساتھ تھے۔ جب سے رابی، شاہ عالم کے ساتھ تھی۔۔ شاہ عالم نے اس سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس کا تعلق مہر جان یا اس تازہ ترین حادثے سے ہو سکتا تھا۔ کائناز تو ابھی تک دم بخود تھی، بات کرنا تو درکنار وہ تو لب کشائی کا حوصلہ نہیں پا رہی تھی۔ رابی کا مسخ چہرہ دیکھ کر اس کی حالت اس کم ہمت آدمی جیسی ہی تھی جس نے اتفاقاً کسی انسان کا خون ہوتے دیکھ لیا ہو۔ اسے تو رابی کی طرف دیکھتے ہوئے شرم سی آرہی تھی مبادا رابی یہ سمجھے کہ وہ کوئی تماشا ہے جو ملاحظہ کیا جائے۔

شاہ عالم نے رابی کو ایک آراستہ و پیراستہ کمرے میں پہنچا کر جو خاص مہمانوں کے لیے مخصوص تھا کائناز کو اشارے کی زبان میں سمجھا دیا تھا کہ اب رابی کو تنہا چھوڑ دیا جائے۔ ڈاکٹر کی تجویز کردہ ادویات انہوں نے خود کھلائی تھیں بالکل اسی نارمل انداز میں جس طرح عام مریض کو ٹریٹ کیا جاتا ہے۔ زخموں سے اٹھتی ٹیسوں نے رابی کو بھی کلام کرنے سے معذور کیا ہوا تھا۔ درد سہتے، سہتے اس کا نچلا ہونٹ زخمی ہو گیا تھا پین کلر بھی چھومنتر نہیں ہوتی، مرحلہ وار ہی درد میں کمی آتی ہے۔

☆☆☆

''ٹرینکولائزر اور پین کلر کے اثر سے وہ جلدی سو جائے گی۔'' شاہ عالم اپنے کمرے میں آکر کائناز سے باتیں کر رہے تھے۔

''دادا جان، روما کو فون کر کے پتا کروں اُدھر کیا پچویشن ہے؟ کہیں اس کی اماں جان سارا غصہ اسی پر نہ اتار رہی ہوں......''

''بہت رات گزر چکی ہے بیٹا...... اب تمہیں بھی آرام کرنا چاہیے ویسے بھی تمہاری طبیعت ابھی ٹھیک نہیں ہے۔''

''مجھے تو یاد ہی نہیں رہا کہ میری طبیعت خراب تھی۔'' کائناز بجھے بجھے انداز میں کہہ کر زبردستی مسکرائی۔

''بہت ہی بڑی ٹریجڈی ہے...... ہنستا بستا نہ سہی...... گھر تو تھا...... کچھ شریف لوگوں کی پناہ گاہ......'' شاہ صاحب اپنا سر سہلاتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں کہہ رہے تھے۔

''تو اب رابی آپا ہمارے ہی پاس رہیں گی؟'' کائناز بڑی معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

''اس سلسلے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا...... کچھ وقت گزر جائے پھر میں خود ڈاکٹر صاحبہ سے ایک میٹنگ کروں گا۔''

''لیکن آپ کتنی بھی میٹنگ کرلیں، رابی آپا وہاں نہیں جائیں گی۔'' کائناز جو سارے معاملات سے کماحقہ باخبر تھی بڑے اعتماد سے بولی تھی۔

''یہ بعد کی بات ہے...... فی الحال تم آرام کرو...... اندازے لگانے سے پرہیز کرو۔ اس چھوٹی سی عمر میں ہی یہ بڑی بات ذہن میں بٹھا لو کہ اندازے لگانے کی عادت توانائی ضائع کرتی ہے، قیاس آرائی، کم عقلی کی نشانی ہے۔ اللہ کے ذہن کو پڑھنا انسانی ذہن کے بس کی بات نہیں، کل کیا ہوگا صرف اللہ ہی جانتا ہے۔'' شاہ عالم اپنے مخصوص حلیم و شفیق لہجے میں پوتی کو سمجھا رہے تھے۔

''جی دادا جان......! ویسے تو میں سترہ سال کی ہوں لیکن ایکچوئیلی تو 75 کی ہوں ناں!''

''اچھا......!'' وہ بے ساختگی سے مسکرا دیے۔ ''مگر یہ تو میری عمر ہے۔''

''آپ کی طرح سوچوں گی تو آپ کی عمر کی ہی بن جاؤں گی۔'' وہ بے ساختہ بولی۔

''پھر بھی نہیں بن سکو گی...... تجربے کی کمی، عمر کا فرق ہمیشہ رکھتی ہے۔''

''جی......!'' کائناز کا انداز غور و خوض کرنے کا تھا...... جی کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔

''شب بخیر......'' شاہ عالم زیرِ لب گویا ہوئے۔

☆☆☆

شبینہ مین گیٹ کھولے ہکا بکا سی کھڑی فائزہ اور شائستہ بیگم کو دیکھ رہی تھی کہ رات ساڑھے دس گیارہ کے قریب یہ کیوں آئی ہوں گی۔ فائزہ تو آنے سے پہلے ہمیشہ فون کرکے بتایا کرتی تھی کہ وہ آ رہی ہے۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو، اندھیرے میں کیا ہم بھوت لگ رہے ہیں؟'' فائزہ اس کی حیرت پر ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''نہیں، نہیں میں تو اتنی رات کو تمہیں اچانک دیکھ کر حیران ہو رہی ہوں۔'' شبینہ نے بہ مشکل خود کو سنبھال کر جواب دیا پھر شائستہ بیگم کی طرف دیکھ کر خجل سے انداز میں سلام کرنے لگی۔

''السلام علیکم آنٹی...... سوری...... وہ میں بس......''

''کوئی بات نہیں بیٹا میں تو فائزہ سے کہہ بھی رہی تھی کہ اتنی رات کو جانا مناسب نہیں مگر اس نے ضد کی کہ گھر راستے ہی میں تو ہے، کراچی میں کون اتنی جلدی سوتا ہے۔'' شائستہ بیگم بھی گویا شبینہ کی گھبراہٹ اور حیرانی دیکھ کر شرمندہ ہوگئی تھیں۔

''آیئے...... پلیز......'' شبینہ انہیں لے کر اندر کی طرف بڑھی۔ صابرہ، شبینہ کی باتوں کی آواز سن کر اسی طرف چلی آ رہی تھی یہ دیکھنے کے لیے کہ شبینہ کس سے باتیں کر رہی ہے۔ فائزہ کے ساتھ ایک اسٹائلش سی

خاتون کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو وہ بھی گھبرا سی گئی۔ اس سے پیشتر کہ کچھ بولتی شبینہ نے خود ہی تعارف کرا دیا۔

''امی...... یہ فائزہ کی ممی ہیں۔''

''السلام علیکم......!'' شائستہ بیگم نے آگے بڑھ کر صابرہ کو گلے لگا کر اپنی کلاس کے مخصوص انداز میں دوستی میں پیش رفت کی۔ ان کی توقع کے مطابق صابرہ ویسی ہی تھی جو خاکہ شبینہ کو دیکھ کر اُن کے ذہن نے بنایا ہوا تھا۔

''شبینہ بیٹا کوئی شربت بنا کر لے آؤ......'' انہیں اندر لا کر ڈرائنگ روم میں بٹھایا پھر وہ بیٹی سے بولی۔

''ارے نہیں...... کوئی تکلف نہیں، کچھ بھی کھانا پینا نہیں ہے کیونکہ پہلے ہی ہم لوگ فل ہیں۔'' فائزہ جلدی سے بولی۔ شبینہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی اور ڈبل مائنڈڈ سی ہو کر اُن کی طرف دیکھنے لگی۔

''ہم اصل میں شام سے شاپنگ کے لیے نکلے ہوئے تھے...... پھر ریسٹورنٹ چلے گئے، وہیں ڈنر کیا وہاں سے اٹھ کر سیدھے آپ کی طرف آ رہے ہیں۔''

''تو پھر ایک، ایک کپ چائے تو چلے گی ناں......'' صابرہ پہلی بار آنے والی مہمان کی خاطر تواضع کے لیے سراپا گرم جوش تھی، یوں تو اس گھر میں مہمان آتے ہی کہاں تھے، جابر علی سے تو اس کے اپنے کتراتے تھے۔ صابرہ کے گنے چنے میکے والوں نے تو برسوں پہلے ہی آنا جانا بے حد کم کر دیا تھا۔

''آپ دونوں اکیلی......؟'' صابرہ کچھ پوچھتے پوچھتے رک گئی۔

''ارے نہیں...... اس نے میرے بیٹے کو اپنا ڈرائیور بنایا ہوا ہے، اسی لیے میں اتنی جلدی میں ہوں کہ وہ باہر کار میں بیٹھا... ہمارا انتظار کر رہا ہے۔'' شبینہ جیسے کسی دھیان سے چونک پڑی۔ دل کی دھڑکنوں نے سہمے سہمے ساز چھیڑے۔ نظر کے پیام کی حد تک تو وہ پہل کر چکا تھا یہ اور بات کہ شبینہ نے اب تک انجان بن کر خیالی لفافے واپس کر دیے تھے۔ وہ چند لمحوں کو کمرے سے باہر آ گئی تھی۔

''حد کر دی آپ نے، بچے کو اس گرمی میں باہر گاڑی میں بٹھایا ہوا ہے، جاؤ بیٹا بھائی کو اندر بلا لو۔'' صابرہ ایک ساتھ دونوں ماں، بیٹی سے مخاطب ہوئی۔

''کار میں اے سی چلا کر مزے سے سو گئے ہوں گے، آپ ان کی فکر نہ کریں۔'' فائزہ تو سہیلی کو دیکھ کر ہر فکر سے آزاد ہو چکی تھی۔ دل کو سمجھانے والا ہر بہانہ اس کے پاس بالکل تیار تھا۔

''یہ تو اور بھی زیادہ تکلیف کی بات ہے کہ اتنی تنگ جگہ پر سو رہا ہوگا۔'' صابرہ اپنی نرم طبع کے باعث گویا تڑپ کر رہ گئی۔

''کار کی سیٹ کھول کر سو رہے ہوں گے، بیٹھے بیٹھے بھی سو سکتے ہیں آپ فکر نہ کریں انہیں پریکٹس ہے۔'' فائزہ کی برجستگی پر تینوں ہی ہنس دی تھیں۔

''ہاں، ہاں بس اس وقت تو واقعی ہم جلدی میں ہیں، کسی دن آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ میری بیٹی تو بس شبینہ کے پیچھے پاگل ہے، ہر وقت اس کی باتیں اس کی فکریں۔'' شائستہ بیگم مسکرا کر بولیں اور اپنا ہینڈ بیگ کھول کر کچھ تلاش کرنے لگیں۔

اسی وقت ستارہ لباس تبدیل کرکے بال سنوار کر اندر آ گئی۔ شبینہ نے اسے اندر جا کر بتایا تھا تبھی وہ اپنا حال حلیہ درست کرنے کی وجہ سے ذرا دیر سے ڈرائنگ روم میں آئی تھی۔

''السلام علیکم!'' اس نے اندر آ کر بڑے مہذبانہ انداز میں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام......! یہ غالباً شبینہ کی بہن ہے۔'' شائستہ بیگم نے بڑی دلچسپی سے ستارہ کی طرف دیکھا تھا جو شبینہ سے یکسر مختلف دکھائی دے رہی تھی اور انداز میں بھی بلا کا اعتماد تھا جبکہ شبینہ جس حلیے میں تھی اسی میں سامنے آگئی تھی۔ کچن کے کام نمٹانے کے بعد پسینے پسینے ہو کر باہر نکلی تو اسی وقت فائزہ اور شائستہ بیگم آگئی تھیں۔ ستارہ کے ہونٹوں پر پنک چمکیلی لپ اسٹک بھی نظر آرہی تھی۔ اسے خوب شعور تھا کہ کس طرح مہمانوں کے سامنے جانا چاہیے۔ وہ جانتی تھی فائزہ ایک بہت بڑے بزنس مین کی بیٹی ہے پوش ایریا میں رہتی ہے، شوفر ڈرون کار میں کالج آتی ہے۔

''دونوں بہنیں دیکھنے میں ہی مختلف ہیں یا عادتیں بھی الگ الگ ہیں۔'' شائستہ بیگم نے نک سک سے درست ستارہ کا بنظرِ غائر جائزہ لیا، ان کی دلچسپی کی واحد وجہ صرف یہ تھی کہ شبینہ کو دیکھ کر اس کی بہن کا تصور بھی شبینہ جیسا ہی بنتا تھا۔

ابھی انہوں نے بیٹے کے لیے لڑکیاں دیکھنے کا سلسلہ شروع نہیں کیا تھا اور جابر علی کی کلاس میں بہو دیکھنے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ تو بس بیٹی کی محبت سے مجبور ہو کر اس کے ساتھ چلی آئی تھیں۔

''بھئی فائزہ یہ سنبھالو...... خود اپنے ہاتھوں سے اپنی دوست کو دو تو اچھا لگے گا۔'' شائستہ بیگم نے ایک ویلوٹ کا پاؤچ نکال کر فائزہ کی طرف بڑھایا۔ وہ ماں، بیٹیاں قدرے حیرت سے فائزہ اور اس کی مما کی طرف باری باری دیکھ رہی تھیں۔ فائزہ نے پاؤچ ماں کے ہاتھ سے لے کر فوراً ہی شبینہ کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' شبینہ نے پاؤچ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ایک چھوٹا سا گفٹ...... کھول کر دیکھو تمہیں بہت پسند آئے گا اس لیے کہ مجھے پہلی نظر میں ہی بہت اٹریکٹ کر گیا تھا۔'' فائزہ نے جیسے شبینہ کے اندر شوق و تجسس ابھارنے کی لاشعوری کوشش کی۔

شبینہ نے قدرے ہچکچاتے ہوئے پاؤچ کھولا۔ صابرہ اور ستارہ بھی بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔

شبینہ نے پاؤچ سے ایک بہت خوب صورت دیدہ زیب آرٹیفشل جیولری کا سیٹ نکالا جو برقی روشنی میں جگر جگر چمک رہا تھا۔

''واؤ...... بہت خوب صورت ہے۔'' ستارہ کی طرف سے ردِعمل سب سے پہلے آیا۔

''واقعی بہت خوب صورت ہے مگر تم نے یہ تکلف کیوں کیا؟'' شبینہ نے سراہتے ہوئے تکلف بھی برتا۔

''ہاں آپ لوگوں نے واقعی تکلف کیا کیونکہ چند دنوں بعد ہی شبینہ آپا کی شادی ہو رہی ہے اور دولھا نے ان کے لیے بہت ساری گولڈ کی جیولری بھجوائی ہے، پتا نہیں امی نے کہاں چھپا کر رکھ دی ہے ورنہ میں دکھاتی آپ لوگوں کو۔'' ستارہ اپنے مخصوص بے ڈھب و غیر محتاط انداز میں بولی تھی گویا اس نے ایک دھماکا کر دیا تھا۔

شبینہ ایک دم گھبرا سی گئی جبکہ صابرہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی جیسے سمجھ ہی نہیں آرہی ہو کہ کیا کرے۔

فائزہ اور شائستہ بیگم تو ابھی ورطۂ حیرت میں غوطے لگا رہی تھیں، فائزہ اگر بھونچکی سی رہ گئی تھی تو شائستہ بیگم کے چہرے سے لگتا تھا کہ انہوں نے گویا سکھ کی سانس لی ہے کہ شکر خود بخود فائزہ اور شبینہ کے درمیان نادیدہ فاصلے پیدا ہو رہے تھے۔ بیٹی کی خوشی کی خاطر وہ جبر کا جو پہاڑ سر کر رہی تھیں آدھی سے کم چڑھائی کے بعد واپس اتر آئی تھیں۔

''بہت بہت مبارک ہو...... its a happy news'' وہ بڑی بے ساختگی سے مبارک باد دے رہی تھیں۔ ایک، ایک لفظ میں شکرانہ پوشیدہ تھا۔

''شبینہ تم نے مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ......'' اس سے پیشتر کہ فائزہ دکھ کی کیفیت میں اپنا جملہ مکمل کرتی، صابرہ نے فوراً ہی اس کی بات کاٹ دی تھی۔

''بیٹا...... تم دل خراب نہ کرو، ابھی ایسا کچھ نہیں ہے، شادی ہوگی تو کیا تمہیں نہیں بلائیں گے...... شبینہ کی کون سی دس بارہ سہیلیاں ہیں، لے دے کہ ایک آپ ہی تو ہیں۔''

ستارہ نے ماں کی طرف بڑے اچنبھے اور حیرت سے دیکھا تھا کہ آخر وہ شبینہ کی شادی کی بات کیوں چھپا رہی ہے۔

صابرہ کو اس کا یوں بولنا بہت بھاری گزرا تھا۔ اس نے ماں کو پھر دودھاری تلوار کے سفر پر روانہ کر دیا تھا۔ تازہ تازہ زخم کو گرم ہوائیں چھونے لگی تھیں۔

''لیکن آنٹی ستارہ تو کہہ رہی ہے......''

''اس کی باتیں تو بس یونہی بے موقع اور بے سر پیر کی ہوتی ہیں۔ شادی، شادی ہوتی ہے کوئی گناہ تو نہیں جو چھپا کر کیا جائے۔ انشاء اللہ جب بھی شبینہ کی شادی ہوگی پہلا کارڈ آپ کو ہی ملے گا۔''

ستارہ کی زبان میں کھجلی تو بہت ہو رہی تھی مگر مرتی کیا نہ کرتی کے مصداق ٹکر ٹکر ماں کی شکل دیکھنے لگی۔ دل ہی دل میں کھول رہی تھی کہ آخر امی کو اتنا جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا۔ شائستہ بیگم اگرچہ دو باتوں کی وجہ سے کھٹک گئی تھیں مگر انہوں نے بہت باوقار انداز میں صابرہ کی لاج رکھتے ہوئے بیٹی سے کہا۔

''چلو فائزہ...... بہت دیر ہو گئی ہے، احمر تو باہر گاڑی میں واقعی نہ سو گیا ہو۔''

''آپ اسے بھی بلا لیتیں۔'' صابرہ کو انہیں روانہ کرنے کی اتنی جلدی تھی کہ انہیں جانے کی بھی جلدی اتنی نہ ہوگی۔ اسے یہی دھڑکا تھا کہ کہیں جابر علی نہ پہنچ جائے اور صبح تک ایک ہنگامہ برپا رہے...... وہ مہمانوں سے بھی پہلے کھڑی ہو کر تکلفات نباہ رہی تھی۔ شبینہ کی جان تو ماں نے چھڑا دی تھی اب وہ ایک دم ہلکی پھلکی نظر آرہی تھی۔

''کل کالج تو آؤ گی ناں......؟'' فائزہ، شبینہ سے ملتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ ستارہ کی پھر زبان پھڑکی جسے اس نے بہ مشکل قابو کیا۔ صابرہ کو اس کی طرف سے ضرور دھڑکا ہوگا تب ہی اس نے حفظِ ماتقدم کے طور پر اس کی طرف گھورا تھا۔ ستارہ اشارے کی زبان سمجھ گئی۔

''اچھا بھئی...... میری طرف سے تو خدا حافظ...... زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔''

''تم بہت چھٹیاں کرنے لگی ہو، آنٹی لگتا ہے ستارہ کا اب پڑھنے وڑھنے کا موڈ نہیں ہے، آپ ایسا کریں پہلے اس کی شادی کر دیں۔''

''ہیں......؟'' انجانے میں نکلی ہوئی فائزہ کی بات ٹھک کر کے سیدھی دل پر لگی...... یوں جیسے نشانہ باندھ کر تیر چھوڑا ہو۔

''ہاں ناں...... بالکل ٹھیک مشورہ دے رہی ہوں آپ کو۔''

''اچھا بس چلو۔ فرصت سے آکر آرام سے بیٹھ کر مشورے دے دینا۔'' شائستہ بیگم پر اب سچ مچ عجلت سوار ہو گئی۔ ابھی دونوں خدا حافظ کہہ کر گیٹ سے باہر نکلی ہی تھیں کہ عین اسی لمحے جابر علی گھر میں داخل ہوا تھا۔ شبینہ اور صابرہ ابھی گیٹ کے ساتھ ہی لگی کھڑی تھیں۔ شبینہ تو باپ کو دیکھ کر ایک دم بدحواس ہو گئی اور یوں پیچھے ہٹی جیسے کسی نے سامنے سے دھکا دیا ہو۔

جابر علی اگرچہ باہر کار میں احمر کو دیکھ چکا تھا مگر صرف صابرہ کو جتانے کے لیے اس نے گردن موڑ کر کار کی

طرف دیکھا تھا۔
شائستہ بیگم اگلی سیٹ پر جبکہ فائزہ بیک سیٹ پر بیٹھ رہی تھی۔ بس اس عمل کے فوراً بعد ہی اس نے خود اپنے ہاتھوں سے گیٹ کا ذیلی پٹ بند کیا تھا۔ شبینہ کے لیے تو یہ لمحاتی مہلت بھی بہت تھی وہ تو بغیر وقفہ کیے اندر دوڑ گئی تھی۔
اتنی رات کو اس کی سہیلی آئی تھی تو شامت بھی اسی کی آنی تھی۔
''ارے بھئی اب تو آدھی، آدھی رات کو لگژری کاریں ہمارے گیٹ پر کھڑی ہوتی ہیں، آئی جی لگ گیا ہوں میں، بڑے بڑے لوگ مجھے سلامی دینے میرے گھر آتے ہیں۔'' جابر علی کی پاٹ دار آواز اور کاٹ دار لہجے نے خاموشی کے سارے بت ایک آن میں توڑ ڈالے۔ صابرہ کو پتا تھا کہ خاموشی کا مطلب بڑی جنگ اور جواب کا مطلب صرف جھڑپ ہے۔ اس نے جواب کے لیے الفاظ موزوں کرنا شروع کر دیے۔
''بازار سے آ رہی تھیں دونوں ماں بیٹی' راستے میں ہمارا گھر پڑتا ہے تو بس کھڑے، کھڑے سلام دعا کرنے آ گئیں۔ شبینہ کے ساتھ پڑھتی ہے ناں یہ فائزہ۔'' الفاظ اِدھر اُدھر ہو رہے تھے مگر مافی الضمیر واضح تھا۔
''اتنی رات کو بازاروں میں پھرنے والی عورتیں...... کیا سبق سیکھے گی تمہاری بیٹی ان عورتوں سے۔ آخر اتنے تعلقات بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ لوگ کھڑے، کھڑے سلام کرنے کا سوچنے لگیں۔''
''پہلی بار آئی تھیں بے چاری......'' صابرہ نے ناگواری کی لہریں دبا کر کہا۔
''دوسری بار بھی آئیں گی، دوستی شروع ہوئی ہے تو نبھانے کی کوشش بھی ہوتی رہے گی، باہر کار میں جوان لڑکا بیٹھا تھا، اسی طرح لوگ گھر کے راستے دیکھتے ہیں، جب یہ چھوٹی تھیں تب ہی تمہیں سمجھا دیا تھا کہ دیکھو اگر عزت سے جینے کا ارادہ ہے تو لڑکیوں کو بہت احتیاط سے پالنا...... جو لڑکیاں اپنے گھر سے نکل کر اپنے، غیر کے گھر میں آنا جانا شروع کر دیتی ہیں ان کا پھر اللہ ہی حافظ...... ہاتھوں سے نکل جاتی ہیں، ایک کا تو بیڑا غرق کر ہی چکی ہو۔'' جابر علی گرجتا برستا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ شبینہ الماری میں کپڑوں کے نیچے فائزہ کا لایا ہوا پاؤچ چھپا رہی تھی۔ ستارہ اس کے قریب کھڑی تھی اور سر گھسا گھسا کر دیکھ رہی تھی کہ وہ کہاں چھپا رہی ہے۔
''ابا جان سینئر پولیس آفیسر ہیں، ان سے کچھ نہیں چھپتا، باہر گڑھا کھود کر دفن کر دو۔'' وہ شریر لہجے میں چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔ ''مگر پولیس تو گڑھے کھود کر بھی لاش برآمد کر لیتی ہے۔'' شبینہ نے الماری کا پٹ بند کیا اور وہی ہاتھ ستارہ کے منہ پر رکھ کر زور سے دبا دیا۔
''چپ ہو جاؤ یا سوئی سے ٹانکا لگاؤں؟'' ستارہ مسکراتی ہوئی آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔
''آپا شکل تو میری بہت اچھی ہے، پھر سب کو بری کیوں لگتی ہوں؟''
''شکل نہیں تمہاری زبان بری لگتی ہے۔ اس کا کوئی حل نکالو۔'' شبینہ نے دانت پیسے۔
''ہاں تلوار کے نشان والی صرف دو گولی۔ ویسے آپا آج کل تمہاری قسمت زوروں پر ہے، آدھی، آدھی رات کو گفٹ نازل ہو رہے ہیں، فائزہ آرٹیفشل جیولری لائی ہے مگر دیکھنے میں بہت مہنگی لگ رہی ہے، ظاہر ہے بزنس مین کی بیٹی ہے۔ ہم تو فی الحال اے کلاس جیل میں ہیں مگر تم تو بس ہواؤں میں اڑنے والی ہو...... ویسے آپا...... فائزہ سے کیوں چھپا رہی ہو؟ ایسی خبریں تو بیسٹ فرینڈ سے فوراً شیئر کی جاتی ہیں۔'' ستارہ کو ایک دم کچھ دیر پہلے کی صورتِ حال یاد آئی۔ شبینہ اس سے جان چھڑا کر کمرے ہی سے نکل گئی۔ ستارہ نے گہری سانس لی پھر ایک لٹ انگلیوں میں لپیٹ کر بل دیے پھر پھونک سے لہرا کر خود کو آئینے میں دیکھنے لگی۔
''ہم وہ ہیں جنہیں خوش رہنا آتا ہے، کوئی اپنی جان جلاتا ہے تو جلائے اپنے خرچے پر......''

☆☆☆

''اصیل خان' ڈاکٹر بہت مایوس نظر آ رہے ہیں...... ان کی تسلی میں دم نہیں ہے، کھوکھلی ہے۔'' گل جان کے رخساروں پر آنسو لڑھک رہے تھے جنہیں وہ بولتے ہوئے انگلیوں کی پوروں سے صاف بھی کرتی جاتی تھی۔
''اللہ مالک ہے! نہ آتے اپنی مرضی سے ہیں نہ جاتے اپنی مرضی سے ہیں، شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ خودکشی کرنے والے کی روح بھٹکتی رہتی ہے اپنی منزل تلاش کرتی رہتی ہے، وہ منزل جو قدرتی مرنے والے کے سامنے خود بخود آ جاتی ہے۔'' اصیل خان بہت صبر وضبط کا مظاہرہ کر رہا تھا۔
''اگر بی بی جان کو کچھ ہو گیا تو میرا اور روما کا کیا بنے گا......؟ خدانخواستہ......'' گل جان کی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز میں لرزش تھی۔
''جس نے پیدا کیا ہے وہی جانتا ہے۔'' اصیل خان ٹھنڈی سانس کھینچ کر گویا ہوا۔
''بی بی جان کی بلند آواز ہمارے جسموں میں زندگی بن کر دوڑتی ہے۔ ان کے بغیر ہم تو زندہ لاش بن جائیں گے۔'' ''اب وہ بلک بلک کر رو دی تھی۔'' ''رابی نے میری بہن کو ختم کر دیا...... اس کی ماں تو ایسی نہیں تھی۔''
''وہ کاروباری عورت تھی...... بڑے، بڑے منافع اٹھاتی تھی، اس کی کوکھ سے بہت بڑے گھاٹے نے جنم لیا تھا۔'' اصیل خان یہ کہہ کر ایک سمت چل پڑا۔ گل جان بڑی بے بسی سے اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

زندگی مزاحمت کا استعارہ سہی مگر انسان کی مزاحمت دیوانے کا پتھراؤ ہے، ہر پل کو تقدیر کا لکھا جان کر سمجھوتا کرنے میں ہی روحانی سکون ہے مگر انسان اپنی لاعلمی کے باعث ہمیشہ خود اپنے ہاتھوں اپنا سکون برباد کرتا چلا آ رہا ہے۔
انا کی جنگ اندھیرے میں کی جانے والی تیر اندازی ہے، زخم ایسی جگہ لگ جاتے ہیں کہ تیر کمان سے نکل کر ضائع ہو جاتے ہیں۔ رابی کی نیند ٹوٹی تو سرہانے شاہ عالم کو پایا جو کرسی پر سر جھکائے مراقبے کی کیفیت میں بیٹھے تسبیح کے دانوں پر کوئی ذکرِ خاص کر رہے تھے۔ اس کے منہ سے ایک سسکاری نکلی...... زخم ٹھنڈے ہو گئے تھے اور مسکّن دوا کا اثر ختم ہو چکا تھا۔ چہرے پر گویا لوہے کے باریک تاروں کا جال تھا۔ ایک، ایک خلیے میں اکڑاؤ کی کیفیت تھی۔
''السلام علیکم...... صبح بخیر بیٹا...... ویسے تو دوپہر ہو چلی ہے مگر سونے والے کی جس وقت آنکھ کھلے وہی اس کی صبح ہے۔'' شاہ عالم نے بہت شفقت سے رابی کے بے تکے کٹے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔
''ہلکا پھلکا ناشتا کر کے دوا کھا لو۔ پین کلر لو گی تو درد تنگ نہیں کرے گا۔''
''درد تو ہمیشہ تنگ کرے گا دادا جان! وہ زخم جو نظر نہیں آتے وہ زیادہ تنگ کرتے ہیں۔'' رابی درد کی ٹیس دباتے ہوئے بہ مشکل گویا ہوئی۔
''بیٹا انسان اپنی تقدیر کے سامنے بے بس ہے۔ جب کچھ بھی اپنی پسند اور مرضی کے مطابق نہ ہو رہا ہو تو تبدیلی کے لیے صبر کے ساتھ کوشش کرتے ہیں اور نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔''
''یہ دکھوں کے کبھی نہ ختم ہونے والے سلسلے...... ان میں کیا بہتری ہو سکتی ہے؟'' رابی نے اٹھ بیٹھنے کی کوشش کرنے کے لیے اپنی پوری قوت صرف کرتے ہوئے پوچھا۔
''بیٹا تکلیف بھی تو خوشی کی طرح وقتِ مقررہ کے لیے آتی ہے۔ جب انسان اللہ کے فیصلے کو ماننے سے

انکار کر دیتا ہے اور مزاحمت کرتا ہے تو تکلیف کا دورانیہ بڑھ جاتا ہے۔ یہ ایک روحانی قانون ہے اور روحانی قانون اٹل ہوتے ہیں اسی لیے صبر کی بہت تاکید ہے۔ صبر کے معنی رکنے اور ٹھہرنے کے ہیں۔''

''تکلیف تو ایک پل کی بھی بہت ہوتی ہے دادا جان نہ کہ زندگی بھر کی۔''

''ہم ضد اور مزاحمت سے دکھوں کے سلسلے دراز کر دیتے ہیں بیٹا۔'' شاہ عالم نے برجستہ کہا تھا۔ رابی اب اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔ درد کی لہروں نے اس کے حواس معطل کرنا شروع کر دیے تھے۔

''میں آپ کا ناشتا یہیں منگواتا ہوں، آپ جب تک ہاتھ منہ دھولیں۔'' انہوں نے روانی میں کہا۔

''منہ......؟'' رابی کے لہجے میں تلخی بھی تھی اور طنز بھی۔ ''آپ نے دیکھا میں نے اپنی ماں کا کتنا خیال کیا، نہ وہ منہ دکھانے کے قابل رہیں اور نہ میں۔''

''سوری بیٹا......بس یونہی منہ سے نکل گیا۔'' شاہ عالم کے انداز میں بہت دکھ اور شرمندگی کا تاثر تھا۔

رابی نے بیڈ سے پاؤں لٹکا لیے اور اپنے اکڑے ہوئے چہرے پر بہت محتاط انداز میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

''آپ کو میری شکل سے خوف تو نہیں آرہا دادا جان؟'' وہ پھر تلخی سے پُر لہجے میں مخاطب ہوئی۔

''میری نظر میں آپ کا وہ روحانی چہرہ ہے جو بہت پیارا ہے، آپ کے زخم اچھے ہو جائیں پھر دیکھیے گا۔ پلاسٹک سرجری کے بعد یہ چہرہ پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو جائے گا۔'' شاہ عالم باہر کی طرف بڑھتے بڑھتے رک کر بولے۔

''پلاسٹک سرجری......؟'' رابی چونک گئی۔

شاہ عالم اسے اسی طرح خیال میں گم چھوڑ کر باہر چلے گئے۔

''میرا دماغ خراب ہے جو پلاسٹک سرجری کراؤں گی...... یہ چہرہ تو مجھے بے ضمیر لوگوں کے ظلم سے بچائے گا......اس اچھی امید پر تو میں یہ آگ کی طرح دہکتے زخم برداشت کر رہی ہوں۔'' وہ سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

''روما تم بالکل فکر نہ کرو، رابی آپا بالکل ریلیکسڈ ہیں، انہوں نے زیادہ بات ہی نہیں کی...... بے چاری کو تکلیف بھی تو بہت ہو رہی ہوگی۔ خود ہی سوچو۔'' کائناز کالج میں تھی روما نے اسے اس کے موبائل پر رنگ کیا تھا۔ وہ ساری رات سو نہیں سکی تھی۔ حادثہ بہت بڑا تھا اور اس کی عمر بہت چھوٹی تھی پھر گھر بھی تو آناً فاناً خالی ہو گیا تھا۔

''ہاں، میں ساری رات یہی سوچتی رہی کہ آپا کو کتنی تکلیف ہو رہی ہوگی۔ آپا نے خود کو تباہ کر لیا کسی کا کچھ نہیں بگڑا۔''

''رات کو ہم انہیں اسپتال لے گئے تھے، ڈاکٹر نے پین کلر فوراً ہی لگا دیا تھا۔ گھر آنے کے تھوڑی دیر بعد وہ سو گئی تھیں۔'' کائناز نے بتایا تو روما ایک دم ہی پُرسکون ہو گئی۔

''اوہ......تھینک گاڈ......'' وہ بے ساختہ بولی۔

''صبح کو جب میں کالج آئی تو وہ سو رہی تھیں۔ تم فکر نہ کرو میں تھوڑی دیر بعد فون کر کے بھی ان کی خیریت پتا کر لوں گی۔ یہ بتاؤ آنٹی کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

''کچھ نہیں پتا......خالہ جان کا کوئی فون نہیں آیا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ میں فون نہ کروں، وہ خود فون کر کے بتا دیں گی۔ دیکھو ابھی تو اماں جان اسپتال میں ایڈمٹ ہوئی تھیں اب پھر...... سمجھ نہیں آتی کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔'' بولتے بولتے روما کی آواز بھرّانے لگی۔

''اچھا......تم خود کو سنبھالو، انشاء اللہ تعالیٰ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ دادا جان کہہ رہے تھے کہ رابی آپا... کاسمیٹک سرجری کے بعد پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو جائیں گی۔ اگر باہر بھی جانا پڑا تو وہ انتظام کر دیں گے۔'' کائناز خود بھی مطمئن تھی اسی لیے روما کو پُرسکون کرنے کے لیے پورا زور لگا رہی تھی۔

''اللہ کرے......! میری تو ہمت ہی نہیں ہو رہی کہ آپا کے سامنے بیٹھ کر ان سے باتیں کروں۔'' روما پر کائناز کی تسلیوں کا خاطر خواہ اثر ہو چکا تھا۔

''ارے نہیں...... تمہیں تو ان کے پاس جانا چاہیے...... تمہیں دیکھ کر انہیں بہت اچھا لگے گا اور تم گھر میں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟ جا کر رابی آپا کے پاس بیٹھ جاؤ۔'' کائناز نے مشورہ دیا تھا۔

''ہاں......تم ٹھیک کہہ رہی ہو...... مجھے تو لگ رہا کہ کچھ دیر اور اکیلی رہی تو پاگل ہو جاؤں گی، میں ابھی جاتی ہوں۔'' روما ایک دم خوشی کے جذبات سے معمور ہو گئی۔

''ٹھیک ہے۔''

''اوکے......'' روما نے مختصراً کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

☆☆☆

''امی خدا کے لیے ستارہ کو بتا دیں کہ شادی اس کی ہو رہی ہے میری نہیں۔'' صابرہ کچن میں ہانڈی چڑھا رہی تھی کہ شبینہ بہت آف موڈ میں آ کر فوراً ہی شروع ہو گئی۔ اس کا نیا، نیا انداز دیکھ کر صابرہ بری طرح چونک پڑی۔

''خیریت......کیا ہوا؟''

''امی ایک بات طے ہو چکی، ابا جان فیصلہ سنا چکے اور جب وہ کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں تو کوئی ان کے سامنے بات کر سکتا ہے بھلا؟ کیا نکاح کے وقت اسے بتائیں گی اگر اس نے کوئی الٹی سیدھی حرکت کر ڈالی......تو سوچ لیں کیا ہوگا۔'' شبینہ بہت فکر مند نظر آرہی تھی۔ فکر مند تو صابرہ بھی تھی اور اس وقت تو شبینہ نے کھڑے کھڑے اس کی فکر میں طوفانی اضافہ کر دیا تھا۔

''اس کی زبان درازی کی وجہ سے تو تمہارے ابا جان نے یہ فیصلہ کیا ہے مگر انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ اتنی بے خوفی دکھانے والی لڑکیاں کوئی غلط قدم بھی اٹھا سکتی ہیں۔ بس اسی وجہ سے مجھے خوف سا ہو رہا ہے، کئی دنوں سے ہمت کر رہی ہوں جیسے ہی اس کے سامنے بیٹھتی ہوں الجھ جاتی ہوں مگر آخر کب تک......؟ اسے بتانا تو ہے ناں...... باپ سے نہیں ڈرتی، جس سے دنیا ڈرتی ہے۔''

''تو میں تو بتا دیتی ہوں اگر اس نے ابا جان کے مہمانوں کے سامنے کوئی حرکت کی تو سارا کچرا آپ پر پڑے گا۔ ابا جان ہاتھ دھو کر آپ کے پیچھے پڑ جائیں گے۔''

''نہیں، نہیں......تم اسے کچھ نہ بتانا...... میں خود بات کروں گی طریقے سے۔'' صابرہ گھبرا کر بولی۔

''کب...... جب اس کی بارات آجائے گی؟ پھر ہمیں تھوڑی بہت تیاری بھی تو کرنا ہوگی۔'' شبینہ سوچتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''کوئی تیاری نہیں ہوگی...... کون سی ارمانوں بھری شادی ہو رہی ہے، میں اپنی بے گناہ بچی کو گھر کے کپڑوں میں ہی رخصت کر دوں گی۔'' یہ کہہ کر صابرہ نے چولہا بند کر دیا اور دیوار سے پیشانی ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

شبینہ پر تو نئی افتاد پڑ گئی اس نے ایک دم ماں کو سینے سے لگا لیا۔

''امی......اب خود کو سمجھا بھی لیں......اس دکھ سے گزرے بغیر زندگی آگے نہیں بڑھے گی۔ ویسے بھی ہم سب گھر والوں کو اب تک عادی ہو جانا چاہیے تھا اور جب آپ نے ابا جان سے مرتے دم تک عہدِ وفا نبھانا ہی ہے تو رو رو کر ان کے فیصلے کیوں مانتی ہیں؟'' بولتے بولتے شبینہ کے لہجے میں تلخی اترنے لگی۔ وہ بہت اپنائیت سے اپنے دوپٹے سے ماں کے آنسو پونچھ رہی تھی۔

☆☆☆

''کچھ لوگ دنیا سے ظلم کے اندھیرے مٹانے کے لیے اپنے گھروں سے نکل پڑتے ہیں اور میں اپنے گھر میں مظلوموں کی مدد کرنے کے قابل نہیں ہوں۔'' برہان بہت افسردگی سے کہہ رہا تھا۔ وہ اس وقت یونیورسٹی کے سرسبز لان میں ایک گھنے درخت کے سائے تلے بیٹھا نعمان سے اپنے دل کی باتیں کر رہا تھا۔

''اپنی، اپنی سوچ ہوتی ہے، ہوسکتا ہے تمہارے فادر کی نیت بھلائی اور بہتری کی ہو۔'' نعمان نے لاشعوری طور پر گویا برہان کو ڈپریشن کی طرف جانے سے روکا تھا۔

''اسلام ہی تو وہ دین ہے جو زبردستی کا قائل نہیں ہے۔ جس نے عورت کو معزز بنایا۔ اس کے حقوق کو قانونی شکل دی۔ نکاح کے لیے لڑکی کی رضامندی کو لازمی قرار دیا ہے......جبر و گھٹن سے نڈھال ذہن کیا خدا سے محبت کے راستے ڈھونڈے گا جب جان پر بنی ہو تو ساری جدوجہد جان بچانے کے لیے ہوتی ہے۔'' برہان نے گھاس سے تنکے چنتے ہوئے دور افق کی طرف یوں دیکھا جیسے وہاں سے کوئی نجات دہندہ اسے اشارے کر رہا ہو۔

''یہی تو اصل بات ہے جو جاننا چاہیے وہ جانتے نہیں، نماز، روزوں کو اسلام کا مظہر سمجھ لیا گیا ہے۔ عبادت کی روح غائب ہے بس جیسے ڈمیاں display کر رہی ہیں، تب ہی تو آج کا انسان بے پناہ آسانیاں ہونے کے باوجود بے شمار مشکلات سے دوچار ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کو اپنی طرح کا انسان سمجھنے پر ہی تیار نہیں۔'' نعمان نے بھی بالآخر تائیدی رویہ اختیار کیا وہ برہان کو بچوں کی طرح نہیں بہلا سکتا تھا۔

''کون سمجھائے ان سخت گیروں کو کہ اسلام تو جیو اور جینے دو کا سبق دیتا ہے مگر چند حدود قیود کے ساتھ۔'' برہان کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ ابھر کر فوراً معدوم ہوگئی۔

''سوچتا ہوں اچھا ہے کہ میری بہن اس دوزخ سے نجات حاصل کر لے مگر دوسری طرف یہ خیال پریشان کرتا ہے کہ تبدیلی کے دوسرے سرے پر اس سے بڑی دوزخ منتظر نہ ہو؟'' برہان خود کلامی کے انداز میں گویا ہوا۔

''یہی تو ڈپریشن کی وجہ ہے۔ negative thinking...کم آن برہان! ٹاپک چینج کرو۔ یہ بتاؤ تمہاری ٹیوشن ایکٹویٹی کیسی چل رہی ہے؟'' نعمان نے پورا زور لگا کر گویا برہان کو یاسیت کے گڑھے سے ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

''ہاں ٹھیک ہے، ایک جگہ تو دادا کی صرف ایک پوتی اور دوسری جگہ دو اے لیول کے اسٹوڈنٹس جن کے پیرنٹس کو عین اسٹڈی کے وقت یاد آتا ہے کہ آج وہ لڑنا تو بھول ہی گئے تھے۔'' یہ کہہ کر وہ ہنس دیا۔ نعمان اس کی بات سن کر خاصا محظوظ ہوا۔

''اب دیکھ لو، لڑائی کہاں نہیں ہوتی؟''

''یہی بات سمجھ نہیں آتی، غریب میاں، بیوی کی لڑائی تو سمجھ آتی ہے کہ میر تقی میرؔ بھی مُہر لگا گئے ہیں۔

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
آدمی کا اعتبار کھوتی ہے

مگر یار یہ دولت مند میاں، بیوی کیوں لڑتے ہیں؟'' برہان اپنی بات پر خود ہی ہنس دیا۔

''یار برہان......'' نعمان کسی گہری سوچ کے دوران برہان سے مخاطب ہوا۔

''ہوں......!'' برہان نے ایک اچٹتی نگاہ اس پر کی۔

''یہ دنیا تو ایک طرح سے میدانِ جنگ ہے، سب لڑ رہے ہیں۔''

''تمہارے ممی، پاپا بھی لڑتے ہیں؟'' برہان نے اسے چھیڑا۔

''ایسا ویسا......یار چھوٹی چھوٹی باتوں پر......یوں جیسے بلیاں ایک ڈبل روٹی کے سلائس پر اسٹین گن لے کر لڑ رہی ہوں۔'' نعمان اب قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ جیسے اسے بہت کچھ یاد آ گیا ہو اور گدگدی ہو رہی ہو۔

''مثلاً......؟'' برہان کو اس جملے کی وجہ سے خود بخود دلچسپی ہوگئی۔

''مثلاً یہ کہ تم نے واش روم کا shower tap ٹھیک سے بند نہیں کیا تھا، باتھ گاؤن صوفے پر کیوں پھینکا......اپنا سیل فون آف کر کے کیوں نہیں سوئے، مجھے اپنا آپریٹر سمجھا ہوا ہے، سوتے ہوئے اتنی زور سے کروٹ کیوں لیتے ہو، لگتا ہے زلزلے سے بیڈ ہل رہا ہے، دوسری طرف پاپا کہ......کف سیرپ سرہانے رکھا تھا پھر کیوں رات بھر کھانستی رہیں؟ تمہیں پرائیویٹ اینڈ کونفیڈنشل envelope نہیں کھولنا چاہیے تھا، ٹی بیگ ں پہلے والی بات ہی نہیں، expiry دیکھے بغیر اٹھا کر لے آئی ہوگی، شاپنگ ہی نہیں کرنی آتی بس پیسے کو گ لگانے سے مطلب ہے۔ وغیرہ وغیرہ......'' نعمان بہت دلچسپ انداز میں بتا رہا تھا۔

''اوہ نو......رئیلی یہ ایشوز ہیں؟''

''ایشوز نہ ہونا بھی تو بہت بڑا ایشو ہے۔'' نعمان نے برجستہ کہا۔ ''یقین کرو ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر نے کے بعد دو دو دن ایک دوسرے سے بات نہیں ہوتی پھر میری چھوٹی بہن دونوں کی دوستی کراتی ہے اور اوضے کے طور پر اس رات دونوں کے ساتھ ڈنر پر جاتی ہے اور رات کو واپسی پر دونوں کے زبردست قہقہے ر میں گونج رہے ہوتے ہیں۔ میں تو سوچتا ہوں، کچھ عرصے بعد کیا میں بھی پاپا جیسا بن جاؤں گا......؟'' مان نے مصنوعی فکرمندی ظاہر کی۔

''اس کے لیے ایک عدد ممی کی ضرورت پڑے گی، میرا مطلب ہے تمہارے بچوں کی ممی کی۔'' برہان نے تگی کا مظاہرہ کیا۔

اب دونوں ہنس رہے تھے۔ نعمان، برہان کا موڈ بدلنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

☆☆☆

شبینہ کی بات نے صابرہ کو ایک مستقل سوچ میں ڈال دیا تھا۔ آخر کبوتر کے آنکھ بند کر لینے سے بلی بھاگ تو ں جاتی۔

ستارہ کی شادی کا حتمی فیصلہ ہو چکا تو اس کا ذہن بھی بنانا ہوگا، وہ شبینہ نہیں ہے جو زور دار دھاڑ سن کر سہم کر جائے۔ سوچ، سوچ کر اس کا ذہن شل ہو رہا تھا مگر اس مرحلے سے گزرنا تو تھا۔ ستارہ کے متوقع ردِعمل کے ں سے ذہن بوجھل ہو رہا تھا۔ اس کا اختلاف، مزاحمت، بے باکی، بے خوفی کسی عفریت کی طرح ماحول ۔ں ناچتے، کودتے محسوس ہونے لگے مگر اس معرکے سے جان کی بازی لگا کر نمٹنا تھا۔ وہ آہستہ بلکہ مرے مرے

قدموں سے چلتی لڑکیوں کے کمرے میں آئی تو دیکھا ستارہ شیشے کے کام کا طُغرہ بنانے میں منہمک تھی، آس پاس خاصا بکھیڑا پھیلا ہوا تھا۔ قینچی، سرخ ویلوٹ کی کترنیں، گلیو، سوئی دھاگا، ریشم کے دھاگے وغیرہ اس نے یا اللہ یا رحمٰن یا رحیم کا بہت دیدہ زیب طغرہ تقریباً تیار کرلیا تھا۔ آج سے بہت عرصے پہلے اس نے جان لیا تھا کہ اس کی دونوں بیٹیاں آرٹ کی طرف رجحان رکھتی ہیں، ستارہ بچپن ہی سے اپنی پینٹنگ کی وجہ سے ہم جماعتوں میں نمایاں ہوگئی تھی۔

جابر علی کو گھر میں شہزادیوں اور ملکاؤں، بادشاہوں کی پینٹنگز نظر آنے لگیں تو اس نے ہنگامہ کردیا کہ یہ شریعت کے خلاف عمل ہے، ستارہ نے دوسرا راستہ اختیار کرلیا کہ ہنر سمندر کی لہروں کی طرح اندر سے ابلتا ہے اور اظہار چاہتا ہے۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہیں امی...... لگتا ہے کوئی خاص بات کرنے آئی ہیں؟'' وہ اپنے کام میں مگن تھی مگر ماں کے چہرے سے اخذ کرنے کی مہلت بھی نکال لی تھی۔

''ہاں...... ذرا اپنی دکان بڑھاؤ تو میں تم سے بات کروں۔'' صابرہ نے اپنا لہجہ معمول کے مطابق کرنے کی سعی کی۔

ستارہ نے ہاتھ میں پکڑی گلیو کی ٹیوب خوب ٹائٹ بند کی دیگر چیزیں سمیٹیں۔

''دلیں دکان بند ہوگئی...... کہیے...... کیا ہمیں شادی کی شاپنگ کرواتے لے جارہی ہیں؟'' وہ اپنے مخصوص پھکّڑپن سے گویا ہوئی اور خود ہی ہنسنے لگی جیسے اپنی ہی بات پر گدگدی ہوئی ہو۔

''میری بات بہت توجہ سے سنو، یہ مذاق میں اڑانے والی بات نہیں ہے۔'' صابرہ نے پیش بندی کی۔

''مذاق میں نہیں اڑاؤں گی، پڑیا میں باندھ لوں گی، اب کہیے بھی، مجھے تو آپ کے انداز بہت خاص لگ رہے ہیں۔'' ستارہ کے لہجے میں خود بخود سنجیدگی اتر آئی کیونکہ ماں کے چہرے پر فکر بھی تھی اور گہری سنجیدگی بھی۔

''بیٹا! بات یہ ہے کہ تمہارے ابا جان نے شبینہ سے پہلے تمہاری شادی کا فیصلہ کیا ہے۔'' صابرہ اندھیری تنگ گھاٹی سے بہرحال چھلانگ مار کر باہر آہی گئی۔

ستارہ نے صابرہ کی طرف یوں دیکھا جیسے سماعت کے دھوکے پر پریشان ہوگئی ہو۔

''میں تمہیں کہتی تھی ... ناں کہ لڑکیاں محتاط اور باحیا ہوں تو بہت سہولت رہتی ہے مگر تمہاری زبان نے تمہیں پھنسا دیا۔ تمہارا بے دھڑک بولنا، تمہارے باپ کو اندیشوں میں مبتلا کرچکا ہے حالانکہ میں جانتی ہوں میری بچیاں باکردار اور نیک ہیں مگر زبان کا کھلا استعمال ہمیشہ انسان کو مصیبت میں مبتلا کردیتا ہے۔'' صابرہ بول رہی تھی، ستارہ ٹکرٹکر ماں کی صورت دیکھ رہی تھی۔ ایک قیامت کا احساس جس نے پہلی بار اسے لب بستہ کردیا تھا۔

یوں جیسے وہ کسی پہاڑ کی اوٹ میں کھڑی فطری نظاروں سے لطف اندوز ہورہی تھی اور کسی نے بتایا پہاڑ کے دوسری طرف سے شیر آرہا ہے اور آناً فاناً ماحول کا سارا رومانس وحشت میں بدل گیا ہو۔

''بیٹا...... یہ فیصلہ تو کئی دن پہلے ہوچکا۔''

''امی...... روزانہ کا جبر، ڈکٹیٹرشپ تو برداشت کی جاسکتی ہے، اپنی پوری زندگی برباد کرنے کا اختیار کسی کو نہیں دیا جاسکتا۔''

''دیکھو، ہر بیٹی ہمیشہ سے باپ کے فیصلے مانتی آرہی ہے، یہی ادب وحیا کا تقاضا ہے، وہ اپنی اولاد کے دشمن تو نہیں ہیں، یہ اُن کی محبت ہی تو ہے کہ انہوں نے بیٹی کے لیے سہولت والا گھر دیکھا ہے۔ کسی غریب نکھٹو کے پلّے بھی باندھ دیتے تو ہم کیا کرلیتے اور ان کی یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ عمر کا زیادہ فرق شریعت کے خلاف بات بں ہے، اصل بات تو میاں بیوی کا پیار، محبت اور خلوص ہے۔'' صابرہ کو وہ دلائل سوجھ ہی گئے جن سے طوفان کنے میں اچھی خاصی مدد مل سکتی تھی۔

مگر ستارہ ابھی تک سکتے کی کیفیت میں تھی، اس کی شادی، منگنی بھی نہیں مکمل شادی...... شادی تو دوشیزگی ے پہلے زینے پر قدم رکھتے ہوئے لڑکی کا سب سے رنگین، اولین رومانس ہوتا ہے۔ سپنوں کا شہزادہ کبھی یچے کے دوسری طرف کھڑا نظر آرہا ہوتا ہے۔ کبھی بیلے کی کلیاں لیے سرہانے آ کھڑا ہوتا ہے، کبھی ساون کی لی گھٹا کے ساتھ گلابوں کے کنج میں چھپ کر دیکھ رہا ہوتا ہے شادی...... شادی کی بات یوں ہورہی تھی جیسے سید ہاتھ میں تھما کر دھوبی سے دُھلے کپڑے منگائے جارہے ہوں۔

ستارہ کی خاموشی کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ صابرہ کا دل سینے میں یوں بھاگ دوڑ رہا تھا گویا وئی گھنے جنگل میں نجات کا راستہ ڈھونڈ رہا ہو۔

''آپ ابا جان سے کہہ دیجیے میرے ساتھ زور زبردستی نہ کریں، میں بے شک بے اختیار اور بہت کمزور وں مگر ہر انسان کو اپنی جان پر تو مکمل اختیار ہوتا ہے، میں شبینہ آپا نہیں ہوں۔'' ستارہ کے لہجے میں بلا کی بے رُوتی اور اجنبیت تھی۔

صابرہ کو جیسے اس کی بات سمجھ ہی نہیں آئی، پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی۔

''امی، سیدھی سی بات ہے میں شادی کیوں کروں؟ مجھے زبردستی کی یہ شادی نہیں کرنی، اب کوئی کچھ بولے یہ میرا فیصلہ ہے۔'' ستارہ نے بہت بے خوفی سے فیصلہ سنا دیا۔ لگتا تھا کہ وہ کسی انتہا پر پہنچ کر کچھ سوچ رہی ہو۔

''اس زبان کو دانتوں تلے دبالو، جانتی ہو کہ اس گھر میں صرف تمہارے باپ کے فیصلے سنے جاتے ہیں، میں تو تمہاری ہمت پر حیران ہوں۔'' صابرہ نے دانت پیس کر دبی، دبی آواز میں بات کی، ستارہ کی جرأت نے تو اسے لامحدود خوف سے ہمکنار کردیا تھا۔

''مجھے نہیں کرنا...... نہیں کرنا...... آپ لوگوں نے زیادہ زبردستی کی تو پھر میں عین نکاح کے وقت انکار کردوں گی۔'' ستارہ یا تو بہت بے وقوف تھی یا بہت عقل مند اس کا انداز اتنا دوٹوک تھا کہ صابرہ چند لمحے اس کی طرف ششدر سی دیکھتی رہ گئی پھر اس نے ایک زوردار تھپڑ ستارہ کے رخسار پر جڑ دیا۔

''یہ سب تیرا اپنا کیا دھرا ہے، شبینہ نے تو باپ کا فیصلہ مان لیا تھا۔ تیری زبان نے تجھے پھنسایا ہے اور جانے اب اور کیا گل کھلائے گی۔ تیری وجہ سے آج میں اپنے بیٹے سے دور ہوں، ماں پر رحم نہیں آتا، ماں کو کبھی اُن کے سامنے زبان چلاتے دیکھا ہے، بے غیرت اولاد......'' صابرہ بولتے بولتے بھل بھل رو پڑی...... جانتی تھی کہ بیٹی بے قصور ہے، ظلم کے سامنے ڈٹ رہی ہے مگر نہیں جانتی تھی کہ ماں پر زندگی کے راستے بند کررہی ہے۔

''کوئی شہزادہ آئے گا تجھے بیاہنے؟ دھمکیاں دے رہی ہے لڑکی ہو کے...... ارے میرے ماں باپ مرچکے، تین سوتیلے بھائی ہیں، کوئی میکا نہیں ہے تیری ماں کا تیرے باپ نے گھر سے نکال دیا تو کیا سڑک پر بیٹھ کر بھیک مانگوں گی؟''

''جان سے ماردیں مجھے...... جان چھوٹے میری۔'' ستارہ یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ ماں کی .... بے بسی نے اس پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ سوچ جس جگہ رک گئی تھی اٹل ہوگئی تھی۔ وہ باپ کی طرح خودغرض اور انتہا پسند تھی، وراثت میں آخر کچھ تو لیا ہی تھا یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ جابر علی کی بیٹی ہے، صابرہ خوف و وحشت کی انتہا پر سکتے کی کیفیت میں مبتلا ہوچکی تھی۔ سامنے صرف ایک سوال تھا کہ اب کیا ہوگا......؟

☆☆☆

''اچھا تو یہ بات تھی یعنی تمہیں پتا چل چکا تھا کہ مجھے سولی پر لٹکانے کا فیصلہ ہوچکا ہے؟'' ستارہ نے غرّاتے ہوئے شبینہ کو مخاطب کیا جو آنے والی کسی قیامت کے خوف سے پیچھا چھڑانے کے لیے خود کو مصروف رکھنے کے بہانے ڈھونڈ رہی تھی۔ اسے یہ تو اندازہ تھا کہ ماں، ستارہ سے بات کررہی ہے تو اس کے بعد کیا ہوسکتا ہے۔ کچھ نہ سوجھا تو کپڑوں کا ڈھیر دھونے بیٹھ گئی۔ ستارہ کے الفاظ سننے کی تاب نہ تھی اس کے لفظ ہمیشہ شبینہ کے لیے امتحان ہوتے تھے۔ واشنگ مشین کی سمع خراش آواز نے اسے ماحول کی خوفناکیوں سے وقتی طور پر دور کردیا تھا مگر حملہ ہوگیا تھا۔ وہ جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی کہ بہن کی باتوں کا جواب دینا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

''چپ کیوں ہو آپا......؟ خوش ہو کہ تم بچ گئیں...... میری زندگی اتنی فالتو ہے کہ لوگوں کی جان بچانے کے لیے خرچ کروں؟ ٹھیک ہے پھر میں یہ زندگی تم پر قربان کردوں گی...... زہر کھالوں گی پھر ہم دونوں کی جان چھوٹ جائے گی، ٹھیک ہے ناں؟''

''بس کرو ستارہ...... اس گھر میں میری نہیں چلتی، تم اپنا غصہ مجھ پر کیوں اتار رہی ہوں، تمہیں سمجھاتے تو تھے کہ فضول میں زبان چلانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور یہ زہر کھانے کی دھمکیاں نہ دو...... یہاں سب ہی زہر پی رہے ہیں، آخر باپ کی ماننے میں حرج کیا ہے؟ وہ دشمن تو نہیں ہیں ہمارے...... ہمارے گھر میں کسی کی بھی شادی ہوا ابا جان کی پسند ہی سے ہوگی تو پھر فلمی ہیروئن بننے کا فائدہ...... وارث علی ہو یا الف، ب، ج...... انتخاب ابا جان کا ہی ہوگا۔'' شبینہ نے بڑے تحمل سے عقل کی بات ستارہ کے دماغ میں بٹھانے کی کوشش کی۔

''مجھے تو شادی وہیں کرنی ہے جہاں میرا دل ہاں کہے گا...... اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے اپنی پسند سے شادی کرنی ہے مگر وارث علی سے بھی نہیں کرنی۔''

''پھر وہی فضول بات...... ہر فیصلہ ابا جان کا ہوتا ہے، تم خود پر نہیں تو اپنی ماں پر ہی رحم کرو، وہ پہلے ہی بہت پریشان ہیں بلکہ تم نے ان کی زندگی مزید مشکل بنادی ہے۔''

''ہاں تو ان کی ساری مشکلیں بھی میں ہی ختم کروں گی۔'' ستارہ یہ کہہ کر پاؤں پٹختی وہاں سے چلی گئی۔ خوف گردباد کی طرح شبینہ کے وجود کے گرد چکرانے لگا۔

☆☆☆

''ڈاکٹر صاحبہ ہوش میں ہیں۔'' نرس نے گل جان کو مطلع کیا تو گل جان کے وجود میں سکون کی لہریں اترنے لگیں۔

''اللہ کا لاکھ، لاکھ شکر ہے۔'' اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر چھت کی طرف دیکھتے ہوئے شکرانہ کہا۔

''رات تک کوئی اچھی امید نہیں تھی مگر انہوں نے دو گھنٹوں میں survive کیا ہے۔ ڈاکٹر بھی حیران اور خوش ہیں۔ آپ کو بہت، بہت مبارک ہو۔ اب وہ بہت جلدی بلکہ تیزی سے صحت یاب ہوں گی۔'' نرس بھی

ڈاکٹر مہر جان کے گھر کا فرد ہی تھی۔ دس سال سے اس اسپتال میں کام کررہی تھی۔ مہر جان کی فیملی سے اچھی طرح واقف تھی۔ اس لیے اس کا انداز خالص پیشہ ورانہ نہیں تھا بلکہ خاصی اپنائیت کا حامل تھا۔

''کوئی بات وات کی بی بی جان نے......؟'' گل جان جذباتی پُرجوش اور زندگی سے بھرپور نظر آنے لگی۔

''جی...... وہ عجب خان کو آواز دے رہی تھیں...... یہ کوئی آپ کے relative ہیں؟''

''جی......؟'' گل جان بھونچکا سی ہوکر نرس کی شکل دیکھنے لگی۔

''عجب خان....؟ عجب خان تو پندرہ سال پہلے مرچکا...... ہمارا بہت پرانا نوکر تھا۔''

''اوہ......؟ ریئلی...... مگر وہ تو مسلسل اس کا نام لے رہی ہیں۔'' گل جان پر سکتہ طاری ہونے لگا۔

''کیا بی بی جان کا دماغ الٹ گیا ہے؟ وہ عجب خان کو کیوں یاد کررہی ہیں؟'' پھر وہ ایک دم حواس باختہ ہوکر مہر جان کے vip روم کی طرف دوڑی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس پر نئے سرے سے حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ مہر جان بیڈ پر ٹیک لگائے اپنے خیال میں گم مسکرا رہی تھیں۔ گل جان تیزی سے ان کے قریب آئی۔

''بی بی جان...... آپ ٹھیک ہیں ناں......؟'' وہ سراسیمگی کے عالم میں پوچھ رہی تھی۔

''اوہ گل جان...... میں تمہیں ہی ڈھونڈ رہی تھی...... کیا مصیبت ہے، یہ مجھے اسپتال کون لے کر آیا...... کیا ہوا ہے مجھے......؟ اتنی ہٹی کٹی تو ہوں۔'' مہر جان کے انداز میں بڑی تازگی تھی۔

''ویسے مجھے یاد نہیں آرہا کہ میں اسپتال کیسے آئی......؟ کیا میں بے ہوش ہوگئی تھی...... مگر کس وجہ سے؟'' مہر جان اپنے ذہن پر زور ڈال کر سوچنے لگیں۔

''آپ کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی اسی لیے اسپتال لے کر آئے تھے۔'' گل جان نے ریت کی طرح بکھرتے وجود کو بہ مشکل سنبھالا۔

''وہی تو پوچھ رہی ہوں کیا ہوا تھا مجھے؟ مجھے کیوں یاد نہیں آرہا......؟ بابا کہاں ہیں؟ کیا زمینوں پر گئے ہوئے ہیں۔ تم نے انہیں بتایا کہ میری طبیعت خراب ہے میں ایڈمٹ ہوں؟ مگر میری طبیعت کیوں خراب ہے؟'' مہر جان پھر گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔

''بی بی جان کا ذہنی توازن بگڑ چکا ہے؟'' گل جان خوف کی بلکہ شدید صدمے کی کیفیت میں مہر جان کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

''ویسے گل جان...... میں ٹھیک ہوں ناں...... وہ میں یہ کہہ رہی تھی......'' بولتے بولتے رک کر مہر جان اپنی پیشانی انگلیوں سے دبانے لگیں۔ ''میں کیا کہہ رہی تھی گل جان؟ بتاؤ ناں میں کیا کہہ رہی تھی؟ یااللہ...... میں کیوں بار بار بھول جاتی ہوں، کیا کہہ رہی تھی میں......؟ یاد ہی نہیں آرہا میں کیا کہہ رہی تھی...... مگر کچھ تو کہہ رہی تھی...... ہاں یاد آگیا...... وہ میں یہ کہہ رہی تھی کہ...... اُف پھر بھول گئی۔'' اب مہر جان نے بڑی بے بسی کی کیفیت میں دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

''اچھا چھوڑو...... میں تھوڑی دیر کو سوکر اٹھتی ہوں پھر مجھے سب یاد آجائے گا۔'' مہر جان گویا پرندوں کی طرح اڑتے لفظوں کو جال ڈال کر قید کرنا چاہتی تھی مگر وہ جال سے بہت اونچے تھے۔ وہ نڈھال سی ہوکر لیٹ گئیں اور آنکھیں بند کرلیں۔

گل جان کے حواس تو صدمے کی انتہا پر معطل ہورہے تھے، اس نے بہ مشکل خود کو سنبھالا اور پاس پڑی

کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

☆☆☆

شاہ عالم ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد آہستہ قدموں سے اپنے گھر کی طرف جا رہے تھے کہ اصیل خان کی نظران پر پڑی، وہ کہیں سے آ رہا تھا۔ تیز تیز قدموں سے اس نے شاہ عالم کو جالیا۔

''السلام علیکم شاہ صاحب......!'' شاہ عالم جانے کس دھیان میں تھے چونک پڑے۔

''اوہ...... اصیل خان آپ......؟ ڈاکٹر صاحبہ کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' اصیل خان پر نظر پڑتے ہی انہوں نے بڑی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔

''جی...... ابھی فون کر کے پتا کروں گا، صبح تک تو ہوش میں نہیں تھیں۔''

''اوہ...... اللہ رحم کرے...... ہوسکتا ہے ڈاکٹر نے انہیں کوئی ایسی دوا دی ہو جس کی وجہ سے گہری نیند سو رہی ہوں۔''

''ہم انہیں بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لے کر گئے تھے۔ بے ہوش بندے کو نیند کی گولی تو نہیں کھلا سکتے۔'' اصیل خان نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔ وہ تو بڑی بے قراری سے رابی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کا حال دریافت کرے کہ اس سرکش موج نے سمندر میں ختم ہونے کا سوچا یا ساحل کی ریت پر اکیلی سر پٹخ رہی ہے۔

''ہوں...... شدید صدمے کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ اسی وجہ سے بے ہوش ہوئی ہوں گی۔'' شاہ عالم خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئے۔

''جی...... مسلسل صدمات انسان کو توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔'' اصیل خان بھی زیرِ لب کہہ رہا تھا۔

''مسلسل صدمات......؟'' شاہ عالم کو یہ جملہ بریکنگ نیوز کے مترادف لگا چونک گئے۔

''ماشاء اللہ...... ڈاکٹر صاحبہ تو بہت کامیاب زندگی گزار رہی ہیں۔ کیا پہلے بھی وہ کسی بڑی ٹریجڈی سے گزری ہیں؟'' فکر و تشویش سے پُر انداز تھا۔

''جی......'' جواب نہایت مختصر تھا۔

شاہ عالم کے علم میں یہ بات تھی کہ اصیل خان، ڈاکٹر مہر جان کا سب سے پرانا ملازم ہے، دونوں بچیاں اس سے بہت مانوس ہیں اسے بابا اصیل خان کہتی ہیں۔ یقیناً گردشِ لیل و نہار کے شکم سے تخلیق ہونے والے حادثات و واقعات کا وہ عینی شاہد تھا۔

''شاہ صاحب...... وہ رابی بی بی کا اب کیا حال ہے، آپ کو بہت پریشانی ہو رہی ہوگی۔'' اصیل خان بالآخر جھجکتے ہوئے رابی تک آ گیا۔

''میری بیٹی ہے وہ...... روما میں کائناز کی جان ہے اور رابی، روما کی بہن ہے۔ اس حوالے سے تو وہ اب میری اولاد کی طرح میری ذمے داری ہے۔'' شاہ عالم بہت پُر وقار لہجے میں گویا اصیل خان کو تسلی بھی دے رہے تھے۔

''آپ کا بڑا پن ہے شاہ صاحب...... آج کل تو خون کے رشتے بھی کسی کی خاطر تکلیف اٹھانا پسند نہیں کرتے۔''

''اللہ کو جس سے جو کام لینا ہے، لے رہا ہے، میں اپنے پیاروں سے بہت جلدی محروم ہو گیا تھا۔ مجھے

خون کے رشتوں سے نہیں آزمایا گیا اصیل خان...... رشتوں میں بہت کام ہوتے ہیں، میں تو طویل عرصے تک سمجھو جاب لیس رہا...... اب تو جاب ملی ہے اور بہت اچھی ہے خدا کرے میری ذات سے خلقِ خدا کو آرام ملے۔'' شاہ عالم کے انداز میں فلسفہ، روحانیت اور قدرے شگفتگی تھی مومن کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ اس کا چہرہ ہمیشہ شگفتہ و تروتازہ رہتا ہے کیونکہ وہ روشنی کا پیامبر ہوتا ہے۔ اصیل خان تو جیسے عقیدت سے دُہرا ہو گیا۔

''اللہ آپ کو اس کا بہت اجر دے گا شاہ صاحب......'' وہ برجستہ بولا۔

''اجر اللہ ہی دیتا ہے، یہ بندوں کے بس کی بات نہیں۔'' شاہ عالم اپنے مخصوص پُروقار انداز میں مسکرائے۔

''رابی، ذہنی، جسمانی ہر لحاظ سے انشاء اللہ بہت جلد اچھی ہو جائے گی۔ جب تک اس کی زندگی میں اجالے نہیں آجاتے اور مجھے زندگی کی صورت مہلت ملی ہوئی ہے وہ اب میری ذمے داری ہے، تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ میں جانتا ہوں تم نے ان دونوں بچیوں کی پرورش میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے اسی وجہ سے تمہارے دل میں ان کے لیے درد ہے۔'' اصیل خان کا دل سمندر ہونے لگا...... پانی آنکھوں کے ساحل تک آیا اور لوٹ گیا۔

''ہم آپ کا احسان نہیں اتار سکیں گے۔'' وہ بہ مشکل گویا ہوا۔

''اور میں اللہ کا احسان کیسے اتاروں جو مجھے بھلائی کی توفیق بخش رہا ہے۔''

اصیل خان اب اپنے آپ میں نہ رہا اس نے شاہ صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور آنکھوں سے لگا لیا۔

''یہ نہ کرو اصیل خان......'' شاہ عالم نے بڑی نرمی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے چھڑایا۔

''یہ عمل تکبر کے قریب لے جاتا ہے۔ احساسِ برتری پیدا کرتا ہے، تمہارا کیا خیال ہے یہ میں اپنی مرضی سے کر رہا ہوں؟ یہ اللہ کی مرضی ہے، ہارٹ پیشنٹ ہوں...... کبھی سانسیں گنتا ہوں کبھی کام......'' شاہ عالم نے گہری سانس لی اور اصیل خان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے تھپکی دی۔

☆☆☆

''کل شام چھ بجے نکاح ہوگا...... کھانا وانا نہیں صرف ریفریشمنٹ ہوگا۔'' جابر علی معمول سے کافی پہلے گھر آچکا تھا۔

''سنتے ہیں ایسی شادیاں تو ہجرت کے وقت ہوئی تھیں۔ چاروں طرف بلوے ہو رہے تھے، جان، عزت بچانے کی خاطر لوگوں نے راتوں رات بیٹیوں کے نکاح پڑھوا دیے تھے تاکہ ذمّے داریاں ہلکی ہو جائیں۔'' صابرہ نے درد کی ٹیسیں دباتے ہوئے بہت دھیمی آواز میں دکھ رو دیا۔ جابر علی نے خشونت بھری نظروں سے صابرہ کی طرف دیکھا۔

''تمہاری نحوست میری اولاد کو برباد کر دے گی۔ ایک بات طے ہو چکی' فیصلہ ہو چکا مگر تمہاری کہانیاں ختم نہیں ہو رہیں۔ ستارہ کی شادی میں اس گھر کا امن چھپا ہوا ہے، سب کو سکون مل جائے گا۔ جب تک اس کی شادی نہیں ہوتی میری نیندیں ویران ہیں، کہاں سے لائے گی بیٹیوں کے لیے اچھے رشتے، جہیز، شادی کی فضول رسموں کے لیے پیسہ، ایک عزت دار بندہ عزت کے ساتھ میری بیٹی کو لے جا رہا ہے۔ عزت سے زندگی گزارے گی اور شادی کا کیا مقصد ہوتا ہے۔ دھوم دھام خرچے سے ہونے والی شادیوں کے انجام بھی دیکھے ہیں؟ تین مہینے بھی نہیں چلتیں...... شادی جُوا ہوتی ہے، اس جوئے پر اتنا پیسہ نہیں لگانا چاہیے...... یہی عقل مندی

ہے، اب جاؤ تیاریاں کرو۔'' جابر علی خلافِ توقع بڑی مصلحت سے بات کر رہا تھا۔ کھری کھری ضرور سنائیں مگر آواز دبی ہوئی تھی۔ شاید ستارہ نے باپ کو واقعی ڈرا دیا تھا۔

''تیاریاں...... کیا تیاریاں کرنی ہیں؟'' صابرہ نے بہ مشکل خود کو سنبھالتے ہوئے سوال کیا۔

''بھئی آٹھ دس بندوں کا چائے پانی کرنا ہوگا...... لڑکیوں کو کل کا پروگرام بتا دو...... اور کیا اخبار میں خبر چھپوانی ہے؟''

''میری تو اب ہمت نہیں...... میں نے ستارہ کو شادی کا تو بتا دیا تھا، اب یہ آپ اسے بتا دیں کہ کل نکاح ہے۔'' صابرہ کے سر پر تو اب ''کل'' کھڑی تھی۔ اس نے بڑی بے بسی سے معذرت کی تھی کیونکہ واقعی اس کے ذہن نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔

''وہ تمہاری ماں ہے یا تم اس کی ماں ہو...... اولاد سے ڈرتی ہو یا اس نے کچھ کہا ہے جو مجھ سے چھپا رہی ہو......؟'' جابر علی کی نظروں میں پولیس والوں کے شک کرنے کا مخصوص رنگ جھلک رہا تھا وہ بہت گہری نظروں سے صابرہ کے چہرے کو تک رہا تھا۔

''ظاہری بات ہے...... قدرتی آفت کی طرح اسے شادی کی خبر ملی ہے، بچی ہے کچھ تو بولے گی۔'' صابرہ نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

''اسے بولنے کا جوش چڑھ چکا ہے، اسی لیے انتظام کر دیا ہے۔ شادی کے بعد جو بولنا ہے اپنے گھر میں بولے۔ بہر حال تمہارے نکمے پن کی وجہ سے ہی یہ صورتِ حال بنی ہے، میں خود بتا دیتا ہوں، مجھے آرام کرنے دو...... اٹھ کر بات کرتا ہوں، تم جاؤ...... عورت کسی کام کی نہ ہو تو سارے گھر کا بھٹا بیٹھ جاتا ہے۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے واش روم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ صابرہ کے سینے سے پھر ہوک اٹھی۔ وہی ہوک جو برسوں سے اس کے سینے میں پکّا گھر بنائے بیٹھی تھی۔

☆☆☆

''کیا کہہ رہی ہیں گل جان بی بی؟'' اصیل خان ریسیور کان سے لگائے صدمے سے نڈھال آواز میں کہہ رہا تھا۔

''ہاں اصیل خان...... بی بی جان کو ان کی زندگی میں ہی غموں سے آخر کار نجات مل گئی۔'' گل جان کی آنسوؤں میں ڈوبی آواز ائرپیس میں ابھری ساتھ ہی ایک سسکاری بھی۔

''مگر...... آج کل تو ہر بیماری کا علاج ہو جاتا ہے۔ آپ کیوں مایوس ہو رہی ہیں؟'' اصیل خان نے اب خود کو سنبھال کر گل جان کی ڈھارس بندھانے کی کوشش کی۔

''مگر میں ان کا علاج نہیں کراؤں گی؟'' گل جان نے ایک دم حتمی لہجے میں دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔ اصیل خان کے لیے تو یہ دھماکا تھا...... چند لمحے کے لیے گنگ سا ہو کر رہ گیا۔

''مگر کیوں......؟'' بالآخر اس کے ہونٹوں سے سوال پھسل گیا۔

''تم کیا چاہتے ہو؟ میری بہن جب تک زندہ رہے ایک ان دیکھی آگ میں جلتی رہے، کبھی خوش اور مسکراتی ہوئی نظر نہ آئے؟ ہر وقت گزرے وقت کو یاد کر کے روتی رہے، جن کی آنکھ نہیں روتی ان کے دل روتے ہیں اصیل خان...... ان کی سختی ان کا پردہ بنی رہی مگر میں گارنٹی سے کہتی ہوں وہ اکیلے میں ماتم کرتی ہوں گی، حد ہوتی ہے خوشیوں کو ترسنے کی......'' گل جان ایک سانس میں بولتی چلی گئی۔

اصیل خان اس کے لفظوں کے اثر سے مسمریزم کی سی کیفیت میں مبتلا ہو چکا تھا۔

''مگر علاج نہ ہونے کی وجہ سے، بہت سے نئے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔''

''نہیں......'' گل جان نے تیزی سے اصیل خان کی بات کاٹ دی۔ ''وہ اب اپنی آخری سانس تک خوش رہیں گی...... ان کی یادداشت صرف بیس برس پہلے تک محدود ہو گئی ہے، عجب خان، بابا، ٹوٹو، گل جان اور اصیل خان کے علاوہ انہیں کچھ یاد نہیں۔ روما، رابی، کائناز، رابی کی ماں، اپنا اسپتال، اسٹاف، دوست انہیں یاد نہیں۔'' اصیل خان کا وجود کسی زلزلے کی زد میں آ چکا تھا۔ وہ بولنا چاہ رہا تھا مگر زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

''اصیل خان، بی بی جان مسکرا رہی ہیں، ہنس بھی رہی ہیں اور ہنستے ہوئے بہت خوب صورت لگ رہی ہیں...... مدتوں بعد جب میں نے انہیں کھل کر ہنستے دیکھا تو دیکھتی رہ گئی، اتنی پیاری لگ رہی تھیں کہ اتنی پیاری تو دلہن بنتے وقت بھی نہیں لگی تھیں۔''

''دلہن......؟'' اصیل خان کی روح کے خالی ڈھول میں جیسے کوئی چاندی کا سکہ گرا۔

''میں انہیں گھر لے کر آ رہی ہوں، ڈاکٹر روکنے کے لیے پورا زور لگا رہے ہیں مگر مجھے ہنستی مسکراتی مہر جان چاہیے۔ اللہ نے میری سن لی۔ بی بی جان کو ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے دکھوں سے نجات مل گئی۔ تمہیں آنے کی ضرورت نہیں...... میں بی بی جان کو خود لے آؤں گی۔'' گل جان نے اعتماد سے فیصلہ سنایا اور فون بند ہو گیا۔ ریسیور ابھی تک اصیل خان کے کان سے لگا تھا۔ گویا اپنے وجود کو متحرک کرنا محال تھا۔

روما اسپتال فون کرنے کے لیے ہی لاؤنج میں آئی تھی۔ اس نے اصیل خان کو شاکڈ کیفیت میں کھڑا پایا تو بری طرح بدحواس ہو کر آگے بڑھی اور ریسیور جھپٹنے کے انداز میں اصیل خان سے لے کر اپنے کان سے لگا لیا مگر دوسری طرف تو ٹوں ٹوں بھی بند ہو چکی تھی۔ فون تو ڈیڈ محسوس ہوا تھا اس نے آہستگی سے ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے اصیل خان کی طرف دیکھا جو روما کے عمل کے بعد اپنے حواسوں میں واپس آ چکا تھا۔

''کیا ہوا بابا......؟ کس کا فون تھا، آپ ایسے کیوں کھڑے ہوئے تھے؟'' روما کے انداز میں وحشت سے پُرعجلت تھی۔

''کچھ نہیں...... آپ گھبرائیں نہیں کوئی ایسی بات نہیں...... گل جان بی بی، ڈاکٹر صاحبہ کو لے کر گھر آ رہی ہیں۔'' اصیل خان نظریں چراتے ہوئے مخاطب ہوا۔

''اوہ...... اس کا مطلب ہے اماں جان اب خیریت سے ہیں۔'' روما نے مطمئن ہو کر ایک گہری سانس کھینچی...... مگر فوراً ہی کسی دھیان سے چونکی۔

''لیکن آپ اس طرح کیوں کھڑے ہوئے تھے جیسے خدانخواستہ کوئی sad news سنی ہو؟'' وہ شک بھری نظروں سے اصیل خان کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔

''بیٹا...... اتنی بڑی خوش خبری نے میرے اوسان ہی چھین لیے، اتنی جلدی اتنی اچھی خبر جو ملی تھی...... میں تو سوچ رہا تھا شاید ڈاکٹر صاحبہ کو وہاں دس پندرہ دن لگ جائیں۔''

''تھینک گاڈ...... مجھے خود یقین نہیں آ رہا کہ اماں جان اتنی جلدی ٹھیک ہو گئی ہیں۔''

''جی بیٹا...... وہ بالکل ٹھیک ہو گئی ہیں۔'' اصیل خان زبردستی مسکرایا اور سوچنے لگا۔ ''اس سے زیادہ کیا ٹھیک ہوں گی۔'' وہ سر جھکا کر باہر کی طرف بڑھا۔ روما نے جلدی سے کائناز کو خوش خبری سنانے کے لیے فون ملانا شروع کر دیا تھا۔ حالانکہ اس وقت وہ کائناز کے گھر رابی سے ملنے کے ارادے سے جا رہی تھی مگر یہ سن کر کہ

خالہ جان، اماں کو گھر لا رہی ہیں اس نے اپنا پروگرام ملتوی کر دیا تھا۔ وہ گھر پر ماں کا استقبال کرنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

صابرہ دم سادھے کچن میں اسٹول پر بیٹھی تھی۔ بڑی بے بسی کی انتہا پر اس نے جابر علی سے کہا تھا کہ وہ بیٹی کو اس کے نکاح کا وقت بتا دے کیونکہ نہ وہ جابر علی سے جیت سکتی تھی نہ اس کی بیٹی سے، جس نے نو مہینے ماں کی کوکھ کے اندھیرے میں تو گزارے مگر سارے رنگ ڈھنگ باپ کے لے کر پیدا ہوئی۔

شبینہ بستروں کی چادریں استری کرنے کا پروگرام بنا کر چادریں نکال رہی تھی۔ ستارہ بیڈ پر اوندھی لیٹی تھی، یہ اس کے خراب موڈ کا کھلا مظاہرہ ہوا کرتا تھا۔ جابر علی کمرے میں داخل ہوا اس نے طائرانہ نگاہ کمرے میں دوڑائی۔ شبینہ الماری کا پٹ بند کرنا بھول گئی۔ بس منہ سے بے اختیار باپ کے لیے سلام نکلا تھا۔

''السلام علیکم ابا جان......'' ابھی تک اس کا باپ سے سامنا نہیں ہوا تھا البتہ وہ جانتی تھی کہ وہ خاصی دیر سے گھر میں ہیں۔

''والسلام...... یہ ابھی تک سو رہی ہے اور کوئی کام نہیں اسے؟'' جابر علی کی سپاٹ آواز نے ماحول میں ارتعاش پیدا کیا۔ باپ کی آواز سن کر ستارہ ایک دم سیدھی ہو گئی۔ وہ لاکھ بہادر تھی بلکہ جان کی بازی لگانے کی حد تک بہادر تھی مگر جابر علی کی آواز پر پہلا ردِعمل گھبراہٹ ہی ہوا کرتا تھا اور آج تو خیر سے وہ بنفسِ نفیس ان کے کمرے میں آیا تھا۔ اس کا حاکمانہ، شاہانہ مزاج اور پاٹ دار آواز سب کو اسی جگہ طلب کرنے کے لیے کافی ہوا کرتی تھی جہاں وہ بیٹھا ہوا ہوتا۔

''نہیں ابا جان...... بس ویسے ہی سر میں درد ہو رہا تھا تو لیٹ گئی۔''

''ہزار مرتبہ سمجھایا ہے عصر، مغرب کے درمیان بستر پر نہیں لیٹنا چاہیے، یہ عبادت کا وقت ہوا کرتا ہے، اس وقت بستر پکڑنے والے پھر زندگی بھر بستر پکڑے رہتے ہیں۔'' اس نے ستارہ کا جواب مکمل سننے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔

ستارہ سر پر دوپٹا ڈال کر جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''جو بات میں کر رہا ہوں وہ ماں کو کرنی چاہیے مگر وہ تم سے بہت ڈرتی ہے شاید...... تمہاری دس گز کی زبان سے سب ہی ڈریں گے، سوائے تمہارے باپ کے بہرحال کل شام تمہارا نکاح کر رہا ہوں، یہ تو تمہاری ماں نے تمہیں بتا ہی دیا ہوگا کہ شبینہ سے پہلے تمہاری شادی کرنے کی کیا وجہ ہے؟'' شبینہ نے دہل کر باپ کی طرف دیکھا۔

''تُف ہے ایسی عورت پر بیٹیوں کے سامنے باپ کو لاکھڑا کیا ہے۔'' اسے پھر صابرہ کی کوتاہیاں یاد آنے لگیں۔

ستارہ نے آہستگی سے نظریں اٹھائیں اس کی آنکھوں سے سوچ کی گہرائی نمایاں تھی، وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔

''میں نے امی کو اپنا جواب بتا دیا ہے، آپ اُن سے بات کرلیں۔''

''وقت نہیں ہے میرے پاس...... مجھے صرف اطلاع دینا تھی۔ تمہاری ماں تو ہے ہی اس قابل کہ اولاد سے ٹکا سا جواب سنے...... مگر مجھے جواب سننے سے کوئی دلچسپی نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ پھر رکا نہیں۔

شبینہ خواہ مخواہ مجرموں کی طرح نظریں چرا رہی تھی جبکہ ستارہ شدتِ جذبات سے اپنی مٹھیاں بھینچ رہی تھی۔

''اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو ذمے دار تم ہوگی...... مجھے نہیں پتا اس نے تمہیں کیا جواب دیا۔ جواب اگر میری مرضی کے خلاف ہے تو اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر وہیں چلی جاؤ جہاں تمہارا بیٹا ہے مگر اس طرح نہیں...... طلاق کے پیپر لے کر جانا...... وہ عورت جو ساری زندگی مجھ پر بھاری پڑی...... ذلت اٹھا کر اسی کے ساتھ باقی زندگی گزاروں، آخر میری کیا مجبوری ہے؟'' شبینہ اور ستارہ اپنے کمرے میں دم بخود کھڑی سن رہی تھیں۔ جابر علی، صابرہ سے براہِ راست مخاطب ہو چکا تھا۔

جواب میں خاموشی، بے بسی کا اظہار تھی۔

شبینہ آگے بڑھی اور آہستگی سے کمرے کا دروازہ بند کر کے ستارہ کے قریب چلی آئی۔

''ایسی ضد تو وہ لڑکیاں کرتی ہیں جو کسی سے عشق کرتی ہیں، وعدے کرتی ہیں، میں تمہاری بہن ہوں، جانتی ہوں تمہاری زندگی میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ ماں کے سکھ کی خاطر تمہیں یہ فیصلہ قبول کرلینا چاہیے۔'' ستارہ سگی بہن تھی، معصوم و بے وقوف تھی۔ شبینہ رنج سے ٹوٹ رہی تھی اس خبر پر اس کا رواں رواں سسک رہا تھا مگر کم سے کم نقصان کے سودے پر تو بہرحال آنا ہی تھا۔

''یہی تو مسئلہ ہے آپا...... ماں کو سکھ پھر بھی نہیں ملے گا۔'' ستارہ گم صم کیفیت اور سپاٹ لہجے میں گویا ہوئی۔

''رسوائیوں سے تو بچ جائیں گی، ان کی ساری زندگی کی قربانیوں اور برداشت کو ضائع نہ کر دینا ستارہ......''

''ٹھیک ہے آپا...... ماں کی خاطر یہ جبر سہہ لیتی ہوں...... پھر اس کے بعد میں اپنی مرضی اور پسند کی زندگی

گزاروں گی...... بالکل ابا جان کی طرح......شادی تو آزادی کا لائسنس ہوتی ہے ناں......؟ عورت کا سوشل اسٹیٹس......'' ستارہ کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔

شبینہ تو آناً فاناً کایا پلٹ پر گویا سکتے میں چلی گئی۔

''ستارہ......خودکشی بزدل لوگ کیا کرتے ہیں، اپنی باہمت ماں سے سبق سیکھو۔'' شبینہ کو اچانک تبدیلی سے وہم ستانے لگے۔

''اتنی فالتو نہیں ہے میری جان...... یہ خیال تو مجھے ابھی ابھی آیا ہے ورنہ پہلے تو میں جان چھڑانے کا یہی راستہ پہچانتی تھی۔ میں امی سے الجھتی ہوں، جواب دیتی ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے اپنی ماں سے محبت نہیں۔ مجھے تو ان کی مظلومیت پر رحم اور ان کی جی حضوری پر غصہ آتا ہے مگر اب بلکہ آج سے میرا غصہ ختم......کل سے نئی زندگی شروع ہو رہی ہے۔ آئندہ ابا جان کے سامنے ان کی بیٹی نہیں صرف وارث علی کی بیوی ہوگی بہت شکریہ ابا جان کا......انہوں نے کم از کم میرے لیے تو جینے کی راہ نکالی......اب میں انہیں جی کر دکھاؤں گی......اچھی طرح سمجھا دوں گی کہ جینا کسے کہتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں عجیب سی پُراسراریت تھی۔ ستارہ یہ کہہ کر دھپ سے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے سے تناؤ کی لکیریں معدوم ہو گئی تھیں۔ دوشیزگی کی نمی لب و رخسار پر نمایاں تھی۔ شبینہ کو تو یہ سن کر بہت خوش اور مطمئن ہو جانا چاہیے تھا مگر اسے تو یوں لگ رہا تھا جیسے وجود میں چھپا... کوئی عفریت اس کا کلیجا نوچ رہا ہو۔ وہ اپنے آنسو چھپا کر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

ڈاکٹر مہر جان، گل جان کے ساتھ اپنی لگژری کار سے اتریں تو سامنے روما کو منتظر و مشتاق کھڑا پایا...... روما، ماں کو دیکھ کر آگے بڑھی اور بے اختیار گلے سے لگ گئی۔

ڈاکٹر مہر جان نے انتہائی حیرت سے گل جان کی طرف دیکھا اور پھر ساتھ لپٹی روما کو پیچھے دھکیلتے ہوئے کہنے لگیں۔

''گل جان یہ...... یہ لڑکی کون ہے؟'' روما پر تو جیسے وسیع و عریض پورٹیکو کی چھت آن گری۔ بدک کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور خوف زدہ نظروں سے گل جان کی طرف دیکھا۔

''خ......خ......خالہ جانی۔'' وہ بری طرح ہکلا کر رہ گئی۔

گل جان نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''کون ہے یہ لڑکی...... کیا تمہاری کوئی دوست ہے؟ مگر یہ تو تمہیں خالہ کہہ رہی ہے؟'' ڈاکٹر مہر جان، روما کو سر سے پاؤں تک گھور رہی تھیں۔

''آپ اندر آئیں...... بتا دوں گی۔'' گل جان نے آگے بڑھ کر مہر جان کو کندھوں سے تھاما، روما اپنی جگہ پتھر کا بت بنی کھڑی تھی۔

''یہ تم مجھے کہاں لے آئی ہو گل جان...... کیا بابا نے کوٹھی رینوویٹ کرائی ہے؟ بالکل نہیں پہچانی جا رہی......ٹوٹو بار بار کہتی تھی یار اپنا لائف اسٹائل چینج کرو......تم سے جاگیرداروں کی اسمیل آتی ہے۔'' یہ کہہ کر مہر جان قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ گل جان نے بہ مشکل اپنے روتے ہوئے دل کو سنبھالا۔

''ویسے یار کمال ہو گیا...... واقعی یہ کوٹھی تو بالکل نئی لگ رہی ہے، بابا مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں، میری ہر بات مانتے ہیں۔'' وہ گل جان کے ساتھ اندر جاتے ہوئے بہت سرخوشی کی کیفیت میں باتیں کر رہی تھی مگر

اندر داخل ہونے سے پہلے انہوں نے پلٹ کر بت بنی روما کی طرف دیکھا تھا۔

''گل جان...... تم نے بتایا نہیں یہ لڑکی کون ہے؟''

''آپ اندر تو آئیں...... سب بتادوں گی۔'' گل جان نے آنسو پیتے ہوئے جواب دیا۔

''ہاں یار، اندر سے تو کوٹھی دیکھنے والی ہوگی...... جب باہر اتنا کام ہوا ہے۔'' مہر جان کسی دوشیزہ کے لہجے میں اٹھلاتے ہوئے بولی تھیں۔

روما میں تو اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ وہ ان دونوں بہنوں کے پیچھے جاتی، اس قیامت کی گھڑی میں اسے رابی اور کائناز شدت سے یاد آئیں۔ گھر کے مین گیٹ پر تعینات گارڈ بہت غور سے روما کی طرف دیکھ رہا تھا۔ روما کی نظر اس پر پڑی تو اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور آہستہ آہستہ چلتی گیٹ پار کرگئی اس نے گارڈ کو بتانے کا بھی تکلف نہیں کیا کہ وہ کہاں جارہی ہے۔

☆☆☆

''تمہیں مجھ سے خوف محسوس نہیں ہورہا؟'' رابی اپنے چہرے کو چھو کر کائناز سے پوچھ رہی تھی۔

''آپ رابی آپا تھیں، رابی آپا ہیں...... زخم ٹھیک ہوجائیں گے بال بڑھ جائیں گے مگر آپا، آپ نے اپنے ساتھ بہت زیادتی کی...... دیکھیں ناں ان زخموں میں کتنی جلن ہورہی ہوگی۔''

''تمہیں کیا پتا کائناز جلن کیا ہوتی ہے؟ جب انسان کی روح میں دوزخ کی آگ بھڑکتی ہے تو یہ باہر کی آگ گلاب کے پھولوں جیسی ٹھنڈی ہوجاتی ہے۔'' رابی نے آنکھیں بند کرکے بڑے کرب سے کہا تھا۔

''لیکن ہمیں تو دیکھ کر ہی تکلیف ہورہی ہے ناں...... آپ تو اتنی اچھی ہیں کہ آپ کی تکلیف برداشت نہیں ہورہی۔'' کائناز نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنی آنکھوں سے لگالیا۔

''تم بہت خوش قسمت ہو کائناز ماں، باپ نہ ہونے کے باوجود تمہیں محبت کی کمی کا احساس نہیں ہوا۔ دادا جان نے تمہیں اتنا پیار دیا کہ تم محسوس ہی نہیں کرسکتیں کہ محبت سے محرومی کا احساس کیا ہوتا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں آپا...... مجھے تو ساری دنیا میں ہر طرف محبت ہی محبت نظر آتی ہے، دنیا بہت خوب صورت لگتی ہے...... سوسال سے بھی زیادہ جینے کو جی چاہتا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے رابی کا ہاتھ چوم لیا...... جیسے وہ رابی کے دکھ اور المیے پر تڑپ رہی تھی۔

''اچھا اب ان لوگوں کو سوچو جو اس دنیا میں ایک پل بھی نہیں جینا چاہتے۔'' رابی نے گہری سانس لی تو زخموں کا اکڑاؤ نئے سرے سے محسوس ہونے لگا۔

''مگر یہ سوچ غلط ہے جو شے سب کو بن مانگے ایک دن ملنا ہی ہے تو اس کی تمنا کیوں کریں...... اللہ سے وہ کیوں نہ مانگیں جو شاید دعا ہی سے مل سکے۔'' کائناز کو گہرے دکھ نے گہری آگہی کے راستے پر ڈالا تھا۔ روما کا دکھ اس کا اپنا ہی تو دکھ تھا۔

''میں نے بہت سوچا...... بہت غور کیا...... کہ انسان کے لیے سب سے ضروری شے کیا ہے...... ہر بار یہی جواب آیا کہ محبت کے احساس کے بغیر انسان، انسان ہی نہیں...... زندہ لاش ہے۔'' رابی خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئی۔

''لیکن آپا...... جو محبت فلموں، ڈراموں میں ہوتی ہے وہ محبت نہیں ہوتی...... محبت تو وہ ہوتی ہے جو میں اور روما ایک دوسرے سے کرتے ہیں اور سب کے دادا جان کرتے ہیں۔'' کائناز کی معصومانہ بے ساختگی نے

بالآخر رابی کو مسکرانے پر مجبور کرہی دیا۔

''بے وقوف...... کسی کے ماں باپ نہیں ہوتے اور کسی کے دادا جان۔''

''ہاں، ہاں...... یہی...... میرا یہی مطلب تھا۔'' کائناز خجل سی ہوکر مسکرائی اور عین اسی لمحے روما نے دھواں، دھواں چہرے کے ساتھ کمرے میں قدم رکھا تھا۔ کائناز تو اسے دیکھتے ہی کھل اٹھی۔

''اوہ...... مجھے لگ رہا تھا کہ بس تم آنے والی ہو...... ظاہر ہے رابی آپا کی طرف سے فکر تو ہوگی ناں...... مگر تم پریشان مت ہو انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے۔ دیکھو چند دنوں میں فرق تو پڑا ہے ناں، دادا جان کہہ رہے تھے جب زخم ٹھیک ہوجائیں گے تو آپا کی کاسمیٹک سرجری کرادیں گے...... اور ہاں دادا جان کہہ رہے تھے کہ رابی آپا اب ہمیشہ، ہمیشہ ہمارے پاس رہیں گی...... اور......''

''اچھا، اچھا ٹھیک ہے۔'' روما شکستہ سے انداز میں ہاتھ اٹھا کر کائناز کو روکنے لگی جیسے کائناز کا بولنا اسے بوجھ لگ رہا ہو۔

''ہیں...... تمہیں کیا ہوا......؟ آنٹی کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟'' کائناز کو جیسے روما کے چہرے پر کچھ لکھا ہوا نظر آیا...... رابی بھی بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ روما کی توجہ رابی کی طرف تھی نہ اس کے زخم، زخم چہرے کی طرف...... اس کا وجود کمرے میں تھا اور ذہن کہیں اور......

''اماں جان کو کچھ نہیں ہوگا...... ان کی وِل پاور بہت اسٹرونگ ہے۔ وہ تو عزرائیل کو بھی زور سے دھکا دے سکتی ہیں۔'' رابی زہر خند کے ساتھ گویا ہوئی۔

''رابی آپا...... رابی آپا...... وہ...... اماں جان......؟''

''روما...... پلیز بولو ناں...... تم کیوں اتنی ڈسٹرب ہو؟ آنٹی کو کیا ہوا ہے...... کیا ابھی تک ہوش نہیں آیا؟''

''تمہیں پریشان ہونے کی بیماری ہے روما...... اور ہاں سنو میرے پاس وہاں سے خبریں لانے کی ضرورت نہیں...... اس ظالم عورت سے اب میرا کوئی واسطہ تعلق نہیں...... ایسا بچہ جس نے کبھی اپنے باپ کو نہ دیکھا ہو، ماں سے باپ کا نام پوچھے اور وہ اسے نہ بتائے تو ایسی ماں کا تو مرجانا ہی بہتر ہے۔'' رابی کے اعصاب پھر چٹخنے لگے...... وہ ہذیان بکنے لگی۔

''چپ ہوجائیں آپا...... خدا کے لیے...... چپ ہوجائیں......'' روما دونوں ہاتھ اٹھا کر رابی کو مزید بولنے سے روک رہی تھی۔ کائناز لب بستہ کھڑی باری باری دونوں بہنوں کو ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔

''وہ خود اعتراف کرچکی ہیں کہ وہ میری ماں نہیں ہیں، انہوں نے مجھے کچرے سے اٹھایا تھا۔ آخر اتنی ظالم عورت نے اتنی رحم دلی کا مظاہرہ کیا ہی کیوں......؟ یقیناً اس نے فوٹو کھنچوا کر اخبار میں چھپوائی ہوگی۔''

''آپا۔ بس بھی کریں...... صرف آپ کے لیے نہیں وہ تو جیسے جیتے جی سب کے لیے مرگئیں...... خالہ جان انہیں گھر لے آئی ہیں، وہ پاگل ہوچکی ہیں، انہوں نے تو مجھے بھی نہیں پہچانا...... بار بار خالہ جان سے پوچھ رہی تھیں یہ لڑکی کون ہے؟''

''اوہ نو......'' کائناز کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔ وہ ششدر کھڑی روما کی شکل دیکھ رہی تھی۔

''آپ کی ماں نہ سہی...... میری تو ہیں......'' یہ کہہ کر روما بھل بھل کر کے رودی اور کائناز تو جیسے تڑپ ہی گئی روما کو گلے سے لگالیا۔

''تمہاری بھی نہیں ہیں...... دیکھنا ایک نہ ایک دن یہ پردہ بھی اٹھے گا۔ تمہیں تمہارے باپ کا نام بتایا

انہوں نے؟'' رابی کے اندر نفرت کے ایسے کانٹے اُگے ہوئے تھے کہ روما کی اطلاع نے بھی دل کی سرزمین میں نمی پیدا نہیں کی۔

''اس وقت یہ باتیں نہ کریں...... انہوں نے غصے میں کہہ دیا ہوگا، وہ میری بھی ماں ہیں اور آپ کی بھی۔'' روما روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''روما ٹھیک کہہ رہی ہے آپا۔''

''ابھی میں بحث نہیں کروں گی، ابھی اسے جی بھر کر رونے دو...... جس کے پاس ماں ہو اس کے ساتھ کائنات ہوتی ہے...... ہماری طرح اکیلے بے چارے نہیں ہوتے۔ ہونہہ، پاگل ہوگئی ہیں۔ اُن کی بہن ان کا علاج کرائیں گی وہ پھر ٹھیک ہو جائیں گی۔ چلی جاؤ یہاں سے...... آئندہ میرے پاس آ کر اُن کا نام لے کر مت رونا...... وہاں اچھی طرح رو دھو کر پھر شاور لے کر میرے پاس آیا کرو۔ خبردار جو میرے سامنے ڈاکٹر صاحبہ کا نام لیا۔'' رابی کے انداز میں شدت اور دھمکی تھی۔

کائناز کا ننھا منا سا دل کانپ کر رہ گیا...... جلدی سے روما کو تھام کر باہر لے جانے لگی۔

''آپا...... پلیز ویٹ...... میں ابھی آتی ہوں۔'' اس نے رابی سے منت کے انداز میں کہا تھا۔ محبت کی بستی میں آنکھ کھولنے والی کائناز کے لیے تو یہ نفرت سے بھرپور مناظر بہت ہی روح فرسا تھے۔ لرزتی کانپتی ہوئی روما کو لے کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ رابی کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

☆☆☆

''ٹوٹو کے فون تو آئے ہوں گے...... کیا کہہ رہی تھی؟'' مہر جان فریش جوس پیتے ہوئے گل جان سے پوچھ رہی تھیں۔

''ٹوٹو......؟'' گل جان کے دماغ پر گویا ہتھوڑے برسے۔

''ٹوٹو...... شی از مائی بیسٹ فرینڈ بلکہ ساری دنیا میں ایک ہی تو میری دوست ہے۔''

''جی جی...... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' گل جان غائب دماغی کی کیفیت میں بول رہی تھی۔

''میں کیا کہہ رہی تھی گل جان؟ مجھے تو یاد ہی نہیں۔'' مہر جان ذہن پر زور ڈالنے لگیں۔ گل جان نے بہ مشکل اپنے آنسوؤں کو آنکھوں کے کناروں سے ٹپکنے سے روکا۔

''آپ کہہ رہی تھیں دنیا بہت خوب صورت ہے، ہر طرف محبت ہی محبت ہے۔'' گل جان بول رہی تھی حلق میں پھندے لگ رہے تھے۔

''ہے ناں......'' مہر جان نے بچوں کی طرح خوش ہو کر تائید چاہی...... ''میں ٹھیک کہتی ہوں ناں...... دنیا بہت خوب صورت ہے۔'' مہر جان نے یہ کہہ کر جوس کا گلاس ایک سانس میں خالی کر دیا اور اِدھر اُدھر رکھنے کی جگہ تلاش کرنے لگیں...... دونوں سائڈ ٹیبل ان سے دور تھیں۔ گل جان نے ہاتھ بڑھا کر گلاس ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

''اور سناؤ گل جان...... کیسی گزر رہی ہے؟ مجھے تو اسپتال میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا......''

''جی بی بی جان......'' گل جانے نے سر جھکا کر جواب دیا۔

''گل جان......؟'' مہر جان گویا کسی دھیان سے چونکیں۔

''جی بی بی جان؟''

''میں ابھی تم سے کیا کہہ رہی تھی...... پھر بھول گئی۔'' مہر جان نے زور زور سے پیشانی پر انگلیاں ماریں جیسے یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

''آپ نے کچھ نہیں کہا...... آپ تو اب خاموش رہتی ہیں۔'' گل جان نے انہیں جیسے یاد کرنے کی اذیت سے نجات دلانے کی کوشش کی۔

''ہاں...... یہ تو تم نے بالکل ٹھیک کہا...... میں تو خاموش رہتی ہوں۔'' مہر جان نے پھر کسی بچے کی طرح خوش ہو کر کہا جیسے گل جان نے کوئی نہایت ہی دلچسپ بات کی ہو...... گل جان اب اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بی بی جان آپ یہ ٹیبلیٹ کھالیں اور آرام کریں۔'' گل جان نے خواب آور گولی چھوٹی سی شیشی سے نکالتے ہوئے کہا۔

''یہ سردرد کی ٹیبلیٹ ہے؟'' مہر جان نے شیشی کی طرف دیکھا۔

''جی...... یہ سارے دردوں سے نجات دیتی ہے۔'' وہ سوزِ دل کی تپش برداشت کرتے ہوئے جبراً مسکرائی۔

''گل جان!''

''جی بی بی جان؟''

''تمہیں کچھ یاد ہے میں کیا کہہ رہی تھی؟''

''آپ کہہ رہی تھیں مجھے سردرد کے لیے کوئی ٹیبلیٹ دو...... یہ لیں۔''

''وہ بابا بتا رہے تھے زمینوں پر لاکھے مزارعے کا قتل ہو گیا تھا اس کی بیوہ پاگل ہو گئی تھی، آگے کچھ پتا چلا؟'' مہر جان اس سے ٹیبلیٹ لیتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

''وہ بھی مر گئی...... سب مر گئے بس ہم زندہ ہیں اور پتا نہیں کیوں زندہ ہیں۔'' گل جان کی برداشت جواب دے گئی تھی نہ جانے کیسے بلا ارادہ اس کے منہ سے یہ سب نکل گیا۔

''مر گئی......؟ اچھا ہوا مر گئی...... پاگل ہو کر زندہ رہنے کا کیا فائدہ......؟'' مہر جان نے گولی منہ میں ڈالی اور گل جان کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر گولی یوں نگلی جیسے پنگ پانگ بال حلق میں پھنس گئی ہو۔

''اب آپ سو جائیں۔'' گل جان نے خالی گلاس ان کے ہاتھ سے لیا۔

''ٹھیک ہے میں سو رہی ہوں، ٹوٹو آئے تو مجھے اٹھا دینا۔'' مہر جان کسی تابعدار بچے کی طرح جلدی سے لیٹ گئیں۔

گل جان یوں تیزی سے کمرے سے نکلی جیسے خطرہ ہو مہر جان پھر اٹھ بیٹھیں گی۔

☆☆☆

آخر کار وہ شام آ ہی گئی جس کے آنے کے اندیشوں نے راتیں جگائی تھیں، شبینہ، ستارہ کو دلہن بنا رہی تھی۔ ستارہ یوں خاموشی سے دلہن بن رہی تھی گویا محبت کی شادی ہو رہی ہو...... تڑپ تڑپ کر ملن کی گھڑیاں آئی ہوں۔ شبینہ کو اس کی خاموشی سے سکون کے بجائے بے سکونی مل رہی تھی۔

''ستارہ یوں سمجھو تم نے اپنی ماں پر احسان کیا ہے۔ اب جہاں جا رہی ہو وہاں خوش رہنے کی کوشش کرنا۔'' شبینہ درد کی ٹیسیں دباتے ہوئے اسے سمجھا رہی تھی۔ ''دونوں بڑے ماموں آئے ہیں۔ ابا جان نے محلے کے چار پانچ گھروں سے صرف مردوں کو انوائٹ کیا ہے۔''

''آپا کم از کم فائزہ کو ہی بلا لیتیں''ستارہ نے اپنے ہاتھوں میں سونے کے کنگن خود چڑھانا شروع کر دیے۔

وہ اتنے پُرسکون انداز میں بات کر رہی تھی کہ شبینہ اندیشوں کے طوفان میں گھرنے لگی۔

''ستارہ...... خدا کے لیے کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھنا۔'' اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''نہیں کروں گی آپا...... تم پریشان مت ہو...... اب تو سمجھو کشتیاں جلا کر اسپین میں اتری ہوں۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

''کیا مطلب......؟'' شبینہ پھر ڈر گئی۔

''مطلب بھی سمجھ آجائے گا...... مگر ڈرو نہیں، مجھے اپنی جان بہت پیاری ہے اگر کسی نے میری جان پر بنانے کی کوشش کی تو اس کی جان لے سکتی ہوں مگر اپنی جان نہیں دے سکتی...... کھل کر جینے کے لیے تو میں نے وارث علی کو قبول کرلیا ہے......'' وہ پھر معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ اسی لمحے صابرہ شکستہ و نڈھال قدموں سے اندر آئی۔

''بیٹا نکاح کے لیے لوگ آرہے ہیں...... تم ایک طرف ہو جاؤ میں اپنی بیٹی کے ساتھ بیٹھتی ہوں۔'' صابرہ نے شبینہ سے کہا اور ستارہ کے قریب آکر بیٹھ گئی پھر آہستگی سے اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔

''اللہ تمہیں شاد و آباد رکھے۔ خدا کرے ہمارے سارے اندیشے غلط ہوں۔'' وہ کانپتے ہونٹوں سے دعا کر رہی تھی اور پھر نکاح خواں کے ساتھ جابر علی اندر آگیا۔ دو مہمان بحیثیت گواہ اس کے پیچھے، پیچھے آئے۔ صابرہ نے ڈوبتے دل کو سنبھالا اور ستارہ کا دوپٹا اس کی پیشانی سے آگے کھینچ دیا۔

''بسم اللہ کریں۔'' جابر علی سفید کلف دار شلوار قمیص میں ملبوس تھا مگر اس وقت انداز کلف زدہ نہیں تھا۔

نکاح خواہ نے فارم جو پہلے سے پُر تھا ستارہ کے سامنے کیا اور نکاح پڑھانے لگا۔

''مسماۃ ستارہ ناز بنت جابر علی آپ کو پانچ لاکھ روپے حق مہر سکہ رائج الوقت عند الطلب وارث علی بن حارث علی کے نکاح میں دیا جاتا ہے، کیا آپ کو قبول ہے؟''

''پانچ لاکھ روپے حق مہر......'' صابرہ نے چونک کر جابر علی کی طرف دیکھا...... وہ اس وقت دو دھاری تلوار پر سفر کر رہا تھا۔ نکاح خواں کے الفاظ کے ساتھ اس نے اضطراری انداز میں پہلو بدلا...... ایک قدم آگے بڑھا...... پھر واپس ہوا۔

پانچ لاکھ کا لفظ سن کر شبینہ بھی شاکڈ بیٹھی تھی۔

''بیٹی ذرا زور سے بولیں تاکہ گواہ سن لیں۔'' نکاح خواں نے ستارہ کی خاموشی سے اخذ کیا کہ شاید وہ آہستہ بولی ہے۔

''بیٹا...... بولو......'' صابرہ نے قیامت رگ رگ میں اترتی محسوس کی۔

''جی...... میں نے وارث علی کو قبول کرلیا ہے۔'' ستارہ کی دلہن والی آواز نہیں تھی جیسے وہ کسی کوئز شو میں جواب دے رہی تھی۔ نکاح خواں اور گواہان نے بھی شاید کسی دلہن کے منہ سے یہ انوکھے انداز کا جواب سنا تھا۔ اپنی اپنی جگہ سب دم بخود کھڑے تھے۔ جابر علی کے ماتھے کی شکنیں گہری ہوگئیں...... صابرہ کا دل کسی نادیدہ آہنی ہاتھ نے مٹھی میں دبایا...... شبینہ تو ہونق سی ہو کر بہن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نکاح خواں نے بہر حال خود کو از سرِ نو منظم کر کے مزید دو مرتبہ اپنے الفاظ دُہرائے اور ہر مرتبہ ستارہ نے بہت ہی واضح انداز میں جواب دیا۔

اب کمرے میں مبارک باد کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ گواہان باری باری جابر علی کو گلے لگا رہے تھے۔

(جاری ہے)



بات تو ٹھیک ہے مگر

عطیہ عنبر

ماریہ نے ایک نظر سامنے دیوار پر آویزاں گھڑی پر ڈالی، دونوں سوئیاں سر جوڑے تھیں۔

''اُف میرے خدا، ساڑھے چھ بج گئے۔ آج پہلا دن ہے اور اگر آج ہی دیر ہوگئی تو کیا تاثر ملے گا؟'' وہ بہت پھرتی سے اٹھی اور تبھی اطلاعی گھنٹی بج اٹھی...... جا کر دروازہ کھولا تو سامنے جمیلہ کھڑی تھی۔

''اتنی جلدی آگئیں، چلو اچھا ہوا، میری کچھ مدد کروا دینا، اس کے الگ سے پیسے دوں گی۔''

ماریہ کہتے ہوئے غسل خانے کی جانب بڑھ گئی۔

''باجی، صاحب اور بچے تو سو رہے ہیں، کہاں سے کام شروع کروں؟''

''لاؤنج، ڈرائنگ روم، کچن وغیرہ تو صاف کرو، جب تک وہ لوگ بھی اٹھ جائیں گے۔'' ماریہ نے جواب دیا۔

یہ ایک عام متوسط پاکستانی گھرانا تھا۔ ماریہ اور داؤد کی شادی کو پندرہ برس ہونے والے تھے۔ ان کے دو بچے تھے۔ چودہ سالہ ذیشان اور اس سے سال، ڈیڑھ سال چھوٹی عائشہ...... دونوں بچے ذہین اور محنتی تھے۔ اپنی، اپنی جماعتوں میں نمایاں کامیابی حاصل کرتے تھے۔ ماریہ اور داؤد کو اپنے بچوں پر فخر تھا۔ شکل صورت بھی اچھی تھی۔ جو ملتا، ان کے بچوں کی ضرور تعریف کرتا۔

داؤد کی ملازمت اچھی تھی، ماریہ بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ شادی سے پہلے بھی ملازمت کر رہی تھی مگر بچوں کی پیدائش کے بعد اسے ملازمت چھوڑنی پڑی...... وہ اپنے بچوں پر بھرپور توجہ دینا چاہتی تھی...... پھر جب بچے اسکول جانے لگے تو اس نے دوبارہ سے ملازمت شروع کر دی۔

داؤد کی تنخواہ بے شک اچھی بلکہ بہت اچھی تھی مگر کچھ کل کے لیے بھی تو پس انداز کرنا تھا۔ بچوں کے مستقبل کی خاطر...... اور پھر اب تو ماریہ کو پہلے سے بھی اچھی ملازمت مل گئی۔ آمدورفت کا انتظام بھی دفتر والوں کا تھا...... ورنہ پہلے داؤد اسے دفتر چھوڑتا تھا، واپسی پر وہ دفتر کی ساتھی حمنہ کے ساتھ آتی، جو ساتھ والی عمارت میں رہتی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ بینک سے قرض لے کر اپنی گاڑی خرید لے مگر ابھی ابھی ناشتا تیار کرتے ہوئے وہ منصوبے بنا رہی تھی کہ جب تنخواہ میں تقریباً ڈیڑھ گنا اضافہ ہو رہا ہے تو کیوں نہ ایک پلاٹ خریدنے کا سوچے، یک مشت نہ سہی، قسطوں پر سہی...... داؤد کی تنخواہ میں سے تو اُن کے موجودہ فلیٹ کی قسط ہی ادا ہوتی تھی۔

جب تک داؤد اور بچے تیار ہو کر ناشتے کی میز پر آئے، ماریہ کا کام سمٹ چکا تھا۔ جمیلہ نے ساتھ ہی کپڑے دھونے کی مشین لگا رکھی تھی۔

''کتنی دیر ہے جمیلہ؟'' ماریہ نے وہیں سے آواز لگائی۔

''بس باجی عائشہ کا کمرا صاف کر رہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے، میری گاڑی آنے والی ہوگی، تم یہ میز صاف کر کے برتن کچن میں لے جاؤ، وقت ملے تو ابھی دھو دینا، ورنہ شام کو آ کر باقی کام کر لینا۔''

''باجی ابھی کر لیتی ہوں، شام کو مجھے اپنی نند کے گھر جانا ہے۔''

''داؤد، فلیٹ کی ابھی کتنی قسطیں باقی ہیں؟'' ماریہ نے اپنے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی تہ جماتے ہوئے پوچھا۔

''اگلے سال فروری تک ختم ہوں گی، ویسے یار...... وہ میرا دوست ہے ناں عثمان، وہ اس طرح قرض پر گھر یا گاڑی وغیرہ خریدنے کا سخت مخالف ہے، کافی مولوی قسم کا بندہ ہے، کہتا ہے اسی لیے تو سود حرام ہے کہ اصل رقم سے کہیں زیادہ رقم سود کی مد میں چلی جاتی ہے اور میں بھی کل حساب کر رہا تھا کہ فلیٹ کی اصل رقم تو ہم تقریباً تین سال پہلے ادا کر چکے ہیں اب تو سود ہی دیے جا رہے ہیں اگر یہی رقم جمع کی ہوتی تو ٹھیک ٹھاک رقم تھی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے داؤد لیکن اس طرح بچت کہاں ہو پاتی ہے...... سو طرح کے خرچ نکل آتے ہیں، آج کل مہنگائی کا طوفان تو دیکھو...... پھر معاشرے میں عزت کی خاطر، بچوں کے لیے کہ اپنے دوستوں میں ان کی سبکی نہ ہو، خرچ تو کرنا پڑتا ہے۔ اللہ کو سب معلوم ہے، وہ معاف کرنے والا ہے۔''

☆☆☆

''افوہ عائشہ......! تمہارے بال کیسے ہو رہے ہیں عجیب سے، اچھی خاصی بڑی ہو گئی ہو، خیال رکھا کرو اپنا...... میں کل اپنے لیے وقت لے رہی تھی، تم بھی میرے ساتھ پارلر چلنا، تمہارے بالوں کو نیا لُک چاہیے۔''

''اوہ ماما، آپ تو بہت دیر لگائیں گی، میں بور ہو جاؤں گی۔''

''ہاں دیر تو مجھے لگے گی، عید کے قریب تو بہت رش ہوتا ہے...... چلو ایسا کرتے ہیں، تم فارغ ہو گئیں تو تمہارے پاپا تمہیں لے آئیں گے...... میں پھر بعد میں آ جاؤں گی۔''

''ماما...... مجھے ایک اور ڈریس چاہیے، میری سب فرینڈز نے عید کے لیے بہت اچھے ڈیزائنرز سوٹ اور برانڈڈ کپڑے لیے ہیں۔''

''بھئی...... تمہارے ڈریسز بھی تو بہت اچھے اور کافی مہنگے ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر آئیں ناں، میں آپ کو دکھاتی ہوں، میری فرینڈ ثنا نے آن لائن آرڈر کیا تھا۔ اس کا ڈریس تو آفت ہے آفت۔''

''بھئی میری پیاری بیٹی جو کہتی ہے، اسے لے دو، انہی کے لیے تو محنت کر رہے ہیں۔'' داؤد نے عائشہ کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

''بس پاپا...... آپ اسی کی فرمائشیں پوری کرتے رہیں، میں کب سے کہہ رہا ہوں مجھے بائیک چاہیے۔'' ذیشان منہ بنا کر بولا تو ماریہ اس کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

''بیٹا! آپ کی یہ فرمائش کیسے پوری ہو سکتی ہے، ابھی آپ چھوٹے ہیں، چند سال کے بعد جب آپ کا ڈرائیونگ لائسنس بن جائے گا تو بائیک لے

دیں گے۔"

"میرے کئی کلاس فیلوز کے پاس بائیک ہیں، فیصل کے پاس تو اپنی گاڑی ہے ماما۔"

ماریہ اور داؤد نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر داؤد کہنے لگا۔

"بیٹا...... وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی بائیک ضرور آئے گی مگر چند سال بعد...... دیکھو یہ آپ ہی کی سیفٹی کے لیے ہے اور سنو، میں تم لوگوں کو سرپرائز دینا چاہتا تھا مگر چلو ابھی بتا دیتا ہوں، تمہاری ماما اور میں سوچ رہے ہیں کہ اگلی عید ہم لوگ ملائشیا میں منائیں۔"

ذیشان کا منہ اب بھی بنا ہوا تھا لیکن دونوں بچے خوش ضرور ہو گئے۔

"بیٹا...... شانی، آپ بھی آن لائن کچھ آرڈر کرنا چاہو تو بتاؤ۔"

"نیا سیل فون۔"

☆☆☆

ماریہ اکلوتے بیٹے کو خوش دیکھنا چاہتی تھی اور داؤد بھی تو یہی چاہتا تھا اسی لیے وہ لوگ سوچ رہے تھے کہ اس عید پر قربانی کرنے کے بجائے وہ لوگ ملائشیا کا چکر لگالیں، ماریہ کا خیال تھا کہ سال بھر ویسے بھی صدقہ خیرات کرتے ہی رہتے ہیں...... ابھی چار مہینے پہلے جمیلہ کا بیٹا سیڑھیوں سے گر گیا، بازو میں فریکچر ہو گیا تھا۔ آٹھ، دس ہزار روپیہ ماریہ کو ہی خرچ کرنا پڑا...... جمیلہ کافی پرانی اور وفادار ملازمہ تھی۔ قریبی کچی بستی میں رہتی تھی۔ اس لیے جب بھی ماریہ بلاتی، وہ آجاتی۔ ماریہ اپنی دوستوں سے ان کی ماسیوں کی آئے دن کی چھٹیوں کے بارے میں سنتی کہ کبھی ہڑتال، کبھی ہنگامہ، ہر بہانہ ایسا ہوتا کہ انسان کچھ کہہ ہی نہ سکے۔ چنانچہ ماریہ کو جمیلہ کا دم بہت غنیمت لگتا اور وہ اس کی ہر طرح مدد کیا کرتی تھی۔

اس نے داؤد کی ہاں میں ہاں، بہت زور شور سے ملائی تھی۔ اب سوات، کاغان جانے کے بجائے ان کے دوست، رشتے دار... دبئی، ملائشیا تک تو جا ہی رہے تھے اور جو گنجائش رکھتے تھے وہ لندن، امریکا کی سیریں کرتے، وہ اور داؤد نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بچے کسی قسم کے احساسِ کمتری کا شکار ہوں۔

" آخری عشرے میں ماریہ کے بڑے بھائی کے ہاں افطار، ڈنر پارٹی تھی...... رات گئے وہ لوگ وہاں سے واپس آرہے تھے تو داؤد نے کہا۔

"شکر ہے کہ کل اتوار ہے، آرام سے اٹھیں گے۔"

"ہاں، یہ تو ہے، بھابی جان نے بھی یہی سوچ کر ہفتے کی شام یہ افطار پارٹی رکھی تھی کہ اگلے روز آرام کا موقع مل جائے گا۔"

"ویسے کافی اچھا انتظام تھا۔"

داؤد کے کہنے پر ماریہ خوشی اور فخر کے احساسات سے بیک وقت دوچار ہوئی تھی۔ انہی احساسات کے تحت کہنے لگی۔

"ہاں، حسن بھائی کو اللہ نے کھلا رزق دیا ہے تو بھائی کا ہاتھ بھی بہت کھلا ہے، ناز بھابی بتا رہی تھیں، کئی اداروں میں افطاری کا ہر روز انتظام کرتے ہیں یتیم بچوں کو عیدی وغیرہ بھی باقاعدگی سے بھیجتے ہیں۔"

"تمہارے بھائی جان کے ساتھ ساتھ جو گورے سے قدرے فربہ سے صاحب تھے، وہ کون تھے؟"

"بھائی جان نے آپ سے ملاقات نہیں کروائی؟ وہی تو اُن کے نئے بزنس پارٹنر ہیں۔"

"اچھا، وہی جو ایک وزیر کے سالے ہیں۔"

"ہاں، وہی......"

"ماریہ، تمہارے بھائی جان موقع سے فائدہ اٹھانا خوب جانتے ہیں۔" داؤد مسکرایا تو ماریہ برا

مان گئی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟ بھائی اتنی محنت سے کماتے ہیں، کسی کا گلا تو نہیں کاٹتے، اب آج کے زمانے میں کون ہے جو تعلقات سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔"

"ماما، صوفیہ پھپو پوچھ رہی تھیں...... تم دونوں بہن، بھائی روزے کیوں نہیں رکھ رہے میں نے کہہ دیا۔ اتنی گرمی ہے، بہت پیاس لگتی ہے؟ تو پتا ہے انہوں نے کیا کہا، کہنے لگیں۔ "بیٹا، یہ گرمی تو گزر جائے گی، اسکول سے بھی چھٹیاں ہیں گھر میں اے سی بھی ہے، افطاری کے ٹائم پہ اپنی بھوک پیاس بجھا سکتے ہو لیکن قبر کی تنگی، میدانِ حشر کی گرمی، اس سے یہی نماز، روزے بچائیں گے۔"

"اُفوہ آپا بھی بس ہر وقت تبلیغ کو تیار رہتی ہیں، اتنے، اتنے سے بچوں کی صحت تو خراب نہیں کرنی، پہلے بچوں پہ کتابوں کا اتنا بوجھ کب ہوتا تھا...... اب آج کا مقابلہ پرانے زمانے سے کہاں تک کریں...... اللہ بہت مہربان ہے...... اسے ہماری مجبوریوں کی سب خبر ہے۔" داؤد نے ماریہ کی طرف دیکھا۔

"آپا تو مجھ سے بھی بہت ناراض ہوئیں...... شاید عائشہ نے ہی ان کی پوتی کو بتا دیا کہ ہمارے گھر میں کوئی روزہ نہیں رکھتا۔ ایک تو اس وجہ سے بہت ناراض تھیں، اُدھر کہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ عیدِ قرباں پہ ہم لوگ ملائشیا جا رہے ہیں، مجھ سے پوچھنے لگیں۔ قربانی کہاں کرو گے؟ جھوٹ مجھ سے بولا نہیں گیا۔ کہہ دیا کہ جانور ذبح کرنا ضروری تو نہیں، اللہ کی راہ میں خرچ ہی کرنا ہے تو وہ سارا سال ہی کرتے رہتے ہیں۔ اب بھی کریں گے لیکن بچے بہت دنوں سے فرمائش کر رہے تھے کہ کہیں سیر کے لیے چلیں، ان کے کلاس فیلوز، دوست وغیرہ...... سب یورپ، امریکا جاتے ہیں تو ہم نے سوچا، بچوں میں احساسِ کمتری نہ پیدا ہو۔ میرے اس جواب سے بھی آپا کو بہت دکھ ہوا، کہنے لگیں۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا یہ تمہاری اپنے بچوں سے کیسی محبت ہے کہ عارضی خوشی، عارضی فائدے کے لیے دائمی نقصان کر رہے ہو...... بھلا بتاؤ تو بچوں کا موڈ نہ ہو تو کیا انہیں اسکول سے بلاوجہ چھٹی کرنے دو گے؟ اس لیے کہ بچے تھک جائیں گے، امتحان کے دنوں میں بچوں کو پڑھنے کے بجائے آرام کرنے کے لیے کہو گے کیا؟ نہیں ناں...... تو پھر اللہ، رسولؐ کے احکام مانتے ہوئے گریز، سستی کا رویہ کیوں؟ والدین کا کام بچوں کو اصل، نقل، نیک و بد کا فرق سمجھانا ہوتا ہے، یہ درست ہے کہ آج نمائش، دکھاوے کا دور دورہ ہے۔ بچے ہوں یا بڑے، ترغیباتِ نفس سے بچنا، ہر ایک کے لیے بہت مشکل ہے لیکن ناممکن تو نہیں۔"

ماریہ کو لگا، داؤد پر اپنی آپا کی باتوں کا اثر کافی گہرا ہو رہا ہے...... اسے خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں ملائشیا کا پروگرام کینسل نہ ہو جائے تو فوراً بول اٹھی۔

"داؤد، آپا کہتی تو ٹھیک ہی ہیں لیکن تم بتاؤ آج کے اس کمپیوٹر کے دور میں ہم خود کو اور اپنے بچوں کو جدید دنیا اور اس کے اثرات سے کیسے بچا سکتے ہیں، ایسا کریں گے تو بہت پیچھے رہ جائیں گے، چلو، ایسا کرتے ہیں ایدھی والوں کے ساتھ گائے میں ایک حصہ ڈال دیں گے، قربانی تو ہو جائے گی، آپا کو بتا دینا کہ ہم نے قربانی کی ہے...... بس چلو تم اپنا موڈ ٹھیک کرو، آپا اور ان کی فیملی تو کچھ زیادہ ہی سخت ہے۔ ورنہ اللہ تو بہت مہربان ہے۔"

"بے شک اللہ بہت مہربان ہے لیکن ہم جانتے، بوجھتے، نافرمان کیوں ہیں......" داؤد کو آپا کی بات یاد آ گئی۔



ناولٹ

کہیں دیپ جلے کہیں دل

قیصرہ حیات

تیرھواں حصہ



''کیا واقعی ......؟'' ماں جی نے انتہائی خوش ہوکر پوچھا۔

''ہاں ...... میری پہلی رپورٹس کسی اور کے ساتھ بدل گئی تھیں۔ وہ لیب والوں کی غلطی تھی۔ میں نے ان سے خوب جھگڑا کیا۔''

''میں کہتی تھی ناں میری ردا جھوٹ نہیں بول سکتی۔ وہ بہت نیک اور پاکباز بچی ہے۔'' ماں جی نے جلدی سے کہا۔

''اور میں جس ذہنی اذیت سے گزر رہا ہوں یہ میں ہی جانتا ہوں۔'' روحیل نے آہ بھر کر کہا۔

''مگر تم نے اپنی اذیت کا بدلہ اس معصوم بچی سے لیا۔'' ماں جی نے نہایت خفگی سے کہا۔

''میں اس سے کوئی بدلہ نہیں لینا چاہتا تھا مگر نہ جانے کیوں اسے دیکھتے ہی میں غصے سے بے قابو ہونے لگتا تھا۔'' روحیل نے افسردگی سے جواب دیا۔

''اس لیے کہ تم اس سے محبت کرتے تھے اور ڈرتے تھے کہ تمہارے اس عیب کی وجہ سے وہ تم سے نفرت نہ کرنے لگے اور تمہیں چھوڑ کر نہ چلی جائے۔'' ماں جی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بتایا۔

''ہاں، شاید...... یہی ڈر اور خوف میرے اندر موجود تھا۔'' روحیل نے شرمندگی سے جواب دیا۔

''اور اب تم کیا چاہتے ہو؟'' انہوں نے استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

''وہی جو آپ چاہتی ہیں۔'' روحیل نے آہستہ آواز میں سر جھکا کر کہا۔

''ٹھیک ہے، میں ابھی ردا کی مما کو فون کرتی ہوں اور ہم جا کر ردا کو واپس گھر لے آتے ہیں۔ شکر ہے پروردگار نے ہماری عزتوں کا بھرم رکھ لیا۔'' ماں جی نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا اور ردا کا نمبر ملانے لگیں مگر اس نے فون نہ اٹھایا۔ انہوں نے گھر کا نمبر ڈائل کیا تو خدیجہ بہت بجھے، بجھے لہجے میں بات کرنے لگیں۔

''میں معذرت چاہتی ہوں، اس روز میں اور روحیل نہیں آ سکے۔'' ماں جی شرمندہ سے لہجے میں بولیں۔

''اچھا ہی کیا...... آ کر بھی کیا کرتے۔'' خدیجہ بیگم مایوسی سے بولیں۔

''کیا مطلب...... ردا بیٹی ٹھیک تو ہے؟'' ماں نے قدرے گھبرا کر پوچھا۔

''نہیں......'' خدیجہ بیگم نے بھرائے لہجے میں جواب دیا۔

''کیا ہوا اسے...... سب ٹھیک تو ہے ناں؟'' ماں جی نے جلدی سے پوچھا۔

''سب کچھ ختم ہو گیا ہے، ردا کی امید اور خوشخبری بھی...اس کا مس کیرج ہو گیا ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ رونے لگیں۔

''ک...... ک...... کب؟'' ماں جی نے گھبرا کر پوچھا تو روحیل چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔

''اسی روز جب آپ نے آنا تھا...... ردا کو چکر آیا اور وہ واش روم میں گر گئی...... اور...... پھر۔'' خدیجہ سسکنے لگیں۔

ماں جی کی آنکھوں سے بھی آنسو گرنے لگے اور انہوں نے فون بند کر دیا۔

''ماں جی...... کیا ہوا...... آپ رو کیوں رہی ہیں؟'' روحیل نے گھبرا کر پوچھا۔

''ردا کا مس کیرج ہو گیا ہے۔'' انہوں نے سپاٹ لہجے میں بتایا۔

''کیا......؟ یہ جھوٹ ہے، ایسا نہیں ہو سکتا۔'' روحیل نے ایک دم غصے سے کہا۔

''یہ سچ ہے، ردا کی مما یہی بتا رہی تھیں۔'' ماں جی نہایت افسردہ تھیں۔

''وہ لوگ ہمیں بے وقوف بنا رہے ہیں، ہمارے ساتھ ڈراما کھیلنے کی کوشش کر رہے ہیں، پہلے گڈ نیوز بتا کر ہمیں ٹریپ کرنے کی کوشش کی اور اب ہم اسے لینے جا رہے ہیں تو بات ہی ختم ہو گئی۔ میں تو کہتا ہوں وہ ہمیں الو بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' روحیل غصے سے بے تکان بولے گیا۔

''روحیل ......بس کرو، میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں اور تمہاری فضول باتیں مجھے مزید پریشان کر رہی ہیں کیا تمہاری رپورٹس تمہارے پاس ثبوت نہیں کہ ردا نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔'' ماں جی نے غصے سے کہا۔

''مجھے اب کسی پر یقین نہیں رہا...... انہوں نے puppet سمجھ رکھا ہے، میرے ساتھ وہ جیسا چاہیں تماشا کریں۔'' روحیل نے غصے سے کہا۔

''بس کرو...... کیوں فضول بکواس کر رہے ہو۔'' ماں جی نے غصے سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''اور اب آپ بھی غور سے سن لیں ماں جی...... میں اب ردا کو لینے کبھی نہیں جاؤں گا۔ آپ ان لوگوں کے ہاتھوں بے وقوف بن سکتی ہیں مگر میں نہیں۔'' روحیل نے طیش کے عالم میں کہا اور وہاں سے باہر چلا گیا۔ ماں جی حیران پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔

☆☆☆

رشنا نے ردا کو فون کیا اور اس کے حالات جان کر وہ بہت پریشان ہو گئی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے ردا کے سارے مسائل کا ذمے دار توقیر ہے۔ اس نے توقیر کو فون کیا۔ وہ بھی ردا کے حالات کے بارے میں جان کر بہت پریشان ہو گیا تھا۔

''توقیر بھائی...... اب آپ کو ہی ردا کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔'' رشنا نے فون کر کے بھائی سے کہا۔

''کیا کروں...... میں نے اسے بھی فون کیا اور روحیل کو بھی...... مگر دونوں ہی میری بات سننے کو تیار نہیں...... میں خود اپنے آپ کو قصوروار سمجھتا ہوں اور اس بات کا میرے دل اور دماغ پر بہت گہرا اثر ہوا ہے۔ میری طبیعت اب ٹھیک نہیں رہتی رشنا!'' توقیر نے اسے حالِ دل سنایا۔

''بہتر یہی ہے کہ آپ پاکستان چلے جائیں اور سامنے بیٹھ کر دونوں کو سمجھانے کی کوشش کریں...... ممکن ہے حالات میں کوئی بہتری پیدا ہو جائے اور آپ کے اندر سے بھی گلٹ کا احساس کم ہو جائے۔'' رشنا نے اپنے تئیں رائے دی۔

''او کے...... کچھ سوچتا ہوں لیکن یہاں جاب کا بھی مسئلہ ہے۔''

''اس وقت سب سے اہم ردا کی زندگی اور خوشیاں ہیں، پلیز آپ اس کی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔'' رشنا نے نہایت گلوگیر آواز میں کہا تو توقیر مزید شرمندگی میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

شمیلہ کا موڈ کافی دنوں کے بعد کچھ بہتر ہوا تھا اور وہ ریحانہ کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی۔ ریحانہ محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں اور باتوں ہی باتوں میں اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''بیٹا...... میں جانتی ہوں تم فہام سے بہت محبت کرتی تھیں مگر بیٹا اب وہ اس دنیا سے چلا گیا ہے یہ حقیقت تسلیم کرو، جانے والے تو چلے جاتے ہیں مگر پیچھے رہنے والوں کو تو زندہ رہنا پڑتا ہے۔ اپنی خاطر اور دوسروں کی خاطر...... تم بھی۔'' ریحانہ کہتے ہوئے رکیں۔

''آپ رک کیوں گئیں، کیا کہنا چاہتی ہیں؟'' شمیلہ نے بیٹھ کر ماں سے پوچھا۔

''تم جوان ہو اور زندگی کا سفر بہت لمبا ہے۔ تنہا عورت کے لیے تو یہ سفر ہے ہی تکلیف دہ...... مگر عورت جب بیوہ یا مطلقہ ہو تو یہ سفر مزید اذیت ناک بن جاتا ہے۔ لوگ چیل کوؤں کی طرح اس پر جھپٹنے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے بیٹا سلمان نے تمہارے بارے میں جو سوچا ہے تم بھی سنجیدگی سے اس کے بارے میں سوچو۔'' ریحانہ نے اسے سمجھاتے ہوئے۔

''ک...... کیا مطلب......؟'' شمیلہ نے گھبرا کر پوچھا۔

''حاتم کے بارے میں......'' ریحانہ نے بہ مشکل کہا۔

''آپ نے پھر حاتم کا نام لیا...... میں نے آپ کو منع بھی کیا تھا...... میں اس کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتی اور آپ......'' شمیلہ اب غصے سے بولی۔

اسی لمحے سلمان کمرے میں داخل ہوا تو شمیلہ اسے غصے سے گھورنے لگی۔

''کیا بات ہے، تم مجھے اتنے غصے سے کیوں گھور رہی ہو؟'' سلمان نے حیرت سے پوچھا۔

''اس لیے کہ آپ ہی میری زندگی میں آگ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''شمیلہ...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' ریحانہ نے گھبرا کر کہا۔

''ان کا بس نہیں چل رہا کہ کس طرح مجھ سے چھٹکارا پائیں۔'' وہ غصے سے چلّائی۔

''شمیلہ...... فضول باتیں مت کرو، تم ہمیشہ میرے بارے میں بدگمان رہتی ہو۔ کبھی مجھے بڑا بھائی ہی نہیں سمجھا، کبھی اپنا ہمدرد نہ جانا۔'' سلمان نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''کیونکہ آپ اس قابل ہی نہیں۔'' شمیلہ نے قدرے بدتمیزی سے کہا۔

''کیا......؟'' شمیلہ کی بات پر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔

''آپ نے آج تک بھائی ہونے کا کون سا حق ادا کیا ہے جو میں آپ کو بھائی سمجھوں۔'' وہ غصے سے اتنا کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

''مما...... کیا میں واقعی اس قابل نہیں کہ شمیلہ؟'' سلمان نے دل برداشتہ ہو کر ماں سے پوچھا۔

''نہیں...... نہیں تم اس کی باتوں کو دل پر نہ لو۔ وہ بہت زیادہ پریشان ہے۔ اسی لیے یہ سب کچھ......'' ریحانہ نے اسے سمجھانا چاہا مگر وہ تیوریوں پر بل لیے وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

شمیلہ کی بدتمیزیاں بھائی بھاوج سے بڑھتی جا رہی تھیں یہاں تک کہ ایک دن نفیسہ نند کی زیادتیوں اور زبان درازی سے تنگ آ کر گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر بیٹھی۔ شمیلہ دل ہی دل میں خوش تھی کہ بھاوج کا پتّا صاف ہو جائے گا جبھی ریحانہ بیگم کو بیٹے کا گھر اجڑنے کا خدشہ لاحق ہو گیا تو انہوں نے فوری فیصلہ کر لیا۔

''تم...... تم کہیں نہیں جاؤ گی، یہ تمہارا گھر ہے اور تم یہیں رہو گی۔ یہاں سے جائے گی تو شمیلہ۔'' اس روز کے بے انتہا جھگڑے کے بعد ریحانہ نے ٹھوس لہجے میں کہا تو نفیسہ ساس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ ریحانہ اپنے کمرے میں آ کر کافی دیر سوچنے کے بعد حاتم کا نمبر ملانے لگیں۔

''حاتم بیٹا......! مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' کافی دیر بعد اس نے فون اٹھایا تو ریحانہ نے جلدی سے کہا، اسی لمحے شمیلہ ان کے کمرے میں داخل ہوئی مگر ماں کو حاتم سے باتیں کرتا سن کر وہیں ٹھٹک کر ماں کی بات سننے لگی۔

''حاتم بیٹا...... میں شمیلہ کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔'' انہوں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''ہاں، ان کے ساتھ حادثہ بھی تو بہت بڑا ہوا ہے ناں!'' حاتم نے نہایت افسردگی سے جواب دیا۔

''وہ دکھ اپنی جگہ پر ہے لیکن تم لوگوں کو شمیلہ کو یہاں نہیں لانا چاہیے تھا۔'' ریحانہ نے شکایتی لہجے میں کہا تو یہ سن کر شمیلہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا۔

''کیا مطلب...... میں سمجھا نہیں خالہ؟'' حاتم نے حیرت سے پوچھا۔

''بیٹی غیر شادی شدہ...... ہو تو اس کی میکے میں اور حیثیت ہوتی ہے مگر جب وہ بیوہ ہو کر یا طلاق لے کر آتی ہے تو اس کی حیثیت یکسر بدل جاتی ہے۔ وہ ایسا بوجھ بن جاتی ہے جسے کوئی بھی خوشی سے اٹھانے کو تیار نہیں ہوتا۔'' وہ افسردگی کے عالم میں بولے جا رہی تھیں۔

''لیکن ہم تو پوری کوشش کر رہے ہیں کہ بھابی آپ پر بوجھ نہ بنیں۔ گھر میں حالات سازگار نہیں تھے اس لیے ہم انہیں آپ کے پاس چھوڑ گئے تھے۔''

حاتم نے وضاحت دی۔

''لیکن وہ یہاں اپنے بھائی بھاوج کے لیے مسئلہ بنی ہوئی ہے بیٹا...... فہام تو اب زندہ نہیں، ایسے میں تم ہی میری امید ہو جو شمیلہ کے دکھ کو کم کر سکتے ہو۔'' ریحانہ نے معنی خیز انداز میں کہا تو شمیلہ یکبارگی چونکی۔

''ہاں...... ہاں...... خالہ جان میں بھی آپ کا بیٹا ہوں، آپ فکر نہ کریں۔'' حاتم نے تسلی دی۔

''جیتے رہو...... خدا تمہیں لمبی زندگی دے، شمیلہ کی عدت ختم ہو رہی ہے، میں جلد ہی تم سے ملنے آؤں گی۔'' ریحانہ نے کہا اور اسے دعائیں دینے لگیں اور شمیلہ کا پارہ ہائی ہونے لگا اور وہ پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

رات کافی گہری ہو رہی تھی۔ ردا اپنے کمرے میں بیڈ پر سو رہی تھی، وہ چہرے سے بہت کمزور اور مرجھائی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے کافی گہرے ہو رہے تھے۔ وہ ایک دم اٹھی اور اپنے چہرے اور گلے پر ہاتھ پھیرنے لگی اسے سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ سائڈ ٹیبل پر پانی کی بوتل خالی پڑی تھی۔ نیند اور کمزوری کی وجہ سے اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ وہ چیزوں کو پکڑ کر آہستہ، آہستہ لاؤنج میں آئی۔ عاصم بھی اسی وقت کمرے سے باہر نکلا تھا وہ ردا کو دیکھ کر چونکا۔ ردا نے ڈائننگ ٹیبل کی چیئر پر ہاتھ رکھا تو بری طرح لڑکھڑانے لگی۔ عاصم نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے تھاما تو ردا نے انتہائی حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور محبت سے اس کے ہاتھ چومنے لگی۔

''تھینک یو...... ان ہاتھوں نے ہمیشہ مجھے گرنے سے بچایا ہے۔'' ردا نے سسکی بھر کر کہا۔

''تم...... تم کمرے سے باہر کیوں آئی ہو؟'' عاصم نے بوکھلا کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے نکالتے ہوئے کہا۔

''پانی...... پینے...... پیاس لگ رہی تھی۔'' ردا نے کہا تو عاصم نے اسے کرسی پر بٹھایا اور گلاس میں پانی ڈال کر اسے دیا۔

''تھینک یو......'' ردا نے گلاس پکڑتے ہوئے کہا اور پانی پینے لگی۔

''عاصم بھائی...... کیا آپ کے دل میں واقعی میرے لیے اب محبت نہیں رہی؟'' ردا نے سسکی بھر کر پوچھا۔

''رات کافی ہو چکی ہے تم اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔'' عاصم نے منہ پھیر کر کہا۔

''کیا...... میں آپ کی نظر میں بھی مجرم ہوں؟ کیا آپ کو اپنی ردا پر ذرا سا بھی بھروسا، اعتبار اور یقین نہیں رہا؟'' ردا نے نم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ کوئی جواب دیے بغیر وہاں سے جانے لگا مگر ردا ایک دم اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور اس کے بازوؤں کو پکڑ کر پوچھنے لگی۔

''پلیز ایک بار میری طرف دیکھ کر کہیں کہ آپ مجھے قصور وار سمجھتے ہیں پھر ساری زندگی کچھ نہیں پوچھوں گی۔'' ردا نے روتے ہوئے کہا۔

''میں کیا سارا زمانہ تمہیں قصور وار سمجھتا ہے۔'' عاصم نے نہایت بے رخی سے جواب دیا۔

''میں زمانے کی نہیں...... آپ کی بات کر رہی ہوں بھائی۔ زمانہ کبھی مجھ سے اتنی محبت نہیں کرتا تھا جتنی محبت آپ کرتے تھے۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کی ذمے دار تم خود ہو۔'' وہ دُرشتی سے بولا۔

''کیا...... میں خود......؟'' ردا نے حیرت سے پوچھا تو وہ اس سے اپنا بازو چھڑا کر واپس کمرے میں چلا گیا اور ردا کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

''اس کا مطلب ہے آپ مجھے ہی قصور وار سمجھتے ہیں۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے رونے لگی اور روتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

☆☆☆

جونہی فجر کی اذانیں بلند ہونے لگیں۔ سائڈ ٹیبل پر پڑے شمیلہ کے موبائل پر الارم بجا، شمیلہ... ہڑبڑا کر اٹھی اور واش روم سے منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلی اس نے چادر لپیٹی اور بیڈ کے نیچے سے اپنا پہلے سے تیار شدہ بیگ نکال کر دبے قدموں لاؤنج میں آ گئی۔ رات میں حاتم سے ماں کی گفتگو سن کر اس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی لاؤنج سے باہر نکل گئی۔ باہر ابھی کافی اندھیرا ہو رہا تھا۔ سڑک پر اکا دکا لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ شمیلہ اپنے چہرے کو چادر سے اچھی طرح لپیٹے بیگ ہاتھ میں پکڑے سڑک پر جا رہی تھی۔ جیسے ہی وہ مین روڈ پر آئی تو سامنے سے پولیس کی گاڑی گشت کرتی ہوئی آ رہی تھی۔ جونہی گاڑی کی ہیڈ لائٹس شمیلہ پر پڑیں تو فرنٹ سیٹ پر بیٹھے پولیس مین نے چونک کر اسے دیکھا اور ڈرائیور کو گاڑی روکنے کو کہا۔

”اس عورت کے پاس گاڑی روکو۔ اس وقت تنہا عورت کیوں گھر سے نکلی ہے، معلوم بھی ہے شہر کے حالات کتنے خراب ہیں۔ ان لوگوں کی بھی کچھ سمجھ نہیں آتی۔“ پولیس مین نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

”کوئی مجرم ہوگی۔“ ڈرائیور نے اس کے قریب گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ شمیلہ نے گھبرا کر اپنا چہرہ مزید ڈھانپنے کی کوشش کی۔ پولیس مین گاڑی سے نیچے اترا۔

”بی بی...... کون ہو تم...... اور اس وقت کہاں جا رہی ہو؟“ پولیس مین نے پوچھا۔

”وہ...... میں...... میں۔“ شمیلہ گھبرا کر ہکلاتے ہوئے بولی۔

”گھبرا تو تم اس طرح رہی ہو جیسے چوری کر کے بھاگی ہو۔“ پولیس مین نے معنی خیز انداز میں گھور کر اس سے پوچھا۔

”چ...... چ...... چوری۔“ شمیلہ مزید گھبرا کر بولی اور اپنے بیگ کی طرف دیکھا۔

”یہ کس کا ہے؟“ اس نے شمیلہ کا بیگ چھینتے ہوئے پوچھا۔

”م...... م...... میرا۔“ اس نے رک رک کر جواب دیا۔

”اگر یہ بیگ تمہارا ہے تو گھبرا کیوں رہی ہو، چلو پولیس اسٹیشن...... وہیں چل کر تفتیش ہوگی۔“ پولیس مین نے کہا تو وہ گھبرا کر رونے لگی۔

”پلیز...... مجھے پولیس اسٹیشن لے کر مت جاؤ۔“ شمیلہ نے روتے ہوئے التجا کی۔

”چلو...... گاڑی میں بیٹھو...... ورنہ......“ پولیس مین نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا تو شمیلہ ڈر کر گاڑی میں بیٹھ گئی اور رونے لگی۔

☆☆☆

ریحانہ وضو کر کے شمیلہ کے کمرے کی طرف آئیں اور دروازے پر دستک دیتے ہوئے بولیں۔

”شمیلہ...... اٹھو، نماز کا ٹائم ہو رہا ہے۔“ مگر کمرے سے آواز نہ آئی تو وہ دروازہ کھول کر اندر چلی گئیں۔ شمیلہ کمرے میں نہیں تھی۔ انہوں نے واش روم دیکھا وہ بھی خالی تھا۔ وہ گھبرا کر اسے آوازیں دیتی ہوئی لاؤنج میں آ گئیں۔ لاؤنج کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ان کے کانوں میں شمیلہ کے الفاظ گونجنے لگے۔

”میں یہ گھر چھوڑ کر دارالامان چلی جاؤں گی۔ یہاں نہیں رہوں گی۔“ ریحانہ کے چہرے پر ایک دم پریشانی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے اور وہ گھبرا کر سلمان کے کمرے کے دروازے کو زور، زور سے بجانے لگیں۔ سلمان اور اس کی بیوی آنکھیں ملتے ہوئے کمرے سے باہر آ گئے۔

”مما...... کیا ہوا...... آپ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہیں؟“

”شمیلہ گھر پر نہیں...... وہ...... وہ گھر چھوڑ کر

چلی گئی ہے۔“ انہوں نے روتے ہوئے بتایا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ خالہ جان کی طرف گئی ہو۔“ سلمان نے کہا۔

”نہیں...... وہ دارالامان جانے کو کہہ رہی تھی۔“ ریحانہ نے سسکتے ہوئے کہا۔

”کیا...... دارالامان......؟“ سلمان حیرت سے چلّایا۔

”ہماری عزت خاک میں ملانے میں وہ کوئی کسر نہیں چھوڑے گی۔“ نفیسہ غصے سے بولی۔

”پلیز...... تم تو چپ کرو اور جاؤ اپنے کمرے میں۔“ سلمان اسے غصے سے ڈانٹتے ہوئے بولا تو وہ منہ بنا کر وہاں سے چلی گئی۔

”کیا...... اس نے آپ سے کچھ کہا تھا؟“ سلمان نے ماں سے پوچھا۔

”بس کچھ روز پہلے وہ جانے کو کہہ رہی تھی۔ شاید وہیں چلی گئی ہے۔ وہ گھر کے حالات سے بہت پریشان تھی۔ معلوم نہیں اب وہ کہاں گئی ہے۔ شاید وہیں......“ ریحانہ سخت پریشان تھیں۔

”اُف خدایا...... کیا کروں، اب اسے کہاں تلاش کروں۔ اس لڑکی نے تو......“ سلمان غصے سے جھنجلا کر بولا۔

”بیٹا...... ابھی کسی سے کوئی بات نہ کرنا ورنہ بہت بے عزتی ہوگی۔ تم اسے کسی دارالامان میں تلاش کرو۔“ ریحانہ نے بیٹے کو سمجھایا۔

”مما...... اگر وہ کسی دارالامان میں پائی گئی تو خاندان بھر میں ہم منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ کتنی شرمندگی ہوگی۔“ وہ غصے سے بولا اور... بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا اور ریحانہ گڑگڑا گڑگڑا کر خدا سے دعائیں کرنے لگیں۔

☆☆☆

پولیس مین، انسپکٹر حیدر علی کو رات کے گشت کے بارے میں تفصیلات بتا رہا تھا۔ شمیلہ ایک کونے میں چادر سے اپنا چہرہ اچھی طرح لپیٹ کر بیٹھی تھی۔ اس کی صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔

”سر...... فجر کے ٹائم یہ عورت پکڑی گئی ہے، شاید کوئی واردات کر کے نکلی تھی یا کرنے جا رہی تھی۔ یہ تفتیش کرنا ابھی باقی ہے۔“ پولیس مین نے شمیلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو حیدر علی نے اسے پیش کرنے کو کہا۔ شمیلہ نے سفید سوٹ کے اوپر بڑی سی چادر سر تا پا لپیٹی ہوئی تھی۔ حیدر علی نے مشکوک انداز میں اس کی طرف بغور دیکھا۔

”کون ہو تم...... اور کون سی واردات کرنے جا رہی تھیں؟“ حیدر علی نے پوچھا۔

”ک...... کوئی نہیں۔“ وہ ہکلا کر بولی۔

”پھر اتنی صبح، صبح کہاں جا رہی تھیں؟“ حیدر علی نے پوچھا تو شمیلہ خاموش ہو گئی۔

”بتاؤ...... خاموش کیوں ہو؟“ اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

”میں...... گھر چھوڑ کر جا رہی تھی۔“ شمیلہ نے نم آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”کہاں......؟“ حیدر علی نے پوچھا۔

”دارالامان۔“

”کیوں......؟“

”میں نہیں بتا سکتی۔“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

”تمہارے گھر والے؟“ حیدر نے پھر سوال کیا۔

”میرا کوئی نہیں۔“

”کیا تم شادی شدہ ہو؟“ حیدر نے پوچھا۔

”بیوہ ہوں......“ شمیلہ نے نم آنکھوں سے جواب دیا۔

”اوہ...... آئی سی۔ کیا سسرال والے تنگ کر رہے ہیں اور تم سسرال سے بھاگی ہو؟“ حیدر نے مزید کریدتے ہوئے کہا۔

”نہیں......“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''ابھی کہاں رہ رہی تھیں؟'' حیدر نے پوچھا۔
''میکے میں۔'' شمیلہ نے جواب دیا تو حیدر خاموش ہوگیا۔
''انہیں دوسرے کمرے میں بٹھاؤ۔'' حیدر نے پولیس مین سے کہا تو وہ اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو حیدر کسی گہری سوچ میں گم تھا۔
''یہ کسی اچھے گھر کی لگ رہی ہے، کیا اس کا کوئی سامان ہے؟'' حیدر نے پولیس مین سے پوچھا۔
''جی ہاں...... یہ بیگ ہے۔'' پولیس مین نے شمیلہ کا بیگ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا...... حیدر نے وہ بیگ کھولا تو اس میں شمیلہ کے چند جوڑوں کے علاوہ فہام کی تصویر بھی تھی۔ فہام کی تصویر دیکھ کر وہ بری طرح چونکا۔
''اوہ......نو......اس کا مطلب ہے یہ؟'' حیدر نے پولیس مین کو تصویر دیتے ہوئے کہا تو وہ بیگ لے کر چلا گیا۔ حیدر نے جلدی سے حاتم کا نمبر ملایا۔ وہ سو رہا تھا۔
''حاتم ......میں انسپکٹر حیدر علی بات کرر ہا ہوں۔ کیا تم اس وقت پولیس اسٹیشن آسکتے ہو؟''
''کیوں...... خیریت تو ہے؟'' حاتم نے گھبرا کر پوچھا۔
''ہاں...... ہاں خیریت ہے ، بس تم فوراً پہنچو......'' حیدر نے کہہ کر فون بند کردیا تو حاتم کچھ سوچتے ہوئے تیار ہونے چل دیا۔

☆☆☆

''حیدر بھائی...... خیریت تو ہے ناں......آپ نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟'' حاتم نے حیدر علی کے سامنے بیٹھ کر پریشانی سے پوچھا۔
''فہام کی ڈیتھ کا مجھے بہت افسوس ہے۔ وہ اکثر بہت یاد آتا ہے۔'' حیدر علی نے معنی خیز انداز میں فہام کا ذکر کیا۔
''ہاں...... ان کے جانے سے تو ہم سب ڈسٹرب ہوگئے ہیں۔'' حاتم نے تاسف سے کہا۔
''آپ کی مدر اور بھابی کے لیے تو یہ صدمہ برداشت کرنا بہت مشکل ہوگا؟'' حیدر نے جان بوجھ کر ذومعنی انداز میں اس سے پوچھا۔
''ہاں...... بھابی تو اپنے senses میں ہی نہیں۔'' حاتم نے قدرے جھجکتے ہوئے بتایا۔
''آئی سی......ویسے آج کل وہ کہاں ہیں؟'' حیدر نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔
''اپنی مما کے پاس......'' حاتم نے ایک گہری سانس لے کر جواب دیا۔
''انہیں وہاں کوئی پرابلم تو نہیں؟'' حیدر نے اسے بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
''نہیں بظاہر تو ایسا نہیں...مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' حاتم نے نہایت حیرت سے کہا۔
''انہیں لے کر آؤ۔'' حیدر نے سپاہی کو کہا تو حاتم نے چونک کر اسے دیکھا۔
سپاہی، شمیلہ کو لے کر آیا تھا۔
''تشریف رکھیے...... مسز فہام......'' حیدر علی نے قدرے احترام سے کہا تو شمیلہ اور حاتم دونوں بری طرح چونکے۔
''بھابی...... آپ اور یہاں...... ؟'' حاتم حیرت سے بڑبڑایا۔ شمیلہ نے چہرے سے چادر ہٹائی اور بری طرح سسکنے لگی۔
''حیدر بھائی یہ سب کیا ہے؟'' حاتم نے خاصی تشویش سے پوچھا۔
''تم نے خود ہی بتایا ہے کہ یہ بہت اپ سیٹ ہیں، شاید اسی ٹینشن میں صبح یہ گھر سے نکلیں تو پولیس انہیں پکڑ کر یہاں لے آئی۔ ان کے بیگ سے فہام کی تصویر نکلی تو میں نے تمہیں فون کردیا۔'' حیدر علی نے بتایا تو حاتم حیران رہ گیا۔
''بھابی آپ کہاں جارہی تھیں؟'' حاتم نے

شمیلہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
''حاتم فی الحال تم انہیں گھر لے جاؤ...... یہ کافی گھبرائی ہوئی ہیں۔'' حیدر نے شمیلہ کے پریشان چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''تھینک یو...... حیدر بھائی!'' حاتم نے اٹھ کر حیدر سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔
''چلیے بھابی......'' حاتم نے شمیلہ سے کہا تو وہ اپنی نم آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے بغیر کچھ بولے اس کے ہمراہ باہر چلی گئی۔

☆☆☆

شمیلہ، حاتم کے ہمراہ گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھی خاموشی سے ونڈو سے باہر دیکھ رہی تھی۔ حاتم کن انکھیوں سے بار بار اسے دیکھ رہا تھا۔ دونوں کافی دیر خاموش رہے۔
''بھابی! آپ تو عدت میں تھیں پھر گھر سے باہر کیوں نکلیں؟'' بالآخر حاتم نے پوچھا۔
''دارالامان جانے کے لیے۔'' شمیلہ نے منہ پھیرے پھیرے جواب دیا۔
''کیا...... دارالامان...... کیوں؟'' حاتم نے حیرت سے پوچھا۔
''جس بے آسرا عورت کے قدموں تلے نہ زمین اپنی ہو اور نہ سر پر چھت تو اسے دارالامان ہی پناہ دیتا ہے۔'' شمیلہ نے سسکی بھر کر جواب دیا۔
''یہ آپ کیسی باتیں کررہی ہیں، آپ فہام بھائی کی نشانی ہیں، ہمارا سب کچھ آپ کا بھی ہے۔ ہمارے فہام بھائی......'' حاتم نے کچھ کہنا چاہا۔
''مجھے فہام کے پاس لے چلو۔ اس کی قبر پر۔'' شمیلہ نے روتے ہوئے کہا۔
''اوکے......'' حاتم نے گہری سانس لے کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور گاڑی کا رخ قبرستان کی طرف موڑ دیا۔ فہام کی قبر کو دیکھتے ہی شمیلہ دہاڑیں مارتی ہوئی اس کے ساتھ لپٹ گئی۔
''فہام......آپ یہاں آکر آرام سے سو رہے ہیں اور میں آپ کے بغیر کتنی تنہا اور بے سہارا ہوگئی ہوں، دربدر کی ٹھوکریں کھا رہی ہوں، کوئی بھی مجھے اپنے پاس رکھنے کو تیار نہیں۔ میں سب پر بوجھ بن گئی ہوں۔ فہام اٹھیے...... چلیے...... یہاں سے...... میں آپ کو لینے آئی ہوں۔'' شمیلہ نے قدرے جذباتی ہو کر قبر کی مٹی ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا تو حاتم گھبرا گیا۔
''شمیلہ بھابی یہ...... یہ آپ کیا کررہی ہیں۔ چلیں، اٹھیں یہاں سے۔'' حاتم نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔
''نہیں، نہیں...... میں نہیں جاؤں گی۔'' شمیلہ چلاتے ہوئے بولی۔
''پلیز...... بھابی خدا کے لیے، چلیے یہاں سے ابھی یہاں ایک تماشا کھڑا ہوجائے گا۔'' حاتم اسے زبردستی گھسیٹتے ہوئے بولا۔

☆☆☆

''سلمان...... شمیلہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹک کر تھکا ہارا گھر لوٹا تو ریحانہ بے تابی سے اس کا انتظار کررہی تھیں۔
''بیٹا......اس کا کچھ پتا چلا......؟'' ریحانہ نے گھبرا کر پوچھا۔
''نہیں ...... تمام ایدھی سینٹرز اور دارالامان میں بھی گیا ہوں مگر کچھ پتا نہیں چلا۔'' وہ انتہائی تھکے ہوئے انداز میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔
''بیٹا...... اگر وہ نہ ملی تو......؟'' انہوں نے بے حد پریشان ہوکر پوچھا۔
''پھر پولیس میں رپورٹ لکھوانی پڑے گی۔'' سلمان بیزاری سے کہنے لگا۔
''نہیں، نہیں بیٹا...... پولیس میں رپورٹ لکھوانے سے بڑی بدنامی ہوگی۔'' ریحانہ نے گھبرا کر کہا تو اسی لمحے نفیسہ بھی وہاں آگئی۔
''ویسے تو وہ بڑے نیک نامی کے جھنڈے گاڑ

رہی ہے ناں۔'' وہ ناک چڑھا کر بولی۔

''نفیسہ......تم خاموش رہو......'' سلمان غصے سے بولا تو وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

☆☆☆

حاتم، شمیلہ کو چھوڑنے خالہ کے گھر آیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''نہیں...... میں اب یہاں نہیں رہوں گی، مجھے یہاں ڈراپ مت کرو، نفیسہ بھابی نے میری زندگی عذاب میں ڈال رکھی ہے۔''

''ابھی آپ کا یہیں رہنا بہتر ہے، چند دنوں کی بات ہے پھر میں آپ کے لیے وہی کروں گا جو آپ چاہیں گی اگر الگ گھر میں رہنا چاہیں گی تو وہ بھی آپ کو لے کر دوں گا۔'' حاتم نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''کیوں......؟'' وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیونکہ آپ ہمارے فہام بھائی کی محبت اور ان کی نشانی ہیں۔ آپ کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔ آپ کوئی بے سہارا اور لاوارث نہیں۔ آپ کو کوئی بھی پرابلم ہو تو پلیز مجھے فوراً کال کریں، چلیے اب میں آپ کو اندر چھوڑ کر آتا ہوں۔'' حاتم نے گاڑی گیٹ کے سامنے روکتے ہوئے کہا تو شمیلہ نے نم آنکھوں سے اسے دیکھا اور پچھلی سیٹ سے بیگ نکالنے لگی۔

''اسے یہیں رہنے دیں اور کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں کہ آپ کہاں سے آرہی ہیں۔ آئی مین...... پولیس اسٹیشن کے بارے میں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ورنہ نفیسہ بھابی کو پھر باتیں بنانے کا موقع مل جائے گا۔ پلیز اس مشکل وقت کو ہمت سے گزاریں۔ میں جلد آپ کو یہاں سے نکالنے کی کوشش کروں گا۔'' حاتم نے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا اور اس کے ہمراہ اندر چلا گیا۔ وہ جونہی لاؤنج میں داخل ہوئے تو تینوں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

''شمیلہ...... شمیلہ تم کہاں چلی گئی تھیں۔ حاتم بیٹا...... تم اسے کہاں سے لائے ہو؟'' ریحانہ نے بے صبری سے پوچھا۔

''خالہ جان...... میں انہیں فہام بھائی کی قبر پر لے گیا تھا۔ انہوں نے صبح، صبح مجھے فون کیا تو میں انہیں وہاں لے کر چل گیا۔'' حاتم نے جلدی سے بات بنائی۔

''اتنے اندھیرے میں قبرستان جانے کی کیا ضرورت پیش آگئی کہ گھر میں کسی کو بتانا تک مناسب نہیں سمجھا۔'' نفیسہ نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا تو سب چونک گئے۔

''آئی ایم سوری...... میں نے سمجھا بھابی نے بتایا ہوگا اس لیے۔''

''یہ تو عدت میں ہے پھر؟'' نفیسہ قدرے طنزیہ انداز میں بولی۔

''نفیسہ بھابی آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟'' حاتم نے حیرت سے پوچھا۔

''نہ ہم بچے ہیں نہ ہی تم لوگ...... جو ہماری آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کر رہے ہو۔ تم جوان بیوہ بھابی کے ساتھ صبح کے گئے اب آرہے ہو...... کیا ہے یہ سب؟'' وہ قدرے غصے سے بولی تو سلمان کو غصہ آگیا۔

''نفیسہ...... دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' وہ غصے سے چلایا تو نفیسہ پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ حاتم بھی خاموشی سے وہاں سے چلا گیا اور شمیلہ روتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

ردا نے کئی روز سے کھانا پینا بالکل چھوڑ رکھا تھا۔ بس ہر وقت بیڈ پر لیٹی اپنے بدلتے ہوئے حالات اور اپنے ہی لوگوں کے بدلتے ہوئے رویوں کے بارے میں سوچتی رہتی اور آنسو بہاتی رہتی۔ اس سے اپنوں کی یہ بے رخی بالکل برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

فہام کی جدائی، روحیل کی بے وفائی، حاتم اور عاصم کی بے اعتنائی، شمیلہ کی بے اعتباری نے اسے اندر ہی اندر اتنا کھوکھلا کر دیا تھا کہ وہ بس زندہ لاش دکھائی دیتی تھی۔ بہت منت سماجت سے ماں خود سے زبردستی چند لقمے کھلاتیں تو کھالیتی ورنہ کھانے کو منہ نہ لگاتی...... اب بھی خدیجہ بیگم اس کے پاس بیٹھی زبردستی دودھ کا مگ اس کی طرف بڑھا کر اسے پینے کو کہہ رہی تھیں مگر اس کا ذہن کہیں اور الجھا ہوا تھا۔

''بیٹا...... اٹھو...... تھوڑا سا دودھ ہی پی لو...... دیکھو تو اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے۔ اٹھو میری جان۔'' انہوں نے زبردستی مگ اس کے ہونٹوں کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''مما...... انسان کی زندگی کے لیے سب سے اہم کیا ہوتا ہے؟'' ردا نے مگ پکڑ کر انہیں بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''انسان کا اپنا وجود...... اگر وہ زندہ ہے تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔'' انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے پیار سے کہا۔

''اور وجود کے لیے سب سے ضروری کیا ہوتا ہے؟''

''یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟'' خدیجہ بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

''مما...... بتائیں ناں...... وجود کے لیے سب سے اہم کیا ہوتا ہے؟'' ردا نے اصرار کیا۔

''اس کی بقا...... اور بقا کے لیے سب کچھ...... پھر اس کا خدا پر ایمان...... اپنی عزت و آبرو اور دوسروں کا اس پر اعتبار......'' خدیجہ بتانے لگیں۔

''اور جو انسان میری طرح بے اعتبار ہو جائے اور اس کی کوئی عزت نہ رہے تو وہ کیا کرے؟'' ردا نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''مت ایسی باتیں کیا کرو...... اسے بس اپنی آزمائش سمجھو اور آزمائش میں انسان کا ایمان خدا پر اور زیادہ مضبوط ہوتا جاتا ہے۔'' خدیجہ بیگم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''میں بہت کمزور انسان ہوں، جس کا ایمان بھی کمزور ہو رہا ہے اور وجود بھی۔'' ردا نے سسکی بھر کر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اسی لمحے زرینہ دروازہ کھول کر قدرے پُرجوش انداز میں اندر داخل ہوئی۔

''بیگم صاحبہ...... ردا بی بی کی ساس آئی ہیں۔'' اس نے خوش ہو کر بتایا۔

''کیا...... ماں جی......'' ایک دم ردا نے چونک کر پوچھا۔ خدیجہ بھی حیران ہونے لگیں اور ماں جی اسٹک کے سہارے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی فضیلت کے ہمراہ اس کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ ردا جلدی سے بیڈ سے اتری اور ماں جی کے گلے لگ کر رونے لگی۔

''میری بیٹی...... ردا میری جان...... یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے، میری گڑیا سی ردا کہاں گم ہو گئی ہے؟'' ماں جی نے والہانہ انداز میں اسے چوما اور اسے سر تا پا دیکھتے ہوئے بولیں۔

''وہ ردا تو مر چکی ہے۔'' وہ سسکی بھرتے ہوئے بولی۔

''اللہ نہ کرے، جب تک میں زندہ ہوں، میری ردا کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ آج میں اپنی ردا کو خود لینے آئی ہوں۔'' ماں جی نے محبت سے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ جبھی حاتم قدرے بلند آواز میں مما، مما پکارتا ہوا ردا کے کمرے کے سامنے سے گزرنے لگا مگر کھلے دروازے کے سامنے رک گیا۔

''حاتم...... اندر آؤ...... ہم سب یہاں ہیں۔'' خدیجہ بیگم نے جان بوجھ کر اسے اندر بلایا۔

''اوہ...... آپ......؟ آپ یہاں کیوں آئی ہیں؟'' حاتم نے اندر داخل ہو کر ماں جی کی طرف دیکھ کر خفگی سے پوچھا۔

''میں اپنی ردا کو لینے آئی ہوں۔'' ماں جی نے جلدی سے کہا۔

"روحیل نے خاندان بھر میں ہماری جتنی عزت کی ہے، کیا اس کے باوجود بھی آپ یہ امید کرتی ہیں کہ ہم ردا کو آپ کے ساتھ بھیج دیں گے؟" حاتم غصے سے بولا۔

"بیٹا...... روحیل اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہے۔" ماں جی نے نرمی سے جواب دیا۔

"اگر وہ شرمندہ ہے تو خود کیوں نہیں آیا؟" حاتم نے اسی خفگی سے بولا۔

"وہ...... وہ تو آنا چاہ رہا تھا۔" ماں جی نے بوکھلا کر کہا۔

"خاندان بھر کے سامنے ردا کی جتنی بدنامی اور بےعزتی ہوئی ہے اس کا یہی تقاضا ہے کہ روحیل سب کے سامنے ردا سے اور ہم سے معافی مانگے ...... پھر ہم ردا کو بھیجنے کے بارے میں فیصلہ کریں گے۔" حاتم نے ماں جی کی بات کاٹ کر ٹھوس لہجے میں کہا تو ماں جی نے گھبرا کر فضیلت کی طرف دیکھا۔

"لیکن...... بیٹا......" ماں جی نے کچھ کہنا چاہا۔

"یہی میرا آخری فیصلہ ہے اور اب فہام بھائی کی جگہ مجھے ہی سب کچھ کرنا ہے۔ سمجھیں یہی ہماری شرط ہے۔" حاتم نے ان کی بات کاٹ کر قطعیت سے کہا تو خدیجہ بیگم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ حاتم غصے سے باہر چلا گیا۔

"میں بھی بہت مجبور ہو چکی ہوں، بیٹوں کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی۔ بس آپ روحیل کو منانے کی کوشش کریں۔" خدیجہ بیگم نے ماں جی کی طرف دیکھ کر بےبسی سے کہا۔

"چلو...... فضیلت۔" ماں جی نے مایوسی سے فضیلت کی طرف دیکھ کر کہا اور دونوں کمرے سے باہر چلی گئیں۔ ردا ماں کے گلے لگ کر سسکیاں بھرنے لگی۔

"شاید...... تمہاری اور آزمائش ابھی باقی ہے۔ حوصلہ کرو، میری بچی!" انہوں نے اسے ساتھ لگا کر روتے ہوئے کہا۔ زرینہ بھی اپنی نم آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

"آپ لوگ کہاں سے آرہے ہیں؟" ماں جی گھر پہنچیں تو روحیل نے ان سے پوچھا۔

"ہم لوگ ردا کے گھر گئے تھے اسے لینے۔" ماں جی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں......" روحیل غصے سے بولا۔

"چھوڑ دو اپنی ضد اور جھوٹی انا......" ماں جی اس کی بات کاٹتے ہوئے غصے سے بولیں۔

"وہ مجھے بار بار دھوکا دینے کی کوشش کر رہی ہے اور میں اتنا بےغیرت نہیں کہ اس پر بار بار ٹرسٹ کروں۔" روحیل بدلحاظی سے بولا۔

"وہ بہت پیاری ہے بیٹا...... وہ جھوٹ نہیں بول رہی خدا کے لیے اپنی ضد چھوڑ دو اور اسے منا کر لے آؤ۔" ماں جی نے محبت سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میں اور اسے لینے جاؤں...... امپاسبل......" روحیل غصے سے کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔ فضیلت اور ماں جی پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔

☆☆☆

آج پھر شمیلہ کا نفیسہ بھابی سے زبردست جھگڑا ہوا تھا، نوبت ہاتھا پائی تک آن پہنچی اور یہ سارا منظر سلمان نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اس نے شمیلہ کو ایک تھپڑ رسید کر کے بیوی کو اس کے چنگل سے نکالا تھا۔ ریحانہ بھی سب کچھ دیکھ چکی تھیں دونوں نے شمیلہ کو زبردستی کھینچ تان کر اس کے کمرے میں پہنچایا اور باہر سے دروازہ لاک کر دیا۔ وہ اندر چیخ، چیخ کر دروازہ پیٹتی رہی۔ ادھر ریحانہ بیگم نے جلدی سے فون کر کے حاتم کو بلا لیا۔ وہ جیسے تیسے دفتر کا کام سمیٹ کر خالہ کے ہاں پہنچا تھا۔

"کیا بات ہے، آپ کیوں رو رہی ہیں؟" حاتم نے ان کے پاس بیٹھ کر پوچھا۔

"بیٹا...... میں شمیلہ کی وجہ سے بہت پریشان ہوں، نفیسہ اور شمیلہ کا بہت جھگڑا ہوا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر رہیں۔" انہوں نے روتے ہوئے کہا۔

"خالہ جان...... اس کا یہی حل ہے کہ آپ کوئی رشتہ دیکھ کر شمیلہ بھابی کی فوراً شادی کر دیں۔" حاتم نے اپنی طرف سے مناسب رائے دی۔

"بیٹا...... میں نے اسی لیے بلایا ہے کہ...... تم ...... تم...... شمیلہ سے شادی کر لو۔" ریحانہ نے رک رک کر حاتم کے سر پر بم پھوڑا تھا۔

"کیا......؟" حاتم ایک دم حیرت سے چلاتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

"حاتم بیٹا...... اس وقت تم ہی شمیلہ کو اس آزمائش سے نکال سکتے ہو۔ میں بہت بےبس اور مجبور ہو کر تمہارے آگے التجا کرتی ہوں۔" ریحانہ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے اس سے کہا۔

"خالہ جان یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟" حاتم نے گھبرا کر ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔

"مجھ مجبور پر رحم کرو، میں تم سے بھیک مانگتی ہوں۔" ریحانہ نے اس کے پاؤں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا تو وہ گھبرا کر ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔

"مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا، میں کیا کروں؟" حاتم نے خالہ کو کندھوں سے تھامتے ہوئے کہا۔

"بیٹا...... ان حالات میں تم ہی ہماری امید اور آسرا ہو۔ شمیلہ، فہام کی بیوہ ہے اس کے دکھ کو جتنا تم سمجھ سکتے ہو کوئی اور نہیں۔" انہوں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "اور دیکھو اس میں برائی بھی کوئی نہیں، تمہارے بھائی کی عزت گھر میں ہی رہے گی۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن مجھے کچھ سوچنے کا موقع دیں۔" حاتم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"بیٹا...... سوچنے کا وقت ہی تو نہیں...... نفیسہ نے شمیلہ کو تمہارے ساتھ منسوب کر کے اس پر الزامات لگانے شروع کر دیے ہیں۔ ابھی شمیلہ کا اس سے جھگڑا ہوا ہے۔ بیٹا...... جب ایسی باتیں باہر نکلنے لگیں تو بیٹیوں کی عزت کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مجھ بےبس ماں پر رحم کرو۔" ریحانہ نے قدرے جذباتی انداز میں اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے خالہ جان، میں جلد ہی مما کو آپ کے پاس بھیجوں گا۔" حاتم نے کچھ سوچتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا تو ریحانہ ایک دم خوش ہو گئیں۔

"بیٹا اللہ تمہیں خوش رکھے۔ تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔" انہوں نے اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا۔

شمیلہ اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس کھڑی اپنی قسمت پر رو رہی تھی جبھی حاتم کو رخصت کر کے ریحانہ بیگم اس کے کمرے میں آگئیں اور شمیلہ کے قریب آکر قدرے پُرسکون لہجے میں بولیں۔

تب ہم نے یہ جانا ہمدم

جب لہجے تبدیل ہوئے
اور جذبوں میں وہ گرمی نہ رہی
آنکھوں میں اتر آئی سرد مہری
ماتھے پر شکنیں ابھرنے لگیں
تب ہم نے یہ جانا ہمدم
کہ قربتیں فاصلے بن گئیں
اور سرد جنگ سی ٹھن گئی
اب نہ لہجے میں وہ نرمی ہے
نہ جذبوں میں وہ گرمی ہے
تب ہم نے یہ جانا ہمدم
کیوں اپنے انمول جذبے
خلوص و وفا کے قیمتی گوہر
تم پر آخر لٹائے کیوں
تمہارے اصل کو جان نہ پائے کیوں؟

شاعرہ: شمائلہ سہیل جاوید، کراچی

"حاتم آیا تھا۔" شمیلہ نے سن کر کوئی جواب نہ دیا۔

"وہ تم سے شادی کے لیے مان گیا ہے۔" ریحانہ بیگم نے اتنا کہا تو شمیلہ چونک پڑی۔

"تمہاری مجبوری اور میری بے بسی کو جان کر وہ مانا ہے۔" ریحانہ کا یہ کہنا تھا کہ شمیلہ نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔

"کیا مطلب......! کیا وہ ہم پر ترس کھا کر مانا ہے؟"

"ترس سمجھو یا کچھ اور...... حاتم کا یہ ہم پر احسان ہوگا۔" ریحانہ بیگم نے زور سے کہا۔

"کیا میں آپ پر اتنا بھاری بوجھ بن گئی تھی؟" شمیلہ سسک اٹھی۔

"جو مرضی سمجھو، تمہارے پاس اب انکار کرنے کا کوئی جواز ہے اور نہ ہی اختیار۔" وہ ٹھوس لہجے میں کہہ کر کمرے سے باہر جانے لگیں۔

"آپ مجھے یوں مجبور کر کے زبردستی اپنی مرضی مجھ پر ٹھونس نہیں سکتیں۔" شمیلہ غصے سے چلائی۔

"میری مرضی...... کیا مجھ بے بس ماں کی کوئی مرضی ہے؟ میں جو بھی کر رہی ہوں، تمہاری بہتری کے لیے کر رہی ہوں۔ میں تمہاری دشمن نہیں۔" اتنا کہہ کر وہ باہر چلی گئیں اور شمیلہ عجیب کیفیت میں مبتلا ہو کر اپنے ہاتھ مسلنے لگی۔

☆☆☆

آزر کمپیوٹر پر کام کرنے میں مصروف تھا مگر بار بار اسے پرابلمز آ رہی تھیں۔ وہ بری طرح جھنجلا رہا تھا۔ خفگی اور جھنجلاہٹ کے تاثرات اس کے چہرے پر نمایاں ہو رہے تھے۔ وہ کام چھوڑ کر کہنیاں ٹیبل پر ٹکا کر اور ہاتھوں میں سر کو تھام کر بیٹھ گیا۔ منیجر نے اسے تیسری بار فائل واپس کی تھی کیونکہ اس میں بہت زیادہ غلطیاں تھیں۔

"آزر صاحب...... کام کرتے ہوئے اپنے ذہن کو حاضر رکھیں۔" منیجر نے خفگی سے کہا اور منیجر کا کہا ہوا جملہ بار بار اس کے ذہن میں گونج رہا تھا۔ وہ اب اسے کیا بتاتا کہ وہ جب بھی کمپیوٹر پر کام کرنے کے لیے بیٹھتا ہے تو اسے یمنیٰ کی بھیجی ہوئی میلز یاد آنے لگتی ہیں۔ اس کی کہی ہوئی باتیں اس کا تمسخر اڑاتی ہیں...... اور اس کے لکھے ہوئے جملے اس کے اندر اضطراب پیدا کرنے لگتے ہیں۔ وہ بہت زیادہ پریشان ہو رہا تھا۔ جبھی کومل دروازہ کھول کر اس کے آفس میں داخل ہوئی۔

"ہیلو...... کیسے ہو تم؟" کومل نے مسکرا کر پوچھا۔

آزر نے اس کی طرف بغور دیکھا اور خاموش رہا۔

"میں تمہیں ایک سرپرائز دینا چاہتی ہوں، کل میں یمنیٰ سے ملنے اس کے گاؤں گئی تھی اور......" اس نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا۔

"ک...... ک...... کیا؟" وہ ایک دم ہڑبڑا کر اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ حیرت سے کومل کی طرف دیکھنے لگا۔

"اس میں اتنی حیرانی کی کیا بات ہے؟" کومل نے چونک کر پوچھا۔

"نہیں...... میں تو اس بات پر حیران ہو رہا ہوں کہ تم اچانک وہاں کیسے چلی گئیں۔" آزر نے بے ربطی سے بوکھلا کر کہا۔

"تم دونوں کی صلح کرانے۔" کومل نے مسکرا کر کہا۔

"صلح...... کیسی صلح......؟" اس نے ایک دم گھبرا کر پوچھا۔

"مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم دونوں میں کسی بات پر شدید ناراضی چل رہی ہے۔" کومل نے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"ناراضی...... ک...... کیسی ناراضی؟"

آزر بری طرح گھبرا گیا تھا۔

"بھئی تم دونوں ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے تھے...... اور یمنیٰ تو تمہارا ذکر سن کر ہی مسکراتی رہتی تھی۔ تم سے وہ جتنی شدید محبت کرتی تھی اس کا عکس اس کے چہرے اور آنکھوں میں صاف دکھائی دیتا تھا...... اور اگر اتنی محبت کرنے والا کوئی شخص ایک دم دوسرے سے بے خبر ہو جائے تو یقیناً دونوں کے درمیان کوئی نہ کوئی ناراضی تو ہوگی ناں...... بس میں یہی جاننا چاہتی تھی۔" کومل نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" اس نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

"یمنیٰ بھی اسی طرح تمہارے ذکر پر خاموش ہوئی تھی۔ اس نے بھی مجھے کچھ نہیں بتایا۔ اس کا مطلب ہے کہ بات واقعی سیریس ہے۔" کومل نے مشکوک لہجے میں کہا۔

"تم کیوں اتنی کیوریس ہو رہی ہو، اس کی کیا وجہ ہے؟ بہتر یہی ہے کہ تم ہمارے معاملے میں انوالو نہ ہو......" آزر نے قدرے خفگی سے کہا تو کومل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم یوں ری ایکٹ کرو گے۔ میں نے تو پورے خلوص سے تم دونوں کے درمیان صلح کرانے کا سوچا تھا۔" کومل نے صاف گوئی سے کہا۔

"کیا میں نے تمہیں ایسا کرنے کو کہا تھا؟ تم کون ہوتی ہو، ہمارے معاملے میں بولنے والی۔" آزر نے انتہائی درشت لہجے میں کہا تو کومل اسے ہکا بکا دیکھتی رہ گئی۔ اسے امید نہیں تھی کہ آزر یوں ہائپر ہو جائے گا۔

"میں نے تو صرف فرینڈشپ میں تم دونوں کو ایک دوسرے سے ملانے کی کوشش کی ہے، اس لیے کہ تم دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔" کومل نے کہا۔

"محبت...... محبت ہہ میں اس سے کبھی محبت نہیں کر سکتا تھا، میں صرف اس سے نفرت کرتا تھا اور کرتا رہوں گا اور میں نے محبت کا وہ کھیل اس سے انتقام لینے کے لیے کھیلا تھا۔" وہ ایک دم غصے سے چلاتے ہوئے بولا۔

"یو...... چیٹر!" کومل نے زور سے اس کے چہرے پر تھپڑ لگایا تو آزر ایک دم بوکھلا کر اسے دیکھنے لگا۔

"آئی تھنک...... تم یہ تھپڑ... ڈیزرو کرتے ہو...... کیونکہ تم نے یمنیٰ جیسی مخلص لڑکی کو محبت کے نام پر دھوکا دیا، اب مجھے تمہارے اضطراب کی سمجھ آئی ہے، کسی معصوم کے احساسات کو ایکسپلائٹ کرنے اور انہیں ہرٹ کرنے پر انسان کے اندر ایسا ہی اضطراب پیدا ہوتا ہے...... میں تمہارے حالات کی وجہ سے تم سے ہمدردی ظاہر کر رہی تھی مگر تم اس قابل ہی نہیں...... تمہارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے بالکل ٹھیک ہو رہا ہے...... اور ابھی تو تمہارے ساتھ بہت کچھ ہوگا...... کیونکہ میں نے یمنیٰ کو جتنا خدا کے قریب دیکھا ہے اگر اس کی ایک بددعا بھی تمہیں لگ گئی تو تم زندہ درگور ہو جاؤ گے۔" کومل نے نہایت طیش کے عالم میں اس سے کہا اور اس کے آفس سے باہر نکل گئی۔

آزر اس کے جانے کے بعد اپنی میز پر زور زور سے مکے مارنے لگا، بال نوچنے لگا۔ وہ عجیب وحشت زدہ لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، جب منیجر انتہائی غصے میں اس کے آفس میں آیا۔

"مسٹر آزر...... آپ کی فائل ابھی تک میرے پاس نہیں پہنچی۔"

"سوری...... میں یہ جاب نہیں کر سکتا، میں اسی وقت جاب چھوڑ کر جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ آفس سے باہر چلا گیا۔ منیجر حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے فوراً رانا صاحب کو فون کیا، وہ بھی اس کی بات سن کر چونک گئے۔ انہوں نے کومل کو کال کی اور اسے ساری بات بتائی۔

"ٹھیک ہے اگر وہ جاب چھوڑ کر چلا گیا ہے تو ہم اسے روک نہیں سکتے۔ let him go"

کومل نے سرد لہجے میں کہا۔

”کیا تم دونوں میں کوئی جھگڑا ہوا ہے؟ ورنہ تم تو اسے بہت زیادہ سپورٹ کرتی رہی تھیں؟“ رانا صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں کرتی تھی...... مگر اب نہیں۔“ کومل نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

آزر...... کومل کی باتیں سن کر بہت زیادہ اپ سیٹ ہوگیا تھا۔ اس کے اندر یمنیٰ سے ملنے کی شدید خواہش پیدا ہورہی تھی۔ یمنیٰ اسے ملے گی یا نہیں اور ملنے کے بعد انجام کیا ہوگا......؟ وہ ان میں سے کسی ایک بات کے بارے میں بھی نہیں سوچ رہا تھا اگر سوچ رہا تھا تو صرف یمنیٰ سے ملنے کے بارے میں...... اپنی سوچوں میں گم وہ جواد کے شوروم چلا گیا مگر جواد شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس نے اسے فون ملایا تو جواد حیرت میں رہ گیا۔

”آزر خیریت تو ہے؟“

”مجھے یمنیٰ کا ایڈرس چاہیے...... ابھی اور اسی وقت۔“

”ٹھیک ہے...... میں تمہیں ابھی sms کرتا ہوں۔“ جواد نے کہا اور آزر نے فون بند کردیا۔

تھوڑی دیر بعد اسے یمنیٰ کا ایڈریس اور فون نمبر مل گیا تھا اور وہ اسی وقت اس سے ملنے روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

یمنیٰ صبح سے کافی زیادہ مصروف تھی۔ شہر سے این جی اوز کی ممبرز اس سے ملنے آئی تھیں۔ اس کے مدرسے کی شہرت گاؤں سے نکل کر شہر تک پہنچ چکی تھی کہ ایک دینی مدرسے کو انتہائی ماڈرن اور سائنٹیفک بنیادوں پر قائم کیا جارہا ہے۔ اس میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی سہولتوں کے ساتھ ساتھ انتہائی لائق اساتذہ کو تعینات کیا جارہا تھا۔ اماں جی نے اپنے منیجر کے ہمراہ ان تمام ممبران کو مدرسے کا وزٹ کروایا۔ لنچ کے بعد وہ لوگ چلی گئیں تو اماں جی آرام کرنے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ یمنیٰ بھی اپنے کمرے میں جاکر ایک ریسرچ رپورٹ تیار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد بلقیس نے اسے کسی کے آنے کی اطلاع دی۔

”کیا نام بتایا ہے؟“ یمنیٰ نے پوچھا۔

”نام نہیں بتایا...... بس کہا ہے کہ ملنا چاہتے ہیں۔“

مدرسے کے سلسلے میں اکثر لوگ اس سے ملنے آیا کرتے تھے۔ کبھی کوئی صحافی تو کبھی کوئی پروفیسر یا ریسرچ اسکالرز۔ اس نے اپنی چادر اچھی طرح لپیٹی اور ڈرائنگ روم میں چلی گئی اور جیسے ہی اس نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا اس کے قدم وہیں کے وہیں رک گئے۔ آزر انتہائی برے حلیے میں اس کے سامنے موجود تھا۔ یمنیٰ کا خون کھولنے لگا اور اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے اپنے پیچھے ڈرائنگ روم کا دروازہ بند کیا اور دیوار پر اس کے دادا جان کی بڑی بڑی رائفلز کے ساتھ لٹکی ہوئی چمڑے کی بیلٹوں میں سے ایک بیلٹ اتار کر وہ آزر کی طرف بڑھی۔ آزر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ سفید چادر میں اس کا لپٹا وجود اسے انتہائی نورانی دکھائی دے رہا تھا۔ اسے اس کی سیاہ رنگت دکھائی نہیں دے رہی تھی...... نظر آرہا تھا تو ایسا نورانی وجود جس سے عجیب سی نورانی شعاعیں جھلک رہی تھیں۔

یمنیٰ نے کھینچ کر بیلٹ زور سے اس کی کمر پر ماری اس کے منہ سے چیخ تو نکلی مگر اس نے کوئی مدافعت نہیں کی۔

”ذلیل، گھٹیا درندے...... آج میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تو انسان نہیں وحشی درندہ ہے۔ آج میں تیری ساری درندگی نکال دوں گی۔ تو نے یہاں آکر اپنی موت کو دعوت دی ہے۔ اس دن تو میں نے تجھے زندہ چھوڑ دیا تھا مگر آج نہیں

چھوڑوں گی۔ آج تیری لاش ہی یہاں سے جائے گی۔“ کہتے کہتے یمنیٰ نے گھما گھما کر بیلٹ اس کے جسم پر زور، زور سے ماری۔ وہ کراہ ضرور رہا تھا مگر زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ جب وہ اسے مار مار کر تھک گئی تو وہ اس کے قدموں میں گرا اور گڑگڑا کر معافی مانگنے لگا۔

”مجھے معاف کردو۔ میں جس آگ میں جل رہا ہوں اس کی تکلیف اس سے کہیں زیادہ ہے جس سے اس وقت میرا جسم دکھ رہا ہے۔ میں اسی لیے تمہارے پاس آیا ہوں کہ تم مجھے اپنے ہاتھوں سے ماردو تاکہ میں ایک بار ہی مر کر سکون میں آجاؤں۔“ وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

”سکون اور تمہیں...... وہ تو تمہیں کبھی نصیب نہیں ہوگا۔ تمہارے لیے تو میری ایک، ایک سانس بددعا کرتی ہے اور کرتی رہے گی۔ تمہیں حمنہ یاد ہے ناں...... کیا، کیا تھا تم نے اس کے ساتھ۔ اس معصوم سے کس بات کا انتقام لیا تھا تم نے، کیا تمہیں اس پر رحم آیا؟ وہ بھی تو تمہارے سامنے روتی اور گڑگڑاتی رہی تھی۔ کیا اس کے آنسو تمہیں دکھائی دیے تھے؟ کیا اس کی چیخیں تمہارے کانوں تک بھی پہنچی تھیں۔ کیا اس وقت تم انسان تھے؟ تم تو اس وقت شیطان بنے ہوئے تھے۔ اب مجھ سے یعنی کالی چمگادڑ سے معافی مانگ رہے ہو۔ آہ آزر عظیم، خوب صورت انسان مجھ جیسی معمولی، حقیر انسان سے معافی مانگ رہا ہے۔ کہاں گیا تمہارا تکبر کہاں گیا وہ غرور...... کہاں ہے؟“ یمنیٰ نے انتہائی حقارت سے اسے دھکا دیا۔

”سب خاک میں مل گیا...... یمنیٰ لوگ مجھے دیکھتے ہی نفرت سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ مجھ سے کراہت محسوس کرتے ہیں اور میں اس کی وجہ جانتا ہوں۔ میرا گناہ...... جو بہت بڑا ہے اتنا بڑا کہ شاید خدا بھی مجھے کبھی معاف نہ کرے۔ میں کبھی خدا سے معافی مانگنے کی ہمت نہ کرسکا اگر مجھے کوئی معاف کرسکتا ہے تو وہ صرف تم ہو۔“ آزر نے سسکتے ہوئے کہا۔

”اور میں تمہیں ہرگز...... ہرگز معاف نہیں کروں گی۔“

”ٹھیک ہے پھر خوب جی بھر کر مارو۔“ آزر اس کے سامنے کھڑا ہوکر بولا۔ یمنیٰ نے اسے مارنے کے لیے بیلٹ اٹھائی تو اگلے ہی لمحے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور بیلٹ اس کے ہاتھ سے گرگئی۔

”رک کیوں گئی ہو؟“ آزر نے پوچھا۔

”تمہارے سامنے حمنہ آکھڑی ہوئی ہے۔“ یمنیٰ نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھتے ہوئے سسکی بھرتے ہوئے کہا۔

”حمنہ......؟“ وہ بڑبڑایا۔

”حمنہ کتنی معصوم اور نیک تھی۔ تمہیں کیا معلوم اللہ کے نیک بندوں کا ظرف تم جیسے نیچ انسانوں سے کہیں بڑا ہوتا ہے۔ اگر ان کا ظرف وسیع نہ ہو تو تم جیسوں کی خباثت ...... اس میں کیسے سما سکے۔ اس وقت حمنہ تمہیں بچانے آگئی ہے۔“ یمنیٰ نے روتے ہوئے کہا تو آزر حیرت سے آنکھیں پھیلائے کبھی اسے اور کبھی اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور اس کی سانس جیسے اکھڑنے لگی۔

”حم...... حمنہ...... حمنہ......“ اس کا جسم بری طرح کانپنے لگا اور پھر وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ ہاتھ باندھ کر گڑگڑانے لگا۔

”حمنہ...... مجھے معاف کردو۔ حمنہ مجھے معاف کردو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ ہاں اسی طرح جس طرح تم نے میرے آگے جوڑے تھے مگر مجھے تم پر رحم نہیں آیا تھا۔ میں بہت گھٹیا انسان ہوں۔ حمنہ تم تو بہت اچھی اور نیک ہو پلیز مجھے معاف کردو۔“ آزر گڑگڑاتا ہوا اور معافی مانگتا ہوا اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے زمین پر پیشانی رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ یمنیٰ نے ایک ٹک اس

کی جانب دیکھا۔
"کسی کے سامنے جب کوئی انسان گڑگڑا کر معافی مانگتا ہے تو وہ فرعون بن جاتا ہے اور اس کی انا کو تسکین ملنے لگتی ہے۔ رحمٰن کا انسان کو معاف کرنا بہت آسان ہے مگر انسان کا انسان کو معاف کرنا بہت مشکل ہے۔ رحمٰن کے سامنے سر جھکا کر انسان کو اندر سے تسکین ملتی ہے اور اپنے جیسے انسان کے سامنے جھکنے سے اندر ہی اندر تذلیل کا احساس ہوتا ہے۔" یہی سب کچھ وہ اپنی رپورٹ میں پہلے سے لکھ رہی تھی اور اب اس پر عمل کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ آیت اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔
"کتنا مشکل ہو جاتا ہے خدا کے فرمان پر عمل کرنا۔" یمنیٰ کے ہاتھ کانپنے لگے۔
"تم یہاں سے چلے جاؤ۔" یمنیٰ نے منہ پھیرتے ہوئے اشارہ کر کے اس سے کہا۔
"کیا تم نے مجھے معاف کر دیا ہے؟" آزر نے جلدی سے پوچھا۔
"میں نے نہیں اس نے جس کی محبت کا تم نے مجھے واسطہ دیا ہے۔" یمنیٰ نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔
"ک...... کس نے؟" آزر نے چونک کر پوچھا۔
"میرے خدا نے۔" یمنیٰ نے آہستہ آواز میں کہا۔
"کیا؟" آزر کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔
"ہاں، وہ کبھی کبھی ہماری محبتوں کو بھی آزماتا ہے اور نفرتوں کو بھی۔" یمنیٰ نے نم آنکھوں سے کہا۔
"کیا تم خدا سے بہت محبت کرنے لگی ہو؟" آزر نے حیرت سے پوچھا۔
"ہاں، جب تم جیسے لوگ محبت میں دھوکا دیتے ہیں تو رب کی سچی اور حقیقی محبت پر ایمان مزید بڑھنے لگتا ہے۔ تم خوش قسمت ہو جو مقصد لے کر یہاں آئے اس میں کامیاب ہو گئے۔ اب جاؤ یہاں سے اور دوبارہ یہاں آنے کی کبھی کوشش بھی نہ کرنا۔ اب میں تم سے کبھی نہیں ملوں گی۔" یمنیٰ نے کہا اور دروازہ کھول کر ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی۔ آزر حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا اور اپنے آنسو صاف کر کے بوجھل قدم اٹھاتا ہوا وہاں سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

آزر جب سے یمنیٰ سے مل کر آیا تھا اس کے اندر اضطراب پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا تھا جسے دور کرنے وہ اس کے پاس گیا تھا۔ بظاہر تو وہ معافی نامہ لے آیا تھا مگر اسے کیا معلوم تھا کہ اس کا اضطراب پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جائے گا۔ اس کے دل میں ایک اور بوجھ ایک ٹیس کی صورت میں اسے تڑپا رہا تھا۔ اسے کسی پل چین نہیں آ رہا تھا۔ پہلے اسے یمنیٰ کی غصے بھری صورت اور حمنہ کی چیخیں سنائی دیتی تھیں اب یمنیٰ کی چادر میں لپٹی نورانی صورت اس کے اندر تڑپ پیدا کر رہی تھی۔ اسے یمنیٰ سے شدید محبت سی محسوس ہونے لگی۔ اتنی محبت جو اس نے زندگی میں کسی کے لیے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ تو اپنی اذیت سے چھٹکارا پانے گیا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہ اس سے بھی زیادہ اذیت کا بوجھ اپنے دل میں لیے واپس آئے گا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پھر یمنیٰ کے پاس جائے مگر اب وہ اس سے کبھی نہیں ملے گی۔ یمنیٰ میں ایسی کیا خاص بات ہو گئی تھی کہ وہ پہلے جیسی بدصورت نہیں لگ رہی تھی یا پھر اس کا اسے دیکھنے کا زاویہ بدل گیا تھا۔
"نہیں...... اس میں ضرور کوئی خاص بات ہے۔ وہ پہلے سے بہت مختلف اور پُرکشش دکھائی دی ہے۔" آزر نے تو اسے نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ جب بھی اسے دیکھتا تو فوراً ہی نظریں جھکا لیتا۔ وہ سارا دن پارک میں بیٹھا سوچتا رہا۔ شام گئے وہ انیکسی میں آیا تاکہ چوکیدار کو بتا دے کہ وہ اسے چھوڑ کر جا رہا ہے۔
"رانا صاحب نے کل صبح آپ کو اپنے آفس میں بلایا ہے۔ ابھی آپ انیکسی چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔" چوکیدار نے کہا تو وہ خاموشی سے انیکسی میں چلا گیا۔ فریج میں کھانے پینے کی ہر شے رکھی تھی۔ اس نے تھوڑا بہت کچھ کھایا اور پانی پی کر نڈھال ہو کر بیڈ پر گر گیا۔ اس نے آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی تو یمنیٰ اس کی آنکھوں کے سامنے تھی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور سر تھام کر بیٹھ گیا پھر کمرے کا چکر لگانے لگا۔
"میرے دل کو کیا ہو رہا ہے، اس کی محبت میں اتنا بے تاب کیوں ہو رہا ہے۔" وہ کافی بے چین تھا۔
صبح سویرے وہ رانا صاحب کے آفس کے باہر جا کر بیٹھ گیا۔ رانا صاحب کافی دیر بعد آئے۔ انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
"آپ کب سے یہاں بیٹھے ہیں؟" رانا صاحب نے حیرت سے پوچھا۔
"صبح سے، چوکیدار نے مجھے آپ کا پیغام دیا تھا۔" آزر نے نظریں جھکا کر کہا۔
"اندر تشریف لائیں۔" رانا صاحب نے کہا تو وہ ان کے پیچھے پیچھے ان کے روم میں چلا گیا۔
"آپ جاب کیوں چھوڑ رہے ہیں؟" انہوں نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ مجھے سامنے لکھے الفاظ دکھائی نہیں دیتے کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔ ایسی سچویشن میں کیسے جاب کروں؟" آزر نے عجیب بے بسی سے کہا۔
وہ اس کی جانب بغور دیکھ کر اس کے چہرے پر لکھی تحریر اور اندر کی کیفیت کو جاننے کی کوشش کرتے رہے۔
"کالے بادل کافی چھٹ گئے ہیں پھر اتنا اضطراب کیوں؟" رانا صاحب نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔
"ک...... کیا مطلب؟" وہ ایک دم بوکھلا کر بولا۔
"مطلب اور وجہ تو آپ بہتر جانتے ہیں، مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے آپ کو کسی سے شدید محبت ہو گئی ہے۔" رانا صاحب نے کہا تو آزر حیرت سے آنکھیں پھیلائے ان کی طرف دیکھنے لگا۔
"جی ہاں، محبت اور کون ہے وہ جس نے آپ کے اندر اتنا شدید طوفان برپا کر رکھا ہے؟" رانا صاحب نے مسکرا کر پوچھا۔
"وہی جس سے میں کبھی شدید نفرت کرتا تھا اور اسی نفرت میں اس سے محبت کا ڈھونگ رچایا۔ اس کی کالی صورت کو نہ جانے کیا، کیا طنزیہ نام دیتا تھا اور اب وہی صورت میرے اندر سما گئی ہے۔ اچانک اس سے نفرت اتنی شدید محبت میں بدل جائے گی مجھے یقین نہیں آ رہا۔ نہ جانے یہ سب کیسے ہو گیا ہے۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، میں کیا کروں؟" وہ شرمندگی سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
"آئی ایم شیور، وہ کوئی معمولی انسان نہیں جس کے لیے نفرت کو خدا نے آپ کی محبت سے بدل دیا ہے۔ کسی کے لیے جذبوں کو بدلنا کوئی معمولی بات تو نہیں۔" رانا صاحب نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔
"ہاں، وہ خود بھی بہت بدل گئی ہے۔ ایک ماڈرن لڑکی سے اللہ والی بن گئی ہے۔" آزر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔
"اسی لیے تو......" رانا صاحب نے قدرے جذباتی انداز میں ٹیبل پر ہاتھ مارا تو آزر نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔
"میں سمجھا نہیں سر آپ؟"
"جب خدا کسی سے محبت کرتا ہے تو اسے زمین والوں کے لیے محبوب بنا دیتا ہے لوگ خود بخود اس کی جانب کھنچے چلے آتے ہیں۔ اس سے قربت اور محبت محسوس کرتے ہیں۔ جب آپ نے اس سے محبت کا

ڈھونگ رچایا اور اس سے اظہارِ محبت کیا تو کیا وہ بھی آپ سے محبت کرنے لگی تھی؟'' رانا صاحب نے استفہامیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، شاید بہت زیادہ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔'' آزر نے سر جھکا کر کہا۔

''اور آپ نے اس سے نفرت کی، اس کی محبت کا مذاق اڑایا اور اس کا دل توڑا۔ اب آپ کو اس کی پُرخلوص محبت کا تاوان تو دینا پڑے گا ناں۔''

''تاوان؟'' آزر ایک دم گھبرا کر بولا۔

''جی ہاں، جب خدا کے معصوم بندوں کے دل ٹوٹتے ہیں تو وہ اس کا تاوان ضرور لیتا ہے۔ وہ بڑے گناہوں کو تو معاف کرسکتا ہے مگر دلوں کو توڑنے کے جرم کو کبھی معاف نہیں کرسکتا جنہیں ہم معمولی خطائیں سمجھتے ہیں اور تاوان ہر انسان کو کسی نہ کسی صورت میں دینا پڑتا ہے۔ اب اس محبت کا تاوان آپ کیسے بھریں گے یہ تو آپ کو سوچنا ہے۔'' رانا صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔

''وہ...... وہ تو میری صورت ہی نہیں دیکھنا چاہتی۔ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتی تو پھر کیسے میری محبت پر اعتبار کرے گی۔ میں بہت بڑی اذیت میں ہوں سر، میں کیا کروں پلیز آپ ہی کچھ بتائیے۔'' آزر سسکتے ہوئے بولا۔ اسی لمحے آفس کا دروازہ کھلا اور کومل اندر داخل ہوئی اور آزر کو اس طرح دیکھ کر وہ ایک دم چونکی پھر حیرت سے وہ رانا صاحب کو دیکھنے لگی۔

''ک...... ک...... کیا ہوا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''آئی ایم سوری کومل، میں نے تمہیں بہت ہرٹ کیا۔ آئی ایم ویری سوری۔''

''اٹس او کے...... لیکن تم رو کیوں رہے ہو؟'' کومل نے گھبرا کر پوچھا۔

''میں......'' وہ کچھ کہنے لگا مگر اس سے کہا نہیں گیا اور وہ جلدی سے آفس سے باہر چلا گیا۔

''نانا ابو اسے کیا ہوا ہے؟''

''شاید بہت زیادہ ڈپریشن ہے۔'' انہوں نے بتایا تو کومل کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی اسے جواد کے الفاظ یاد آنے لگے ''آڈ کیریکٹر'' وہ آزر کے بارے میں کہتا تھا واقعی آزر ایسے کردار کا مالک تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

☆☆☆

''جمال، یمنیٰ کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے۔ جلدی گاؤں پہنچنے کی کوشش کرو۔'' اماں جی نے قدرے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ جمال احمد اور ایمن اماں جی کے رات تین بجے فون آنے پر بے انتہا پریشان ہوگئے۔

جمال، ایمن کو تسلی دے کر اسی وقت گاؤں کے لیے روانہ ہوگئے۔ اماں جی سے مزید پوچھ گچھ وہیں جا کر کرنا تھی۔ وہ انتہائی تیز رفتاری سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وہاں پہنچے تو یمنیٰ کو بے حال پایا۔ ایمبولینس وہ کال کرچکے تھے۔

اماں جی اس کے قریب بیٹھی فکرمندی سے اس کے سر پر بار بار ہاتھ پھیرتے ہوئے دعائیں پڑھ پڑھ کر اس پر پھونک رہی تھیں۔

''کیا ہوا یمنیٰ کو؟'' جمال احمد نے گھبرا کر یمنیٰ کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ڈاکٹر نے نیند کا انجکشن دے کر سلایا ہے۔ بہت شدید درد تھا۔ اب تم اسے فوراً شہر لے جاؤ۔ ایمبولینس تیار کھڑی ہے۔''

شہر کے بڑے اور جدید اسپتال پہنچتے ہی اس کے ٹیسٹ شروع ہوگئے۔ دو دن بعد حتمی اور تفصیلی رپورٹس آگئیں جن کے مطابق اس کا ایک گردہ مکمل ناکارہ ہوچکا تھا جبکہ دوسرا بھی بہ مشکل کام کر رہا تھا۔

جمال صاحب یہ سب جان کر فوراً اپنا گردہ دینے پر تیار ہوگئے مگر ان کے اندر کچھ ایسی کمپلیکیشنز تھیں

کہ ڈاکٹرز نے یہی تجویز کیا کہ پہلے کسی جوان انسان کا گردہ حاصل کرنے کی کوشش کریں اگر وہ نہیں ملتا تو پھر اُن کے بارے میں سوچیں گے۔ ایمن کو شوگر تھی اس لیے وہ گردہ نہیں دے سکتی تھیں۔

جمال صاحب نے ٹی وی اور اخبارات میں اشتہارات دیے۔ کچھ مجبور اور کچھ لالچی لوگوں نے ان سے رابطہ بھی کیا مگر ہر ایک کے ساتھ کوئی نہ کوئی ایسا مسئلہ نکل آتا کہ ڈاکٹرز انکار کردیتے۔ جمال احمد بھاری سے بھاری قیمت پر بھی گردہ حاصل کرنے پر رضامند تھے مگر ڈاکٹروں کا انکار انہیں جھنجلا رہا تھا۔

اس روز وہ سخت مایوسی کے عالم میں اسپتال کے ایم ایس ڈاکٹر شہر یار کے آفس میں گئے جو کافی ہائیلی ایجوکیٹیڈ تھے اور چند سال پہلے ہی فارن ڈگریز لیے اپنے ملک کے لوگوں کی خدمت کا عزم لیے لوٹے تھے۔ جمال احمد نے ان کے بارے میں اچھی باتیں سن رکھی تھیں مگر وہ ملے پہلی بار تھے۔ اتنی ینگ ایج کے اتنے قابل ڈاکٹر سے مل کر وہ کافی متاثر ہوئے۔

’’ڈاکٹر صاحب، مجھے آپ کے ڈاکٹرز کی کچھ سمجھ... نہیں آرہی۔ میں نے کڈنی کے لیے جن لوگوں کو بھی کال کیا ہے آپ کے ڈاکٹرز نے انہیں ریفوز کردیا۔ آپ جانتے ہیں ناں یمنیٰ کو کچھ ہوگیا تو......؟‘‘ جمال احمد نے آنسو روکتے ہوئے بہ مشکل کہا۔

’’یمنیٰ۔‘‘ ڈاکٹر شہر یار کے آفس میں پہلے سے بیٹھے نوجوان نے یمنیٰ کا نام سن کر زیر لب دہرایا اور ان کی طرف دیکھنے لگا۔

’’آپ فکر نہیں کریں، میری ڈاکٹرز سے میٹنگ ہوئی ہے۔ آپ کے مریض میں کچھ ایسی پیچیدگیاں ہیں کہ ہم کسی کا کڈنی اسے نہیں لگا سکتے۔ بہت سوچ سمجھ کر ہر اسٹیپ لینا ہوگا۔ انشاء اللہ کل شام تک ہم کوئی نہ کوئی فیصلہ لے لیں گے۔ آپ سے

قمر علی عباسی کے نام

تحریر کے رشتے بھی کیا خوب ہوتے ہیں...... وہ لوگ جن سے کبھی نہیں ملے ہوتے ہیں اور نہ ملنے کی امید...... ان کی تکلیف پر دل تڑپ اٹھتا ہے...... قمر علی عباسی کی وفات کا سن کر کتنی ہی دیر سورۂ اخلاص پڑھتی رہی...... اور پھر قلم لے کر بیٹھ گئی...... منیر نیازی کہتے ہیں ہمیشہ دیر کردیتا ہوں میں...... اور میں اس کی عملی تفسیر ہوں...... وہ جو اِک بہت بڑا افسانہ نگار...... سفرنامہ نگار تھا...... پاکیزہ کی تقریبات کا احوال لکھنے والی، نئی رائٹر کی بھی حوصلہ افزائی کرتے تھے...... خواہش تھی کہ کبھی بحیثیت تبصرہ نگار ہی میں کسی تقریب میں شرکت کروں گی اور پھر احوال لکھوں گی اور قمر علی عباسی کو کہوں گی کہ میں بھی حیدر آباد کی ہوں...... میرا احوال کیسا لگا......؟ مگر...... میں ہمیشہ دیر کردیتی ہوں......

اللہ جی ان کو جنت میں بہت اوپر اوپر جگہ دے اور نیلوفر کو صبر...... آمین۔

تحریر: ڈاکٹر کومل عبدالستار
لیاقت میڈیکل یونیورسٹی جام شورو

زیادہ ہمیں مریض کی فکر ہے۔‘‘ ڈاکٹر شہر یار نے نرمی سے انہیں سمجھایا تو جمال صاحب نے ایک گہری سانس لی۔

’’ٹھیک ہے مجھے ہر حال میں اپنی بیٹی کو بچانا ہے۔ جیسا آپ بہتر سمجھیں۔‘‘ یہ کہہ کر جمال صاحب ایم ایس کے کمرے سے باہر نکل گئے۔

وہ نوجوان یمنیٰ کا نام بار بار ذہن میں دُہرا رہا تھا پھر اسے نہ جانے کیا خیال آیا کہ ایم ایس سے اس کی کنڈیشن پوچھنے لگا اور ڈاکٹر شہر یار جو اس نوجوان کے واقف کار تھے وہ اسے پوری تفصیل دینے لگے۔ ان سے معلومات لے کر وہ آئی سی یو میں چلا گیا

جہاں یمنیٰ ہڈیوں کا ڈھانچا بنی بے سُدھ بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ جمال احمد بھی وہیں کھڑے تھے۔ نوجوان نے یمنیٰ کی طرف دیکھا اور گہری سانس لیتے ہوئے اپنی عینک اتاری اور اپنی جیب سے رومال نکال کر اپنی نم آنکھوں کو صاف کرنے لگا۔ جمال احمد حیرت سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔

''میں انہیں اپنا کڈنی ڈونیٹ کرنے کو تیار ہوں۔''

''آپ؟'' جمال صاحب نوجوان کی بات سن کر بے یقینی سے بولے۔

''جی ہاں، میں ابھی ایم ایس صاحب سے مل کر آرہا ہوں اینڈ آئی ایم شیور میرا کڈنی ان سے میچ کرجائے گا۔'' نوجوان نے قطعیت سے کہا۔

''لیکن آپ......'' جمال صاحب نے مزید کچھ پوچھنا چاہا مگر وہ ان کی بات سنے بغیر آئی سی یو سے باہر چلا گیا۔ جمال صاحب کسی سوچ میں پڑ گئے۔

ڈاکٹر نے نوجوان کے سارے ٹیسٹ کیے اور جمال صاحب کو خوش خبری سنائی کہ کڈنی ٹشوز میچ کرگئے ہیں۔

''آپ......آپ......کو میں وہی پرائس دوں گا جو آپ چاہیں گے۔'' جمال صاحب اپنے ہینڈ بیگ سے چیک بک نکالنے لگے۔

''ابھی اس کی ضرورت نہیں جب پیشنٹ ٹھیک ہوجائیں گی تب میں آپ سے پرائس بھی لے لوں گا۔'' نوجوان نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تو جمال صاحب حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اتنا کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔

''وہ کون تھا اور کتنا عجیب تھا ورنہ اس سے قبل آنے والا ہر شخص پہلے پرائس کی بات کرتا بعد میں کڈنی کی۔'' جمال صاحب بہت زیادہ حیران ہورہے تھے۔ ایک اجنبی شخص جسے نہ وہ جانتے تھے اور نہ ہی انہوں نے کڈنی دینے کے لیے کہا تھا کیسے فوراً آگے بڑھ کر اس نے اپنا کڈنی آفر کیا تھا اور پھر پیسے بھی نہیں لیے تھے۔

☆☆☆

آزر بہت زیادہ مضطرب تھا۔ اس کے اندر ایک ایسی آگ لگی تھی جو اسے بری طرح اندر ہی اندر جھلسا رہی تھی۔ بس اس کا دل چاہ رہا تھا وہ صرف ایک بار ایک نظر یمنیٰ کو دیکھ لے۔ اسے اپنے اندر کی کیفیت بتادے چاہے وہ اس پر یقین کرے یا نہ کرے۔ مضطرب ہوکر ایک دفعہ پھر وہ اس کے گاؤں جانے والی بس پر سوار تھا۔

سارے راستے وہ یہی سوچتا رہا کہ وہ اس سے جاکر کیا کہے گا۔ کس طرح بات شروع کرے گا کیا بتائے گا، کیا اس کے پاس وہ الفاظ ہیں جو اس کے اندر کی انتہائی مضطرب حالت کو بیان کرسکیں گے۔ وہ آہیں بھر کر یہی سوچتا رہا۔

نہایت بوجھل قدم اٹھاتا جب وہ حویلی پہنچا اور یمنیٰ کے بارے میں پوچھا تو اس کا دل گویا دھڑکنا ہی بھول گیا۔ چوکیدار کے بتانے پر وہ مضطرب دل لیے واپسی کے لیے مڑ گیا۔

''یا اللہ میں نے کبھی تجھ سے کچھ نہیں مانگا، نہ تجھ پر کبھی بھروسا کیا اور نہ ہی مجھے یہ معلوم تھا کہ ایمان کیا ہوتا ہے مگر یمنیٰ سے ملاقات کے بعد میرے اندر تجھ پر یقین بھی پیدا ہونے لگا اور ایمان بھی کہ وہ مجھ جیسے گناہ گار کو صرف تیری محبت کی خاطر معاف کرسکتی ہے۔ یقیناً تیری محبت بہت خاص ہوگی جس کی وجہ سے یمنیٰ نے مجھے معاف کردیا۔ میرا گناہ تو بہت بڑا تھا کوئی بھی نہ معاف کرتا۔ مجھ جیسا ظالم، گناہ گار رحمنہ کا قاتل اور یمنیٰ کا مجرم جس نے اس کا دل بھی توڑا تھا، اس کی محبت کا مذاق بھی اڑایا اس کے وجود پر طنز بھی کیا۔ اتنے بڑے خطاوار کو اس نے صرف تیری محبت کی خاطر معاف کردیا۔ میں تجھے

تیری محبت کا واسطہ دیتا ہوں کہ اس کی ہر بیماری، ہر تکلیف دور کردے۔ اسے ہر اذیت سے نجات دے۔'' وہ درخت تلے بیٹھ کر ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے روتے گڑگڑاتے ہوئے دعائیں کرنے لگا۔

☆☆☆

حاتم گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا ویران سڑک پر جارہا تھا۔ اس کا ذہن بہت بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اس نے اچانک جو فیصلہ کیا تھا وہ درست بھی تھا یا نہیں۔

''میں اور شمیلہ......؟ میں نے کبھی ان کے بارے میں .... اس انداز سے نہیں سوچا تھا۔ قدرت مجھے کس موڑ پر لے آئی ہے۔'' اس نے گاڑی روک کر پریشانی سے سوچا۔

''میں نے جو بھی فیصلہ کیا ہے وہ صرف خالہ جان کی تکلیف کو دیکھ کر کیا ہے۔ ان کا رونا، گڑگڑانا بہت دردناک تھا۔'' حاتم نے آہ بھر کر سوچا اور اسی لمحے شمیلہ کا فون اس کے موبائل پر آنے لگا۔

''حاتم......تم نے یہ کیا فیصلہ کیا ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ میں تم سے بڑی ہوں......''

''بھنور میں پھنسے انسان کو صرف بچانے کی کوشش کی جاتی ہے اس سے اور کچھ نہیں پوچھا جاتا۔'' حاتم نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''کیا تم مجھ پر ترس کھا کر مجھے بچانے کی کوشش کررہے ہو؟'' وہ غصے سے بولی۔

''میں صرف اپنے فہام بھائی کی محبت اور آپ کی عزت کو بچانے کی کوشش کررہا ہوں۔''

''یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں تم سے محبت نہیں کرتی؟'' وہ خفگی سے بولی۔

''مجھے آپ کی محبت پانے کی بھی کوئی خواہش نہیں۔'' اس نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

''کیا تم نہیں جانتے کہ خالہ جان میرے ساتھ اب کیا سلوک کرنے لگی ہیں۔ وہ کبھی مجھے قبول نہیں کریں گی۔'' شمیلہ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''وہ آپ کو قبول کریں گی اور بہو بنانے بھی بہت جلد آئیں گی۔ یہ میرا مسئلہ ہے آپ کا نہیں۔ آپ فکر نہیں کریں۔'' حاتم نے کہہ کر فون بند کردیا۔

☆☆☆

یمنیٰ کا کامیاب آپریشن ہوچکا تھا۔ قدرت نے ہر مرحلے کو اس کے لیے بہت آسان بنادیا تھا۔ وہ ہوش میں آچکی تھی اور اب آہستہ، آہستہ ایمن اور اماں جی سے باتیں کررہی تھی۔ جمال صاحب بے حد خوش تھے اور اس نوجوان کا بہت زیادہ خیال رکھ رہے تھے جو فرشتہ بن کر ان کی مدد کو آیا تھا۔ انہیں اب یمنیٰ سے زیادہ اس کی فکر تھی۔ وہ بھی آپریشن کے بعد قدرے بہتر تھا۔ جمال صاحب نے ایک اٹینڈنٹ اس کی دیکھ بھال کے لیے مقرر کردیا تھا اور گاہے بگاہے اس کی خیریت پوچھنے آتے تو باتوں باتوں میں اس کے بارے میں پوچھتے مگر وہ ہر بار بات گول کرجاتا۔ وہ بتانے سے زیادہ یمنیٰ کے بارے میں پوچھتا اور جمال صاحب سے اس کی خیریت کا سن کر زیرِلب مسکرا دیتا۔

اسے اسپتال سے ڈسچارج کیا جارہا تھا اور جانے سے پہلے وہ یمنیٰ سے ملنا چاہتا تھا۔ جمال صاحب اسے یمنیٰ کے روم میں لے کر آئے۔ نوجوان کی شیو قدرے بڑھی ہوئی تھی اور چہرہ بھی قدرے مرجھایا ہوا اور زرد ہورہا تھا۔ آنکھوں پر نظر کی عینک تھی۔ یمنیٰ کے پاس ایمن کرسی پر بیٹھی تسبیح پڑھنے میں مصروف تھیں اور اس کے اردگرد ہر طرف بہت خوب صورت پھولوں کے گلدستے رکھے تھے جو عیادت کرنے والے اس کے لیے لارہے تھے۔ وہ جمال صاحب کے ہمراہ روم میں داخل ہوا۔

''یمنیٰ ان سے ملو میرے اور تمہارے محسن۔ انہوں نے تمہیں اپنا کڈنی ڈونیٹ کیا ہے۔'' جمال

صاحب نے مسکرا کر نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے بتایا تو یمنیٰ نے انتہائی حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور یوں جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ وہ اپنے ذہن پر زور ڈالنے لگی، نوجوان بھی مسکراتا ہوا اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''یہ تو فرشتہ بن کر تمہاری مدد کو آئے ہیں۔ اللہ نے تمہیں دوبارہ زندگی انہی کی بدولت دی ہے۔'' جمال صاحب اسے بتاتے رہے اور وہ بغور اسے دیکھتی رہی اور پھر ایک دم بڑبڑانے لگی۔

''م......م...... محسن رضا۔'' اس نے ایک دم بڑبڑا کر کہا تو وہ نوجوان مسکرانے لگا۔ جمال صاحب حیرت سے دونوں کی طرف دیکھنے لگے۔

''کیا آپ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟'' جمال صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

''اگر آج میں زندہ ہوں، سانس لے رہا ہوں تو ان کی وجہ سے ہے۔'' محسن رضا نے مسکرا کر بتایا تو ایمن اور جمال دونوں حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

''کیا مطلب......؟ مگر یمنیٰ نے تو کبھی آپ کا کوئی ذکر کیا اور نہ ہی میں نے کبھی آپ کے بارے میں سنا اور آپ اتنی بڑی بات بتا رہے ہیں!'' جمال صاحب شدید حیرت زدہ تھے۔

''کبھی کبھی انسان بنا سوچے سمجھے کوئی نیکی کر دیتا ہے اور خود ہی اسے بھول جاتا ہے مگر خدا کبھی نہیں بھولتا۔ وہ تو انسان کے چھوٹے سے چھوٹے عمل کو بھی اپنے پاس محفوظ رکھتا ہے اور پھر اس عمل کو کبھی جزا اور کبھی سزا کی صورت میں انسان کی طرف لوٹاتا ہے۔ یمنیٰ کی اس نیکی کو بھی آج اس نے انعام کی صورت میں لوٹایا ہے۔'' پھر محسن رضا انہیں اپنے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا کہ کیسے یمنیٰ نے کراچی میں اس کی جان بچائی تھی۔ آج ایمن کو بھی سب کچھ یاد آ رہا تھا۔

''میں دراصل ورلڈ بینک میں جاب کرتا ہوں۔ آج قدرت نے مجھے اتنا نوازا ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ میں لاہور میں ڈاکٹر شہریار سے ملنے آیا تھا۔ یو کے میں ہم دونوں نے پڑھائی کے دوران اچھا ٹائم گزارا اور وطن آنے سے پہلے میں سوچتا تھا کاش مجھے یمنیٰ کہیں مل جائیں ایک بار اور میں ان کا شکریہ ادا کروں۔'' محسن رضا نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اور خدا نے آپ کی دعا سن لی۔'' جمال صاحب نے مسکرا کر کہا۔

''دعا تو میں ہر پل ہر لمحہ ان کے لیے کرتا رہا ہوں۔ جو لوگ دوسروں کو زندگی دیتے ہیں وہ سانسوں کی طرح انسان کے اندر سما جاتے ہیں اور ویسے بھی ان کی ایک یاد مجھے انہیں کبھی فراموش کرنے نہیں دیتی تھی۔'' محسن رضا نے اپنی جیب سے موبائل نکال کر انہیں دکھایا جو یمنیٰ نے اسے دیا تھا۔ یمنیٰ بھی حیرت سے اس موبائل کی طرف دیکھنے لگی۔

''یمنیٰ آپ کو اپنا یہ موبائل یاد ہے ناں؟'' محسن رضا نے مسکرا کر موبائل اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ یمنیٰ نے حیرت سے اسے ہاتھ میں لیا اور مسکرانے لگی۔

''ابھی تک یہ آپ کے پاس ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ابھی تک...... کیا مطلب ہے یہ تو میری زندگی کی آخری سانسوں تک میرے ساتھ رہے گا۔'' محسن رضا نے مسکرا کر کہا تو اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ جمال صاحب اور ایمن نے چونک کر بیٹی کی طرف دیکھا جو بہت عرصے بعد مسکرا رہی تھی اور مسکراتے ہوئے اس کے چہرے اور آنکھوں سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ خوشی کی حسین چمک دیکھ کر وہ دونوں بھی مسکرانے لگے۔

(باقی آئندہ)



خیانت

مصباح نوشین

''بس ایک رات کی بات ہے کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔ دوسرے ہی روز زندگی تمہارے ہم قدم ہوگی کل رات گیارہ بجے کے بعد...... تم اچھی طرح سے سوچ لو، میں تمہیں لینے آؤں گا۔'' اس نے آئی سی یو کی گلاس وال کے پار زندگی اور موت کی جنگ لڑتے اس شخص کو دیکھا جو اس کی محاورتاً نہیں حقیقتاً زندگی تھا۔ زندگی اسے اس مقام تک لے آئے گی اس نے کبھی سوچا نہ تھا۔ محبت کی اتنی بڑی اور کڑی سزا...... اس نے اپنی روح کو گھائل

ہوتے محسوس کیا۔

''ایک رات کی بات......!'' اس نے اس ظالم اور سفاک انسان کے کہے جملے کو دُہرایا پھر لمحہ بہ لمحہ زندگی سے دور جاتے اپنے محبوب کو نظر بھر کر دیکھا۔

''کیا میں اس کے بغیر رہ پاؤں گی؟'' اس نے خود سے سوال کیا...... جواب بڑی پُرزور تردید کے ساتھ ملا تھا۔ دھڑکنیں بے ہنگم انداز میں شور بپا کیے دے رہی تھیں۔ سانسیں بے ترتیب ہو کر بکھر گئی تھیں۔ ٹانگوں میں لرزش واضح تھی گویا خون کی ایک، ایک بوند جسم سے نچوڑ لی گئی ہو۔

''آپ کو خدا کا واسطہ صدیق بھائی، کچھ تو رحم کریں آخر اعظم آپ کے بھائی ہیں۔'' وہ روتے ہوئے اُن کے قدموں میں گری گڑگڑا رہی تھی۔ انہوں نے اپنے پاؤں پر دھرے اس کے ہاتھوں کو ایک جھٹکے سے پرے ہٹایا۔

''بھائی تھا......اب نہیں رہا۔ تمہیں اپنانے کے بعد اس نے خود ہی تعلق توڑ لیا تھا ہم سے۔'' ان کا لہجہ بے حد سفاک تھا۔ کسی بھی قسم کی لچک کے بغیر بے حد سنگدل اور کٹھور لہجہ......رگِ جاں کو چیرتا، آس و امید کو توڑتا لہجہ۔ زمر پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

''وہ زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے ہیں صدیق بھائی۔ ان کا آپریشن بے حد ضروری ہے اگر ان کا آپریشن نہ کیا گیا تو......تو وہ مر جائیں گے۔'' وہ اس ظالم انسان کی بے حسی دیکھتے ضبط کی شدت سے چلا اٹھی تھی مگر وہاں ہنوز بے حسی، بے اعتنائی براجمان تھی۔

''میرا گھر اجڑ جائے گا، میں اجڑ جاؤں گی۔ آپ کو اللہ کا واسطہ ہے میری مدد کریں۔ آپریشن کے لیے اتنی بڑی رقم کا میں انتظام کیسے کروں؟'' وہ اب بھی ان کے قدموں میں بیٹھی تھی گریہ زاری کرتے اس کے لرزتے لب اور سر سے ڈھلکتا آنچل اس کا رازِ حسن عیاں کر گیا تھا۔ صدیق احمد نے ایک نظر روتی گڑگڑاتی ہوئی اپنی بھاوج کو دیکھا جس سے شادی کرنے کی ضد میں ان کے بھائی نے ''اپنوں'' کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تھا اور آج اس کی بیوی انہی کے در پر انہی کے قدموں میں گڑگڑاتے ہوئے سوال کر رہی تھی وہ کتنا لڑے تھے بھائی سے۔

☆☆☆

''کس قماش کی بیاہ کر لا رہے ہو اعظم، جس کے باپ کا کچھ پتا نہ باقی ددھیال کا؟'' انہوں نے بڑے بھائی ہونے کے ناتے انہیں خوب سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر اعظم احمد پر تو عشق کا بھوت سوار تھا۔

''زمر بہت اچھی اور خاندانی لڑکی ہے بھائی صاحب۔'' انہوں نے اختصار سے کام لیتے ہوئے بہت سی باتیں انہیں جتا دیں۔

''کس خاندان کی؟'' صدیق احمد نے طنزیہ ہنکارا بھرا تھا۔ اعظم احمد لمحے بھر کو خاموش سے ہو گئے۔

''میں زمر سے بے پناہ محبت کرتا ہوں بھائی صاحب اور محبت' خاندان، ذات، برادری کی قید سے آزاد ایک ماورائی جذبہ ہے، مجھے اس کے حسب نسب سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔'' اعظم کا لہجہ بے حد ٹھہرا ہوا اور فیصلہ کُن تھا۔

''مگر ہمیں ہے...... ہمیں فرق پڑتا ہے اعظم احمد! ہمارے لیے اس لڑکی کا خاندان جاننا ضروری ہے۔ اس کے باپ سے ملنا ضروری ہے کیونکہ ہمیں دنیا والوں کو منہ دکھانا ہے کیونکہ ہم دنیادار لوگ ہیں۔'' آخری الفاظ انہوں نے بے حد چبا چبا کر ادا کیے تھے۔ اعظم احمد بے حد ٹھنڈے پڑ گئے۔

''میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ اس کا باپ لاپتا ہے اور اس کی ماں نے ہی اس کی پرورش کی ہے۔''

''کہاں گیا ہے اس کا باپ اور باقی خاندان......ددھیال، ننھیال کیا وہ بھی لاپتا ہو گئے؟'' وہ تڑخے۔

''ان لوگوں کا اپنے ددھیال ننھیال سے ملنا جلنا نہیں ہے۔'' اب کی بار اعظم احمد کا سر جھک گیا تھا۔

''واہ میاں یہ بھی خوب کہی، ایک بات ہماری بھی سن لو۔ ہم ہرگز کسی ایسی لڑکی کو نہیں بیاہ کر لائیں گے جس کا باپ لاپتا ہو اور خاندان والے میل جول رکھنا پسند نہ کریں۔ ہمیں ایسے مشتبہ خاندان سے رشتے داری منظور نہیں کیونکہ عشق کی پٹی تمہاری آنکھوں پر بندھی ہے زمانے والوں کے نہیں۔'' ان کے سفاچٹ انکار کے باوجود بھی اعظم احمد نے ہار نہیں مانی تھی۔ صدیق احمد کی تعلق توڑنے کی دھمکی بھی کارگر ثابت نہیں ہوئی تھی انہوں نے کہا اور اعظم احمد نے کر دکھایا تھا۔ زمر سے شادی کے بعد وہ علیحدہ گھر میں رہنے لگے تھے مگر اچانک ہونے والا شدید ایکسیڈنٹ انہیں موت کے دہانے پر کھڑا کر گیا تھا۔ ان کے جسم کا کافی خون بہہ چکا تھا۔ سر پر بے حد شدید چوٹ آئی تھی اور انہیں فوری آپریشن کی ضرورت تھی۔ زمر کے پاس اور تو کوئی چارہ نہیں تھا جمع جتھا جو تھا وہ تو اسپتال لانے اور ایمرجنسی میں ہی خرچ ہو گیا تھا۔ ایسے میں ڈیڑھ لاکھ کا فوری انتظام وہ کہاں سے کرتی۔ اسی لیے ایک آخری امید پر وہ اپنے بڑے جیٹھ کے پاس آئی تھی۔

''ایک شرط پر میں تمہیں اپنے شوہر کے علاج کے لیے روپے دے سکتا ہوں۔'' اچانک انہوں نے اس کے بے داغ حسن کو گہری نظروں سے جانچتے ہوئے کہا۔ زمر نے بے ساختہ اپنا دوپٹا شانوں پر درست کیا۔

''مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے بھائی صاحب۔'' وہ فوری آمادہ ہو گئی۔ صدیق احمد نے اسے گہری نگاہ سے دیکھا اور کچھ سوچتے ہوئے ڈیڑھ لاکھ کا چیک کاٹ کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ زمر کو اس کاغذ کے ٹکڑے میں زندگی سانس لیتی محسوس ہوئی۔ اس نے لپک کر چیک اٹھانا چاہا پر صدیق احمد نے اچک لیا۔

''پہلے شرط تو سن لو۔'' انہوں نے اسے اتنی بے تابی دکھانے پر ٹوک دیا۔ زمر لمحے بھر کو کسی عجیب سے احساس کے زیرِاثر خاموش سی کھڑی رہ گئی۔ نظر اٹھا کر صدیق احمد کو دیکھا تو تھرا کر رہ گئی ان کی بولتی نگاہوں میں کئی پیغام روشن نظر آ رہے تھے۔

''اس ڈیڑھ لاکھ کے عوض تمہیں اپنا کچھ قیمتی وقت میرے ساتھ بِتانا ہو گا کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔ صرف چند گھنٹوں کی تو بات ہے۔ یوں سمجھو بات تمہارے اور میرے درمیان رہے گی۔ اعظم آپریشن کے بعد گھر آ جائے گا، زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں رہے گی۔ تم اچھی طرح سوچ لو......آخری فیصلہ تمہارا ہی ہو گا۔ اعظم کی زندگی یا پھر......؟'' صدیق احمد نے مکروہ قہقہہ لگاتے زمر کے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا تھا۔

''صدیق بھائی رحم کریں، میں آپ کی بھاوج ہوں۔'' وہ ایک مرتبہ پھر گڑگڑائی تھی۔ اپنے شوہر سے بے وفائی کی وہ مرتکب ہو سکتی تھی نہ ہی اسے مرتے ہوئے دیکھ سکتی تھی عجیب دوراہا تھا۔ پل صراط پہ کھڑے اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

''جب بھائی سے کوئی تعلق داری ہی نہیں تو پھر تم سے کیسا رشتہ...... دیکھو لڑکی آج کے زمانے میں کچھ پانے کے لیے کچھ نہ کچھ قربانی تو دینی ہی پڑتی ہے ناں...... اعظم نے بھی تو تمہیں پانے کے لیے

صدقہ

جب انسان اپنے ہاتھ سے صدقہ دیتا ہے تو اس وقت صدقہ پانچ باتیں کہتا ہے۔

☆ میں فانی تھا تم نے مجھے بقا دے دی۔

☆ میں تمہارا دشمن تھا لیکن تم نے مجھے اپنا دوست بنا لیا۔

☆ آج سے پہلے تم میری حفاظت کرتے تھے لیکن آج سے میں تمہاری حفاظت کروں گا۔

☆ میں حقیر تھا اور تم نے مجھے عظیم بنا دیا۔

☆ پہلے میں تمہارے ہاتھ میں تھا اور اب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوں۔

مرسلہ: ممتاز خانم، کراچی

اپنے خاندان کو چھوڑ دیا تھا تو کیا تم اس کی زندگی بچانے کے لیے یہ ذرا سی قربانی نہیں دے سکتیں؟'' انہوں نے فرار کے جیسے سارے راستے مسدود کردیے تھے وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی......اور پچھلے کئی گھنٹوں سے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی تھی۔

''آپ نے آپریشن کے لیے فیس جمع کروادی؟'' ڈاکٹر صاحب راؤنڈ پر آئے تو انہوں نے باہر آئی سی یو کے دروازے کے پاس دوزانو بیٹھی زمر سے پوچھا۔ اس کی سانس رک گئی آہستہ سے نفی میں سر ہلا دیا۔

''دیکھیں جلدی کیجیے، مریض کے لیے ایک، ایک لمحہ بے حد قیمتی ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ زمر گویا جلتے کوئلوں پر چلنے لگی بے بسی سے ڈبڈبائی نگاہوں سے سفید پٹیوں میں جکڑے اپنے عزیز از جان شوہر کو دیکھا آنِ واحد میں فیصلہ ہوا تھا۔

''مجھے معاف کردینا اعظم مجھے اس خیانت کی معافی دے دینا پر میں تمہیں یوں مرتا ہوا بھی نہیں دیکھ سکتی۔'' اس نے بے خبر سوئے وجود سے سرگوشی کی۔

☆☆☆

ساری رات اس نے جلتے بلتے گزاری تھی۔ سردی میں ساری رات مسجد کے صحن میں اکڑوں بیٹھنے سے اس کی کمر تختہ ہوچکی تھی۔ ساری رات اس نے مسجد کے صحن میں روتے اور فریاد کرتے گزاری تھی۔ صبح کی پو پھٹنے پر اس نے جیسے خود کو ہر انہونی کے لیے تیار کرلیا تھا۔ اس نے اپنی ساری ہمت مجتمع کرکے اعظم کی طرف جانے کی کوشش کی تھی پر اس کے قدم چلنے سے انکاری تھے۔ وہ کس منہ سے اس کے سامنے جائے گی اور کس طرح اس کی شکوہ کناں نظروں کا سامنا کرپائے گی؟

اس نے جیسے خود کو ہر طرح کے حالات کے لیے تیار کرلیا تھا۔ اس نے ٹھنڈی آہ بھر کر آسمان کی جانب نگاہ دوڑائی تھی۔ وہ جب کاریڈور میں آئی تو وہاں غیر معمولی رش تھا زمر کو اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ اس نے بے ساختہ دیوار کا سہارا لیا تھا۔ خوف، سراسیمگی اس کے وجود کے ہر عضو سے عیاں تھی۔

''اعظم......'' اس کے منہ سے جیسے کراہٹ کی صورت نکلا۔ ''میں تم سے اپنی محبت نہیں نبھا پائی اعظم... میں تمہارے لیے کچھ بھی نہیں کرپائی۔'' اس نے وہیں دیوار سے ٹیک لگائے اعظم سے معافی مانگی۔ کاریڈور سے رش اب چھٹنے لگا تھا۔ لگتا تھا کوئی ایمرجنسی آئی تھی۔

''ارے آپ اِدھر کھڑی ہیں، اندر چلیں آپ کے مریض کو ہوش آگیا ہے۔ رات ان کا آپریشن کامیاب ہوگیا تھا۔'' اس نے آنکھ اٹھا کر دیکھا ایک نرس اس کے قریب کھڑی کہہ رہی تھی۔ اس نے غائب دماغی سے نرس کو دیکھا اسے لگا اسے کوئی غلط فہمی ہوئی تھی۔

''تم......کس کی بات کررہی ہو؟'' اس کے منہ سے سرسراتے ہوئے نکلا۔

''آپ مسز اعظم ہیں ناں؟'' اس کا سر بے ساختہ اثبات میں ہل گیا۔ نرس نرمی سے مسکرائی تھی۔

''میں آپ کے شوہر ہی کی بات کررہی ہوں۔ ان کا آپریشن کامیاب رہا اب وہ ہوش میں ہیں اور آپ کو بلا رہے ہیں آپ رات بھر کہاں تھیں؟'' نرس کے آخری سوال پر وہ گڑبڑا گئی۔ کیا ساری دنیا کو خبر ہوگئی کہ زمر اعظم کس آزمائش سے دوچار کی گئی تھی اور وہ اس پر پوری بھی اتری یا نہیں۔

وہ مرے مرے قدم اٹھاتی دماغ میں کلبلاتے سوالوں کو نظر انداز کیے اندر کمرے میں آئی تھی۔ سامنے ہی اس کی زندگی سانس لیتی نظر آرہی تھی۔ اعظم اسے دیکھ کر نرمی سے مسکرائے۔ وہ روتے ہوئے تڑپ کر اعظم کے سینے سے لگنا چاہ رہی تھی کہ تیسری آواز نے اسے ٹوک دیا۔

''ارے آؤ آؤ زمر......ابھی تمہارا ہی ذکر ہورہا تھا۔'' اس نے لمحے بھر کو دیکھا اور گنگ رہ گئی۔

سامنے ہی ہنستے مسکراتے صدیق احمد بیٹھے تھے اور اس سے بے حد شفقت سے مخاطب تھے۔ اس کی سانس حلق میں اٹک گئی وہ یہاں پر کیوں موجود تھے؟

''مبارک ہو، اعظم کو اللہ نے نئی زندگی دی ہے شاید تم جیسی نیک اور عزت دار بیوی کی دعا ہی اس کی زندگی بچا گئی ہے۔'' وہ بہت نرمی اور محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے گویا ہوئے تھے۔ زمر نے بے ساختہ چونک کر انہیں دیکھا تھا جن کے چہرے پر بے حد حلاوت اور شفقت بکھری تھی۔

''خوش رہو، اعظم تمہارا انتخاب لاجواب تھا۔'' انہوں نے آگے بڑھ کر اعظم کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ زمر الجھ کر رہ گئی تھی ان کا بدلا رویہ اس کے لیے حیرت کا باعث تھا۔

''میں مانتا ہوں میں غلط تھا۔ ایک شریف عورت کے لیے اس کی نسوانیت کے خزانے کی حفاظت اہم ترین شے ہوتی ہے اور یہی چیز اسے عزت دار بناتی ہے۔ صرف اعلیٰ خاندان اور حسب نسب معنی نہیں رکھتے۔ مجھے تمہاری پسند پر فخر ہے۔'' انہوں نے محبت پاش نگاہوں سے اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ جس کے چہرے پر آج بڑی آسودہ مسکراہٹ پھیلی تھی مگر زمر سے اُن کا بدلا بدلا پہیلیاں بجھواتا لہجہ ہضم نہیں ہو پارہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ان کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل آئی۔ وہ اسے دیکھ کر نرمی سے مسکرا دیے۔ انہیں زمر کے چہرے پر پھیلی الجھن واضح نظر آرہی تھی۔

''اعظم میرا سگا بھائی ہے پھر تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں ایسا گھناؤنا فعل انجام دے سکتا ہوں؟'' انہوں نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو زمر کا سر جھک گیا۔

''عزت پر جان دینے والے کبھی کسی کی عزت سے نہیں کھیلا کرتے، یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔'' انہوں نے مزید کہا۔ ''مجھے اعظم سے کئی گلے تھے جو کل رات تمہارے نہ آنے کی وجہ سے ختم ہوگئے۔'' وہ سانس روکے انہیں حیرت سے تک رہی تھی۔

''کل کی رات میرے اوپر بہت بھاری گزری زمر۔ کہیں تم اعظم کی محبت میں میرے پاس اس شرط کی پاسداری کے لیے نہ آجاؤ، یہ خوف ساری رات مجھے ٹوپس کی طرح جکڑے ہوئے تھا۔ میں ہر گزرتے پل بڑی شدومد سے تمہارے نہ آنے کی دعائیں مانگتا رہا۔ میں نے تمہیں بہت کڑی آزمائش میں مبتلا کیا تھا اور مجھے یہ ڈر تھا کہ تم اعظم کی زندگی کی خاطر اپنی عزت سے بھی کھیل نہ جاؤ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ محبت اپنی جگہ مگر عورت کی عزت سب سے پہلے ہے اور اسے کسی بھی قیمت پر اپنی عزت کو کھلونا نہیں سمجھنا چاہیے۔ بھلے تمہارا وہ فعل ایک محبوب شوہر کی زندگی کے لیے ہوتا مگر تمہیں میری نظر سے ہمیشہ کے لیے گرا دیتا کیونکہ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر تم آگئیں تو پھر کسی بھی قیمت پر تمہیں اعظم کی زندگی میں نہیں رہنے دوں گا اور مجھے فخر ہے کہ تم نے اپنی عزت کو مقدم سمجھا۔ کل رات میں نے تمہیں اسپتال کی مسجد میں اعظم کے لیے روتے، گڑگڑاتے دیکھا اور لمحہ لمحہ اپنے بھائی کی پسند پر فخر کیا۔ تمہیں اس قدر ذہنی اذیت سے دوچار کیا اس کے لیے معذرت خواہ ہوں مگر میں مجبور تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بھی ان مشکل حالات میں تمہاری مجبوری سے فائدہ اٹھاتا اور مجھے یقین ہے کہ دنیا اِدھر کی اُدھر ہوجائے کوئی بھی مرد تمہیں مجبور نہیں کرسکتا۔ عورت کو اتنا ہی مضبوط ہونا چاہیے۔'' اتنا کہہ کر وہ اس کا سر تھپتھپا کر چلے گئے۔

زمر کے قدم بے ساختہ اللہ کے گھر کی جانب گامزن ہوگئے۔ اللہ نے اس کی محبت کی لاج رکھی تھی، اس کی عزت کی حفاظت کی تھی، وہ اپنے شوہر سے خیانت کی مرتکب نہیں ہوئی تھی وہ سرخرو ٹھہری تھی۔ صد شکر وہ کسی کمزور لمحے کی زد میں آنے سے بچ گئی تھی سو سجدۂ شکر تو اس پر واجب ہوگیا تھا۔

شامِ شہرِ یاراں

عنیزہ سیّد

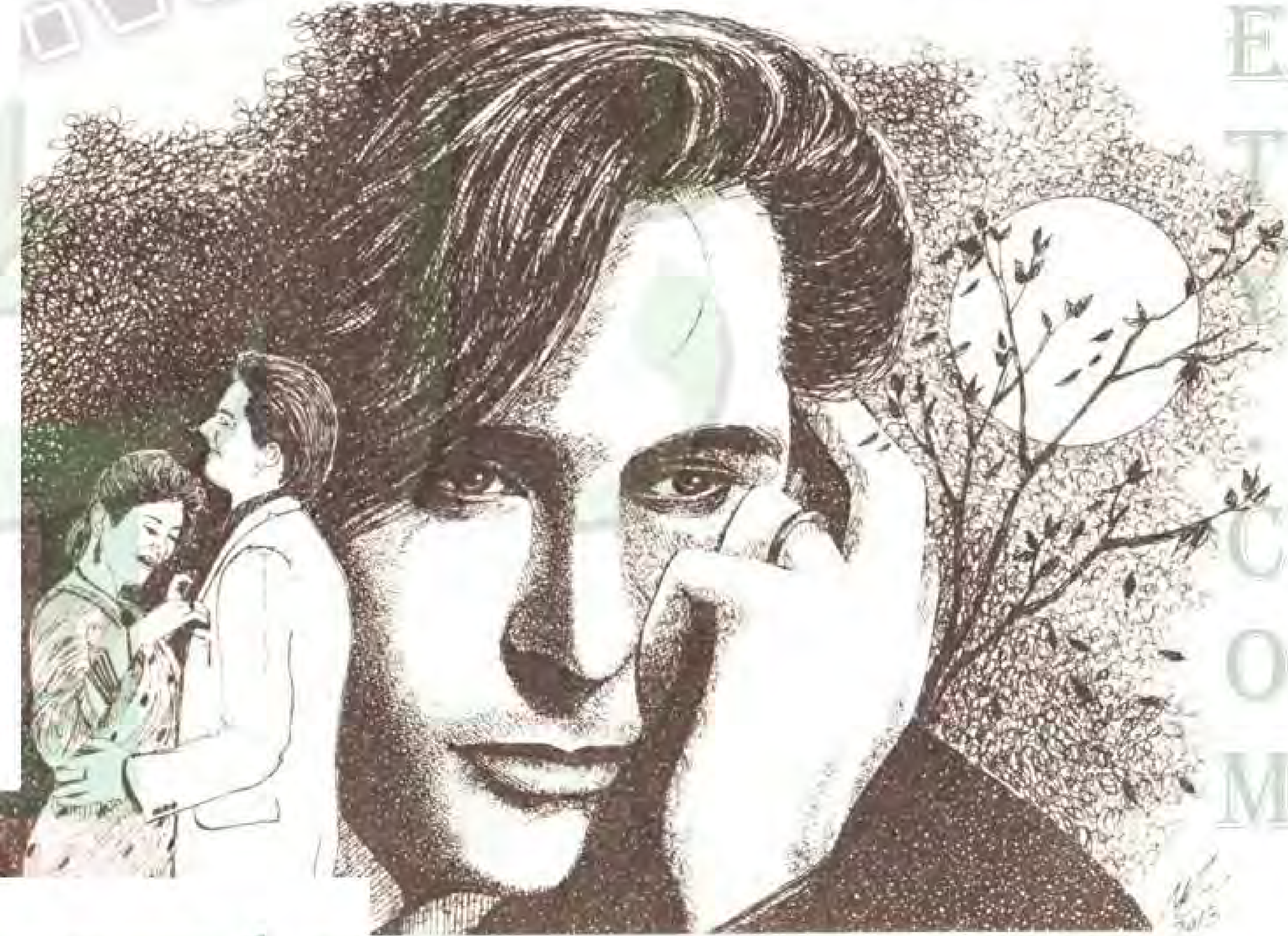
قسط 7



زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے . . . خیر و شر، نیکی اور بدی . . . زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت . . . ہر برائی پر حاوی ہوجاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

محمود درانی اور مہرین کی تیسری اولاد حمزہ، مہرین کی زچگی میں پیچیدگی کے باعث نانی کے پاس ان کے آبائی گھر سیالکوٹ میں پروان چڑھتا ہے۔ جہاں نگین اس کے ماموں کی بیٹی سے اس کی خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ بڑے ہونے پر حمزہ کے والدین اسے واپس لانا چاہتے ہیں مگر وہ راضی نہیں ہوتا۔ علینہ کے والدین نادیہ اور سعید کیانی نے کورٹ میرج کی تھی مگر شادی کے تین سال بعد سعید کیانی بیوی کو داغ مفارقت دے گئے۔ علینہ، فہد کو ٹی وی شو میں ایک شیف کے طور پر دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے فہد جس کے ساتھ اس نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ آکسفورڈ کا پروردہ سردار مہر زاد خان اپنے باپ کے سیاسی قتل کے بعد حادثاتی طور پر سیاست میں شامل ہوا تھا اور زرنگار کے حسن وذہانت کا شکار ہو چلا تھا...... بینش دو بھائیوں کی اکلوتی بہن، اپنی ضد اور صرف بھائیوں کے تعاون سے نیشنل کالج آف آرٹس میں تعلیم حاصل کر رہی تھی جہاں اس کا سینئر ساتھی دانیال اس سے ہر ممکن تعاون کرتا تھا۔ ایک پاکستانی مسلمان مرد اور بدھ مذہب کی پیروکار چینی عورت کی بیٹی زوئی حسین چین سے آکر پاکستان میں فارمیسی کی تعلیم حاصل کرتی ہے یہ سب اس نے دادی کی محبت میں کیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کا دل پاکستان کی سرزمین اور یہاں کے لوگوں سے شدید محبت کرنے لگا تو اس نے ریسرچ ڈیپارٹمنٹ جوائن کرلیا تاکہ اپنے قیام کو بڑھا سکے۔ حمزہ جو اب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے ایک سیمینار کے سلسلے میں ایبٹ آباد جاتا ہے اور وہاں بی اماں کی سہیلی رابعہ کلثوم کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے جو بچپن میں باقاعدگی سے سیالکوٹ آتی تھیں اور حمزہ بھی بی اماں کے ساتھ ایبٹ آباد آیا کرتا تھا مگر 2005ء کے زلزلے کے بعد وہاں سب کچھ بدلا ہوا تھا۔ حمزہ اپنی کزن اور بچپن کی دوست نگین سے بی اماں کی سہیلی اور پوتی (میرال) کے متعلق اپنی تشویش بتاتا ہے کہ رابعہ کلثوم کی وفات اور زلزلے کے بعد پوتی نہ جانے کہاں چلی گئی۔ رابعہ کلثوم بواجی کے نام سے آرٹ اینڈ کرافٹ سینٹر چلاتی تھیں۔ زرنگار، امراؤ بیگم جو اپنی والدہ زبیدہ خانم کا کوٹھا آباد کیے ہوئے تھیں کی آمدنی کا ذریعہ بن جاتی ہے مگر صرف سردار مہر زاد خان نے اس کی کئی راتوں کے حقوق بھاری معاوضے کے عوض اپنے نام کرلیے تھے۔ دانیال آرٹ کا عشق رکھنے کے ساتھ فلائنگ میں بھی مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے اور ایک دن طیارے کے دھوئیں سے نقش ونگار بنانے کی کوشش میں حادثے کا شکار ہو کر اسپتال میں پٹیوں میں جکڑا (عافیہ) ماں کی ممتا کا شدید امتحان بن جاتا ہے۔ بیٹے کی زندگی کی دعائیں مانگتے مانگتے عافیہ اللہ تعالیٰ کے مقربانِ خاص بندوں میں سے ایک کی درگاہ میں جا پہنچتی ہے۔ زوئی حسین کے ویزے کی مدت ختم ہونے سے دو روز قبل وہ اپنے ایک ساتھی نادر سے نکاح کرلیتی ہے تاکہ پاکستان میں رہنے کا جواز پاسکے۔ 2005ء کے زلزلے میں زوئی حسین نے بھی متاثرین کی مدد کی تھی جو اسے خاصی مہنگی پڑی اور اب نادر بدگمانی کی آخری اسٹیج پر تھا۔

اب آگے پڑھیں

"مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اب جاکر تمہاری وہ جھینپ اور جھجک آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے جو شروع میں تمہاری شخصیت کا حصہ معلوم ہوتی تھی۔" دانیال نے گیئر بدلتے ہوئے اپنے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی بینش سے کہا۔

دانیال کی یہ بات ہی بینش کو بوکھلا دینے کے لیے کافی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ فوری طور پر وہ اندازہ نہیں لگا پائی تھی کہ اسے کس بات پر شرم آئی تھی۔ پہلے والی جھینپ اور جھجک پر یا اب والی اس کیفیت پر جسے دیکھ کر دانیال نے وہ بات کہی تھی۔

"ویسے یہ امتزاج اچھا لگتا ہے۔" وہ سگنل پر رکتا ہوا بولا۔ "ایسٹرن ٹریڈیشنل جھجک اور حد میں رہنے کا احساس اور سوسائٹی کا حصہ بننے والے نت نئے ٹرینڈز کے ساتھ چلنے کی کوشش بھی۔ لڑکیوں کو بولڈ نہیں لیکن کانفیڈنٹ ضرور ہونا چاہیے۔"

"بولڈ اور کانفیڈنٹ ہونے میں کیا فرق ہے؟" بینش نے فطری جھجک کو خود پر طاری ہونے سے روکتے ہوئے پوچھا۔

"بہت فرق ہے۔" وہ مسکرایا۔ "جو بولڈ ہوتے ہیں وہ ہر بات کہہ دیتے ہیں اور جو کانفیڈنٹ ہوتے ہیں وہ ہر وہ بات کہہ ڈالتے ہیں جو کہنے والی ہوتی ہے لیکن فضول گوئی سے پرہیز کرتے ہیں۔" بینش نے اس کی بات سمجھنے میں چند منٹ لگائے۔

"لیکن کانفیڈنٹ اور بولڈ ہونے کے علاوہ لوگوں کی ایک تیسری قسم بھی ہوتی ہے۔" اسے خاموش دیکھ کر دانیال نے کہا۔

"وہ کون سی قسم ہے؟"

"آؤٹ اسپوکن لوگ جنہیں ہماری زبان میں منہ پھٹ کہتے ہیں۔ جو لوگ منہ پھٹ ہوتے ہیں وہ اس بات میں فخر محسوس کرتے ہیں کہ ہم بڑے چھوٹے کا لحاظ کیے بغیر اپنی بات اگلے کے منہ پر مارتے ہیں۔"

"ایسے لوگ اچھے ہوتے یا برے؟" بینش نے اس کی طرف دیکھا۔

"پتا نہیں۔" اس نے سر ہلایا۔ "لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ ایسے لوگ دل کے صاف ہوتے ہیں۔ دل کی بات دل میں نہیں رکھتے۔ اپنا غصہ، رنجش، شکوہ، گلہ بس کہہ ڈالتے ہیں لیکن میری رائے ایسے لوگوں کے بارے میں تھوڑی مختلف ہے، میں آؤٹ اسپوکن ہونے کی آڑ میں کسی کو ہرٹ کرنے کے سخت خلاف ہوں۔ مجھے دوسروں کے جذبات، پسند، ناپسند اور احساسات کا خیال رکھنا اچھا لگتا ہے۔"

بینش نے تحسین آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اور دوسروں کا خیال رکھنے.......... کی عادت نے مجھ میں ایک اچھی عادت ڈیولپ کی، اپنا غصہ رنجش، شکوہ، گلہ پی جانے کی عادت۔" وہ مسکرایا۔ "گو یہ بہت مشکل ہے مگر جب یہ عادت ڈیولپ ہوجائے تو انسان خود آسانی پا جاتا ہے۔"

"بالکل صحیح ہے۔" بینش نے سر ہلایا۔ "میرے نانا جی پسرور میں رہتے ہیں، انہیں بھی غصہ نہیں آتا کبھی اور وہ اب ستر برس کی عمر سے بھی چند سال اوپر مگر صحت منداور خوش باش رہتے ہیں۔"

"ہاہا......" دانیال بے اختیار ہنسا۔ "یار جو لوگ بٹ ہوتے ہیں وہ ویسے بھی صحت مند ہی ہوتے ہیں حالانکہ سنا ہے خاصے لڑاکا ہوتے ہیں۔"

بینش اس کی بات سن کر بری طرح جھینپ گئی۔

"کم آن......" وہ اسے یوں جھینپتے ہوئے دیکھ کر بولا۔ "میں ایک جنرل بات کر رہا ہوں، تمہیں تھوڑی کہہ رہا ہوں۔" وہ مسکرایا۔ "اچھا ایسا ہے کہ اوپر مال سے دھرم پورہ کی طرف مڑیں تو تمہارا گھر نزدیک پڑے گا، رائٹ؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"نہیں آزادی چوک کی طرف سے زیادہ نزدیک ہے، آپ غلط سائڈ اور لمبے راستے کی طرف آگئے۔" بینش نے شیشے سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ دانیال کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر کہیں جانے کا احساس ایسا تھا جس نے اسے گردو پیش کی خبر بھلادی تھی۔

"میں جانتا ہوں۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "لیکن کیا ہے کہ میرا گھر مال پر ہے اور مجھے گھر سے ایک ضروری فائل پک کرنی ہے، میں اسی لیے اس طرف سے آیا ہوں اگر تم برا نہ مانو تو میں وہ فائل وہاں سے لے لوں، تم کچھ دیر میری ممی سے مل لینا۔"

بینش نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"لیکن میں......" اس نے کچھ کہنا چاہا اس کی زبان ہکلا گئی۔

"تم مجھ پر اعتماد کرسکتی ہو لڑکی، میری نیت میں کوئی فتور نہیں......" وہ ایک موڑ کاٹتے ہوئے نرمی سے بولا۔ "جو انسان موت کی سرحدوں کو چھو کر واپس زندگی کی طرف لوٹا ہو اسے موت اور زندگی دونوں کے

درمیانی فاصلے کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے اور اسے یہ بھی یاد رہتا ہے کہ موت کو سامنے پا کر زندگی میں کیے ہوئے کیسے کیسے گناہ یاد آنے لگتے ہیں، بھولے بسرے گناہ...... لہٰذا ایسا شخص دوبارہ زندگی ملنے پر دانستہ کچھ غلط کرنے لگے تو اس پر لعنت ہی بھیجنی چاہیے۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں۔'' بینش منمنائی۔

''میں ابھی سمجھاتا ہوں۔'' اس نے گاڑی ایک بڑے سے گیٹ کے سامنے کھڑی کرتے ہوئے کہا اور ہارن بجانے لگا، کچھ لمحوں بعد وہ آہنی گیٹ کھلا اور گاڑی ایک ایسے گھر کے ڈرائیووے کی طرف بڑھنے لگی جس کا اندرونی منظر لینڈ اسکیپ کا تاثر دے رہا تھا۔

''آؤ۔'' وہ گاڑی سے باہر نکل کر اس کی طرف آکر دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ''اور اُف......'' اس کی نظر بینش کے چہرے پر پڑی۔ ''پلیز اپنی اس گھبراہٹ اور سفید پڑتے چہرے پر قابو پالو، میری ممی کہیں یہ نہ سمجھنے لگیں کہ میں تمہیں اغوا کر لایا ہوں۔''

بینش کو وہ لمحے اپنی زندگی کے مشکل ترین لمحے لگ رہے تھے۔ ایک طرف وہ خود کو ملامت کر رہی تھی جو اتنی بے تکلفی سے دانیال کے ساتھ بیٹھ کر گھر جانے پر راضی ہوگئی۔ اس بے وقوفی کا کیا نتیجہ نکلنے والا تھا۔ اس کے گھر کے بجائے اپنے گھر آنے کی بات دانیال نے اتنی اچانک کی تھی کہ وہ ڈھنگ سے کچھ بول ہی نہیں سکی تھی اور اس کے بعد فوراً وہ اسے اپنے گھر لے بھی آیا تھا۔ دوسری طرف اس گھر کا رقبہ اور اس رقبے پر بنی وہ عمارت اسے مرعوب کیے دے رہی تھی۔ دانیال اپنی ممی کا ذکر کر رہا تھا اس خوب صورت، جدید طرزِ تعمیر پر بنے عالیشان گھر کی مالکہ کیا خاتون ہوں گی وہ اندازہ کر سکتی تھی۔ ماڈرن، انگریزی بولنے والی، اس کے حلیے اور انداز پر اسے بالکل بھی خاطر میں نہ لانے والی خاتون، صحیح معنوں میں اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

''آؤ بھئی، اتنی دیر میں تو بڑے بڑے نامور سپہ سالار لڑنے یا نہ لڑنے کا فیصلہ کر لیا کرتے تھے۔ جتنی دیر تم سوچنے میں لگا رہی ہو۔'' دانیال نے اسے اس قدر تذبذب میں پڑے دیکھ کر کہا۔

''بی کانفیڈنٹ بینش، تمہیں کسی ایک پر تو اعتماد ہونا چاہیے، مجھ پر یا پھر خود پر۔'' وہ نرمی سے بولا۔

بینش نے اپنا دوپٹا سر پر سلیقے سے جمایا اور گاڑی سے باہر آگئی۔ گھر کے رہائشی حصے کی طرف جاتے ہوئے دانیال کی ممی کا ممکنہ حلیہ اور انداز اسے کنفیوز کر رہا تھا اور دوسری طرف اندر جانے پر کیا ہوگا، کبھی کی پڑھی کہانیاں بھی اسے دہلا رہی تھیں، قدم قدم پر اس کا دل مڑ کر واپس بھاگ جانے کو چاہ رہا تھا لیکن آگے جانے کی ہمت اور واپسی کے لیے بھاگ جانے کا ارادہ دونوں ہی باری باری کمزور پڑ رہے تھے۔

''السلام علیکم ممی، شکر ہے آپ گھر پر ہیں، میں ڈر رہا تھا کہیں جانا نہ ہو آپ کو آج۔'' بے دھیانی میں چلتے ہوئے اس کے کان میں دانیال کی آواز پڑی۔ اس نے چونک کر سامنے دیکھا۔ دانیال ایک وسیع کمرے کے وسط میں کھڑا تھا۔ کمرے کا انٹیریئر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ بینش کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ایسی سادگی اور سادگی میں ایسا سلیقہ جس کا گھر کی بیرونی عمارت دیکھ کر تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

''ممی یہ بینش ہے۔'' دانیال نے بینش کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور بینش یہ میری ممی ہیں۔'' اس نے بینش کو مخاطب کیا۔ ''بینش بہت گھبرا رہی تھی ہمارے گھر آتے ہوئے، اسے لگا شاید میں اسے دھوکے اور زبردستی سے اِدھر لے آیا ہوں اور میرے ارادے میں کوئی خرابی ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے اپنی ممی کو بتا رہا تھا۔ ''میں بینش کو اس کے گھر چھوڑنے جا رہا تھا۔ مجھے یاد آیا عاصم بھائی کی وہ فائل جو ٹریڈ اینڈ انڈسٹری ڈیپارٹمنٹ میں انکل سلیم

سے پروسیس کرانی ہے وہ میں صبح ساتھ لے جانا بھول گیا تھا، میں نے سوچا گھر سے وہ فائل پکڑ لوں اس لیے اِدھر چلا آیا اور بس بینش کا سارا اعتماد ڈول گیا...... مجھ پر سے بھی اور خود پر سے بھی۔'' ماں سے بات کرتے ہوئے وہ اس کی طرف مڑا۔ ''لڑکی یہاں تمہارے اعتماد کا ٹیسٹ بھی ہوگیا اور تم بھئی بری طرح فیل بھی ہوگئیں۔'' اب کے وہ بینش سے مخاطب ہوا۔

''وجوہات اور نتیجے ہی سناتے رہوگے یا اسے بیٹھنے کو بھی کہوگے۔'' صوفے پر بیٹھی خاتون اٹھ کر بینش کی طرف آتے ہوئے بولیں۔

''اوہ ہاں......'' دانیال کو جیسے ان کے یاد دلانے پر یاد آیا۔ ''آپ بٹھائیں اسے، دو چار باتیں کریں، میں اوپر سے فائل لے کر ابھی آیا۔'' وہ اسی کمرے کے کونے میں بنی اوپر جاتی سیڑھیاں تیزی سے چڑھتا اوپر چلا گیا۔

''آؤ بیٹی، میرے پاس بیٹھو۔'' اس کے جانے کے بعد دانیال کی ممی بینش سے مخاطب ہوئیں۔ بینش کی توقع کے بالکل برعکس دانیال کی ممی سادہ سے کاٹن کے سوٹ میں ملبوس تھیں، ان کا دبلا پتلا سراپا اور ان کی سفید رنگت پر ہلکے رنگ کا یہ سوٹ جچ رہا تھا۔ انہوں نے سوٹ سے ہم رنگ سوتی دوپٹا سر پر اوڑھ رکھا تھا، دوپٹے سے نیچے ان کے قدرتی بھورے بالوں میں کہیں کہیں سفیدی اپنی جھلک دکھا رہی تھی، بینش کو اتنے بڑے گھر کی وہ مالکن اپنے ہی ماحول میں رہتی سیدھی سادی خواتین جیسی لگیں۔

''دانیال کا مزاج ایسا ہے کہ وہ شاید ہی کسی ساتھ پڑھنے والی لڑکی کو اپنے ساتھ گھر لے آئے۔'' انہوں نے بینش سے اس کا مکمل تعارف حاصل کرنے کے بعد کہا تھا۔ ''یقیناً اس کے لیے تم میں کوئی ایسا ریزن ہوگا جو تمہیں یہاں تک لے آنے میں اسے کوئی مسئلہ نہیں لگا، تم ریلیکس ہو کر بیٹھو، ایسے ہی جیسے تم اپنے گھر میں بیٹھتی ہو۔'' بینش نے کمرے کی دیواروں پر کہیں کہیں سجی قرآنی آیات پر نظر ڈالی جن میں سے کچھ فریمز میں جڑی تھیں اور کچھ اونی نمدوں پر خوب صورت رنگوں میں ابھری ہوئی تھیں۔ ان آیات اور حروفِ مقطعات کے علاوہ کسی بھی قسم کی سجاوٹ ان دیواروں پر موجود نہیں تھی۔ کمرے کا فرنیچر سادہ اگرچہ بیش قیمت تھا۔ فرش پر نصب ٹائلز درمیان میں سادہ مگر شطرنجی نمونے کا حاشیہ بنا رہی تھیں۔ فرش پر کہیں کہیں رکھے رگز اور صوفوں کے درمیان رکھی میزوں کے پائے، دیوار کے ساتھ رکھے چیسٹس (chests) اور کنسولز یقیناً بیش قیمت تھے مگر انہیں دیکھتے ہوئے نہ جانے کیوں بینش پر امارت کی دہشت طاری نہیں ہو رہی تھی اور یقیناً اس کی سب سے بڑی وجہ دانیال کی ممی کا وہ رویہ تھا جس کا مظاہرہ وہ بینش سے باتیں کرتے ہوئے کر رہی تھیں۔

''اس گھر میں ہم تین لوگ رہتے ہیں۔'' وہ بتا رہی تھیں۔ ''میں، دانیال کے ڈیڈی اور دانیال، میرا بڑا بیٹا عاصم اور اس کے بیوی بچے امریکا میں رہتے ہیں، ایک سال پہلے عاصم ایم ایس کرنے میری لینڈ چلا گیا۔ اسے یونیورسٹی آف میری لینڈ سے اسکالرشپ پر ماسٹرز کرنے کی آفر آئی تھی۔ اس کے اور اس کے بچوں کے چلے جانے کے بعد میں خاصی تنہائی محسوس کرتی ہوں۔ اس کی بیوی شاندانہ یہاں تھی تو گھر میں تقریبات اور مہمانوں کی آمد و رفت کا خوب ہنگامہ رہتا تھا۔ اب میں ہوں اور میری دنیا بہت محدود ہے، تعلقات کم ہیں اور کہیں آنا جانا اس سے بھی کم، دانیال کے ڈیڈی اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں اور دانیال اپنی دلچسپیوں میں اگرچہ ہم ماں بیٹے کے درمیان بڑی مضبوط ذہنی ہم آہنگی موجود ہے۔ ہم دونوں روز رات کو دن بھر کی مصروفیت کی جزئیات تک ایک دوسرے کو سناتے ہیں مگر پھر بھی یہ اس کا وقت ہے جس میں وہ اکیلا اور مصروف ہے، ہر

وقت میرے پاس تو نہیں بیٹھا رہ سکتا ناں۔''

''تو پھر آپ کی کیا مصروفیات ہوتی ہیں سارا دن؟'' بینش نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے اپنے لیے ایک لائبریری سیٹ کر رکھی ہے، اس میں کتابیں بھی ہیں اور سی ڈیز بھی، انٹرنیٹ کے ذریعے تحقیق کی سہولت بھی، میں وہاں مصروف رہتی ہوں دن بھر اور میرا وقت بہت اچھا گزر جاتا ہے۔''

''اوہ اچھا۔'' بینش کو اُن کا جواب سن کر حیرت ہوئی۔ اسے قطعی توقع نہیں تھی کہ وہ ایسی کسی مصروفیت میں مصروف رہتی ہوں گی۔

''ہم......'' انہوں نے بینش کے لیے منگوائی چائے اور اس کے ساتھ کے لوازمات اسے پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم مطلب میں اور دانیال آج کل ایک کتاب ترتیب دینے کی کوشش میں مصروف ہیں۔''

''اچھا......'' بینش نے کیک کا ایک ٹکڑا اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیسی کتاب......؟''

''ہم کوشش کر رہے ہیں کہ دنیا بھر میں جہاں بھی کسی ایسے شخص سے رابطہ ممکن ہو، ضرور رابطہ کریں جو کسی حادثے یا کسی بھی وجہ سے موت کے منہ سے بچ کر نکلا ہو اور اس کے اس معجزے کے بارے میں تاثرات قلمبند کریں۔ آج کل ہم اسی کوشش میں مصروف ہیں۔''

''اچھا۔'' بینش کو تجسس محسوس ہوا۔ ''ایسی کتاب کیوں ترتیب دینا چاہتی ہیں آپ؟''

''اس لیے کہ دیکھیں جو ہم نے محسوس کیا، کیا وہ ہی سب اُن لوگوں نے بھی محسوس کیا جو اس سرحد سے لوٹ آتے ہوں۔'' بینش کو اُن کی بات بہت عجیب لگی۔ وہ ان سے انہی کی بات کی وضاحت کرانا چاہتی تھی مگر اسی وقت دانیال کی آمد ہوئی۔

''سوری بینش مجھے فائل ڈھونڈنے میں تھوڑا وقت لگ گیا پھر کچھ تفصیلات لینے کے لیے بھائی کو کال بھی کرنا پڑی، مجھے امید ہے تمہیں مجھ پر غصہ نہیں آیا ہوگا۔'' اس نے نیچے آتے ہی بلند آواز میں کہا۔

''نہیں۔'' بینش نے اس کی تسلی کے لیے سر ہلایا اور اس کی ممی کی طرف دیکھا، وہ ان سے ان کی بات کی تفصیل لینا چاہ رہی تھی لیکن دانیال آ کر ان کے قریب بیٹھ گیا اور اس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''اچھا......اب بتاؤ بھلا صبح سے تم مجھے کیا دکھانا چاہ رہی تھیں؟''

''وہ......'' بینش کو اچانک مقامی اخبار کا وہ صفحہ یاد آ گیا اور وہ ایک بار پھر جھجک گئی۔ دانیال کی ممی جیسی خاتون کے سامنے ایک فضول سی خبر والا وہ صفحہ وہ کیسے دِکھا پائے گی۔

''بتاؤ بھی یار، صبح سے تجسس میں ہوں میں۔'' دانیال نے اپنی بات پر اصرار کیا۔

''وہ دراصل......'' وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

''وہ...'' اس نے کن انکھیوں سے دانیال کی ممی کو دیکھا۔ ''پھر کبھی دکھاؤں گی۔''

''اوہ کم آن یار۔'' دانیال نے اس کی جھجک کو بھانپتے ہوئے کہا۔ ''جو بھی ہے دکھا دو، میری ممی بہت فرینڈلی ہیں۔ وہ بھی ہمارے ساتھ انجوائے کریں گی......'' اس نے اپنی ممی کے گلے میں پیچھے سے بازو ڈالتے ہوئے کہا۔

''ہاں، بیٹا...... میں بھی انجوائے کرلوں گی، دکھاؤ تو کیا چیز ہے۔'' اس کی ممی نے مسکرا کر کہا۔

''وہ آپ نے ایک روز ایک سیاست داں کی بات کی تھی کہ اس کا افیئر......'' بینش کو دانیال کی ممی کے سامنے یہ

بات دُہراتے ہوئے بھی شرم آ رہی تھی۔

''اوہ ہاں......'' شکر ہوا کہ دانیال کو فوری طور پر اپنی بات یاد آ گئی۔

''تو کیا اس کی محبوبہ کہیں دیکھ لی تم نے؟''

''جی، ایک اخبار میں تصویر شائع ہوئی ہے اس کی، میں نے سوچا آپ کو دکھاؤں آپ ایکسائٹڈ ہو رہے تھے اس کا ذکر کرتے ہوئے۔'' بینش کو یہ بات کہنے میں بھی مشکل پیش آ رہی تھی۔

''ہاں دکھاؤ، دکھاؤ پلیز......'' دانیال کے لیے اگر یہ بات کھودا پہاڑ نکلا چوہا والی بھی ثابت ہوئی تھی تو شاید اس نے بینش کے خیال سے تجسس کا اظہار کیا تھا۔

''وہ......'' بینش نے اپنے بیگ سے اخبار کا صفحہ نکالا اور دانیال کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ دانیال نے اس صفحے کی تہیں کھول کر اسے سیدھا کیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے چہرے پر ایسی ہی مسکراہٹ تھی جیسے کسی بچے کے اپنا کارنامہ سنانے کے دوران کسی بڑے کے چہرے پر ہوتی ہے۔

''اچھا تو کون سی ہیں، وہ محترمہ......؟'' دانیال نے اپنی ٹھوڑی پر انگلیاں پھیرتے ہوئے اس صفحے پر نظریں دوڑائیں، اخبار کا وہ صفحہ تھیٹر اور سینما کی ہیروئنز اور ایکٹرز کی تصویروں سے بھرا پڑا تھا۔

''یہ والی۔'' بینش نے ذرا سا آگے کھسک کر ایک تصویر پر انگلی رکھی۔

''اوہ......'' دانیال نے صفحہ اٹھایا اور پڑھنے لگا، پڑھ لینے کے بعد اس نے وہ صفحہ اپنی ممی کو پکڑا دیا اور اس خبر پر انگلی رکھ کر انہیں اس کے بارے میں بتانے لگا۔

''اوہ میرے خدا......!'' لڑکی کی اس تصویر پر نظر پڑتے ہی دانیال کی ممی کے منہ سے بلند الفاظ میں آواز نکلی۔ دانیال اور بینش نے بیک وقت چونک کر اُن کی طرف دیکھا۔ ان کے ہاتھ جن میں اخبار کا صفحہ پکڑا تھا واضح طور پر لرزتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

☆☆☆

پاکستان میں موسم ابر آلود تھا اور فضا میں کچھ دیر پہلے برس کر رکنے والی بارش کا اثر تھا۔ ہوا خوشگوار اور عمارتیں اور راستے بھیگے ہوئے تھے۔

''اس فضا میں اور اس ماحول میں کتنی مانوسیت ہے، یہ ہی بارش جب اُس شہر یا اس ملک کے کسی بھی شہر میں برستی ہے تو اُس مشینی زندگی کے عادی لوگ اسے بھی زندگی کا معمول سمجھ کر اس کے برسنے کے دوران بھی اپنے کاموں میں مگن رہتے ہیں۔'' اس نے ائرپورٹ کی عمارت سے باہر نکل کر ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے سوچا ''جبکہ یہاں...'' ائرپورٹ سے باہر جاتی سڑک کے گرداگرد بنی چھوٹی بڑی دکانوں، فلنگ اسٹیشنز اور فٹ پاتھوں کے ساتھ بنے لوکل ٹرانسپورٹ کے مسافروں کے شیڈز کے نیچے کھڑے لوگوں کے چہروں پر بارش دیکھنے کے بعد چھا جانے والی تازگی اور خوشگواری دیکھ کر اسے رشک آنے لگا۔ ذیلی سڑکوں کے ساتھ بنے راستوں میں استعمال ہونے والے ناقص میٹریل کے باعث ایک دو بارشوں کے بعد ہی چھوٹے بڑے گڑھے بن چکے تھے، ان گڑھوں میں بارش کے جمع ہو جانے والے پانی میں بچے چھلانگیں لگا رہے تھے اور ایک دوسرے پر چھینٹے اڑا رہے تھے، ناقص سیوریج سسٹم کے باعث نکاس نہ ہونے کے سبب اکثر راستوں پر پانی کھڑا ہو چکا تھا اور ہر گزرنے والی گاڑی کے پہیے پیدل چلنے والوں پر پانی کے چھینٹے اڑاتے تھے۔ پیدل چلنے والے خود کو اُن چھینٹوں سے بچاتے، رک کر گزرنے والی گاڑیوں کے ڈرائیوروں کو دو چار گالیاں سناتے اور پھر اپنی چھتریاں

بغل میں دبائے اپنے راستوں پر چلتے آگے بڑھ جاتے۔

''کبھی کبھی کسی قانون قاعدے کا پابند نہ ہونا اور ہر چھوٹی بڑی غلطی پر پکڑے نہ جانے کا احساس بھی کتنا جاندار لگتا ہے۔'' اس نے سوچا اور اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں دوبارہ سے گزرتے راستوں پر گاڑ دیں۔ ''زندگی میں حظ اٹھانے کو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی کچھ تو موجود ہوتا ہے۔''

اس وقت اس کا ذہن بالکل خالی تھا اور وہ نظر کی حد میں آنے والی ہر چیز کے بارے میں بلاوجہ سوچے چلی جا رہی تھی۔ اسے کہاں جانا اور کہاں رہنا تھا وہ اس کا بھی فیصلہ نہیں کر پائی تھی۔ نادر اسے ائرپورٹ پر لینے کے لیے موجود نہیں تھا۔ ائرپورٹ سے اسے فون کرنے کے جواب میں اس کا نمبر بھی بند ملا تھا۔ وہیں ائرپورٹ پر ہی کہیں بیٹھ کر اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کو طے کرنے کے بجائے وہ اسی خالی ذہن کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گئی تھی۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو کیا بتایا تھا کہ اسے کہاں جانا تھا۔ اس وقت اسے یہ بھی یاد نہیں آ رہا تھا وہ گزرتے راستوں پر نظریں جمائے اس ملک کے شہریوں کے مانوس چہروں اور ان کی مانوس حرکتوں کو دیکھ اور دل میں ان پر تبصرہ ہی کیے چلی جا رہی تھی۔

اجنبی چہرے اور خدوخال والی زوئی حسین، اس مانوس ملک کے مانوس ماحول میں اپنی ہر ممکن کوشش کر لینے کے باوجود بھی تنہا تھی۔ نادر کی بے نیازی نے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں پانی بھر دیا تھا جو دوبارہ سے برسنے کو تیار بادلوں کے ساتھ ہی بہنے کو تیار معلوم ہوتا تھا۔

☆☆☆

''بعض اوقات ذہن میں زندگی اور اس کی نیرنگیوں کے بارے میں ایسے سوالات آ جاتے ہیں جن کا جواب کہیں سے نہیں مل پاتا۔ ان سوالات کے جواب صرف اور صرف زندگی خود ہی دے سکتی ہے۔ زندگی جوں جوں آگے بڑھتی جاتی ہے ایسے سوالوں کے جواب پیچھے چھوڑتی جاتی ہے اور کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ کچھ سوالوں کے جواب اس وقت جا کر ملتے ہیں جب نہ صرف امتحانی پرچہ دیا جا چکا ہوتا ہے بلکہ اس کا نتیجہ بھی سامنے آ چکا ہوتا ہے...... جیسے کہ میری زندگی کے یہ دن، ہفتے اور سال۔'' حمزہ نے بیڈ پر سیدھے لیٹے لیٹے چھت کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

''ذہن میں اَن گنت سوال ہیں، وقت بہت سے سوال پوچھتا ہے مگر مجال ہے کسی سوال کی کوئی کی (Key) ہاتھ لگ جائے۔'' اس کا سر بھاری ہو رہا تھا اور آنکھوں میں ایسی جلن تھی جیسے کئی راتوں سے نہ سونے کے باعث ہونے لگتی ہے۔ ''شاید نگین ٹھیک کہتی ہے، میں دانستہ ان سوالوں سے نظریں چراتا ہوں جو میرے دل و دماغ میں اٹھتے ہیں۔'' اس نے کروٹ بدلی۔

''میں کیا اور کیوں کر رہا ہوں، تلاشِ لاحاصل اور اگر یہ تلاش حاصل بھی ہو گئی تو کیا میں جانتا ہوں کہ اس سے آگے کیا ہوگا۔ میں ماضی پرستی کی جس کیفیت میں ہر وقت مبتلا رہتا ہوں کیا اس نے مجھے بالکل تنہا نہیں کر دیا، ماں، باپ، بہن بھائیوں کے ہوتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرا کوئی نہیں ہے، میں نے خود کو اُن سے اور اُن کو خود سے محروم کر رکھا ہے۔'' وہ مسلسل سوچے جا رہا تھا۔

''کیا مجھے خود کو بدل ڈالنے کی سعی نہیں کرنی چاہیے، بجائے کسی سراب کے پیچھے دوڑنے کے جو موجود ہے اسے اپنی گرفت میں لینے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے؟'' اب کے اس نے خود کلامی کی۔

''ہاں، شاید مجھے سب کچھ بدل ڈالنا چاہیے مگر اس احساس کا کیا کروں جو بڑی اماں کی یاد دل میں ہر دم

جگائے رکھتا ہے اور اس سے دھیان کہیں اور بٹانے کی کوشش پر اُن کی سوال کرتی نظریں آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہیں، اُن کی نظریں سوال کرتی ہیں، میں نے تمہیں ان خطوط پر تو نہیں اٹھایا جن میں تم نے خود کو ڈھال لیا ہے...... سچ ہے شاید میں کبھی یہ فیصلہ نہ کر پاؤں کہ مجھے ماماز بوائے بننا ہے یا گڈ اولڈ گرینیز سن......؟ خدا کبھی کسی کو ان دو انتہاؤں میں نہ پھنسائے، انسان نہ خود میں رہتا ہے نہ خود سے باہر نکل پاتا ہے۔'' اس کی آنکھوں پر پپوٹے بھاری ہونے لگے اور انہوں نے کھلی آنکھوں کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا، اس نے اس انکار کے جواب میں آنکھیں بند کر لیں۔

''دیکھو بیٹا...... تمہاری لگن اور تلاش نے میری روح کو سکون کی کیفیت میں ڈال دیا تھا۔ شاید کبھی تمہاری تلاش اسے پا لے اور میری روح وقتی کیفیت سے دائمی کیفیت میں چلی جائے، میری درخواست ہے تلاش جاری رکھنا، اس کا سلسلہ نہ روکنا، یہ ایک زندگی اور زندگی کی حرمت کا سوال ہے۔'' آنکھیں بند ہونے پر بھی کا دیکھا اور مانوس چہرہ اس کے سامنے آیا۔ اس نے کبھی اس چہرے کا تصور نہیں کیا تھا مگر وہ اس چہرے کو پہچانتا تھا اور ان لفظوں کے ایک، ایک حرف کو سمجھ سکتا تھا۔

''گویا طے ہوا کہ زندگی کو اسی رنگ پر چلنا ہے اور دل و دماغ میں اٹھتے سوالوں کے جواب آگے بڑھتی ہوئی زندگی نے ہی دینے ہیں۔'' اس نے سوچنے کا سلسلہ موقوف کرتے ہوئے ایک بار پھر کروٹ بدلی۔

''میں تلاش سے نہیں ہاروں گا آپ بے فکر ہو جائیں۔'' اس نے اس چہرے کو مخاطب کیا اور اپنے دماغ کو بھی نیند کی کیفیت میں اترنے دیا۔

☆☆☆

قومی اسمبلی کے ایک حلقے اور اس حلقے کے دیہی اور شہری حصوں کے ووٹرز کی کل تعداد، ووٹنگ میں حصہ لینے والوں کی متوقع تعداد اور ووٹوں کا تناسب یشل کے لیے ڈیٹا اکٹھا کرنا ایک کارِ دارد ثابت ہو رہا تھا۔ الیکشن کے متوقع نتائج کے حساب کتاب میں صبح سے شام تک اسٹاک مارکیٹ کے بھاؤ کی طرح کئی بار اتار چڑھاؤ آتا اور نئے سرے سے صورتِ حال کا جائزہ لینے کی ضرورت درپیش ہو جاتی...... یہ الیکشن اس کی زندگی کا سب سے انوکھا تجربہ ثابت ہو رہا تھا۔ وہ سردار مہر زاد خان کی میڈیا ٹیم کی سربراہ کے طور پر کام کر رہی تھی۔ مہر زاد، ان دنوں اپنے حلقے کے لوگوں سے جلسوں، کارنر میٹنگز اور انفرادی ملاقاتوں میں مصروف تھا۔ ان مصروفیات کے دوران اس کی گفتگو کا مکمل ڈرافٹ اسلام آباد سے تیار ہو کر جاتا تھا۔ مہر زاد خان کی گفتگو کی الف ب تک کو کلیئرنس دینا میڈیا ٹیم کا کام تھا۔ اسلام آباد میں بیٹھے اسٹیک ہولڈرز کے جنبشِ ابرو تک پر بھی نظر رکھنے کے لیے ان سب کو چوبیس گھنٹے حاضر دماغی کی حالت میں رہنا تھا۔ اسٹیک ہولڈرز مہر زاد خان کی شخصیت کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے۔ وہ اس سے جی حضوری کی کیا اور کتنی توقع رکھتے تھے، آئندہ آنے والے سالوں کے سیاسی منظرنامے پر وہ اسے کہاں جگہ دے سکتے تھے، اس کا انحصار بھی ان سمجھوتوں پر ہی تھا جو مہر زاد خان ایک سیاسی مہرے کے طور پر اپنی بقا کے لیے اُن سے کرنے والا تھا۔ یشل نے اب تک جتنا کام براہِ راست مہر زاد کی موجودگی میں کیا تھا۔ اس سے اسے مہر زاد کی شخصیت کے بہت سے ایسے پہلوؤں تک رسائی حاصل کرنے کا موقع ملا تھا جو اَب تک باقی لوگوں سے مخفی تھے۔ یشل کی ذہانت، قابلیت اور سب سے بڑھ کر شخصیت بینی کی جبلّت نے بہت جلد اسے یہ اندازہ کرا دیا تھا کہ مہر زاد اپنی چالیں اتنی خاموشی سے چلنے کا عادی تھا کہ اس کے ساتھ بساط پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو پتا بھی نہیں چلتا تھا اور چال چل چکی ہوتی تھی۔ میڈیا ٹیم کی مدد تو ایک طرف، وہ

اپنی گفتگو میں الفاظ کا استعمال اتنی احتیاط سے کرتا تھا کہ بعض اوقات وہ اس کی بات سن کر حیران رہ جاتی۔ اسے اردو اور انگریزی زبانوں میں الفاظ کے مترادف اور متضاد لفظوں پر مکمل گرفت حاصل تھی اور مہرزاد کی گفتگو سن کر ہی اسے اندازہ ہوا تھا کہ الفاظ کے ذخیرے پر عبور حاصل ہونا گفتگو میں کیسا سلیقہ پیدا کرسکتا ہے، کبھی کبھی اسے ایسا لگتا کہ اپنے باپ کی غیر متوقع موت کے بعد اچانک واپسی پر مجبور ہوتے ہی وہ اپنی آئندہ زندگی کا لائحہ عمل اتنی کامیابی سے تیار کرچکا تھا کہ اسے پیش آنے والا کوئی بھی واقعہ آؤٹ آف پلان نظر نہیں آتا تھا۔

''لیکن زرنگار سے ٹکراؤ......؟'' مہرزاد کی شخصیت پر غور کرتے کرتے اسے یاد آتا۔ ''یقیناً پہلے سے کیے گئے پلان کا حصہ نہیں تھا۔ جب ہی تو اس چال پر مہرزاد خان کا گھوڑا ذرا سا لڑکھڑایا تھا مگر کتنے کم وقت میں اس نے اسے سنبھال بھی لیا اور دُلکی چال چلاتا آگے بڑھا دیا۔'' سچ تھا کہ یشل رئیس، سردار مہرزاد خان کی شخصیت کے سحر میں گرفتار ہونے سے خود کو بچا نہیں پا رہی تھی۔ مہرزاد کی شکل میں اسے اس کے علاقے کے روایتی، پیچیدہ شخصیت سرداروں کے بجائے نئی روایتوں کا انوکھا علم بردار نظر آتا تھا۔ جو سر جھکانے کے بجائے کٹادینے کا قائل تھا، اس ملک کے گنجلک سیاسی میدان میں وہ کہاں تک اور کب تک اپنی بقا قائم رکھ سکتا تھا اس کا انحصار الیکشن جیتنے کے بعد اس کی آنے والی منصوبہ بندی پر تھا۔

''وہ کہتا تو ہے کہ اگر روایتوں کی عفریت سے لڑ نہ پایا تو میدان چھوڑ جائے گا لیکن شاید ابھی اسے اندازہ نہیں کہ میدان کے اندر لگنے والے تماشوں کے تماشا گروں کے ہاتھ آکٹوپس کے مانند ہوتے ہیں جو خود میں جس کو ایک بار جکڑ لیں وہ اُن سے نجات حاصل نہیں کر پاتا، دم گھٹنے سے مرجائے تو وہ الگ بات ہے۔'' ملک کے ایک سینئر اور معتبر سیاسی تجزیہ نگار نے ایک بار یشل سے کہا تھا۔

''کیا وہ اتنا بے خبر ہے کہ اسے خود جکڑے جانے کا علم نہیں ہو پائے گا؟'' یشل نے سوال کیا تھا۔

''میں اس کی ذہانت اور فطانت دونوں کا ہی قائل ہوں، وہ چوکنا اور ہوشیار بھی ہے لیکن تم جانو وہ کتنا بھی ذہین، فطین اور ہوشیار کیوں نہ ہو، وہ ایک ہے اور نظام ایک کل ہے، یہ نظام اس کے پردادا کے بھی پردادا کی عمر جتنا ہے اور وہ اس کے سامنے کل کا بچہ ہے، اس نظام کے پیچ وخم کو اگر وہ پڑھنے بھی بیٹھے تو ایک نہیں کئی عمریں درکار ہوں گی پھر بھی شاید پوری طرح سمجھ نہ پائے لہٰذا جس سوچ کو وہ ترویج دینا چاہ رہا ہے میں اس کے بارے میں زیادہ پُرامید نہیں ہوں۔'' سیاسی تجزیہ نگار نے اپنا سر ماہرانہ انداز میں ہلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''وہ جتنا دکھائی اور پکڑائی دیتا ہے اس کی ایک خاص حد ہے، اس حد سے آگے وہ اپنی شخصیت کے دروازے سب پر بند کرلیتا ہے اور ان بند دروازوں کے پیچھے کیا کھچڑی پکاتا ہے اس کے لوازمات سے کوئی واقف نہیں۔'' یشل نے ماہرانہ رائے کے جواب میں اپنی عاجزانہ رائے پیش کی تھی، اگرچہ سیاسی تجزیہ نگار صاحب نے اس کی عاجزانہ رائے سے بالکل ہی اتفاق نہیں کیا تھا۔

''وہ اپنے علاقے میں ہے اور وہاں گویا وہ محاذِ جنگ پر اپنی عسکری چالیں چل رہا ہے، ایسے میں اس کو رٹی ژاں سے تو اس کا نہ تو کوئی رابطہ ہوگا نہ تعلق، اس حسین ساحرہ کو بھی شاید اندازہ ہو گیا کہ سرداری نظام سے منسلک ایک ابھرتے ہوئے نوجوان سیاست داں کی داشتہ بننا کچھ اتنا آسان تجربہ نہیں۔'' مہرزاد خان کی مخالف لابی سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان مبصر نے دو دن پہلے انتہائی تمسخرانہ انداز میں اس کے بارے میں بات کی تھی۔

''یہ ہی تو......'' یشل نے دل میں سوچا۔ ''یہ ہی تو میں کہتی ہوں بند دروازوں کے پیچھے پلنے والی کھچڑی

کے لوازمات کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کیونکہ میری ذاتی معلومات کے مطابق گزشتہ رات دو بجے کے قریب مہرزاد، زرنگار سے ملنے کسی خفیہ مقام پر پہنچا تھا۔ یقیناً زرنگار اس کے لیے ایک ایسی کمٹ منٹ ہے جسے نبھانا اس کی ترجیحات کی لسٹ میں کم از کم پہلی دس ترجیحات میں تو شامل ہوگا ہی اور زرنگار...... اس کے لیے یہ تجربہ آسان نہیں آسان ترین ثابت ہوا ہوگا کیونکہ اس نے اس شخص کو اپنے سامنے چاروں شانے چت گرا رکھا ہے جو زندگی کے ہر میدان میں سر جھکانے کے بجائے کٹا دینے کے فلسفے پر یقین رکھتا ہے۔'' مہرزاد کے بارے میں اپنے نوٹس کی فائل کو محفوظ کرنے کے بعد اس پر کوڈ لگاتے ہوئے یشل نے سوچا اور پھر اٹھ کر اپنی وارڈ روب کھول کر اس لباس کا انتخاب کرنے لگی جو الیکشن سے ایک رات قبل اپنی پریس رپورٹ میں اسے پہننا تھا۔

☆☆☆

وہ معجزاتی رفتار کے ساتھ روبہ صحت ہو رہا تھا۔ عافیہ کو بعض اوقات اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا تھا...... کئی مہینے سے زندہ لاش کی طرح اسپتال کے بیڈ پر پڑا وجود پہلی بار ایک آنکھ کھولنے کے بعد ہر گزرتے دن کے ساتھ اپنے جسم کے اعضا کی جنبش بڑھا رہا تھا۔ اس کے پاؤں کا انگوٹھا متحرک ہوا، اس کے ہاتھوں کی انگلیاں کبھی کبھی ہلتی نظر آئیں اور یہ تو اکثر نظر آنے لگا کہ قدرے بلند آواز کانوں میں پڑنے پر وہ آنکھیں کھول کر کبھی چھت کی طرف اور کبھی گردن کو ہلکا سا موڑ کر دائیں جانب دیکھتا رہا۔ عافیہ گھنٹوں اس کے بیڈ کے قریب کرسی رکھے اس کی ایک ذرا سی جنبش دیکھنے کی منتظر مسلسل اس پر نظریں جمائے رکھتیں۔

''آپ تھک جاتی ہیں اور کمزور ہو رہی ہیں، آپ درمیان میں یہاں سے اٹھا کریں کبھی اِدھر اُدھر چکر لگا کر اپنی ٹانگیں سیدھی کرلیا کریں، کبھی صوفے پر ہی سہی کچھ دیر لیٹ کر کمر ٹکا لیا کریں۔'' دانیال کو دیکھنے کے لیے آنے والے ڈاکٹرز، عزیز، رشتے دار اُن کے اپنے شوہر اور بیٹے ان سے کہتے لیکن وہ اپنے معمول سے باز نہیں آئیں۔

''میں معجزے کو رونما ہوتے دیکھنا چاہتی ہوں، اس کے ایک ایک پل کا مشاہدہ کرنا چاہتی ہوں، میں اپنے اللہ پر اپنا ایمان مضبوط، مضبوط تر اور مضبوط ترین کرلینا چاہتی ہوں، دانیال کے پاس میرا یوں بیٹھنا اور اس کی ہر جنبش کا مشاہدہ کرنا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، میں اس کی پروگریس دیکھتی ہوں تو میرا اپنے اللہ پر ایمان پہلے سے زیادہ مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے۔'' وہ سب کو جواب میں ایک ہی بات کہتیں۔

''آپ کی آنکھیں تھک جاتی ہوں گی، مسز جہانگیر۔'' دانیال کے انسٹرکٹر قیوم کے لیے اُن کا یہ جنون باعثِ حیرت تھا، وہ تقریباً ہر دوسرے روز دانیال کو دیکھنے آتا تھا اور وہ بھی دانیال کی بہتر ہوتی حالت کا گواہ تھا مگر اسے بہتری کی یہ رفتار سست رفتار لگتی تھی۔ اس بہتری کی رفتار جو بھی تھی اس نے ایک امید بہرحال پیدا کردی تھی کہ وہ زیادہ نہیں تو ایک نہ ایک دن خود سے یا کسی ہلکے سہارے سے اٹھنے بیٹھنے، بات سن لینے اور شاید جواب دینے کے قابل ہوجائے۔

''یہ توقع اور امید بہت زیادہ ہے۔'' دانیال کے ڈاکٹرز عافیہ کی غیر موجودگی میں کبھی اسے بتاتے۔ ''دانیال کے موت کے منہ میں جانے سے بچ جانے کے چانسز مضبوط ہیں اس کی حسیات بھی کسی حد تک کام کرنے لگیں گی لیکن خود سے اٹھنا بیٹھنا، بولنا، جواب دینا، نارمل رسپانسز، چلنا پھرنا بہت ریموٹ چانس ہے۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے کہتے۔ ''ہم دانیال کی مدر کے یقین اور ایمان کی وجہ سے کھل کر یہ بات نہیں کرتے، ایک نیم زندہ انسان سے زیادہ مکمل زندہ انسان کے احساسات کا خیال رکھنا ہم سب کا اولین فرض ہے، ابھی وہ ذرا ذرا

سی جنبش سے پُر امید ہوئی ہیں جب اس سے زیادہ پروگریس نظر نہ آئی تو انہیں خود ہی سمجھ آنے لگے گی، ہم اپنی زبان سے کچھ کہہ کر انہیں مایوسی کی تکلیف کیوں دیں۔''

''آپ کی آنکھیں تھک جاتی ہوں گی مسز جہانگیر، آپ درمیان میں تھوڑا آرام کرلیا کریں۔'' قیوم ان سب آرا کے تناظر میں کبھی کبھی عافیہ سے کہتا۔

''آپ نے دانیال کا جنون دیکھ رکھا ہے ناں قیوم......؟'' ایک دن جواب میں انہوں نے قیوم سے سوال کیا۔ ''اس کی ہمت، عزم اور شوق میں آپ نے کبھی کوئی کمی دیکھی تھی؟''

''نہیں......'' قیوم نے سر ہلایا...... ''میرے بہت سمجھانے کے باوجود بھی نہیں۔''

''بس تو پھر میں اسی دانیال کی ہی ماں ہوں۔'' وہ سر ہلا کر بولیں...... ''میں شوق، ہمت اور عزم کیسے ہار سکتی ہوں، مجھے ہر پل اس معجزے کا انتظار رہتا ہے جب یہ دوبارہ سے مجھے پکارے گا جب یہ مجھے خود بتائے گا کہ اسے کیسا محسوس ہو رہا ہے۔''

''آپ میں اور دانیال میں یہ فرق ہے مسز جہانگیر کہ جب وہ کسی طریقے سے بھی اپنے جنون سے پیچھے ہٹ جانے سے باز آتا نظر نہیں آتا تو پھر میں اسے خدا کا حوالہ دیتا کہ ایسا جنون اسے ناپسند ہے، اس پر وہ قطعی بے نیازی سے کہتا مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ جب کسی طریقے سے بات نہیں بنتی تو درمیان میں اللہ کو لے آتے ہیں، مذہب کے تذکرے چھیڑ دیتے ہیں۔'' قیوم نے کہتے ہی اُن کی طرف دیکھا اُن کے چہرے پر یہ بات سن کر اضطراب اتر آیا تھا۔

''جبکہ آپ کا معاملہ مختلف ہے۔'' اس نے کہا۔ ''آپ کا جنون، شوق، عزم اور ولولہ، خدا پر ایمان سے ہی شروع ہوا ہے اور اسی پر اب تک قائم ہے۔''

''دانیال جو ایسے کہتا تھا اس میں میرا ہی قصور تھا۔'' عافیہ نے گھُٹی گھُٹی آواز میں کہا تھا۔ ''دانیال کے حادثے سے پہلے اللہ میرے لیے شاید صرف ایک اسم تھا۔ ایک بڑی طاقت کا نام، مسلمان باپ کی اولاد کی حیثیت میں اللہ اور اس کی کتاب سے میرا تعارف بھی اتنا ہی تھا جتنا ایک مذہبی فریضہ سمجھتے ہوئے لوگ اپنی اولاد کا کراتے ہیں، اللہ کو جاننا اور پہچاننا تو دور کی بات میں بھی کئی کئی دن زندگی کی مصروفیات میں کھو کر اسے دن کے کسی حصے میں یاد کرنا بھی بھول جاتی تھی۔ غفلت کا پردہ اتنا دبیز اور دلکش تھا کہ اسے توڑنے یا ہٹانے کا کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا۔ جب ہی تو میں نے اپنے دونوں بچوں کی تربیت میں اس پہلو پر اتنی توجہ ہی نہیں دی کہ انہیں اندازہ ہوتا... اللہ کے بارے میں یوں بے نیازانہ گفتگو کرتے ہوئے وہ ایک سپریم طاقت کو چیلنج کر رہے ہیں اور آپ نے دیکھا اس کی ذات کو چیلنج کرنے کا کیا نتیجہ نکلا......؟'' انہوں نے قیوم کی طرف دیکھا۔ ''صرف دانیال ہی نہیں میں، جہانگیر، عاصم ہم سب جیسے زندہ لاشیں بن کر رہ گئے ہیں۔ چلتی پھرتی زومبیز۔'' ان کے لہجے میں دکھ تھا اور شاید پچھتاوا بھی۔

''آپ دعا کیجیے قیوم، دانیال ایک بار زندگی کی طرف لوٹ آئے۔'' پھر انہوں نے اپنی نم آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

''جب ایسا ہو جائے گا، میں اپنی فیملی کو زندگی کے تمام سبق دوبارہ سے پڑھنے کو کہوں گی، ایسے سبق جو اس عظیم طاقت کو پہچاننے، سمجھنے اور اس کے راستے پر چلتے ہوئے اس تک رسائی حاصل کرنے پر مبنی ہوں۔ ہم زندگی کو ڈھنگ سے گزارنے اور ہر دم اس کی ذات کو یاد رکھنے کا قرینہ سیکھیں گے۔''

''بے شک یہ بہت بڑی بلیسنگ ہوگی۔'' قیوم نے کہا۔ ''شاید کچھ حادثے انسانوں کی زندگی کی جہت بدل ڈالنے کے لیے ہی ظہور پزیر ہوتے ہیں۔''

''یہ جو دانیال کی اب کنڈیشن ہے ناں۔'' عافیہ نے کہا۔ ''یا جو حادثے کے فوراً بعد تھی اس سے لے کر اس کی زندگی کے سفر میں دوبارہ شامل ہونے تک کا عرصہ ہمارے لیے مہلت کے طور پر عطا ہوا ہے، ہم اب بھی نہ سمجھیں تو پھر ہماری بدقسمتی ہوگی۔'' قیوم نے اُن کی بات سن کر تائید میں سر ہلایا۔

''ورنہ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ حادثے میں دانیال کی جائے حادثہ پر ہی جان چلی جاتی یا پھر معجزاتی طور پر اسے خراش تک نہ آتی۔'' عافیہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''ان دونوں انتہاؤں کی درمیانی صورت، یہ۔'' انہوں نے بیڈ پر پڑے دانیال کی طرف اشارہ کیا۔ ''جو دانیال کی اب ہے، یہ صرف اور صرف ایک الارم ہے، وارننگ ہے، آزمائش ہے، امتحان ہے یا تو مجھے پالو یا ہمیشہ کے لیے کھودو...... یہ اللہ کا پیغام ہے اور ہم اب بھی اس پیغام کو نہ سن پائیں تو ہم سا بدقسمت کون ہوگا؟'' قیوم نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا۔ عافیہ کی یہ گفتگو اسے کچھ اور ہی قصہ سنا رہی تھی۔ اسے حادثے کے فوراً بعد والی عافیہ جہانگیر یاد آئیں جو اسی اسپتال کی انٹرنس پر اپنے شوہر کے ساتھ لگ کر رو رہی تھیں۔ ان عافیہ جہانگیر اور ان خاتون جو اَب اس کے سامنے بیٹھی تھیں کا حلیہ یکسر مختلف تھا۔ ایک الٹرا ماڈرن خاتون سے لے کر عجز و انکساری سے بھرپور ایک ایسی شخصیت جنہیں دیکھ کر سوائے تقدس و احترام کے کوئی دوسرا خیال ذہن میں نہیں آسکتا تھا تک کا سفر عافیہ نے دانیال کے حادثے سے لے کر اب تک یعنی صرف چھ ماہ کے اندر طے کیا تھا۔ ان کے خیالات اور اندازِ گفتگو دونوں یکسر بدل چکے تھے۔ قیوم اس کیفیت کی معجزاتی تبدیلی پر یقیناً حیرت زدہ تھا مگر دل ہی دل میں وہ اس معجزے کو بھی مان رہا تھا جو یقیناً عافیہ کی شخصیت کی تبدیلی کے طور پر ظہور پزیر ہوا تھا۔

''بس کچھ عرصے کی آزمائش اور ہے پھر......'' عافیہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''تب تک جب تک ہماری ذاتوں اور شخصیتوں کی کجیاں اور کمیاں مکمل طور پر ختم نہیں ہو جاتیں...... پھر دیکھیے گا دانیال کیسے ٹھیک ہوتا ہے، یوں جیسے اس کے ساتھ کبھی کوئی حادثہ ہوا ہی نہیں تھا۔'' ان کے لہجے میں یقین تھا، اتنا یقین جتنا شاید انہیں خود اپنے ہونے پر بھی نہ تھا۔

''یقیناً......'' قیوم نے متاثر ہوتے ہوئے سوچا۔ ''جو ہم چاہتے ہیں اس کے حصول کے لیے اللہ پر مضبوط یقین ہونا سب سے ضروری ہے، غیر متزلزل یقین......''

اور پھر قیوم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، اگلے آٹھ ماہ کے دوران وہ معجزہ ظہور پزیر ہوا جس سے دانیال کے ڈاکٹرز دبے لفظوں میں مایوسی ظاہر کرتے تھے، دانیال کے جسم کے ہر عضو نے باری باری بعض اوقات دنوں اور بعض اوقات ہفتوں کے وقفے کے بعد حرکت کرنا شروع کی پھر اس کی آنکھوں نے شناسائی کی جھلک دکھانا شروع کی، آہستہ آہستہ وہ جسم کے کچھ حصوں کو اٹھانے موڑنے اور واپس رکھنے میں کامیاب ہوا۔ رفتہ رفتہ وہ اٹھنے بیٹھنے اور بغیر سہارے کے لیٹنے کے قابل ہوا، اس کے حلق سے آواز نکلنے لگی اور وہ منہ کے ذریعے نرم خوراک لینے لگا۔ قیوم انگشت بدنداں یہ سب ہوتے دیکھ رہا تھا۔ عافیہ جہانگیر، ان کے شوہر اور بڑا بیٹا وقفہ وقفہ آزمائش، وقفہ وقفہ انتظار میں تھے۔ بلاشبہ یہ ایک طویل اور صبر آزما انتظار تھا لیکن معجزے یونہی تو رونما نہیں ہو جاتے، عافیہ کا صبر اور حوصلہ دیدنی تھا۔ انہوں نے دانیال کو واپس زندگی تک لانے کے دوران تئیس چوبیس سالہ جوان نہیں بلکہ جیسے نوزائیدہ بچہ دوبارہ سے پالا تھا۔ وہ اس کے جسم کی صفائی کے علاوہ، اسے کھلانے

پلانے، اس کے جسم کی مالش کرنے، اسے بچوں کی طرح پچکار بچکار کر ہمت کرنے اور خود کو واپس زندگی کی طرف لانے کی کوششوں میں مگن رہتیں۔ انہوں نے دانیال کی سماعت، گویائی اور دماغ کو پہچان کے سگنلز دینے والی قوت کو بحال کرانے کے دوران خود ڈاکٹرز سے مل کر، انٹرنیٹ پر تحقیق کر کے خود ایسے مریضوں کے پاس جا کر جو ایسی کیفیتوں میں مبتلا تھے جس محنت اور جانفشانی سے کام لیا وہ ان کے عزم و ہمت کو سب کی نظروں میں لے آئی تھی۔ جس روز دانیال نے قیوم کی نظروں کے سامنے اپنے جوتوں کے تسمے جھک کر خود باندھے اور سیدھے ہو کر اس کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔

"I am once again ready to face the challanges of life Sir"

اس روز قیوم کو معجزوں کے ہونے پر دل و جان سے یقین آگیا تھا۔

☆☆☆

زوئی کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اسے کہاں جانا اور ٹھہرنا تھا۔ نادر کی بے نیازی نے اسے چونکا ہی نہیں رُلا بھی دیا تھا مگر اب اسے فوری طور پر یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اسے کہاں جانا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو شہر کی مختلف سڑکوں پر ٹیکسی دوڑانے کا کہتے کہتے اب وہ اس کے سوالوں سے بھی عاجز ہو رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر نادر کو کال کرنے اور اس کا نمبر بند ملنے پر مریم کو کال کی۔ مریم انہی فلیٹس میں سے ایک میں رہتی تھی جن میں نادر سے نکاح اور واپس چین جانے سے پہلے زوئی رہتی تھی۔ مریم کا شوہر بیرون ملک کام کی غرض سے گیا ہوا تھا اور وہ خود یہاں کسی اسکول میں ٹیچنگ کر رہی تھی۔ فلیٹس کے مکینوں میں سے واحد مریم ہی تھی جو باقیوں کی نسبت اس سے بہتر سلوک روا رکھتی تھی۔ مریم نے زوئی کا فون فوراً اٹینڈ کر لیا اور اسے بتایا تھا کہ وہ اس وقت گھر ہی پر تھی اور زوئی اس کے گھر آسکتی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور کو فلیٹس کا پتا بتانے کے بعد زوئی وقتی طور پر ریلیکس ہو گئی لیکن ٹیکسی کے منزل پر پہنچنے کے بعد اپنے بیگ کا ہینڈل پکڑے اسے پہیوں پر اپنے پیچھے دوڑاتے ہوئے مریم کے فلیٹ تک پہنچنے تک آنسو پھر سے اس کی آنکھوں سے رواں ہونے لگے۔

''دیکھو زوئی تم نے تو بس کسی نہ کسی طرح یہاں اس ملک میں رہتے رہنے کی خواہش کی تھی ناں......'' کچھ دیر بعد مریم اپنے فلیٹ کے چھوٹے سے سٹنگ روم میں اس کے قریب بیٹھے اس کے بال سنوارتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''نادر سے نکاح اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے ایک جواز تھا پھر تم نادر سے بڑی بڑی توقعات کیوں لگانے لگی ہو؟''

''نادر ایسا نہیں تھا۔'' زوئی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اب بھی اسی نے سب پیپرز مکمل کرا کے مجھے بھیجے تو ہی میں یہاں آسکی ہوں۔ اسے معلوم تھا کہ مجھے آج یہاں پہنچنا تھا پھر اس نے اپنا فون کیوں بند کر لیا، اس نے ائرپورٹ پر آنے کی زحمت کیوں نہیں کی؟''

''اس لیے کہ تمہارے سلسلے میں اس کا کام بس اتنا ہی تھا، اس نے نکاح کیا، تمہارے مطلوبہ پیپرز بنوائے اور تمہیں یہاں آنے اور رہنے کا جواز دے کر منظر سے ہٹ گیا۔'' مریم نے اسی بات کو صاف اور سیدھے لفظوں میں دُہرایا۔ ''اور سچ پوچھو تو اس نے وہ ذمے داری جو تمہارے سامنے لی تھی خوب نبھائی، ورنہ پاکستانی مردوں سے اتنی مستقل مزاجی کی توقع لگانا بیکار ہے۔''

''میرے سلسلے میں ابھی وہ منظر سے ہٹ نہیں سکتا تھا۔ اسے مجھ سے بہت ضروری کام تھا۔'' زوئی نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا اور پھر کوئی خیال ذہن میں آنے سے خوفزدہ سی ہو گئی۔

”اوہ میرے خدا.....!“ اس نے اسی خیال کے تحت کہا۔ ”کہیں میری وجہ سے نادر کسی بڑی مصیبت میں نہ پھنس گیا ہو۔“

”مصیبت.....؟“ مریم نے حیرت سے کہا۔ ”کیسی مصیبت؟“

”نہیں۔“ زوئی نے مریم کو مزید کچھ نہ بتانے کا فیصلہ کیا اور بات بدل ڈالی۔ ”کہیں اس کی ماں اور بہنوں نے اسے منع کر دیا ہو ائر پورٹ آنے سے۔“

”ہوسکتا ہے۔“ مریم نے شانے اچکائے۔ ”لیکن خیر.....“ پھر اس نے زوئی کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”تم واپس یہاں سیٹل ہونے تک میرے پاس ٹھہرو، اپنی فارماسیوٹیکل کمپنی میں جاؤ ہوسکتا ہے وہ تمہاری گڈوِل کی وجہ سے تمہیں دوبارہ نوکری پر رکھ لیں، وہاں نہیں تو اس شہر میں بہتیری ایسی کمپنیاں ہیں، تمہیں کہیں بھی جاب مل سکتی ہے، اسی بلڈنگ میں دو تین فلیٹ حال ہی میں خالی ہوئے ہیں، ہم تمہارے لیے کوئی فلیٹ بھی کرائے پر لے لیں گے۔“ مریم کا خلوص وقتی تسلی کے لیے کافی سے زیادہ تھا مگر زوئی کے دل میں نادر کی طرف سے ایک عجیب سی کھٹک پیدا ہو چکی تھی۔ جو اسے چین لینے نہیں دے رہی تھی۔

”کل کمپنی پہنچ کر جاب سے زیادہ نادر کا پتا لگانے کی کوشش کرتی ہوں.....“ پاکستان میں پاکستانی شہری کی حیثیت سے پہلی رات کو سونے سے پہلے آخری بات اس نے یہی سوچی تھی۔

☆☆☆

”تم نے کبھی قدرتی آفات کے رونما ہونے کے بعد اجتماعی انسانی المیوں کے اندر انسان کی ازلی بدفطرتی کے مظاہرے دیکھے ہیں؟“ نیوز چینل کے ایک معروف نیوز ریڈر جس سے فہد کی اچھی دوستی ہو چکی تھی نے ایک شام اس کے اپارٹمنٹ میں کافی پیتے ہوئے اس سے پوچھا تھا، یہ نیوز ریڈر جس کا نام مجتبیٰ تھا، اس کے ساتھ والے اپارٹمنٹ میں اپنی فیملی کے ساتھ رہتا تھا اور کبھی فرصت کی شام میں فہد کے ساتھ بیٹھ کر اس کی بنائی کافی پینا اسے بہت پسند تھا۔

”انسانی المیوں کے اندر انسانی بدفطرتی.....؟“ فہد نے مجتبیٰ کی بات دُہرانے کے بعد اس کی طرف دیکھا۔ ”میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”ایک انسانی المیہ تو وہ ہوتا ہے جو قدرتی آفات جیسے سیلاب، زلزلے، طوفان وغیرہ کے نتیجے میں رونما ہوتا ہے۔“ مجتبیٰ نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ ”اور ایک انسانی المیہ وہ ہوتا ہے جو قدرت کی طرف سے آنے والی تباہی سے نبرد آزما ہونے کے دوران رونما ہوتا ہے۔“

”وہ کیسے.....؟“ فہد نے دلچسپی سے پوچھا۔

”ریلیف ورک کے دوران۔“ مجتبیٰ نے کہا۔

”اوہ..... میں سمجھ گیا۔“ فہد نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”کچھ اموات جو فوری طور پر ہوتی ہیں اور بہت سی جانیں جو ریلیف دینے کے دوران چلی جاتی ہیں کیونکہ انسان موت، زندگی کے فیصلوں کے سامنے بے بس ہے۔“

”میں نے انسان کی نیک فطرتی نہیں بدفطرتی کا ذکر کیا ہے۔“ مجتبیٰ نے کہا۔

”بدفطرتی؟“ فہد نے اس لفظ پر غور کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نہیں سمجھ سکا۔“ پھر اس نے گردن موڑ کر مجتبیٰ کی طرف دیکھا۔ ”تم ہی بتاؤ۔“

”میں نے اس بدفطرتی کا مظاہرہ 2005ء کے زلزلے کے دوران دیکھا۔“ مجتبیٰ نے کہا۔ ”ہم اپنی ٹیم

کے ساتھ زلزلہ زدہ علاقوں میں براہِ راست رپورٹنگ کے لیے پہنچے اور کئی دن ٹھہرے رہے۔“

”بہت بڑا انسانی المیہ تھا وہ۔“ فہد نے کہا۔ ”اگرچہ ان دنوں میں یہاں نہیں تھا لیکن بیرونِ ملک بیٹھے ہوئے بھی اس المیے کی شدت کا اندازہ کر سکتا تھا۔“

”تم تو بہت دور بیٹھے تھے، جو لوگ اسی ملک میں موجود تھے لیکن اس علاقے سے دور تھے انہیں بھی اندازہ نہیں ہوا کہ اس المیے کے اندر سے کیسے کیسے المیے پھوٹ رہے تھے۔ یاد کرتا ہوں تو اب بھی راتوں کی نیندیں اُڑ جاتی ہیں۔“

”کچھ بتاؤ گے مجھے بھی۔“ فہد نے کہا۔

”زخمی مر رہے تھے اور کیمپس سے دوائیں چرائی جا رہی تھیں، کھلے آسمان تلے بیٹھے بچے، بوڑھے، بیمار، جوان بارش اور سردی کے ہاتھوں جانیں گنوا رہے تھے اور امداد کے لیے آنے والے خیمے، کمبل، غذا، خرد برد کر کے مارکیٹ میں بیچی جا رہی تھی۔“

”اوہ.....“ فہد نے افسوس سے سر ہلایا۔

”یہاں تک ہی بات ختم نہیں ہوئی۔“ مجتبیٰ نے کہا۔ ”بے سہارا ہو جانے والی مجبور، زخمی، نوجوان لڑکیوں کی حفاظت کرنے والا کوئی نہیں تھا، ان کیمپوں سے ایسی ہی کئی لڑکیاں اغوا کی گئیں اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی کیونکہ اُن کے پیچھے دہائی ڈالنے والا گھر کا کوئی فرد بچا ہی نہیں تھا۔“

”ڈونٹ ٹیل می یار.....“ فہد جھرجھری لیتا ہوا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”میں عینی شاہد ہوں ایسی وارداتوں کا۔“ مجتبیٰ نے سر ہلایا۔ ”شاید میں ٹھیک سے بتا نہ سکوں کہ کیسی کیسی تنظیموں کے نام کا پردہ اوڑھے کارکنوں نے یہ گھناؤنی وارداتیں کیں اور پھر اُن لڑکیوں کے ساتھ کیا، کیا برا سلوک نہ کیا ہوگا۔“

”تم لوگوں نے اس بات کو رپورٹ نہیں کیا؟“ فہد نے کہا۔

”ہمارے اوپر جتنا پریشر ان دنوں تھا اتنا تو کبھی نہیں رہا۔ ہم پر پریشر تھا کہ ہم تصویر کا ایک ہی رخ دکھائیں، ریسکیو اور ریلیف ٹیمیں دن رات کام کر رہی ہیں، حکومت سرپرستی کر رہی ہے اور تاریخ میں اتنے اچھے انتظامات پہلے کبھی کیے ہی نہیں گئے۔ بہت کوشش کے باوجود ہم اس پریشر سے صرف اس حد تک نکل سکے کہ لوگوں کو اتنا بتا دیا جائے کہ دوائیں، کمبل، غذا اور خیمے لوگوں تک پہنچ نہیں پا رہے۔ اس اتنے حساس موضوع پر تو آج بھی ہم نجی محفلوں میں ہی دبے لفظوں میں ذکر کر پاتے ہیں۔“

”کیا تم نے خود اپنی آنکھوں سے یہ ہوتے دیکھا؟“ فہد نے بے یقینی سے مجتبیٰ کی طرف دیکھا۔

”ہم میں سے کتنوں نے دیکھا، رات تک لڑکی کا ذہنی اور جسمانی علاج کیا جا رہا ہوتا، صبح تک وہ لڑکی کیمپ سے غائب ہوتی، تین چار ایسے کیسز میں نے خود دیکھے، ایک، دو کے بارے میں کہا گیا کہ وہ خود کیمپ سے فرار ہو گئیں اس لیے کہ وہ وہاں رہنا نہیں چاہتی تھیں مگر ایک لڑکی میرال صلاح الدین کے بارے میں تو میں گواہ ہوں، وہ لڑکی خود سے وہاں سے نہیں گئی تھی اسے اغوا کیا گیا تھا۔“

”کیا.....!“ فہد ایک لمحے کے لیے جیسے شاک میں جانے کے بعد بولا تھا۔ ”کیا نام لیا تم نے اس لڑکی کا؟“

”میرال صلاح الدین۔“ مجتبیٰ نے کہا۔ ”اس لڑکی کی صرف دادی زندہ تھیں جو اس زلزلے کا شکار

ہوگئیں، اُن کے بعد لڑکی بالکل بے آسرا تھی۔ وہ بہت زیادہ زخمی نہیں تھی اور اپنے حواسوں میں نظر آتی تھی۔ بہت خوب صورت تھی اور ذہین بھی...... بہت خوب صورت تھی، شاید اسی لیے اسے وہاں سے اٹھالیا گیا۔'' مجتبیٰ، فہد کی کیفیت کا اندازہ کیے بغیر، بول رہا تھا اور وہ ششدر بیٹھا سن رہا تھا۔

☆☆☆

''کیا ہوا ممی...... خیریت؟'' دانیال نے عافیہ کو یوں لرزتے دیکھ کر سوال کیا۔

''یہ...... یہ لڑکی۔'' عافیہ کی زبان لڑکھڑاہٹ کا شکار ہونے لگی۔

''جی ممی...... کیا ہوا اس لڑکی کو......؟'' دانیال نے میز پر رکھے اخبار کی طرف دیکھا۔

''یہ تو میرال ہے، آنٹی بلقیس کی پوتی۔'' انہوں نے اسی لڑکھڑاتی زبان سے کہا۔

''میں تمہیں آنٹی بلقیس کے بارے میں بتاتی رہتی ہوں ناں۔'' انہوں نے دانیال کی طرف دیکھا۔ ''وہ جو تمہارے مکمل صحت یاب ہونے کے بارے میں ہمیشہ مجھے تسلی دیتی رہتی تھیں۔''

''ہاں، ہاں بالکل......'' دانیال نے تیزی سے سر ہلایا۔

''اور جو تمہارے مکمل صحت یاب ہونے سے پہلے ہی ایک حادثے کا شکار ہو کر دنیا سے چلی گئیں۔''

''جی، مجھے یاد ہے۔'' دانیال نے کہا۔

''یہ لڑکی......'' انہوں نے اخبار کے صفحے پر چھپی تصویر پر انگلی رکھی۔ ''یہ لڑکی ہو بہو میرال ہے، آنٹی بلقیس کی پوتی۔''

''لیکن ممی یہ وہ لڑکی کیسے ہوسکتی ہے؟'' دانیال نے صفحہ اٹھاتے ہوئے کہا اور غور سے تصویر دیکھنے لگا۔ ''یہ تو کال گرل ٹائپ کوئی لڑکی ہے، جس کی خبر اخبار میں صرف ایک بڑے سیاست دان کے ساتھ وابستہ ہونے کی وجہ سے لگ گئی۔''

''یہ ہی تو......'' عافیہ نے کہا۔ ''اسی خبر نے تو مجھے لرزا کر رکھ دیا ہے، اگر یہ میرال ہے تو کال گرل کیسے ہوسکتی ہے مگر شکلوں کی اتنی مماثلت نظر کا دھوکا تو نہیں ہوسکتی۔''

''ہوں۔'' دانیال نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''ہوسکتا ہے وہ حادثاتی طور پر اس طرف آگئی ہو، آنٹی بلقیس کے علاوہ اس کا کوئی تھا بھی نہیں، آپ نے بتایا تو تھا۔''

''حادثاتی طور پر......'' عافیہ نے دانیال کے الفاظ دُہرائے ''لیکن اس کے ساتھ حادثہ کیسے ہوسکتا تھا۔ وہ تو صوفی صاحب کی دعاؤں کے حصار میں... اسے تو صوفی صاحب نے اپنی دعاؤں کی حفاظت میں لے رکھا تھا۔'' عافیہ جیسے خود کلامی میں محو تھیں۔ دانیال اور بینش حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

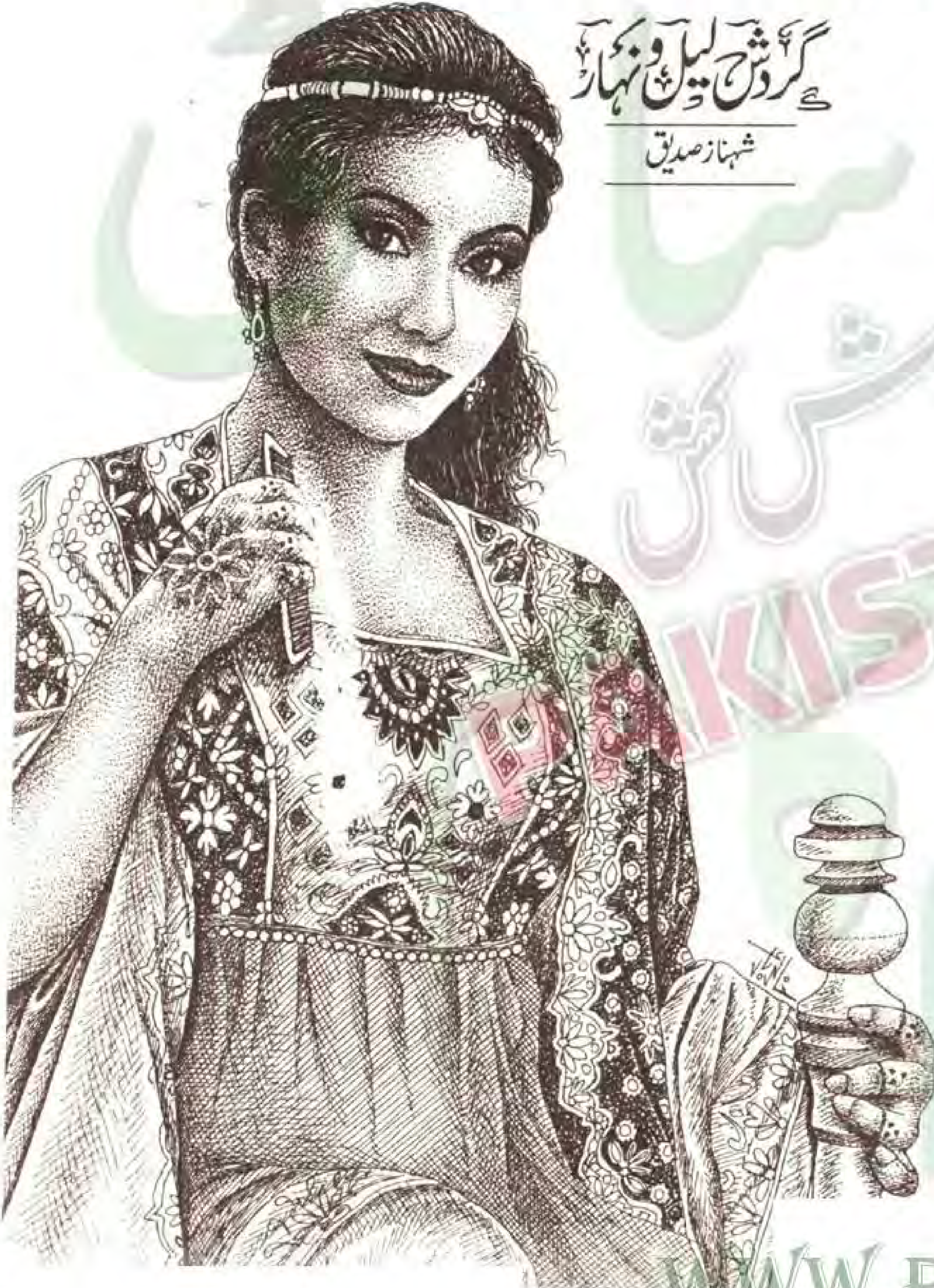
''آج میں اپنے کارڈز میز پر رکھتی ہوں۔'' مہرزاد کو اس خصوصی نمبر سے پہلا پیغام موصول ہوا تھا۔

''میرا وہ نام جس کے ساتھ پکارتے ہوئے شاید آپ رک نہ جائیں میرال صلاح الدین تھا...... جو حادثاتی طور پر زرنگار بن گیا۔'' دوسرا پیغام اسے ایک پُرہجوم پریس کانفرنس کے دوران موصول ہوا تھا...... مہرزاد کی الیکشن میں جیت کے بعد پہلی رات اور پہلی پریس کانفرنس تھی۔

(باقی آئندہ)

گردشِ لیل و نہار

شہناز صدیق



وہ کتنی دیر سے ایک ہی زاویے میں بیٹھی اپنی مضطرب نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر جمائے متفرق سوچوں میں الجھی ہوئی تھی۔ اس کے معصوم چہرے پر اضطراب کی پرچھائیاں اتنی واضح تھیں کہ ہر دیکھنے والی آنکھ اس کے اندرونی خلفشار اور توڑ پھوڑ سے آگاہ ہوسکتی تھی...... سفیدی مائل سرخ رنگت میں کچھ عرصے سے زردیاں سی گھل گئی تھیں۔ خوب صورت بڑی بڑی خم دار دراز پلکوں پر ہر وقت بھیگے رہنے کا گمان گزرتا۔

اپنی چھوٹی سی عمر میں زندگی کی سلیٹ پر اس نے خواہشوں و امیدوں کے اتنے حروف رقم کر ڈالے تھے، اتنی توقعات وابستہ کرلی تھیں کہ اب جب زندگی نے اسے تہی دامنی سونپی تو وہ انگشت بدنداں تھی۔

☆☆☆

وہ سیٹی پر مدھم سی دُھن بجاتے بے حد مگن انداز میں کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے ہر ہر انداز سے اِک سکون اِک آسودگی جھلک رہی تھی۔ اس کی بڑی، بڑی سیاہ آنکھوں اور وجیہہ پُرکشش سلونے چہرے پر اطمینان بھرا سکون ہلکورے لے رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی وہ اپنے گیٹ پر ہارن دے رہا تھا۔ چوکیدار کے گیٹ کھولنے پر اس نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی اور ایک مضبوط چال چلتا اندر کی طرف بڑھ گیا۔

"شبانہ، مما کہاں ہیں؟" لاؤنج میں صفائی میں مصروف ملازمہ سے اس نے پوچھا۔

"صاحب جی وہ مارکیٹ تک گئی ہیں۔ میں آپ کے لیے چائے لاؤں؟" صفائی کا کام وہیں چھوڑتے اس نے پوچھا تھا۔

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ اپنے کف لنکس کھولتا نفی میں سر ہلاتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ شبانہ نے حسبِ معمول اپنے صاحب کی پرسنالٹی کو دل ہی دل میں سراہا تھا جو اتنی ڈیشنگ تو ضرور تھی کہ وہ جب، جب دیکھتی اس کا معصوم دل دھڑک، دھڑک جاتا۔

کمرے میں آتے ہی اس نے کندھے پر رکھے کوٹ کو سامنے صوفے پر پھینکا، ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی، گھڑی میں ٹائم دیکھا تو مغرب کی اذان ہونے میں کچھ وقت ہی رہ گیا تھا۔ جوتے موزے اتارنے کے بعد وہ وارڈ روب سے استری شدہ شلوار سوٹ نکال کر واش روم میں گھس گیا۔ ٹھیک دس منٹ کے بعد وہ قریبی مسجد میں نمازِ مغرب کی ادائیگی کے لیے جا رہا تھا۔

☆☆☆

"حوصلہ کر پتر، حوصلہ کر، اللہ کی مرضی کے آگے بھلا کوئی کیا کر سکتا ہے، دکھ، تکلیفیں تو زندگی کا ہی حصہ ہوتی ہیں اور تم تو بہت بہادر بیٹی ہو میری۔" بوا بیگم نے اس ٹوٹی بکھری لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے جیسے اسے تسلی دینی چاہی مگر وہ ان کی نرمی پا کر بکھر، بکھر گئی ان کے کمزور بازوؤں کے گھیرے میں بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ، تڑپ گئی۔

"صبر کر میری دھی۔" اسے سنبھالنے میں ہلکان ہوتی بوا بیگم بھی رو پڑی تھیں۔

"مجھے صبر نہیں آتا بوا...... صبر بہت بڑی چیز ہے جس پر بہت عظیم ہستیاں ہی قائم رہ سکتی ہیں اور...... اور میں بہت کمزور ہوں بوا، کیسے صبر کروں۔ میرے ساتھ ہی ایسے کیوں ہوا بوا، کچھ نہ بچا میرا، دیکھیں، دیکھیں میں خالی ہاتھ رہ گئی۔" اس نے بلکتے ہوئے اپنی دونوں ہتھیلیاں اُن کے سامنے کیں۔

"نہ، نہ میری بچی ایسے نہیں کہتے۔" اس کی حالت دیکھ کر بوا بیگم سے جیسے ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"میری دنیا اجڑ گئی بوا...... اور آپ کہہ رہی ہیں کہ ایسے نہیں کہتے، میں...... میں کیوں زندہ بچ گئی، کیوں نہ اس گاڑی میں اپنے پیاروں ساتھ ہی مر گئی۔ وہ، وہ سب مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے۔ کیوں نہ اپنے ساتھ لے گئے۔ پاپا کتنا پیار کرتے تھے مجھ سے میری ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتے تھے۔ زمانے کے سرد و گرم سے کتنی حفاظت کرتے تھے میری اور مما، کتنی فکر ہوا کرتی تھی انہیں میری، ہمیشہ میرے کھانے، پینے کے ہی پیچھے پڑی رہتی تھیں اور آج میں کئی، کئی دن بھوکی رہتی ہوں، وہ مجھے کھانے کے لیے کیوں نہیں کہتیں، کیوں میری فکر نہیں کرتیں۔" وہ بری طرح بلک رہی تھی۔ "اور...... اور وہ ہانی...... کتنا چھوٹا تھا ناں بوا وہ...... کتنی جلدی تھی اسے دنیا سے جانے کی...... اب کون مجھے اپنی معصوم زبان میں قاری آپی کہے گا، کون اپنی معصوم شرارتوں سے میرا دل بہلائے گا۔ کتنے بے وفا ہیں ناں سب مجھے اکیلا چھوڑ گئے۔ آپ ان سے کہیے ناں بوا کہ وہ میرے پاس آ جائیں یا پھر مجھے اپنے پاس بلا لیں، مجھے ان کے بغیر رہنا نہیں آتا پلیز...... بوا...... آپ کہیے ناں۔" درد کی شدت تھی یا پھر شدید اعصابی دباؤ وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہوتی ان کے بازوؤں میں ہی جھول گئی اور اسے اپنی بانہوں میں بے جان ہوتے دیکھ کر بوا بیگم کا کمزور نحیف وجود کچھ اور کمزور پڑ گیا تھا۔ بہتی آنکھوں اور کپکپاتے ہونٹوں سے انہوں نے ملازمہ کو آواز دی تھی۔

☆☆☆

بوا بیگم کی طبیعت ایک دم بگڑ گئی تھی وہ جو پہلے ہی اندر سے بے حد کمزور ہو چکی تھی اُن کی حالت دیکھ کر وہ جہاں بے حد پریشان ہوئی وہیں خوف سے پیلی پڑ گئی۔ اس اتنی بڑی دنیا میں بوا بیگم کے سوا اس کا تھا ہی کون...... جو رشتے میں تو اس کے پاپا کی کزن تھیں مگر اب وہی اس کا سب کچھ تھیں۔

"اگر بوا بیگم کو بھی کچھ ہو گیا تو......" اس سوچ اور ڈر نے جیسے اس کے پورے جسم سے جان نچوڑ کر رکھ دی۔ بارہ گھنٹوں کی صبر آزما بے ہوشی کے بعد جیسے ہی انہیں ہوش آیا اس کی جان میں جان آئی ورنہ وہ متوحش نظروں سے کاریڈور میں ٹہلتی مسلسل ایک ہی دعا کا ورد کر رہی تھی۔ "اللہ جی بوا کو کچھ نہ ہو۔" ان کے کمزور وجود کا سہارا ابھی اس کے لیے بہت بڑی نعمت تھا۔ اُن کے وجود کے سائے تلے چھپ کر ہی تو وہ زندگی کے دن گزار پا رہی تھی۔ ورنہ مما، پپا اور ہانی کے بعد اس کا زندہ رہنا ناممکن ہو جاتا۔

بوا بیگم کے اسپتال سے گھر آتے ہی وہ اپنا غم بھلائے اُن کی تیمارداری میں مصروف ہو گئی۔ وہ اس وقت ایک ایسی ڈری سہمی بچی تھی جس کے ہاتھ میں زندگی کی مشکل و کٹھن رہ گزر پر چلنے کے لیے صرف بوا بیگم کا ہاتھ تھا۔ وہ ہراساں تھی اس خوف سے کہ کبھی جو بوا بیگم کا ہاتھ چھوٹ گیا تو وہ دنیا کے میلے میں ایسے گم ہو جائے گی کہ پھر شاید اپنی بھی نہ رہے۔ یہ ایک ایسا ڈر تھا جو کنڈلی مارے کسی اژدھے کی طرح پھن پھیلائے اس کے اندر چھپا بیٹھا تھا اور جس سے چاہ کر بھی وہ جان نہیں چھڑا پا رہی تھی۔

"ایسا مت کیجیے گا...... آپ جانتی ہیں ناں کہ آپ کے سوا میرا کوئی نہیں......" رات وہ ان کی ٹانگیں دباتے بھیگے لہجے میں کہہ رہی تھی اور بوا بیگم کی پُرسوچ نظریں اس کے معصوم چہرے پر جمی نہ جانے کہاں سے کہاں پرواز کر رہی تھیں۔

"قاری ذرا فون تو میرے پاس لاؤ۔" یکلخت ان کے کہنے پر وہ تابعداری سے سر ہلاتے اٹھ کر فون سیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

"یہ ساتھ والی دراز میں نیلے کلر کی ڈائری ہے، وہ بھی پکڑا دے اور میرا چشمہ بھی۔" اس سے ڈائری پکڑتے ہی انہوں نے چشمہ لگایا اور نمبر ملانے سے پہلے ایک دفعہ پھر اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"اور اب تم میرے لیے چائے لے آؤ۔"

"جی اچھا......!" وہ حیران حیران سی باہر کی طرف بڑھی تھی مگر پھر جب چائے لے کر کمرے میں آئی تو انہیں کسی گہری سوچ میں مستغرق پایا۔

"بوا......" اس کے دو تین بار آوازیں دینے پر ہی انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"یہ چائے لے لیں۔"

"ہاں رکھ دو، ابھی ضرورت نہیں ہے۔"

"مگر ابھی تو......" وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی جب وہ بولیں۔

"پی لیتی ہوں بیٹا، تم پریشان نہ ہو۔" اس نے تعجب سے اُن کے الجھے الجھے انداز کو دیکھا اور پھر ان کے قریب بیٹھتی ایک بار پھر سے ان کی ٹانگیں دبانے لگی۔

☆☆☆

دوسرے دن وہ لان میں بیٹھی تھی جب اس نے ایک گریس فل سی عورت کو گیٹ سے داخل ہو کر اپنی طرف آتے دیکھا۔ ان کی شخصیت اتنی پُرکشش تھی کہ وہ بے ساختہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"السلام علیکم بیٹا! مجھے فاخرہ بیگم سے ملنا

ہے۔'' ان کے بولنے کا انداز ان سے بھی زیادہ پُرکشش تھا وہ سراہے بغیر نہ رہ سکی۔

''آیئے پلیز...... میں آپ کو بوا بیگم کے کمرے میں چھوڑ آؤں۔'' سلام کا جواب دیتے وہ انہیں ساتھ لیے بوا بیگم کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''آپ فاریہ ارسلان ہیں ناں؟'' راستے میں وہ پوچھ رہی تھیں۔ اس نے آہستہ سے اثبات میں ہلا دیا۔ اس نے اس عورت کی آنکھوں کو چمکتے دیکھا تھا۔

''ماشاء اللہ بہت پیاری ہو، بیٹا، اللہ نصیب اچھا کرے۔'' نہ چاہنے کے باوجود بھی اس کے گال سرخ پڑ گئے تھے، اپنی تعریف بھلا کسے بری لگتی ہے۔ انہیں کمرے میں چھوڑ کر وہ خود کچن میں آ گئی۔ کچھ دیر کے بعد وہ چائے لے کر جیسے ہی اندر داخل ہوئی بوا بیگم کی بات نے اسے ٹھٹک کر وہیں رکنے پر مجبور کر دیا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے نفیسہ، مجھے پھر بھی منظور ہے، میں اپنی بیٹی کو کوئی سہارا دے کر مرنا چاہتی ہوں جو اس کے ساتھ مخلص ہو اس کا احساس کرے اس کا خیال رکھے۔ وہ بہت بکھر گئی ہے اسے سمیٹ لے اور صائم بیٹے کو میں جانتی ہوں اس کی طبیعت ایسی ہی ہے۔''

''مگر پھر بھی میں چاہوں گی کہ تم ایک بار اس سے مل لو۔''

''میں نے اسے دیکھا ہوا ہے نفیسہ، تم فکر نہ کرو۔''

''اور کیا فاریہ مان جائے گی، آخر عمروں کا بھی تو کافی فرق ہے؟'' اِک خدشے کے تحت انہوں نے بوا بیگم سے پوچھا تھا۔

''وہ میری بڑی فرمانبردار بیٹی ہے، مجھے اس پر پورا بھروسا اور مان ہے اور میں جانتی ہوں کہ وہ اپنی بوا کو کبھی انکار نہیں کرے گی، تم بس تیاریاں کر لو جا کر۔'' پھر انہوں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔

''ارے فاریہ آؤ بیٹا اندر...... وہاں کیوں کھڑی ہو۔'' اسی پل اُن کی نظر اس کے ساکت گم صم وجود پر پڑی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم بھرتی ان کے قریب آئی چائے کی ٹرے سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہی باہر آنے لگی تھی جب اس گریس فل خاتون نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے قریب بٹھا لیا۔

''یہ میری سہیلی نفیسہ ہے، پہلے امریکا میں رہتی تھی اب کچھ عرصے سے اپنے بیٹے صائم کے ساتھ مستقل پاکستان آ گئی ہے۔'' بوا بیگم کے تعارف کروانے پر بھی اس کا جھکا سر نہیں اٹھا تھا۔ اس کا دماغ تو ابھی تھوڑی دیر پہلے سنی جانے والی ادھوری گفتگو میں ہی الجھا ہوا تھا۔

''میں نے اس کے بیٹے صائم سے تمہارا رشتہ پکا کر دیا ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔'' اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر ششدر نظروں سے بوا بیگم کی طرف دیکھا۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی اور پھر بوا بیگم کی مان بھری نظروں میں دیکھتے، نوکِ زباں پر آئے لفظوں کو اس نے بہ مشکل اندر دھکیلتے آہستہ سے سر جھکا لیا۔ جسے بوا بیگم رضامندی سمجھتے ہوئے تشکر سے بھیگی آنکھیں لیے مسکرا دیں۔

''دیکھا نفیسہ، میں نہ کہتی تھی کہ میری فاری ایسی نہیں ہے۔'' ان کے پُراعتماد بھرائے لہجے پر اس نے بے ساختہ پہلو بدلا تھا۔ وہ شادی کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھی مگر وہ اس وقت کچھ بھی کہہ کر بوا بیگم کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی جبکہ رات کو ان سے تفصیلی بات کرنے کی اندر ہی اندر ٹھان چکی تھی۔

مگر یہ کیا...... بوا بیگم کا حوصلہ افزا اشارہ پاتے ہی آنٹی نفیسہ نے اپنی انگلی سے انگوٹھی اتاری اور پھر اس کی نازک سی مخروطی انگلی میں پہنا دی۔

''ابھی تو یہ ہی انگوٹھی پہنا رہی ہوں مگر انشاءاللہ ...۔ شادی میں کوئی کسر نہیں چھوڑوں گی۔ اب یہ میرے صائم کی امانت ہے تمہارے پاس۔'' انہوں نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔ اسے ان کی

آواز بھی بھرائی ہوئی سی لگی۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکی۔ بس ہکا بکا دیکھتی رہ گئی۔ اسے اپنے اندر خالی پن اترتا محسوس ہوا۔ ہونٹ خاموش تھے مگر جسم کا ایک، ایک عضو تڑپ تڑپ کر اس زیادتی کا احساس دلا رہا تھا۔ صرف سترہ سال کی عمر میں وہ بھلا شادی کے حوالے سے کس طرح سوچ سکتی تھی۔

☆☆☆

''بوا آپ نے یہ کیا، کیا...... میں بھلا کیسے شادی کر سکتی ہوں۔'' رات وہ ناراض، ناراض سی کہہ رہی تھی۔ جب بوا بیگم نے حیرانی سے اس کی برہم صورت دیکھی۔

''کیوں...... تم کیوں نہیں شادی کر سکتیں؟'' کافی دیر بعد انہوں نے پوچھا تھا۔ جب اس نے شا کی نظریں اٹھائیں۔

''میرے زخم ابھی تازہ ہیں اور پھر میری عمر، میری ادھوری تعلیم...... میرا دل تیار نہیں ہے کسی بھی نئے رشتے کے لیے، اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے آپ کو مجھ سے ضرور پوچھنا چاہیے تھا۔'' وہ خفا خفا سی بولی جب بوا بیگم نے متاسفانہ اس کی طرف دیکھا۔

''کیا پوچھتی میں تم سے۔ یہی کہ میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں اور میں تمہیں اکیلا کس کے سہارے چھوڑ کر جاؤں یا پھر یہ کہ فاری کیا تم اکیلی اس ظالم دنیا کا مقابلہ کر سکو گی...... تمہاری عمر بڑھنے تک اور تعلیم مکمل ہونے تک تمہاری بوا بیگم زندہ رہیں گی؟ تمہیں بے سہارا چھوڑ کر تو تمہاری بوا مرنے کے بعد بھی بے چین رہے گی۔ کیا منہ دکھائے گی تمہارے مما، پاپا کو...... کیا جواب دے گی ان کے سوالوں کا جب وہ پوچھیں گے کہ ان کی لاڈلی کو میں کس کے سہارے چھوڑ کر آئی ہوں۔'' بوا بیگم دکھ سے بوجھل آواز میں روتے ہوئے بولیں تو وہ بھی ان کے قریب آ کر بلک، بلک کر رو دی۔ بوا بیگم نے آہستہ سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور پھر وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا۔ رات بوا بیگم سوئیں تو صبح اٹھ نہ سکیں۔ وہ وحشت سے بت بنی کتنی دیر بے یقین سی ان کے بے جان وجود کو دیکھتی رہی تھی۔

بوا بیگم کی جدائی، تنہا رہ جانے کا خوف، اب کیا ہوگا کا ڈر...سب نے مل کر اسے اتنا ہراساں کر دیا کہ اس کے آنسو بھی جیسے اس خوف کی زد میں آتے منجمد ہونے لگے۔ گھبراہٹ، بوکھلاہٹ، بے بسی، لاچاری نے اسے اندر تک سراسیمہ کر ڈالا تھا۔ جہاں وہ ازحد سہم گئی تھی وہیں اس کے اردگرد کا ماحول اِک خاموشی اِک چپ اور سپاٹ سناٹے کی لپیٹ میں آنے لگا۔ وہ اکیلی کس طرح بوا بیگم کو ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچا سکتی تھی۔ کیا وہ باہر نکل کر چیخے، چلّائے یا پھر ہمسایوں کو مدد کے لیے پکارے، صحیح معنوں میں وہ اب تنہا ہوئی تھی۔ پھر ڈوبتے کو تنکے کے سہارے کے مصداق اسے یکلخت آنٹی نفیسہ کا خیال آیا تو وہ تیزی سے بوا بیگم کی نیلے کلر والی ڈائری کی طرف بڑھی اور پھر ان کا نمبر ملانے لگی۔ فون کسی مرد نے اٹھایا تھا۔ وہ حواس باختہ سی روتے ہوئے بوا بیگم کے بارے میں بتانے لگی۔ ٹھیک 20 منٹ کے بعد آنٹی نفیسہ 30، 31 سال کے دراز قامت ڈیسنٹ نوجوان کے ساتھ اندر داخل ہوئی تھیں۔

''آنٹی...... میری بوا......'' وہ بھاگتے ہوئے ان کی طرف بڑھی اور پھر اُن کے سینے سے لگی بلک، بلک کر رو دی۔

صائم جہانگیر نے مما کی بانہوں میں تڑپتی روتی اس چھوٹی سی لڑکی کو حیرت سے دیکھا تھا۔ جس بات کی طرف اس کا دماغ اشارہ کر رہا تھا دل اسے ماننے سے قاصر نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆

''مما یہ آپ نے کیا، کیا؟''

''کیوں کیا ہوا......؟''

''کیوں، آپ نہیں جانتی کہ کیا ہوا ہے۔'' ان کے تجاہلِ عارفانہ برتنے پر وہ بڑی سنجیدگی سے گویا ہوا۔ جب سے اس نے فاریہ کو دیکھا تھا بے چین سا ہو گیا تھا۔ ''میری اور اس کی عمروں میں فرق دیکھا ہے آپ نے؟''

''میں نے اس بارے میں فاخرہ سے بات کی تھی مگر جب اسے کوئی اعتراض نہیں تھا تو پھر میں کس طرح اعتراض کرتی۔''

''یہ سراسر غلط ہے مما، وہ معصوم سی بچی اور میں......'' وہ بے حد سنجیدہ ہو چکا تھا۔

''مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا صائم اور پھر جب فاریہ کو کوئی اعتراض نہیں ہے تو پھر تمہیں کیوں پرابلم ہو رہی ہے اور ویسے بھی مرد جتنا بھی بڑا ہو ایک وقت آتا ہے جب عورت اس کی ہم عمر نظر آنے لگتی ہے۔'' انہوں نے اپنی طرف سے جیسے بات ختم کرنی چاہی۔

''یہ ٹھیک نہیں ہے مما اور اسے دیکھنے کے بعد مجھے نہیں لگتا کہ مجھے اس سے شادی کرنی چاہیے۔ بارہ تیرہ سال کا ایج ڈیفرینس کوئی کم نہیں ہوتا۔''

''کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا صائم کہ اب وہ تمہاری منگیتر ہے، تمہاری عزت ہے اور دوسرے اس بھری دنیا میں اللہ کے بعد تمہارے سوا اس کا کوئی سہارا نہیں ہے۔'' بیٹے کے تیور دیکھتے ہوئے انہیں بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔

''مگر...... مما......''

''کوئی اگر مگر نہیں۔ اگر وہ تمہیں پسند نہیں ہے یا پھر اس میں کوئی خامی ہے تو پھر تمہارے انکار کا جواز بنتا ہے لیکن اگر تم محض عمروں کے فرق کو مدِ نظر رکھ کر اس معصوم یتیم بچی کے ساتھ ناانصافی کرو گے تو یہ ٹھیک نہیں ہو گا اور میں بھی برداشت نہیں کروں گی۔'' وہ جز بز سی کمرے سے نکل آئیں تو اس نے مضطرب ہو کر دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

اسے آنٹی نفیسہ کا بہت سہارا تھا، بوا بیگم کی دور اندیشی اور باریک بینی کا اسے اب احساس ہو رہا تھا اور اگر اس مشکل وقت میں آنٹی نفیسہ کا آسرا بھی نہ ہوتا تو...... واقعی اللہ بہت بڑا مسبب الاسباب ہے۔ اس نے ابھی نمازِ ظہر ادا کی تھی جب ملازمہ نے اسے صائم جہانگیر کے آنے کی اطلاع دی، وہ آہستہ سے سر اثبات میں ہلاتے اس کے پیچھے ہی چل پڑی۔ دل کسی انوکھی لے پر نہیں دھڑکا تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ قدرے مطمئن تھی۔

''السلام علیکم!'' ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی اس نے سلام کیا تو وہ جو اپنی سوچوں میں گم تھا یکلخت چونکا، سفید دوپٹے کو نماز کی صورت لپیٹے اس کے پاکیزہ معصوم چہرے پر جیسے اس کی نظریں ٹھہر سی گئیں۔ کئی پل سرک گئے مگر اس کی نظروں کا ارتکاز نہ ٹوٹا۔ وہ نروس سی ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتے ہوئے صوفے کی طرف بڑھی تو اسے تبھی جیسے اپنی بے خودی کا احساس ہوا۔ نظروں کا زاویہ بدلتے اس نے بے ساختہ خود کو سرزنش کی تھی۔

''کیا لیں گے آپ...... چائے یا......؟''

خاموشی جب طوالت اختیار کرنے لگی تو گھبراتے ہوئے اسے ہی بولنا پڑا۔

''کچھ نہیں...... ایکچوئیلی مجھے آپ سے ضروری بات کرنی تھی۔''

''جی کہیے، میں سن رہی ہوں۔'' وہ ہمہ تن گوش ہوئی۔

''کیا آپ اس رشتے سے خوش ہیں؟'' گہری سیاہ نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور سر جھکائے وہ جیسے اپنے اندر جھانک رہی تھی۔ اب وہ اسے کیسے بتاتی کہ وہ اس رشتے سے خوش نہیں ہے مگر یہ رشتہ اس کی واحد ضرورت بن گیا ہے، اکیلے ہو جانے کے خوف نے اسے اس قدر ہراساں کر دیا ہے کہ اس نے اس رشتے کے حوالے سے اب خود کو قدرے مطمئن ضرور کر لیا ہے۔

''لگتا ہے کہ میں نے بہت مشکل سوال پوچھ لیا ہے۔'' وہ جو اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا بغور جائزہ لے رہا تھا اس کے جواب نہ دینے پر بولا جبکہ گھبراتے ہوئے اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''جی...... نہ نہیں وہ تو میں......'' زور زور سے دھڑکتے دل کی دھڑکنیں اوپر سے اس کی یکسرے جیسی گہری نظریں وہ بوکھلاتی نہ تو کیا کرتی، بے ربطی ایسی تھی کہ کچھ بھی ٹھیک سے کہہ نہ پائی جبکہ وہ کہہ رہا تھا۔

''میرے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ آپ اس رشتے کے بارے میں کیا محسوس کرتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس رشتے کو ہمارے بڑوں نے جوڑا ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ اسے نبھانا ہم دونوں کو ہے اس لیے آپ کی رائے میرے لیے بہت اہم ہے۔ پلیز مجھے بتائیں۔'' اس کے اصرار پر آخر اسے بولنا ہی پڑا۔

''مجھ سے پوچھ کر ہی بوا نے آنٹی نفیسہ کو ہاں کی تھی۔'' نظریں جھکائے وہ مدھم سی آواز میں بولی۔ صائم جہانگیر کی نظریں جیسے اس کی لرزتی پلکوں اور سرخ عارضوں پر ٹھہر سی گئیں۔ بے شک وہ قدرت کا حسین ترین شاہکار تھی اگر درمیان میں یہ عمروں کا تفاوت نہ ہوتا تو اس وقت وہ خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان تصور کر رہا تھا۔

''اس کا مطلب آپ کو کوئی اعتراض نہیں۔''

''جی......!''

''اتنے زیادہ ایج ڈیفرینس کے باوجود بھی؟'' وہ نہ جانے کیوں مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا اس لیے کرید کرید کر پوچھ رہا تھا۔ فاریہ نے آہستہ سے پلکیں اٹھائیں۔ اس کی پلکوں کی نمی لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کی نظروں کی گرفت میں آئی تھی۔

''فاریہ پلیز جو آپ کے دل میں ہے مجھ سے شیئر کر لیجیے پلیز...... یقین کیجیے اس سے بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے جو چیز آپ کو ڈسٹرب کر رہی

وجوہات

سمجھوتوں پہ سمجھوتا کرنا پڑ جاتا ہے
مرتے مرتے بھی زندگی تجھے جینا پڑ جاتا ہے
کبھی شوہر، کبھی بیٹا تو کبھی باپ کے گھر
دو وقت کی روٹی کا قرض چکانا پڑ جاتا ہے
دہاڑیں مار کے رونے کو جب چاہے دل
مار کے جھاڑیں اسے ہنسانا پڑ جاتا ہے
دیتے ہیں دعا جنہیں اپنی بھی عمر لگ جانے کی
اپنے ہاتھ سے اُن کو بھی دفنانا پڑ جاتا ہے
مانگا ہو جس شخص کو شبِ قدر کی دعاؤں میں
زیست میں اس سے بھی دامن چھڑانا پڑ جاتا ہے

شاعرہ: عنبرین کاظمی اشک، فیصل آباد

ہے ایک بار کہہ کر تو دیکھیے'' یکلخت وہ بے چین ہو گیا تھا جبکہ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی اور اس کے بھیگے رخسار صائم جہانگیر کو تشویش میں مبتلا کرنے لگے۔ ''تو میرا شک درست ہے آپ اس رشتے سے خوش نہیں ہیں۔'' وہ از حد سنجیدگی سے کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔

''نہ...... نہیں...... نہیں ایسی بات نہیں ہے۔'' وہ بھی تیزی سے اٹھی تھی۔ ''پلیز میری بات سنیے۔'' کچھ تو ضرور تھا اس کی آنکھوں میں کہ صائم جہانگیر بے ساختہ ٹھٹکا۔ ''مجھے آپ سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں مگر......'' موٹی موٹی براؤن آنکھوں میں جیسے کوئی حسرت، کوئی التجا یا پھر کوئی گزارش مترشح تھی۔

مگر...... اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

''نہیں کچھ نہیں......'' وہ بے بس سی آہستہ سے نفی میں گردن ہلا گئی۔ رخساروں پر بہتے آنسوؤں اور نہ، ہاں کے درمیان معلق جواب نے صائم جہانگیر کو مشتعل سا کر دیا، وہ ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالتے ناراض سا لمبے لمبے ڈگ بھرتا بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ گیا جبکہ وہ حواس باختہ اس کے پیچھے لپکی تھی مگر وہ

سنی ان سنی کرتا گیٹ سے گاڑی نکال کر لے گیا اور وہ سراسیمہ سی وہیں بیٹھ کر رونے لگی۔

"یقیناً اب وہ منگنی توڑ دے گا اور......اور نہیں، نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔" وہ تیزی سے اٹھی اور اس کا موبائل نمبر ملانے لگی جو آنٹی نفیسہ نے ہی اسے دیا تھا۔ تیسری بیل پر ہی کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

"پلیز صائم واپس آئیں، مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔ آپ جو پوچھیں گے میں سچ، سچ جواب دوں گی پلیز...... یوں ناراض ہو کر نہ جائیں۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی جب دوسری طرف سے کال ڈسکنیکٹ کر دی گئی اور وہ گھٹنوں میں سر دے کر پھوٹ، پھوٹ کر رو دی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی اِک مانوس سے احساس کے زیر اثر اس نے سر اٹھایا تھا۔

"آپ......" صائم کو سامنے پا کر اس کے اندر مسرت بھرا احساس ابھرا تھا۔ بھیگی پلکوں اور مسکراتے ہونٹوں نے صائم جہانگیر کو لمحوں میں مبہوت کر دیا تھا اور محبت بہت خاموشی کے ساتھ اس کے اندر سرائیت کرتی گئی۔

"دراصل میں اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہوں اور......اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اتنا عرصہ میں تنہا نہیں رہ سکتی، مجھے سہارے کی ضرورت رہے گی، مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں اپنی الجھن شیئر کس سے کروں، میرے زخم ابھی تازہ ہیں، عمر کے لحاظ سے بھی اس رشتے کو نبھانا میرے لیے بہت مشکل ہے، مجھے بس تھوڑا وقت چاہیے ورنہ اور کوئی وجہ نہیں۔" وہ پلکیں جھکائے جھکائے بولی، صائم جہانگیر کے تنے اعصاب ایک دم ڈھیلے ہوئے تھے چہرے پر بھی نرمی چھانے لگی۔

"بس یہ ہی وجہ تھی؟"

"جی......" سر جھکائے ہی وہ سوں، سوں کرتی بولی...... معصومیت کی انتہا تھی ناک اور گال سرخ انار ہوتے اس کی دلکشی میں مزید اضافہ کرنے لگے۔ صائم کے ہونٹ دھیرے سے مسکرا دیے۔ یک دم ہی وہ اسے اپنی، اپنی سی لگنے لگی۔ دل اس کی تمام تکلیفوں اور اذیتوں کو خود میں جذب کر لینے کو مچلنے لگا۔

"اعتماد کا بہت بہت شکریہ......!" وہ جب بولا تو اس کی آواز بے حد نرم تھی۔ فاریہ نے بے اختیار پلکیں اٹھائیں اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا اسی پل آنٹی نفیسہ نے اندر قدم رکھا اور وہ اس پر ایک گہری نظر ڈال کر مما کی طرف متوجہ ہو گیا جنہیں اسے یہاں دیکھ کر خوشگوار سی حیرت ہوئی تھی۔

☆☆☆

اور پھر واقعی اس کی پریشانی کا صائم جہانگیر نے اتنا خوب صورت حل نکالا کہ وہ حیران سی رہ گئی۔ اِک سلونی شام اس کا نکاح صائم جہانگیر سے ہو گیا۔ وہ ایک رشتے کا مان لیے ہی صائم جہانگیر کے گھر داخل ہوئی تھی مگر اس نے رخصتی اس کی تعلیم مکمل ہونے تک ملتوی کر دی تھی۔ صائم جہانگیر کے فیصلے نے اس کے دل میں اس کا احترام اور بڑھا دیا تھا۔ نکاح ہوتے ہی بیشتر...... مشرقی لڑکیوں کی طرح اس نے بھی صائم کو ہی اپنا سب کچھ مان لیا تھا اور پھر جیسے، جیسے وہ اسے سمجھتی گئی اسے اس پر فخر ہوتا گیا۔ اس کی سہیلیاں بالیاں اس کی قسمت پر رشک کرتے نہ تھکتیں۔ اس کی ذرا سی پریشانی جہاں اسے متفکر کر دیتی وہیں اس کی مسکراہٹ اسے اندر تک آسودہ کر دیتی۔ اتنی کیئر اتنی محبت پر وہ جیسے حیران رہ جاتی۔ وہ اس کی کسی نازک آبگینے کی طرح حفاظت کرتا تھا۔ اپنی ہر خواہش پر اس کی خواہش کو ترجیح دیتا اور بعض اوقات تو اپنی بات پر اس کی بات کو فوقیت دینے سے بھی گریز نہ کرتا۔ کالج لے جانے اور لانے کی ذمے داری بھی اس نے اپنے سر لے رکھی تھی۔ اس کے معاملے میں وہ کسی ملازم پر بھی بھروسا نہیں کرتا۔ اتنی محبت پا کر فاریہ کی شوخیاں اور ضدیں دوبارہ لوٹ آئی تھیں۔ یقیناً صائم جہانگیر کے وجود سے قدرت نے اس کے تمام دکھوں کا مداوا کر دیا تھا۔ ہر گزرتے دن وہ اس کی مزید دیوانی ہوتی گئی اور وہ مزید مہربان۔

☆☆☆

وہ افسردہ سی لان میں بیٹھی تھی جب وہ آفس سے آتے ہی سیدھا اس کے پاس چلا آیا۔ آج وہ بہت تھک گیا تھا سارا دن کام میں بزی رہا۔

"کیا ہوا......؟" اس کے چہرے کی مسکراہٹ نے جیسے اسے اپنی تھکن بھلا دی۔

"نہیں کچھ نہیں۔" اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

"کچھ تو ہے ورنہ تم اتنی اداس نہیں ہوتیں۔" کرسی پر بیٹھتے اس نے اس کے مضمحل پژمردہ چہرے کی طرف تشویش سے دیکھا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں، آپ تو ایسے ہی پریشان ہو رہے ہیں۔" اپنے لیے اس کی پوزیسو طبیعت سے اچھی طرح وہ آگاہ تھی اسی لیے ہلکا سا مسکراتے ہوئے اسے مطمئن کرنے لگی۔

"او کے اگر تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں مگر ایک بات یاد رکھنا فاریہ تمہارے چہرے پر ٹھہری مسکراہٹ میری ساری تھکن دور کر دیتی ہے اور تمہارے چہرے پر چھائی افسردگی مجھے کسی نادیدہ تھکن میں مبتلا کر دیتی ہے۔"

"آئی ایم سوری...... بس ایسے ہی دل کچھ افسردہ سا ہو رہا تھا۔" اسے اس بات کا اچھی طرح احساس تھا اسی لیے معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔

"او کے پھر چلو، باہر کہیں گھوم کر آتے ہیں۔" وہ یکلخت اٹھ کھڑا ہوا۔

"نہیں رہنے دیں، آپ بہت تھکے ہوئے ہیں۔"

"مگر یار میری تھکن کا تو ایک ہی علاج ہے۔"

"کیا......؟" وہ حیران ہوئی۔

"تمہاری مسکراہٹ......" وہی گہری سیاہ بولتی نظریں...... وہ سر جھکائے مسکرا دی۔

"ویری گڈ...... چلو اب اچھے بچوں کی طرح بغیر کوئی سوال جواب کیے میرے پیچھے، پیچھے آ جاؤ۔"

"میں بچی نہیں ہوں۔" نہ جانے کچھ عرصے سے کیا ہوا تھا وہ جب بھی اسے چھوٹے بچے کی طرح ٹریٹ کرتا وہ تپ جاتی۔ اب بھی اس کے ساتھ چلتے تیزی سے بولی تھی۔ اس نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ بے بی پنک کلر میں وہ کھلی کھلی سیدھی اس کے دل میں اتر رہی تھی۔

"میرے لیے نئی اطلاع ہے۔" وہ اسے چڑانے کو بولا اور وہ واقعی چڑ گئی۔

"میں واقعی اب بچی نہیں رہی۔"

"تو......؟" وہ لب دبا کر مسکراہٹ روکتا جیسے انجان بن کے بولا۔

"تو یہ کہ بڑی ہو گئی ہوں۔" اس نے گردن گھما کر بغور اس کی طرف دیکھا۔ اس کے دیکھنے کے بدلتے انداز نے یکلخت اس کی فراٹے بھرتی زبان کو بریک لگایا تھا۔ سرخ چہرے کے ساتھ وہ آہستہ سے سر جھکا گئی جبکہ وہ معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھ کر ہنسا۔

"واقعی اب تم بڑی ہو گئی ہو۔" جہاں جملہ ذو معنی تھا وہیں لہجہ بھی یکسر بدلا ہوا تھا۔ وہ بے ساختہ شپٹائی تھی جبکہ وہ گاڑی کا دروازہ کھولتے دھیرے دھیرے مسکراتا اس کے گھبرانے سے محظوظ ہوتا رہا۔

☆☆☆

وہ مطمئن، آسودہ و مسرور سی بیٹھی چاند کو تک رہی تھی جب اپنے پیچھے سرسراہٹ محسوس کر کے پلٹی۔

"آپ......" اس کے ہونٹوں پر ابھرنے والی مسکراہٹ اتنی خوب صورت تو ضرور تھی کہ اس کی نظروں کو جکڑ سکتی۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟"

"دیکھ رہا ہوں تم روز بروز خوب صورت ہی ہوتی جا رہی ہو۔"

"میں پہلے بھی اتنی ہی خوب صورت تھی جناب۔" اس کی والہانہ نظروں سے نظریں چراتے وہ ایک بار پھر سے چاند کو دیکھنے لگی جبکہ اس نے اس

کے معصوم پُرکشش چہرے سے ایک پل کے لیے بھی نظریں نہیں ہٹائی تھیں۔

''میں تم سے کچھ پوچھنے آیا تھا۔''

''کیا......؟''

''یہی کہ اب مجھے اور کتنا انتظار کرنا پڑے گا جبکہ تمہارا گریجویشن بھی کمپلیٹ ہوگیا ہے۔'' وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے جیسے مکمل فرصت میں کھڑا تھا جبکہ اس کے دل کی دھڑ دھڑ سینہ چیرتے باہر آنے کو مچل رہی تھی۔ وہ کانوں کی لوؤں تک سرخ انار ہوگئی تھی۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے فاری؟''

''مجھے نہیں پتا۔'' اس کی نظروں کی وارفتگی نے اسے بے انتہا نروس کردیا۔

''کیوں، تمہیں کیوں نہیں پتا......جبکہ تمہاری خواہش کا احترام کرتے ہی میں اب تک کنوارہ ہوں۔''

''کنوارے تو نہیں آدھے شادی شدہ ہوچکے ہیں۔'' اس کی زبان سے ایک دم پھسلا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے بے اختیار زبان دانتوں تلے دبائی جبکہ صائم جہانگیر اس کے دونوں ہاتھ تھامتے گویا ہوا۔

''میں اب آدھا نہیں پورا شادی شدہ ہونا چاہتا ہوں۔'' اس کی لرزتی پلکوں کو نظروں کی گرفت میں لیے وہ بولا۔ اس کے لہجے میں جہاں اسے بے پناہ محبت محسوس ہوئی وہیں شاید کوئی حسرت یا پھر خواہش۔

''میں بقرعید کے فوراً بعد رخصتی چاہتا ہوں، تمہارا کیا خیال ہے؟'' اس نے اس کے ہاتھوں کو دبایا۔ ایک وقت تھا جب اس نے اس کی خواہش کا مان رکھا تھا اور آج اس کی باری تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ انکار کرے گی تو وہ اب بھی زبردستی نہیں کرے گا۔ آخر اتنے عرصے میں اتنا تو وہ اسے جان ہی گئی تھی۔ اس کی خواہش پر اس نے ہر بار اپنی خواہش کو دبایا تھا۔ وہ ایم اے کرنا چاہتی تھی مگر نہ جانے کیوں آج دل اور ہی راگ الاپ رہا تھا اس بار دل اس کی خواہش پر اپنی خواہش قربان کرنے پر خوشی، خوشی تیار تھا۔

اس نے دھیرے سے پلکیں اٹھائیں اور پھر اس کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ نکالتی تھوڑا فاصلہ پیدا کرتی بولی۔

''ایک شرط پر مانوں گی۔''

''کیا؟'' اس نے بے قراری سے پوچھا۔

''شاپنگ ساری میری پسند کی ہوگی۔''

''بس......؟'' وہ ہنسا۔

''جی نہیں......اور بھی کچھ ہے۔''

''اچھا......وہ کیا؟''

''ہنی مون پر بھی میں اپنی پسند کی جگہ پر جاؤں گی۔''

''اور کوئی حکم......؟'' دونوں ہاتھ سینے پر باندھے وہ جیسے محظوظ ہوا جبکہ اس کی معنی خیز بولتی نظروں سے راہِ فرار اختیار کرتی وہ تیزی سے سیڑھیوں کی طرف لپکی تھی جب اس کی کلائی اس کے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں آگئی۔

''تم سچ کہہ رہی ہوناں...... واقعی تمہیں کوئی اعتراض نہیں۔'' وہ بے یقین سا بولا۔

''جی جناب، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔''

''اور تمہارا ایم اے؟'' اِک خدشے کے تحت اس نے دوبارہ پوچھا۔ اس کی پڑھائی کی لگن سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔

''وہ شادی کے بعد بھی کیا جاسکتا ہے۔'' بے پروائی سے کہتے اس نے یک دم زبان دانتوں تلے دبائی مگر فائدہ کوئی نہ تھا تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس کی لودیتی مسکراتی نظروں نے اسے اتنا نروس کردیا کہ وہ کلائی چھڑواتی تیزی سے نیچے کی طرف دوڑی جبکہ وہ دونوں ہاتھ بالوں میں پھیرتے دھیرے سے مسکرادیا واقعی زندگی نے اسے اس کی توقع سے بڑھ کر نوازا تھا۔



سحرِ عیدِ قرباں

رفاقت جاوید



''شبینہ عید کی چھٹیوں اور عید کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کہاں گزاری جائیں؟'' عبداللہ نے چائے کا سپ لیتے ہوئے نہایت لگاوٹ سے کہا۔

''میں نے تو سوچ رکھا ہے کہ چھٹیاں اسی گھر میں اور عید اپنے میکے میں...... اپنے تمام رشتے داروں کے ساتھ گزارنے کا پروگرام ہے۔ تم نے کیا سوچا ہے؟'' شبینہ نے ٹوسٹ پر مکھن لگاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا تو عبداللہ تھوڑا سا چونکا۔ قدرے

حیرت میں بھی ڈوبا۔

”تم نے تو میری بھابیوں والی ہی بات کی ہے، ہمیشہ عید سے پہلے ان کے گھروں کا ماحول سوگوار ہو جاتا ہے، مقابلے میں کوئی ہار ماننے کو تیار نہیں ہوتا اور آخر مجبوراً عورت کو ہی ہتھیار ڈال کر سفارتی تعلقات کو درست کرنا پڑتا ہے۔“ وہ بھی سنجیدگی سے بولا۔ ”اور بہنوں کا بھی یہی حال ہے، شنوائی ان کی بھی نہیں ہوتی۔ تم بھی ذرا سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری پہلی عید ہی بدمزگی اور ناراضی کا شکار ہو جائے۔“

”شادی کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ اپنے خونی رشتوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے۔ وہاں سب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مجھے روکنے کی کوشش مت کرنا پلیز...... میں رکنے والی نہیں ہوں، میں نے اپنی بہنوں اور بھابی کو ہر عید پر روتے تڑپتے دیکھا ہے۔ کیا مجال کہ شوہر کا دل موم ہو جائے اور ساس سے اجازت مل جائے۔ عید نہ ہوئی آزمائش ہوگئی۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔ ”اصولاً عید اپنے، اپنے میکے میں سیلیبریٹ کرنی چاہیے۔“

”یہ تم کہہ رہی ہوں ناں، ہمارے ریت اور رواج اس کی اجازت نہیں دیتے۔“ وہ نرمی سے بولا۔

”دیکھو میرے والدین یعنی تمہارے ساس سسر ہمارے انتظار میں نظریں دروازے پر جمائے بیٹھے ہوں گے۔ اس بار تو ہر صورت ان کے ساتھ ہی عید منائی جائے گی۔ اگلی عید تمہارے میکے میں سہی...... میں تمہارے بہنوئی اور بھائی جیسا روایتی شوہر نہیں ہوں۔ ہم نے ایک دوسرے کو سمجھنے میں نہ تو زیادہ دیر لگائی نہ ہی ایڈجسٹ ہونے میں کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اب اس مسئلے کو بھی خوشی، خوشی حل کر لیا جائے تو ہم سب کے لیے بہت خوب رہے گا۔“ وہ پیار سے بھرے لہجے میں بولا مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

”دوسرا مسئلہ یہ بھی تو ہے کہ ہم دونوں کی پہلی عید جدائی اور دوری میں کیونکر گزرے۔ ایک ساتھ جینے مرنے کے وعدے کیے ہیں کوئی مذاق نہیں...... بس میں نے تو فیصلہ کر بھی لیا اور تمہیں سنا بھی دیا اور عمل کرنا تمہارا فرض ہے۔“

”ایسا ہرگز نہیں ہوگا...... تمہارا یکطرفہ فیصلہ نامنظور...... مجھے عید اپنوں میں منانی ہے۔“ وہ کسی ضدی بچے کی طرح بولی۔

”یار میرے لیے مشکلات کھڑی مت کرو، سمجھنے کی کوشش کرو، برادری سسٹم کی کچھ ریکوائرمنٹس ہمیں پوری کرنی پڑتی ہیں۔ اس لیے تمہارے انکار یا کسی اعتراض کی گنجائش نہیں۔“ لہجہ مستحکم تھا۔ شبینہ کے مزاج میں تلخی آگئی۔

”پچھلے دو ہفتوں سے عید اور قربانی کی رٹ کسی ناسمجھ اور نادان بچے کی طرح لگائے جا رہے ہو خدا کے لیے بڑے ہو جاؤ۔ اگر چھوٹے ہی رہنا تھا تو شادی کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اماں کے گھٹنے پکڑ کر بیٹھے رہتے۔ خواہ مخواہ مجھے امتحان میں ڈال دیا۔ بہنوں کے حال سے میں نے سبق تو سیکھ ہی لیا تھا مگر تمہاری اماں نے جان ہی نہ چھوڑی...... اور تم بھی کیسی بھیگی بلی بن کر بیٹھے ہوئے تھے۔ افسوس کہ تم نے بلی سے شیر بننے کا فاصلہ بہت سرعت سے طے کر لیا۔ اٹ از آ بگ سرپرائز فارمی۔“ وہ زہر آلود لہجے میں بولی تو عبداللہ نے جاندار قہقہہ لگایا۔

”بھئی جاہل عورتوں والی لعن طعن تمہیں زیب نہیں دیتی۔ چلو دونوں مل کر ایسا پروگرام بناتے ہیں جس میں ہمیں ایک دوسرے سے شکایت بھی نہ ہو۔ مابدولت بھی خوش اور محترمہ بھی شاداں...... اور ہمارے ماں باپ بھی پُرسکون۔ بیک وقت اتنے سارے لوگوں کا خوش ہو جانا کسی معجزے سے کم نہیں۔ پھر بھی ہم دونوں عقل کے گھوڑے دوڑا دیکھتے ہیں۔“ وہ اس کے غصے کو نظر انداز کر کے

ملائمت سے بولا۔

”پلیز عبداللہ بی سیریس، میرا دل بجھ سا گیا ہے۔“ وہ خفگی کے انداز میں بولی۔

”میرا دل جواں بھی ہے اور بھڑک بھی رہا ہے کیونکہ پہلی چھٹی کی حسین صبح اپنے ساتھ بے پناہ رعنائیاں لے کر نمودار ہوئی ہے نہ تو افراتفری کا عالم ہے نہ ہی بھاگم دوڑی کا سین...... بہت اچھا لگ رہا ہے، تمہارے ہاتھ کا ناشتا تمہارے ساتھ کرتے ہوئے یقین جانو چائے میں شوگر کے بغیر بھی شہد جیسی مٹھاس ہے۔“ وہ ہنسی دباتے ہوئے بولا۔

”میں تمہاری ایسی بے جا تعریفوں میں آنے والی نہیں ہوں۔ چلو ذرا میرے لیے چائے دم کر دو۔ ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا کہ میری چائے میں کڑواہٹ ہے کہ حلاوت......“ وہ موڈ کو خوشگوار کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”ہم بدنصیبوں کے ہاتھ میں چاشنی کہاں؟ میرے رب نے تو یہ انعام بیویوں کو ہی بخشا ہے۔“ وہ اک لمبی آہ بھر کر بولا۔ ”جس پر تمہاری نوکری کنڈلی مارے بیٹھی ہے۔“

”جناب رب نے ایسے بے حساب انعامات شوہروں کو بھی بڑی فراخدلی سے عنایت فرمائے ہیں، تم استعمال کرنے کی کوشش تو کرو۔ آج لنچ کے بارے میں کیا خیال ہے، تمہارے ہاتھ کی بنی ہوئی بریانی کی مہکتی خوشبو اور اشتہا انگیز مہک اس کالونی میں ایسے پھیلتی ہے جیسے سورج کی روشنی...... عبدی آج تم دیگچا بھر کر بریانی تو بنا دو۔ آس پاس کے لوگوں کو بھی چھٹی کی خوشی میں عیاشی کرا دیتے ہیں۔ چلیں چھوڑیں بس ان فضول بحثوں کو...... ایسی گفتگو کا اختتام لڑائی جھگڑے پر ہی ہوتا ہے۔ ایسے ڈرامے میں نے بہت بار دیکھے ہیں۔“ وہ خوشامدانہ لہجے میں بولی۔

”یہ خوب رہی...... آج لنچ تم بناؤ گی، تمہاری چھٹی ہے بھئی، میری طرف سے دیگ اتار لو اور محلے بھر میں اپنی خوشی کی منادی کرا دو۔ مجھے قطعاً اعتراض نہیں ہوگا۔ ذرا ان چھٹیوں کو شوہرِ نامدار کی خاطر داری میں گزار کر ثواب ہی کما لو۔ ایسا سنہری موقع تو تمہیں کم ہی ملتا ہے۔ اس بار ضائع کر دیا تو گناہ گار، نافرمان اور ظالم ٹھہرائی جاؤ گی۔“ وہ محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔

”دیکھو جانِ جاناں......! میری ڈیوٹی تم سے ہزار درجے زیادہ سخت اور ڈیمانڈنگ ہے۔ ہفتے کے چھ دن مجھے اپنا تو ہوش ہوتا نہیں۔ تمہاری خدمت گزاری کرنے کا میرے پاس وقت ہی کہاں ہے۔ جبکہ تم ہفتے کے پانچ دن کام کرتے ہو...... باقی دو دن سو کر اور فلمیں دیکھ کر گزارتے ہو۔ میں اپنی سنڈے کی چھٹی بھی گھر کے کاموں میں گزار دیتی ہوں۔ نہ سونے کا وقت ملتا ہے نہ ہی آرام کا۔ بس کولھو کا بیل بن کر رہ گئی ہوں پھر بھی مجھے گناہ گار ٹھہراتے ہو، ویسے مجھے کون سا تمہارے ان طعنوں و تشنوں کی پروا ہے۔“ وہ چڑ کر بولی۔

”تمہاری اپنی چوائس ہے بھئی...... میری طرف سے تم آج گھر بیٹھ جاؤ، دیکھنا اپنے رول کو پہچاننے کے بعد تم خود کو اس گھر کی رانی محسوس کرنے لگو گی۔ چھوڑو یار کیا رکھا ہے نوکری میں، عورت کی کمائی میں برکت ہی کہاں ہوتی ہے۔“ وہ شریر لہجے میں بولا۔

”میں نے یہ ڈگریاں چولھے میں جھونکنے کی خاطر حاصل نہیں کیں۔ ان کے حصول میں میری شب و روز کی محنت اور لگن شامل ہے۔“ وہ جل کر بولی۔ ”گھر بیٹھ جاؤ۔ ایسا بے ہودہ مذاق مجھے بالکل پسند نہیں۔ بن جاؤں نوکرانی‘ دو ٹکے کی مہترن اور دھوبن...... یہ سب نہیں ہوگا۔ میری بہنوں نے یہی تو غلطی کی۔ جس کا خمیازہ آج تک بھگت رہی ہیں۔“

”تو پھر واویلا اور رونا دھونا کیسا......؟ حالانکہ میں ہر قدم پر تمہارا ساتھ دینے کو تیار رہتا ہوں۔ ذرا سوچو کہ تم سسرال میں رہ رہی ہوتیں تو نہ میں تمہارا ہاتھ بٹا سکتا، نہ ہی ماما کو سمجھا بجھا کر دھیما کر سکتا۔

وہاں تمہیں گھر کی تمام ذمے داری طوعاً وکرہاً خود ہی اٹھانی پڑتی۔ چاہے تم صبح کی گئی شام کو گھر واپس کیوں نہ آتیں۔ ڈنر کا انتظام تمہیں ہی کرنا پڑتا...... سب کو ناشتا دینے کے بعد تمہیں آفس جانے کی اجازت ملتی۔ جوائنٹ گھروں میں ایسے ہی اصول چلتے ہیں ناں...... پھر میں دیکھتا کہ تم نوکری چھوڑتیں یا مجھے۔'' وہ کہہ کر ہنسا تھا پھر مزید بولا۔

''تم بڑی ہی خوش قسمت ہو کہ ہماری نوکری دوسرے شہر میں ہے۔ ورنہ جوائنٹ فیملی سسٹم کے ہتھے چڑھ گئی ہوتیں تم تو تیر کے مانند سیدھی ہو جاتیں۔''

''تو میں سسرال میں کاہے کو رہتی۔ شادی تم سے ہوئی ہے تمہاری ماما سے نہیں...... اور سن لو کان کھول کر میں جاب چھوڑتی، نہ ہی تمہیں چھوڑتی۔ تمہاری ماما کو ناکوں چنے چبوا دیتی اور وہ ہاتھ جوڑ کر مجھے الگ کر دیتیں۔ ایسی بھی مصری کی ڈلی نہیں ہوں کہ جو چاہے منہ میں ڈال لے۔'' وہ چڑ کر بولی تھی۔

''تم خاندان بھر میں میری ناک کٹوا دیتیں، لگتا ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا تمہیں۔'' وہ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔ ''بھئی بہت بری زبان ہے تمہاری۔''

''میری تعلیم کا مقصد اپنی جگہ قائم ودائم ہے جناب...آپ سمجھنے کی کوشش تو کریں۔ میں تمہارے شانہ بشانہ چل کر زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش میں برابر کی شریک ہوں تو تمہیں میرے دم قدم چلتے ہوئے اتنی شرمندگی، پچھتاوا اور سُبکی کیوں محسوس ہو رہی ہے۔ بڑے افسوس کا مقام ہے اور جان لو کہ فضول رعب داب اور خالص شوہرانہ رویّہ اور سلوک روا رکھنا پرانے وقتوں کی باتیں ہیں۔ اب ہم نئے دور کے ماڈرن، تعلیم یافتہ اور سوجھ بوجھ رکھنے والے نمائندے ہیں۔ یہ مت بھولو کہ تم سے میری تنخواہ کم ہے نہ ہی تعلیم۔ حالات کے پیشِ نظر ملازم تک تو رکھ نہ سکے۔ اس لیے نوتڑی۔'' وہ بھویں چڑھا کر بولی اور ڈائننگ چیئر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کہاں جارہی ہو؟ عید کا پروگرام بنانے سے بات شروع ہوئی تھی، تم کہاں سے کہاں پہنچ گئیں، ماما بھی عمر بھر ایسی ہی نامناسب باتوں سے پپا کو تنگ کرتی رہیں۔ بتاؤ کہ ان میں اور تم میں فرق کہاں ہے۔ عورت کی فطرت کو تعلیم تو کیا اوپر والا بھی نہیں بدل سکتا اور یہ ناچیز جسے تمہارا شوہر کہا جاتا ہے بالکل ہی ناکام ہو گیا۔'' وہ شکست خوردگی سے بولا۔

''تمہارا عید کا پروگرام فلاپ ہے اور اگر مجھے پریشرائز کرنے کی کوشش کی تو یہ چھٹیاں خاموشی اور ناراضی کی نذر ہو جائیں گی مگر سسرال نہیں جاؤں گی۔ یہی میرا حتمی فیصلہ ہے۔'' وہ جلتے ہوئے روکھے پن سے بولی تو وہ اسے حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

''بیٹا! کیسی عجیب باتیں کرتی ہو؟ بیوی وہ بھلی جو شوہر کی کسی بات کو نہ جھٹلائے۔ اس کے دل کی بات کو پل بھر میں جان لے اور فوراً اس پر عمل کرے۔ شادی کے بعد کی پہلی عید سسرال میں ہی منانا بہتر ہے۔ بے شمار مثالیں تمہارے سامنے ہیں، اپنی بہنوں، بھابیوں اور اپنی سسرال میں نندوں اور جیٹھانیوں کو دیکھو۔'' وہ فون پر اسے فکر مندی سے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں اور وہ تھی کہ قیل وقال پر اتری ہوئی تھی۔

''امی! میں ان رسم ورواج پر قطعاً یقین نہیں رکھتی۔ کم از کم اپنی اس پوزیشن میں...... اپنی تنخواہ گھر پر صرف کر دیتی ہوں ان سے بے جا طلب نہیں کرتی، یہ بتائیں کہ آپ نے ان تمام بے جا اصولوں کو عمر بھر اپنائے رکھا ہے تو کون سا سسرال نے آپ کو ستارۂ صبر واستقلال کا تمغہ دے ڈالا؟'' وہ زچ ہو کر بولی۔

''وہ میڈل بے حساب صورتوں میں مجھے مل چکا ہے۔ تم جانتی ہو کہ بقر عید پر تمام خاندان میرے گھر جمع ہوتا ہے، یہ میری عزت افزائی ہے، خاندان کو یکجا

رکھنے والی عورت ہوتی ہے، تم اپنا اہم کردار کھو کر بے وقعت نہ ہو جانا۔ مجھے دیکھو کہ میں خود بھی خوش رہتی ہوں اور دوسروں کو بھی خوش رکھتی ہوں۔ مجھے اس سے بڑی نعمت اور کیا چاہیے کہ ہر عید پر میرے اس خاموش گھر میں محبتوں اور چاہتوں کا ریلا بہہ نکلتا ہے۔ تم میری مانو اپنے میاں کے ساتھ خوشی خوشی سسرال عید منانے جاؤ۔'' وہ پیار بھرے لہجے میں بولیں۔ ''بعد میں کسی دن دونوں ہمیں ملنے آجانا۔ کچھ اصول نبھانے بہت ضروری ہوتے ہیں بیٹا۔''

''ایسے ہونا ناممکن ہے امی...... زمانہ بدل چکا ہے، عبداللہ میرے ساتھ عید کے لیے اپنی سسرال جائے گا۔ یعنی میرے میکے اور آپ کے گھر...... کچھ ریتیں زمانے کے مطابق بدل جائیں تو نئے پن کا خوش کن احساس بہت بھلا لگتا ہے۔ اب ان گھسی پٹی فرسودہ رسموں کو میں الوداع کہہ چکی ہوں۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''مجھے قربانی کا بکرا مت سمجھیے۔''

''باؤلی ہو گئی ہو، تمہاری عقل تو بالکل ہی ماری گئی ہے۔'' وہ خفگی سے بولیں۔ ''خبردار جو عبداللہ کو تنگ کیا۔ اس گھر کی دہلیز نہ ناپنے دوں گی۔''

''ٹھیک ہے، میں آپ کے گھر نہیں آسکتی تو سسرال کیونکر جاؤں گی، میں اپنے اس چھوٹے سے گھر میں ہی عید مناؤں گی۔ وقت میرا غلام ہے، اسے اپنی مرضی کے مطابق گزاروں گی۔ جی بھر کر سوؤں گی...... آرام کروں گی...... آزادی کی خوشی مناؤں گی۔'' شبینہ مسرت آگین لہجے میں بولی۔

''اور قربانی کہاں گئی؟'' ماں نے اچنبھے سے کہا۔ ''اس کا کہیں ذکر نہیں آیا۔''

''امی آپ جانتی ہیں گھر میں اس قدر خون خرابہ مجھے ہرگز پسند نہیں۔ آپ کو یاد ہے ناں کہ ہر طرف سے گوشت کی بساند مجھے فاقہ کرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اب تو میں وہ کروں گی جو مجھے پسند ہے۔ میں نے ایدھی سینٹر قربانی کے پیسے بھجوا دیے ہیں۔ غریب غربا کو گوشت کی ضرورت ہوتی ہے، ہم ہیں کہ ان کے حصے میں چھیچھڑے اور اپنے لیے رانیں...... ویری سیڈ۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

''بیٹا مجھے تمہارے ان خیالات سے قطعاً اتفاق نہیں، اللہ خیر کرے، کل تمہارے بچے قربانی کی اہمیت کو کیسے جان پائیں گے؟ اگر تم نے ہر بار قربانی کی رقم کسی بھی چیرٹی ادارے کو دے دی تو......'' وہ افسوسناک لہجے میں بولیں۔

''اپنے گھر میں ایسا صدیوں پرانا فرسودہ عمل تو ہرگز نہیں چلے گا۔ مقصد ہے قربانی کا گوشت دوسروں تک پہنچانا۔ وہ باہر ہی باہر سے تقسیم ہو سکتا ہے۔ باقی بات رہی بچوں کی تو وہ بھی اسی باعزت طریقے سے قربانی کے فرائض سے سبکدوش ہوا کریں گے۔ آپ نے میرے ساتھ بہت برا کیا۔ ایک مہینہ پہلے سے ہی نامراد بکرے کا بھیں بھیں کا بے سُرا میوزک سنایا اور پھر مجھ سے اس کی خدمت گزاری بھی کروائی، مجھے اس سے اٹیچ منٹ ہونے کے بجائے گھن آنے لگتی تھی کہ اسے بچے جیسا لاڈ پیار دینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ آپ کے خیالات سے مجھے بالکل اتفاق نہیں کہ بکرے صاحب کی خاطر داری کارِ ثواب ہے اور پھر ظلم کی انتہا ہے کہ پھر کس بے دردی سے اپنی آنکھوں کے سامنے اس پر چھری پھروا دی جائے۔ کسی کو رتی بھر تکلیف نہیں ہوتی تھی بلکہ مزے کی اور بے حسی کی انتہا ہے کہ اسی پیاری اور معصوم سی ہستی کا گوشت تھوڑی دیر بعد چٹخارے لے لے کر کھائیں اور دوسروں کو بھی کھلائیں۔ دس از ناٹ فیئر امی۔ اب آپ مجھے دعوت بھی دیں گی تو میں آپ کے گھر نہیں آؤں گی۔ خواہ مخواہ اپنا چین وسکون غارت کر ڈالوں۔'' وہ نہایت تلخ لہجے میں بول رہی تھی اسی اثناء میں عبداللہ کمرے میں داخل ہوا۔

''کس سے بات ہو رہی ہے؟'' وہ قریب آکر نہایت لگاوٹ سے بولا۔

''امی سے بات ہو رہی تھی قربانی کے بارے میں۔'' وہ موبائل آف کرتے ہوئے بتانے لگی۔

''ہاں، میں بھی یہی پوچھنے والا تھا کہ ہمارے حصے کے دو بکرے پپا ہی خرید لیں ہماری طرف سے؟ آخر ہم نے عید تو انہی کے ساتھ ہی منانی ہے ناں۔'' وہ نرماہٹ سے بولا۔

''میں اپنا فیصلہ آپ کو سنا چکی ہوں کہ میں آپ کے گھر جاؤں گی نہ اپنے گھر...... اسی اپنی جنت کے چھوٹے سے ٹکڑے میں اپنی مرضی اور پسند کی عید مناؤں گی۔'' وہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ ''میں جانتی ہوں کہ برسرِ روزگار ہونے کی وجہ سے مجھ پر بھی قربانی واجب ہے سو میں نے ایدھی سینٹر رقم بھجوادی ہے...... آرام ہی آرام...... نہ قصائی کی منتیں نہ گوشت کا پھیلاوا۔ نہ ہی گندگی اور بدبو۔ نہ گھر، گھر گوشت تقسیم کرنے کی کوفت۔'' وہ ایک دم سے شگفتہ لہجے میں بولی۔

''جسے تم کوفت کہتی ہو، وہی تو ہماری رونق اور چہل پہل ہے، عیدیں تو تمام رشتے داروں سے ملنے کا اِک بہانہ ہیں، ورنہ سال بھر کسے اتنی فرصت مل پاتی ہے کہ عزیز واقارب اور دوست احباب سے ملاقات ہو پائے۔ شادی کے بعد ہم بھی عید کے بہانے سب کو مل لیں گے، مجھے تو اس دن کا انتظار ہے آئی ایم سو ہیپی۔''

''عبداللہ یہ سب غیر ضروری ہے۔ مجھے ایسی گہما گہمی سے الجھن ہونے لگتی ہے۔ چھٹیوں کا مقصد ہے جی بھر کر آرام کرو۔ سال بھر کی تھکن کو ختم کر کے آنے والے وقت کے لیے کمربستہ ہو جاؤ۔ تم ہو کہ بچپنا ہی نہیں جا رہا۔'' وہ اپنے تئیں بڑی عقل مندی کی باتیں کر رہی تھی۔ ''عبدی! اب ہم بالغ ہیں۔ زندگی کو اپنی مرضی اور پسند کے مطابق ڈھالنے کے ہم حقدار ہیں، ہماری پہلی عید اسی گھر میں گزرے گی۔ خوب موج مستی کریں گے اور سنو کھانے کی تمام ذمے داری میری ہوگی...... اور پسندیدگی میری جان کی۔ ابھی سے مجھے مینیو بتادو کہ کیا کھانا پسند کرو گے۔ وہی کھانا حاضرِ خدمت ہوگا۔ لسٹ بناتے وقت ایک بات کا خیال رکھنا کہ قربانی کے چربی زدہ گوشت کی کڑاہی کی فرمائش نہ کر دینا۔ باقی سب منظور ہے۔'' وہ خوشگوار لہجے میں بولی۔

''ہم یہاں تنہائی میں عید منائیں؟ کیسی عجیب اور انہونی باتیں کرتی ہو، یہ عید کی بہاریں ماما اور پاپا کی وجہ سے قائم ہیں، اس گھر کے دروازے انہی کی وجہ سے کھلے ہیں۔ تم بڑی ناسمجھی کی باتیں کر رہی ہو۔'' وہ حیران کن نظروں سے اسے گھورنے لگا۔ ''ذرا یہ تو بتاؤ کس سیارے سے تشریف آوری ہوئی ہے تمہاری؟''

''ہم دو ہیں پھر تنہائی کیسی؟'' وہ اس کے گلے میں بازو حمائل کر کے پیار بھرے لہجے میں بولی۔

''نان سینس...... میرے گھر میں سب ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے جبکہ تمہارے گھر میں تمہارا اور میرا منتظر کم از کم عید کے دن کوئی نہیں ہوگا۔ وہ لوگ معاشرے کے ساتھ چلنے والے وضع دار اور دنیا دار لوگ ہیں، جانتے ہیں کہ تمہاری عید سسرال میں ہی منانی ضروری ہے۔ تمہاری مصروفیت کی وجہ سے تمہارا ماما کی طرف جانا اور سب سے گھل مل کر رہنا ناممکن ہو گیا ہے۔ کم از کم اب تو ہم چھٹیوں کا صحیح استعمال کر سکتے ہیں۔ چند دن بزرگوں کی خدمت کرنے سے تمہارا اسٹرخاب کا پر ٹیڑھا نہیں ہو جائے گا۔'' وہ پُرملال انداز میں بولا۔

''عبداللہ...... چھوڑو ناں ضد...... دیکھو تمہیں ہر وہ کھانا کھلاؤں گی جو تم فرمائش کرو گے۔'' وہ اپنی بات پر اَڑی رہی پھر کچھ سوچ کر بولی۔

''ٹھیک ہے تم مجھے اکیلا، تنہا اور اداس چھوڑ کر جانا چاہتے ہو تو جاؤ، میں تمہیں نہیں روکوں گی کیونکہ شخصی آزادی ہر ایک کا حق ہے یہی فارمولا میرے لیے بھی ہونا چاہیے۔ مجھے ایک سوال کا جواب تو دو کہ ہر طرح کی آزادی صرف مرد کے لیے کیونکر لکھی گئی

ہے، میرے لیے کیوں نہیں؟'' وہ ایک دم پژمردہ ہو گئی، پتا نہیں وہ کس بحث میں پڑ گئی تھی کہ عبداللہ بھی اس کی باتیں سن کر حیران تھا۔

''یہ ری ایکشن ہے شبینہ...... اس فیز سے باہر نکل آؤ۔'' وہ بھی افسردہ سا ہو گیا۔ ''زندگی کی حقیقت اور سچائی کو قبول کرنے کی کوشش کرو، زندگی آسان اور سہل ہو جائے گی۔''

''عبداللہ جب تم نے مجھ سے شادی کا فیصلہ کیا تھا تو تم میری عام سی شکل صورت پر فریفتہ نہیں ہوئے تھے بلکہ تم میری تعلیم، خود اعتمادی اور خود مختاری پر مرمٹے تھے۔ تمہیں مجھ پر فخر تھا، آج تم مجھے برابری کا مقام دینے سے کیوں ہچکچا رہے ہو؟ دیکھو تنگ نظری محبتوں میں دراڑ ڈال دیتی ہے، اپنے ذہن وقلب کو وسیع کرو اور زمانے کی خواہشات، رسومات اور روایات کو نظر انداز کر کے زندگی کا ہر لمحہ شادمانیوں کے سپرد کر دو۔'' اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ نرمی سے بولی۔

''تعلیم کا مقصد اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کو پار کرنا ہر گز نہیں۔ جب اس معتبر ذات نے تمہیں میری برابری کا رتبہ نہیں بخشا تو میں کون ہوتا ہوں، تمہیں اپنے برابر کھڑا کرنے والا تم ہوش میں آؤ۔'' وہ تلخی سے بولا۔ بحث نہ جانے کہاں سے کہاں چلی گئی تھی۔ ''اس گھر کا سربراہ میں ہوں تم نہیں...... حاکم میں ہوں تم نہیں...... اگر تم چار پیسے کما کر یہ سمجھنے لگی ہو کہ ہم برابر ہیں تو بہتر ہے تم گھر میں رہ کر اپنی تمام تر ذمے داریوں کے بارے میں سوچو۔ سسرال کی خدمت کرو اور اس گھر کی چار دیواری میں میری رعایا بن کر زندگی گزارنے میں اپنی خوشی جانو۔'' وہ ہق دق اسے دیکھنے لگی۔ عبداللہ نے آج تک اس سے ایسے تلخ لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ ہمیشہ اس کا ساتھ دیا تھا۔ گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹایا تھا۔ جسے وہ اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی رہی تھی۔ اس کا احسان تک نہیں مانا تھا۔ اتنی حقیقت کے قریب باتیں سن کر وہ زیر ہونے والی کہاں تھی؟ فوراً اکڑ کر بولی۔

''جاؤ پھر کوئی گنوار بیوی لے آؤ جسے تم صبح شام تگنی کا ناچ نچاتے رہو گے تو بھی وہ مائنڈ نہیں کرے گی۔ تمہارے آگے باندی بن کر بچھ بچھ جائے گی۔'' وہ تنکی تھی۔

''کیا میں تم سے ایسی ناجائز اور غیر مناسب توقعات رکھتا ہوں؟ ہر گز نہیں لیکن کچھ اصولوں اور طریقوں کو اولیت ضرور دیتا ہوں، گھر کے تمام امور میں تمہیں میری طرف سے ہر طرح کی سپورٹ حاصل ہوگی۔ اس میں کمی نہیں آئے گی۔ تمہیں شوہر کے حقوق سے آگاہ ہونے کا درس اپنی اور میری ماں سے ضرور لینا ہوگا۔ ورنہ ہماری گاڑی کے پہیے جام ہو جائیں گے۔'' اس نے سختی سے کہا اور بیگ میں کپڑے پیک کرنے لگا۔

☆☆☆

''اُف گھر میں کتنی خاموشی اور اداسی ہے۔ رونق اور گہما گہمی کا احساس تو عبداللہ کی ذات سے وابستہ تھا۔ وہ کیا گیا کہ آرام کرنے کی چاہ ہی ختم ہو گئی۔ نہ نیند آتی ہے نہ ہی میوزک دل بہلا سکا اور نہ ہی مووی نے حوصلہ بڑھایا اور اس طنّاز نے بھی تو فون کر کے حال تک نہیں پوچھا۔ اپنی ماں کی آغوش

لاعلمی

ایک کنجوس نے اپنے دوست کو بتایا۔ ''میری بیوی بہت فضول خرچ ہے روز مجھ سے دو سو روپے مانگتی ہے۔''

دوست نے پوچھا۔ ''وہ ان پیسوں کا کیا کرتی ہے؟''

کنجوس بولا۔ ''مجھے کیا پتا کیا کرتی ہے، میں نے کون سے آج تک اسے پیسے دیے ہیں۔''

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

میں دودھ پیتا بچہ بن کر شاداں وفرحاں ہورہا ہوگا۔ کل عید ہے، تمام رشتے داروں کی موجودگی میں وہ میری ذرا سی بھی کمی محسوس نہیں کرے گا کیونکہ ان کے ساتھ اس کا جنم، جنم کا رشتہ ہے جبکہ میں تو چند مہینے سے اس کی زندگی میں شامل ہوں اور وہ وقت میں نے نوکری کی کلفتوں میں گزار دیا۔'' اچانک وہ گزرے وقت کا ناقدانہ جائزہ لینے لگی۔

''ہمارے درمیان ایک دوسرے کے قریب ہونے کا جواز ہی نہیں بنا کیونکہ میں نے ایسے لگاؤ اور پیار کی بنیاد ہی نہیں رکھی، صرف اس لیے کہ میری تنخواہ میرے تمام فرائض پر غالب آگئی اور ایک فرض شناس بیوی کے رول کو میں حقارت ونفرت سے دیکھنے لگی۔ شوہر سے عقیدت اور محبت پر میری ڈگریوں کی چھاپ لگ چکی ہے۔ بدقسمتی سے میرے جیسی بے حساب نادان لڑکیوں نے اپنے اسی غیر فطری رویّے سے مردوں کو تعلیم نسواں کے خلاف کردیا ہے۔ ہمارے لیے چادر اور چار دیواری کا انتخاب کرنے کی شہ شاید ہم نے انہیں خود ہی دی ہے۔ قصور صرف ان کا نہیں، گناہگار ہم بھی ہیں۔'' اس وقت وہ جانے کیا کیا سوچے جارہی تھی۔

وہ دو راتوں سے مسلسل جاگ رہی تھی۔ حالاتِ حاضرہ پر غوروخوض کرتے ہوئے دل کو بہلانے کی خاطر سو حیلے بہانے ڈھونڈے مگر ناکام رہی۔ وہ اس تنہائی میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ قصور تو اس کا بھی ہے۔ مجرم صرف عبداللہ نہیں۔

''میں تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ایک اناڑی، جاہل اور بے وقوف عورت کی طرح شوہر کی قربت کی متمنی اور دیوانی ہوں اور اس کی جدائی اور دوری میں ایسی جان لیوا اداسی ہے کہ پل بھر کو چین ہے نہ سکون...... یہی تو عورت کی کمزوری ہے، جسے مرد بخوبی جانتا ہے۔''

''شوہر سے مقابلہ کرنے نکلی ہو تو سامانِ جنگ ساتھ لے کر چلو۔ تمہاری کامیابی کا ہتھیار صبر اور خاموشی ہے۔ عبداللہ شریف النفس اور محبت کرنے والا خاوند ہے۔ اس کی قدر کرو، اسے شوہر کا رتبہ دو۔'' جیسے اندر سے کسی نے تنبیہہ کی ہے۔

''افسوس کہ مجھ میں وفا شعار، تابعدار اور محبتیں نچھاور کرنے والی بیوی کی ہلکی سی بھی رمق نہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ میرے گھر کا کچن باہر کے کھانوں کی ڈیلیز کا مرہونِ منت رہا۔ عبداللہ نے کبھی اعتراض نہ کیا، کبھی ناشتے کے لیے نہ جگایا نہ ہی اپنا ذاتی کام مجھ پر مسلط کیا۔ میرا بکھرا ہوا بے ترتیب گھر جہاں سے ضروری اشیا تلاش کرنے میں ہی کئی گھنٹے لگ جائیں، عبداللہ نے ہنس کر درگزر کرلیا۔ ہر سنڈے بریانی بنانا عبداللہ کا شغل تھا۔ مقصد اپنے کچن کو آباد کرنا تھا...... پھر بھی مجھے خیال نہیں آیا۔ اپنی انا کی کامیابی کے زعم میں، میں روز بروز مبتلا ہوتی چلی گئی اور اس کی نرمی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے شرم بھی نہیں آئی۔ میں ایسی کیوں ہوں، مڈل کلاس کی تمام ریتوں، رواجوں سے دور کیوں بھاگتی ہوں، عبداللہ سچ کہتا ہے کہ یہ دراصل ری ایکشن ہے، احتجاج ہے، ہمارے معاشرے میں بکھری ہوئی لاتعداد ستمگیریوں کا، پاؤں تلے روندنے کا...... مگر میرا طریقہ درست نہیں...... مجھے اپنے تمام فرائض کی ذمّے داری اٹھاتے ہوئے اس راہ کا چناؤ کرنا ہے جو میرے نسوانی وقار اور عزت وتحریم کو برقرار بھی رکھے...... اور تعلیم میرے ان حقوق کو پامال کرنے سے دوسروں کو روکے رکھے جو حقوق مجھے اللہ تعالیٰ نے بخشے ہیں، اس معاشرے میں جہاں مرد ایک اسٹیپ کے بجائے بیسیوں اسٹیپس عورت سے اونچا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، اس سے حقوق چھیننا ناممکن ہے، اپنی تعلیم کی روشنی میں صبر وتحمل سے ان تمام حقوق پر غلبہ پالینے کا گُر آنا بہت ضروری ہے۔'' وہ سوچتی رہی اور بہت گہرائی سے سوچتی رہی۔

☆☆☆

قربانی کے بعد گھر کی خواتین کچن میں اپنی اپنی ڈیوٹی سنبھالے ہوئے تھیں۔ عبداللہ کی بڑی بھابی کلیجی پکانے میں بے مثال تھیں۔ چھوٹی بھابی پراٹھے بڑے مزے کے بنایا کرتی تھیں۔ ماما اپنے مہمانوں کے ساتھ گپ شپ میں مصروف تھیں کہ بہوؤں نے آپس میں آنکھ مار کر ساس سے سوال کیا۔

''شبینہ کی پہلی عید ہے نظر نہیں آرہی۔ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں...... کہیں میکے تو نہیں سدھار گئی؟''

''میکے کیونکر جائے گی...... کیا میری بیٹیاں میکے عید منانے آتی ہیں جو میری بہوئیں اپنے میکے چل پڑیں گی۔ عبداللہ بتا رہا تھا کہ بہو آفیشل ٹور پر چائنا گئی ہوئی ہے۔ اب عید کے بعد ہی چکر لگائے گی۔'' ماما نے تسلی بخش لہجے میں کہا۔

''کماؤ، بہوؤں کا یہی تو گھاٹا ہے آپا۔ نہ دین میں نہ دنیا میں، نہ اپنوں میں نہ غیروں میں...... نہ اچھے میں نہ برے میں...... ہمیشہ ہی غیر حاضر ہوں گی۔'' کسی خاتون نے لقمہ دیا تھا۔

''دیکھیں عورت کا اولین فرض تو ہے گھرداری...... شوہر کی خدمت گزاری اور بچوں کی بہترین تربیت...... یہ تمام فرائض نبھانے کے بعد اگر وقت اجازت دیتا ہے تو مرد کے شانہ بشانہ ضرور چلیں۔ اس میں برائی ہرگز نہیں۔'' ایک بہو نے سمجھداری سے کہا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو...... لیکن آج کل کی لڑکیوں کے لیے سب سے اہم ان کی اپنی زندگی ہے۔ آج کل کی پود میں خودغرضی، خودپسندی اور میں رچ بس گئی ہے۔'' انہی خاتون نے دوبارہ کہا۔

''بھئی میں نے تو عبداللہ کو کہہ دیا ہے کہ ہم اپنی نسل کو کسی آیا کے ہاتھ میں نہیں دیں گے۔ بہو کو نوکری چھوڑنا ہوگی ہر صورت میں ورنہ بچہ میں اپنے پاس لے آؤں گی، ہاں......'' ماما نے شاید ان خاتون کو یا اپنی موجودہ بہوؤں کو سنانے کو کہا۔

''ماں بچہ نہ دیوے بی بی جی، مرتی مرجائے گی۔'' پاس کھڑی ملازمہ نے لقمہ دیا۔

''تم جاؤ اپنا کام کرو۔'' ماما نے نخوت سے کہا...... اسی سمے مین ڈور کی بیل نے سب کو اسی طرف متوجہ کردیا۔

''آج دروازہ تو کھلا ہوا ہے، ضرور کوئی فقیر گوشت لینے آیا ہوگا۔'' ماما نے کہا۔

ابھی یہ بات چل رہی تھی کہ شبینہ، عبداللہ کے ساتھ لاؤنج میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے ملازم ڈھیر سارے تحفے اٹھائے چلا آیا تھا۔

''ماما! ہماری طرف سے ہماری پہلی عید کی خوشی میں...... یہ حقیر سے تحفے قبول فرمائیں۔'' شبینہ ساس کے گلے لگ کر مسرت آمیز لہجے میں بولی۔

''بہو آج سب کی موجودگی میں تمہاری کمی شدت سے محسوس ہوئی، شکر ہے تم آگئیں۔ عید کے بعد آنے کا مزہ نہ آتا۔'' ماما نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

''بھابیاں تو کچن میں ہی ہوں گی مگر آج سب میرے ہاتھ کی بنی ہوئی مٹن کڑاہی کھا کر انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے۔'' اس نے سب کی طرف عقیدت مندانہ نظروں سے دیکھ کر خوشگوار لہجے میں کہا۔

''بہو سب سے پہلے کوئی سی سویٹ ڈش بنا کر ہم سب کا منہ میٹھا کرادو پھر جو چاہے پکاؤ۔ ہمیں منظور ہے۔'' ماما نے خوشی سے مغلوب ہوکر اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''سویٹ ڈش کون سی؟ ماما کھیر اور حلوا نہیں، زمانہ بدل چکا ہے۔ میں اعلان کرتی ہوں کہ میں پائن ایپل کیک بنانے جارہی ہوں۔ ہماری پہلی عید کی خوشی میں ماما اور پپا کیک کاٹیں گے۔''

''تالیاں، تالیاں......'' عبداللہ نے ہنستے ہوئے بلند آواز میں کہا اور لاؤنج تالیوں سے گونج اٹھا۔



مکمل ناول

تتلی

شیریں حیدر



دوسرا اور آخری حصہ



''سائنس کی یہ ایجادات لاکھ اچھی سہی کہ جن کی بدولت پوری دنیا مٹھی میں سما گئی ہے مگر ان کا حد سے زیادہ استعمال اور وہ بھی کم روشنی میں...... نظر کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔'' سرمد نے عام سے لہجے میں کہا۔ ''یوں بھی رات بہت ہوگئی ہے تم تو اتنی دیر تک جاگتی نہیں ہو، سو جاؤ......'' کسی انتہائی پیار کرنے والے شوہر کا سا لہجہ تھا۔

''اسے کیا...... میں چاہے جو بھی کروں، اس

کی بلا سے......'' مگر میں نے جلدی سے ٹیب کو بند کیا اور اپنے سرہانے رکھ کر لیٹ گئی۔ سرمد غسل خانے سے لوٹ کر آیا تو تھوڑی دیر رکا، میں نے مُندی مُندی نظر سے اسے دیکھا، وہ کھڑا مجھے ہی دیکھ رہا تھا، جانے کیا سوچ رہا تھا، تاہم چند لمحے مزید رکا اور واپس لائبریری میں چلا گیا...... ایک اور شب بسر ہوئی۔ میں نے اس کے جہازی سائز بیڈ پر قبضہ جما رکھا تھا اور وہ تین فٹ چوڑے صوفہ کم بیڈ پر پچھلے کئی دنوں سے سو رہا تھا۔

رات بھر کروٹیں بدلتے گزری کہ مجھے باقی پیغامات پڑھنے کا شوق ہو رہا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ جاننے کا کہ پیغامات بھیجے کس نے تھے...... کوئی کزن مگر کون؟ مجھے تو کبھی کسی نے درخورِ اعتنا نہ جانا تھا۔

''چلو کل سرمد دفتر جائے گا تو دیکھ لوں گی۔'' میں نے خود کو تسلی دے کر کروٹ بدلی۔

صبح حسبِ معمول ناشتے کے لیے پہنچی یہ سوچ کر کہ سرمد جا چکا ہوگا مگر ٹی وی لاؤنج میں سرمد، بابا اور خالہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ میں نے کچن میں جا کر باورچی کو اپنے ناشتے کا بتایا اور وہیں لاؤنج میں جا بیٹھی، بابا اور خالہ کو سلام کیا تو سرمد سمیت تینوں نے جواب دیا، میں ایک نشست پر بیٹھ گئی۔

''طبیعت ٹھیک ہے تمہاری بیٹا یا تم بھی سرمد کی طرح موسم سے متاثر ہو گئی ہو؟'' بابا نے سادگی سے سوال کیا۔

''جی میں بالکل ٹھیک ہوں......'' میں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

''تم اتنی دیر تک سوتی جو نہیں......'' خالہ نے کہا۔ ''اس لیے تشویش ہونے لگی تھی۔'' انہوں نے کہا تو مجھے اچانک یاد آ گیا۔

''رات ہم دیر تک جاگتے رہے بابا، کچھ میری طبیعت ٹھیک نہ ہونے کے باعث بھی نتالیہ ڈسٹرب رہی۔'' بابا کے چہرے پر ایک خوشی سی لہرائی اور میں دل ہی میں بل کھا کر رہ گئی۔

''چلو کوئی بات نہیں......'' خالہ نے کہا۔ ''کون سا جلدی جاگ کر کوئی کام کرنا تھا۔'' مگر مجھے تو یاد آ گیا کہ مجھے کوئی کام کرنا تھا۔ اب سرمد کے گھر پر ہونے کے باعث جانے کیا اداکاری کرنا پڑتی اور کس وقت موقع ملتا اپنی فیس بک چیک کرنے کا۔

''میرا خیال ہے کہ ذرا فریش ہو کر تم دونوں آج نتالیہ کے میکے چلے جاؤ...... اس کی اماں کب سے اصرار کر رہی ہیں...... بلکہ میں تو کہتی ہوں کہ ایک آدھا دن رہ آؤ، جب سے شادی ہوئی ہے تم لوگ ایک بار بھی رہنے کو نہیں گئے......'' خالہ نے سرمد کی طرف رخ کر کے تجویز پیش کی۔

''آج تو طبیعت ٹھیک نہیں خالہ جان...... ویک اینڈ پر چلے جائیں گے، کم از کم دو دن رہ تو آئیں گے ناں!'' سرمد نے میری مشکل آسان کر دی۔ ''کیا خیال ہے نتالیہ......؟''

''ج...... ج...... جی......'' میں ہکلائی۔ ''ٹھیک ہے۔''

''چلو ناشتا ختم کر لو پھر اس کے بعد میرے کمرے میں آنا بیٹا تو میں اس گھر کی چابیاں، کنجیاں تمہارے حوالے کروں اور تمہیں تمہاری ساری بری بھی دکھاؤں، وہ سب کچھ جو سرمد نے خود بڑے ارمانوں سے تمہارے لیے لیا تھا......'' میں نے ان کی بات پر مسکرانے پر اکتفا کیا، سرمد چور نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''اسے سونے دیں خالہ...... رات بھی بے آرام رہی بیچاری......'' سرمد نے میری سفارش کی۔ ناشتا میں نے جلدی جلدی زہر مار کیا اور کمرے کی طرف چلی۔

''میں ڈاکٹر کی طرف جا رہا ہوں، تم آرام کر لو نتالیہ!'' میں نے رک کر اس کی بات سنی اور دل ہی دل میں کہا۔

''جلدی جلدی جاؤ اور دیر لگا کر آؤ......''

☆☆☆

''بڑا شکار مارا ہے تم نے......'' میں نے پیغام پڑھ کر غصے سے delete کر دیا۔

''مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ دلہن بن کر تم پر اتنا روپ آئے گا۔''

''ہونہہ......'' میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''کوئی ہے جس نے میری شادی میں بھی شرکت کی ہے......'' میں نے سوچا، ابھی تک یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ میں نے اس سے اگلا پیغام کھولا۔

''کاش......!''

''اس کا کیا مطلب ہوا بھلا!'' میں نے اس پیغام کو مٹا دیا۔

''فون کون سا ہے تمہارے پاس؟''

''ہوں...... اس سے کیا فرق پڑتا ہے، اب مجھ سے نمبر مانگا جائے گا۔''

''رشک آ رہا ہے تم پر...... اور تمہارے اس کلوٹے شوہر پر بھی...... بھئی ایک کو تو حسن مل گیا اور ایک کو دولت۔''

''جیسے مجھے دولت کی کمی تھی یا کوئی لالچ۔'' میں نے ہونٹ چبا ڈالے اور یہ پیغام بھی مٹا دیا۔

''کیسا لگا تمہیں اپنا مجنوں؟'' یہ پیغام ہمارے ولیمے سے اگلے دن کا تھا۔

''ہونہہ مجنوں، کیسا مجنوں کہ جو دیکھے بنا ہی میری چاہت کر بیٹھا، بڑا ارینجڈ قسم کا مجنوں ہے۔'' میں دل ہی دل میں اس تشبیہہ پر خود محظوظ ہوئی۔

''کیا تم کھلی آنکھ سے اس سے محبت کر سکتی ہو؟'' میرا دل عجیب انداز میں دھڑکا۔ میں نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا، اس سے قبل ملازمہ کو بلا کر بتایا کہ میرے سر میں درد ہے اس لیے مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے جب تک کہ میں خود نہ جاگوں۔

''رنگت کا کیا ہے، امیر ہے یار...... ذہین ہے اور اسمارٹ بھی......'' کوئی سرمد کی وکالت کر رہا تھا۔

''مجھ سے دوستی کرو گی؟''

''لگتا ہے کہ کوئی مرد ہی ہے۔'' میں نے اپنے کزنز کو ایک، ایک کر کے سوچا، ان کے علاوہ کوئی میرے اس نام تک رسائی نہ کر پاتا، بہت سے کزنز تو اب ذہن سے نکل بھی گئے تھے۔

''یار کسی پیغام کا جواب تو دو......'' آخری پیغام ایک دن پہلے کا تھا۔

''کون ہو تم؟'' پہلی بار میں نے جواب میں سوال لکھا اور بھیج دیا۔

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے......'' جواب فوراً آیا۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ جو کوئی بھی ہے میری طرح کچھ دنوں کے بعد جواب دے گا۔

''کون سے سوال کا جواب دوں پہلے؟'' میں نے لکھا۔

''ہوں......'' جواب آیا۔ ''فیس بک تم لیپ ٹاپ پر استعمال کرتی ہو؟''

''پہلے لیپ ٹاپ پر کرتی تھی، اب میرے مجنوں نے مجھے ٹچ فون بھی لے دیا ہے اور ٹیب بھی اس لیے ان پر بھی استعمال کر سکتی ہوں......'' میں جواب لکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

''اچھا تمہارے پاس پیغام رسانی کی یہ application ہے؟'' سوال میں ایک application کا نام لکھا ہوا آیا۔

''نہیں...... کس میں؟ فون میں یا ٹیب میں؟'' میں نے پوچھا۔

''تو ڈاؤن لوڈ کر لو ناں فون میں......'' میں نے فون پر اس app کو ڈھونڈا۔

''یہ تو تین ڈالر کی ہے......''

''کتنی کنجوس ہو تم...... تین ڈالر کا مطلب فقط تین سو روپے ہوتا ہے...... کیا تمہارے پاس تین سو روپے نہیں ہیں......؟''

''بہت سارے تین سو ہیں مگر میں کسی ایسے شخص کے کہنے پر کیوں ضائع کروں جسے میں جانتی

تک نہیں......'' پیغام لکھتے وقت میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

'' جاننا چاہتی ہو مجھے؟ '' سوال آیا، میری دھڑکن تھم گئی۔

'' میں اجنبیوں سے بات نہیں کرتی......'' میں نے جواب ٹائپ کیا۔

'' یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے......''

'' اب میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی......''

'' کیوں؟'' ناراض چہرے کی تصویر کے ساتھ پیغام آیا۔

'' تم پہلے میرے سوال کا جواب دو......کون ہوتم؟''

'' جان جاؤ گی، انتظار کرو......''

'' اچھا یہ بتادو کہ تم لڑکا ہو یا لڑکی؟'' میں نے سوال ٹائپ کیا۔

'' کوئی لڑکی کسی اور لڑکی کے حسن کی تعریف نہیں کرتی میری جان......'' میرا دل دھڑ دھڑانے لگا، میں نے فوراً فیس بک سے sign out کیا اور اپنے فون اور ٹیب پر password لگادیے تاکہ کوئی اور انہیں استعمال نہ کر سکے...... کوئی اور کون ہوتا...... سرمد ہی تو تھا جو کسی وقت بے مقصد ہی میرے فون کو چیک کر لیتا حالانکہ اس کا احتمال کم ہی تھا۔

کریڈٹ کارڈ نکال کر میں نے اس کی تفصیلات سے اکاؤنٹ بنایا اور وہ app اپنے فون میں ڈاؤن لوڈ کر لی، اسے بعد میں کسی وقت استعمال کر کے دیکھوں گی، اس وقت تو دل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ جو کوئی بھی تھا اب تک جانے کہاں تھا اور اب اسے میرا حسن اور مظلومیت نظر آئی تھی۔ میں بستر پر گر کر بے مقصد کروٹیں بدلتے بدلتے جانے کب سو گئی۔

☆☆☆

سرمد جو معمولی سے فلو کا شکار ہوا تھا، اسے کھانسی اور بخار بھی ہو گیا اور وہ ایک کے بجائے کئی دن کے لیے بستر پر پڑ گیا، چونکہ خالہ اس کی خیریت پوچھنے کمرے میں آتی رہتیں، کبھی اسے قہوہ بنا کر پلاتیں اور کبھی دیسی چوزے کی یخنی......اس لیے میں تکلیف دہ صورتِ حال میں پھنس گئی، وہ بستر پر قابض تھا اور وہیں سو جاتا اور میں لائبریری والے صوفے پر، جو اس بیڈ پر سونے کے بعد بہت غیر آرام دہ لگتا تھا......سرمد بھی تو کتنے دنوں سے اس پر سو رہا تھا اور اس کے آرام دہ بیڈ پر میں قابض تھی۔ ایک لمحے کو مجھے اس شخص پر رحم آیا جو اس وقت معصومیت سے سو رہا تھا اور بخار کی حدت سے اس کا سیاہ چہرہ میرون بلکہ جامنی سا ہو رہا تھا، اس کی رنگت صاف ہوتی تو یہی چہرہ لال ہوتا۔ اس کے چہرے کی طرف گھورتے ہوئے مجھے وہی کراہت سی ہونے لگی۔

میں نے اپنے صوفہ کم بیڈ پر آ کر فیس بک کھولی...... باقی تصویریں اور تبصرے چیک کرنے کے بعد میں نے پیغامات کھولے۔

'' یوں آدھے میں گفتگو چھوڑ کر جانا اچھا نہیں ہوتا، کوئی سولی پر ٹنگا رہ جاتا ہے۔''

'' ٹنگا رہے کوئی جو ٹنگنا چاہتا ہے، میں نے کسی سے کہا ہے کہ میں اسے ضرور ہر پیغام کا جواب دوں گی؟'' میں نے غصے والی شکل کے ساتھ پیغام بھیجا۔

'' ناراض ہو گئی ہو کیا؟'' پیغام آیا۔

'' ناراض ہونے کے لیے کسی رشتے اور تعلق کی ضرورت ہوتی ہے...... میرا تم سے کیا رشتہ ہے؟''

'' میرا تم سے کیا رشتہ ہے؟ اچھا سوال ہے...... دل کے تعلق کو کوئی نام دینا ضروری ہوتا ہے کیا؟'' سوال آیا۔

'' ثنائلہ......'' سرمد کی آواز آئی، میں چونکی۔ وہ بخار میں بھی مجھے پکار رہا تھا، میرا دل کانپنے لگا۔

'' میں سونے لگی ہوں......'' پیغام بھیج کر میں نے sign out کیا اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی، جی میں آیا بھی کہ اٹھ کر جا کر سرمد کو دیکھوں، کہیں اس کا کمبل ہٹا ہوا نہ ہو، اسے کسی چیز کی ضرورت نہ ہو مگر حقارت کا احساس ہر احساس پر غالب آ گیا اور میں سو گئی۔

☆☆☆

خدا خدا کر کے سرمد کا بخار ٹوٹا اور وہ صحت یاب ہو کر دفتر جانا شروع ہوا، میں نے شکر کیا کہ اب دن میں کئی بار اس کا چہرہ دیکھنے سے نجات مل جائے گی۔ خالہ اب اصرار کر رہی تھیں کہ ہمیں اماں کی طرف جانا چاہیے...... سرمد نے بھی خالہ کی بات کی تائید کی۔ اسی بات کو میں ماننا نہیں چاہتی تھی کہ اماں میری سرمد سے بے نیازی اور لاتعلقی کو فوراً جان جائیں گی اور خوب لعنت ملامت کریں گی...... جب تک میں اپنے لیے کوئی محفوظ راستہ نہ چن لیتی مجھے اماں کو اس بات سے بے خبر رکھنا تھا کہ ہمارے مابین کوئی تعلق سرے سے تھا ہی نہیں...... نکاح کے تین بولوں کے علاوہ...... کچھ اداکاری کر لوں گی اور کچھ...... مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی۔

'' عائشہ میں اور سرمد دو دن کے لیے اماں کی طرف جا رہے ہیں، تم اور ذاکر بھی آ جاتے تو مجھے اور سرمد کو کمپنی مل جاتی......'' میں نے عائشہ کو فون پر کہا۔

'' ارے مجھے بہت اچھا لگا یہ سن کر......'' عائشہ نے چہک کر کہا۔ '' سچ پوچھو تو میرا دل خوشی سے بے تاب ہو رہا ہے، تمہیں اور سرمد کو اکٹھے اور خوش دیکھنا بھی میرے لیے عمر کا ایک بہترین تجربہ ہو گا......'' میں نے فون بند کیا اور آنکھیں موند لیں...... کتنی خوش ہو رہی ہے عائشہ، جو حقیقت جانتی ہوتی تو اس وقت مجھے ملامت کر رہی ہوتی۔

میں نے اپنا دو دن کا سامان پیک کیا اور بابا اور خالہ سے اجازت لے کر گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر سرمد کے ساتھ بیٹھ گئی۔

'' کچھ لے لیں تمہاری اماں کے گھر کے لیے؟'' سرمد نے سامنے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

'' کیا لینا ہے؟'' میں نے روکھے انداز میں کہا۔ '' کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

'' ہم پہلی بار اُن کے گھر جا رہے ہیں......''

'' میں اسی گھر سے آئی ہوں اور بیس سال تک وہیں رہتی رہی ہوں......'' میں نے اسی طرح بے نیازی سے کہا۔

'' میں تو وہاں پہلی بار جا رہا ہوں اس گھر میں اور وہ بھی بیٹے کی حیثیت سے......'' سرمد نے کہا تو میں نے دل ہی دل میں سوچا، شاید آخری بار بھی۔

'' اماں کو دامادوں کا کچھ لے کر آنا پسند نہیں......'' اس نے ایک پھل کی دکان کے سامنے گاڑی روکی تو میں نے اسے روکنا چاہا۔

'' اور مجھے کہیں بھی خالی ہاتھ جانا پسند نہیں......'' کہہ کر وہ گاڑی سے اتر گیا میں نے گاڑی اندر سے لاک کر لی، بیگ سے فون نکالا اور یوں ہی اسے دیکھنے لگی۔

'' تم نے بتایا بھی نہیں کہ تم نے اس app کو ڈاؤن لوڈ کر لیا ہے......'' نئے انداز سے پیغام تھا۔

'' تمہیں کیسے علم ہوا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

'' تم میری facebook پر ہو تو جب تم نے اسے ڈاؤن لوڈ کیا تو مجھے خود بخود نوٹیفکیشن آ گیا کہ میری دوست بھی اس app پر آ گئی ہے......''

'' ہوں دوست......؟'' میں نے جواب دیا۔

'' فیس بک کے سبھی contacts دوست ہی کہلاتے ہیں، چاہے وہ باپ بیٹی بھی ہوں...... ہے ناں اسٹوپڈ بات......؟'' پیغام کے ساتھ اس نے مسکراتا ہوا چہرہ بھیجا۔

'' ہاں ہے تو......'' میں نے اس کی تائید کی۔

'' اور کیا ہو رہا ہے اور کہاں ہے تمہارا beast؟''

''شرم کرو......'' میں نے اسے پیغام بھیجا مگر اس ''خوب صورت'' تشبیہ پر میری ہنسی نکل گئی۔

''کچھ غلط کہہ دیا میں نے beauty؟'' شکر ہے کہ وہ مجھے دیکھ نہیں رہا تھا جو میرا بلش ہوتا ہوا چہرہ نہ دیکھ سکا۔

''یہ نیڈی کیا نام ہوا؟'' میں نے سوال کیا۔

''بہت زیادہ سوال کرتی ہو...... جانِ من تم کمال کرتی ہو......'' اس نے کہا تو میں نے فون آف کر دیا، میرا دل عجیب انداز میں دھڑکنے لگا۔ کچھ غلط ہو رہا تھا... جانے کون تھا جو مجھے بے راہ روی کی طرف لے جا رہا تھا اور اس وقت کہاں تھا جب اماں رشتے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نڈھال ہو رہی تھیں اور پھر مجھے اس کلوٹے کے پلے باندھ دیا۔

''چلو اب بھی مل جائے تو کیا برا۔'' میں نے اپنے ذہن میں آنے والی منفی سوچ پر خود کو داد دی۔

سرمد پھولوں کا ایک بڑا سا گلدستہ اور ایک لڑکا پھلوں کا ٹوکرا اٹھائے دکان سے نکلے، میں نے دروازہ کھولا جو میں نے اندر سے لاک کر لیا تھا، سامان گاڑی میں رکھوا کر سرمد نے اس لڑکے کو کچھ ٹپ دی اور وہ اسے سلام کر کے چلا گیا۔ گاڑی میں سیٹ سنبھال کر اس نے ایک لال گلاب میری طرف بڑھایا، میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''مجھے اچھا لگا، میں نے سوچا تمہیں پسند آئے گا۔'' میں نے خاموشی سے پھول پکڑ لیا اور بصد کوشش شکریہ کہہ کر اپنی ہیرے کی قیمتی انگوٹھی کو انگلیوں میں گھمانے لگی۔

☆☆☆

اماں تو داماد کے صدقے واری جا رہی تھیں...... ان کا سب سے چھوٹا داماد پہلی بار اُن کے ہاں آیا تھا، خوب ہی خاطر تواضع ہو رہی تھی۔ ذاکر اور سرمد گپیں لگا رہے تھے، عائشہ اماں کے ساتھ مسلسل کھانے کی تیاریوں میں تھی، میں بھی کچن میں ہی چلی گئی۔

''تم نے سرمد کو منع نہیں کیا بیٹا، اتنا پھل خواہ مخواہ لے آیا...... مجھے دامادوں کا یوں آنا اچھا نہیں لگتا......''

''جی کہا تھا میں نے اسے...... کہنے لگا کہ اسے خالی ہاتھ کسی کے ہاں جانا پسند نہیں اور وہ بھی بیٹا ہو کر......'' مجھے اس کے احمقانہ الفاظ پر ہنسی آئی تھی، جہاں کی بیٹی اسے لفٹ نہیں کروا رہی تھی وہاں وہ زبردستی بیٹا بنا پھر رہا تھا، اگر دلہن وہ ہوتی ہے جو پیا من بھائے تو دولھا بھی تو وہی ہونا چاہیے ناں جو دلہن کے من کو بھائے۔

''یہ تم بات کیسے کر رہی ہو؟'' اماں نے تیوری چڑھا کر مجھے گھورا، میں نے حیرت سے انہیں دیکھا، کیا میں بہ آواز بلند سوچ رہی تھی۔

''کیوں، کیا ہوا ہے؟''

''یہ کیا بات ہوئی۔ ''اسے''...... اور ''کہنے لگا''......

''انہیں'' کہہ کر بات کرو اور ''کہنے لگے''...... اماں نے غصے سے کہا تو میرے منہ سے ہنسی کا فوارہ نکل گیا...... ''بے شک شوہر کی عزت بیوی پر فرض ہے۔''

''مگر پہلے میں اسے شوہر تو تسلیم کر لوں...... اماں!'' میرے منہ سے بات پھسل ہی گئی۔

''کیا...... کیا کہا تم نے؟'' اماں چمچہ چھوڑ کر میرے پاس کرسی کھینچ کر بیٹھ گئیں۔ ''ہزار لوگوں کی موجودگی میں نکاح نامے پر دستخط کر کے تم نے اسے شوہر ہی تو تسلیم کیا تھا...... اور شوہر کو کس طرح تسلیم کرتے ہیں؟'' اماں کی ناراضی کے ڈر سے میں نے پینترا بدلا۔

''مذاق کر رہی تھی اماں......'' فون پر پیغام کی بیپ سنائی دی، میں نے پرس سے فون نکالا تو اسکرین پر جگمگا رہا تھا۔

''بھاگ کیوں جاتی ہو جانم!'' میں نے فوراً میسج delete کیا اور فون بند کر کے کچن سے باہر نکل آئی، ذاکر تنہا بیٹھا تھا، سرمد نماز کے لیے میرے کمرے میں گیا تھا۔

''نتالیہ...... جاؤ جا کر اپنے شوہر کو دیکھو، اسے کسی چیز کی ضرورت نہ ہو۔'' ذاکر کا لہجہ سادہ سا تھا۔

''کیا ہو گیا ہے تم سب لوگوں کو ذاکر...... شوہر، شوہر کی رٹ لگا رکھی ہے......'' میں نے چڑ کر ٹیلی وژن کا ریموٹ کنٹرول اٹھا کر آواز اونچی کر دی، ذاکر حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

کھانے کے بعد اماں تو سونے چلی گئیں اور ہم چاروں لاؤنج میں بیٹھے رہ گئے، ذاکر اور سرمد باتیں کر رہے تھے، عائشہ نے سرمد سے کافی کا پوچھا تو اس نے پیشکش شکریے کے ساتھ قبول کر لی، میں اس کے ساتھ ہی کچن میں چلی گئی۔ وہ برتن نکال کر ٹرالی پر رکھ رہی تھی، پانی اس نے ہلکی آنچ پر چولھے پر چڑھا دیا تھا، ایک پیالے میں اس نے کافی پاؤڈر، کریم اور چینی ڈالی اور پھینٹنے لگی۔ میں نے فون نکالا، کوئی پیغام نہ تھا، مجھے تھوڑا سا عجیب لگا، اتنا لمبا وقفہ...... ناراض ہو گیا ہو گا۔

''نیڈی کا مطلب نہیں بتایا تم نے......'' میں اپنی بے چینی پر قابو نہ پا سکی اور پیغام بھیجا۔

''نیڈی ضرورت مند کو کہتے ہیں، ملکۂ حسن......''

''طنز کر رہے ہو؟''

''لگتا ہے تمہیں آج تک کوئی صاحبِ نظر نہیں ملا......''

''شاید مل گیا ہے......'' میں نے جواب دیا، عائشہ اپنے کام میں مصروف تھی۔

''کون...... وہ beast؟''

''بری بات نیڈی...... ویسے نیڈی کیا نام ہوا؟''

''نام تو کچھ اور ہی ہو گا، جیسے تتلی کوئی نام نہیں ہوتا......''

''میرے بچپن کا نام ہے تتلی، میرے کچھ کزنز کہتے تھے مجھے...... جانے کیوں؟''

''تتلی جیسی خوب صورت ہو گی تم...... یا پھر پھول، پھول منڈلاتی ہو گی......''

''شٹ اپ......'' میں نے پیغام بھیجا اور میں مسکرا دی، جانے کون ہے، اچھی طرح جانتا ہے مجھے اور اگر میرا کوئی کزن نہیں تو کوئی دوست ہو گا کسی کا۔

''کیا بات ہے کس سے پیغام رسانی کر کے مسکرایا جا رہا ہے؟'' عائشہ کی آواز مجھے حال میں کھینچ لائی۔

''ہوں...... وہ، وہ...... میری ایک دوست نے لطیفہ بھیجا ہے۔'' میں نے فون فوراً آف کر دیا۔

''ذرا ہم بھی تو سنیں......'' وہ ٹرالی تیار کر کے کھڑی تھی۔

''ایسے ہی واہیات سی دوست ہے، میں بھلا اس طرح کا لطیفہ اپنی بہن کو کس طرح سنا سکتی ہوں۔'' میں نے بات بنائی۔

''اچھا تو فون دو، میں خود ہی پڑھ لیتی ہوں......'' اس نے ہاتھ بڑھایا۔

''کیا ہے یار ٹیکسٹ کر دیتی ہوں ابھی تمہیں، کافی پی کر......'' میں فون پرس میں رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی، وہ آگے آگے چلی۔ ''ابھی کوئی پیغام نہ بھیجنا مجھے جب تک کہ میں پیغام نہ بھیجوں......'' میں نے جلدی سے لکھ کر بھیجا۔

''اچھا پیاری...... اپنے اس کے ساتھ......'' احمقانہ سا پیغام آیا، میں نے فوراً delete کیا اور عائشہ کے پیچھے، پیچھے چل پڑی۔ ذاکر اور سرمد جانوروں پر کوئی دستاویزی فلم دیکھ رہے تھے، ہم پہنچے تو ذاکر نے فوراً چینل بدل دیا۔

☆☆☆

میں تو بری پھنسی تھی، کافی پینے کے بعد کمرے میں جا کر اندازہ ہوا کہ میرے کمرے میں بیڈ تھا تو مگر اتنا جہازی سائز کا نہیں... جتنا سرمد کے ہاں تھا اور بیڈ کے علاوہ کمرے میں دو وکٹورین طرز کی کرسیاں تھیں جن پر کہ سویا نہیں جا سکتا تھا...... نہ ہی

فرش پر سونا ممکن تھا کہ میٹرس تک نہ تھا، ناچار تھوڑی دیر تک بیٹھ کر اپنی ٹیب پر ایک گیم کھیلتی رہی، پھر ای میلز چیک کیں اور جب اچھی طرح یقین ہو گیا کہ سرمد سو گیا ہوگا تو میں اٹھی اور آہستگی سے بیڈ پر لیٹ گئی...... بیڈ پر سرمد کا ٹیب رکھا تھا میں نے اسے اٹھایا اور نہ جانے کیوں میں نے اسے آن کر دیا۔

"handwriting" نام کی app پر سرمد نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا تھا۔

"چلو اس کا نہیں اللہ کا احسان لیتے ہیں
وہ منت سے نہیں ملتا تو منت مان لیتے ہیں"

میں نے ٹیب.... آف کر دیا اور اپنی طرف کی میز پر رکھ دیا۔ کمرے میں مدھم سی روشنی تھی، سرمد کو تو اس سے زیادہ روشنی میں سونے کی عادت تھی مگر اچھا ہے کہ رات کو اسے خود سے اتنا قریب دیکھ کر مجھے ڈر نہیں لگے گا......صبح آنکھ کھلی تو مجھے خود یقین نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح میں سرمد کے اتنا قریب تھی۔ میں جھٹکا کھا کر اٹھی اور فوراً بیڈ سے اتری، میرے گرد اس کالمس جیسے ابھی تک لپٹا ہوا تھا۔ میں نے غسل خانے کی راہ لی اور شاور لے کر باہر نکلی تو وہ منتظر بیٹھا تھا، بغیر کچھ کہے وہ اٹھا اور تولیا اٹھا کر غسل خانے چلا گیا۔

میں نے بستر کی سلوٹیں درست کیں اور باہر کی راہ لی۔ سب لوگ ہمارے ہی منتظر تھے۔

"جاگ گئیں تم؟" ذاکر نے سوال کیا۔

"نہیں ......سو رہی ہوں ابھی تک میں......" میں نے چڑ کر کہا۔

"ہر وقت انگارے کیوں چبائے رہتی ہو تم...... اس لہجے میں شوہر سے بات کی ناں تو اگلے لمحے ہی تمہیں فارغ کر دے گا وہ......"

"ہیں واقعی؟" میں نے فوراً کہا۔ "اس سے چھٹکارا پانا کیا اتنا ہی آسان ہے؟" مگر جانتی تھی کہ وہ کافی ڈھیٹ ہے اور میری حقارت کو جان کر بھی نظر انداز کرتا ہے کیونکہ وہ اپنے بابا کو دکھ نہیں دینا چاہتا...... "یہ سب کچھ کر چکی ہوں میں......کوئی اور ترکیب بتاؤ یار جو اس پر کام کر جائے......"

"کہیں تم واقعی کوئی بے وقوفی تو نہیں کرنے جا رہیں نتالیہ؟" ذاکر کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔

"تم شاید اسے بے وقوفی کہو گے مگر میں نہیں......" اماں بے دھیانی سے ٹی وی دیکھ رہی تھیں کیونکہ ہم ساری گفتگو انگریزی میں کر رہے تھے۔

"ہمارے کہنے یا نہ کہنے سے تمہاری بے وقوفی عقلمندی میں نہیں بدل جاتی......" ذاکر نے دانت پیسے، عائشہ بھی مجھے گھور رہی تھی۔

"بعد میں بات کرتے ہیں، اماں کے سامنے تماشا نہ لگاؤ اور وہ بھوت بھی آنے والا ہوگا......"

"ڈوب مرو تم شرم سے......" عائشہ نے ہلکی سی آواز میں کہا، جسے اماں کے سوا ہم سب نے سن لیا، اس نے بھی جو ابھی نہا دھو کر کمرے سے نکلا ہی تھا۔

"ارے عائشہ...... یوں نہیں کہتے اپنے مجازی خدا کو......" سرمد نے شرارت سے کہا تھا۔

"ن، ن نہیں ...... میں تو......" وہ کچھ کہتے کہتے رکی، شاید وہ اس مشکل میں پھنس گئی تھی کہ اگر میرا کہے گی تو وہ پوچھے گا کہ وہ مجھ سے اتنی خفا کیوں تھی، اس لیے وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس کر بولی......

"ناشتا لگاؤں آپ لوگوں کے لیے؟"

"آپ لوگ فارغ ہو لیے؟" سرمد نے سوال کیا۔

"ہاں، ہم تو کافی دیر سے جاگے ہوئے تھے اس لیے......"

"جاگا ہوا تو میں بھی کب سے تھا، بس آپ کی بہن کے آرام کے باعث ہل تک نہیں سکتا تھا اور یوں بھی شادی کے بعد میں نے آج پہلی بار انہیں اتنے سکون سے سوتے دیکھا ہے......" سرمد کا کہنا تھا کہ میں خفیف سی ہو گئی۔

"ظاہر ہے کہ مجھے ہمیشہ سے اپنے کمرے، اپنے بستر اور اپنے تکیے کی عادت ہے......"

"عادتیں آہستہ آہستہ ہی بدلتی ہیں ناں سرمد یار......" ذاکر نے یہ کہہ کر سرمد کا ہاتھ پکڑا... اور اسے لیے ڈائننگ روم کی طرف چلا، اماں بھی اٹھیں اور میں نے ان کی تقلید کی۔

"ناشتے کے بعد میں ذرا تھوڑی دیر کے لیے دفتر جاؤں گا، کسی اہم کام کے لیے کال آ گئی تھی، بابا تو منع کر رہے تھے مگر میرا جانا ضروری ہے......" سرمد نے کہا۔ "دوپہر کے کھانے تک واپس آ جاؤں گا......آپ چلیں میرے ساتھ ذاکر......" ناشتا ختم کر کے اٹھتے ہوئے سرمد نے ذاکر سے کہا تو وہ خوشی خوشی اس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

بات، بات پر وہ مسکراتی ہے مگر جانے کیوں...... جونہی اس کی نظر مجھ پر پڑتی ہے اس کی مسکراہٹ پھیکی پڑ جاتی ہے...... میں اس کی اس کیفیت سے لطف اندوز ہوتا ہوں، خالہ کو یقین ہے تو میں اپنی کوشش کر کے دیکھ لیتا ہوں، اگر وہ مجھے دل سے قبول کر لے تو میں اس کے اس منفی رویے کو بھول جاؤں گا اور اگر کوئی امید نہ ہوئی تو میں معاملہ بہت زیادہ دیر تک نہ لٹکا سکوں گا۔

اس کے میکے جانا میری طبیعت کے خلاف تھا، کیا کرتا میں وہاں جا کر بھلا...... مگر اچھا ہوا کہ ہم وہاں پہنچے تو عائشہ اور ذاکر بھی وہیں تھے، مجھے کمپنی مل گئی اور مجھے یہ مسئلہ نہیں رہا کہ میں وہاں بور ہوتا۔ وہ رات...... میری زندگی کی پہلی رات...... جب وہ میرے اس قدر قریب تھی۔ رات پہلی بار میں تب چونکا جب مجھے اس کے وجود کی حدت محسوس ہوئی، جاگا تو ہلکی سی روشنی میں اسے اپنے پہلو میں دیکھ کر میرا دل پسلیوں کو توڑنے کو مچلنے لگا، میں نے اس کے بال اس کے چہرے سے ہٹائے، اس کے ہلکے ہلکے خراٹے میرے اندر گدگدی کرنے لگے، اس کے پرفیوم کی خوشبو میں کیسا خمار تھا۔

میں تو اس کے بعد رات بھر سو نہ سکا، وہ کتنی گہری نیند سو رہی تھی، میں اس کی ہر، ہر کروٹ اور ہر حرکت کو محسوس کر رہا تھا، میرا اس سے کتنا قریبی رشتہ تھا مگر وہ رشتہ کس قدر مبہم تھا، دل نے اسے چھونے کی تمنا کی تو میں نے اسے ڈانٹ دیا، دل تو بچہ ہے ناں ...... فجر کی اذان کے ساتھ میں اسے آہستگی سے ہٹا کر اٹھا اور نماز پڑھ کر دوبارہ بستر پر دراز ہوا تو نیند کی وادی میں اتر گیا، آنکھ اس کے حرکت کرنے سے کھلی تو وہ حیرت زدہ سی بیٹھی ہوئی تھی، اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ میرے پہلو میں یوں رات بھر رہی ہے، گھبرا کر اٹھی، اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے...... وہ غسل خانے چلی گئی تو میں نے مسکرا کر اس کی ادائے بے نیازی کو بھول جانا چاہا۔ ٹیب اٹھایا، رات کو ایک نظم لکھتے لکھتے سو گیا تھا، اسے کھولا اور اس سے آگے یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا، جانے کب پڑھی تھی اور کہاں مگر کچھ کچھ یاد رہ گئی تھی۔

☆☆☆

"بتا رہی ہوں میں آپ کو کہ نہیں رہنا مجھے اس کے ساتھ......" میں نے کہا تو اماں اور عائشہ کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

"میں تو سمجھی تھی کہ تمہارے حواس ٹھکانے آ چکے ہوں گے......" عائشہ نے حیرت سے کہا۔

"کیوں، کوئی تبدیلی آ گئی ہے سرمد میں جو میرے ارادے بدل جاتے؟"

"کیا تبدیلی چاہیے تمہیں اس میں؟"

"اماں مجھے دودھ پیتی بچی کی طرح ٹریٹ نہ کریں......" میں نے بپھر کر کہا۔ "جب کہہ دیا کہ نہیں رہنا اس کے ساتھ تو طے ہے کہ نہیں رہنا، آپ مجھے مجبور نہیں کر سکتیں۔"

"کیا کرو گی تم، طلاق لے کر میرے سینے پر مونگ دلنے آ جاؤ گی؟" اماں نے غصے سے پوچھا۔

"نہیں آؤں گی آپ کے سینے پر، نہ مونگ دلنے نہ ماش......" میں نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

"تو اور کہاں جائے گی؟" اماں کو بھی غصہ آ گیا۔

"مل جائے گا کوئی نہ کوئی اسی دنیا میں اماں اس سے بہتر......"

"پہلے تو نہ ملا اتنی عمر گزار کے......"

"پہلے آپ ڈھونڈ رہی تھیں اور میں سمجھی تھی کہ آپ کو کچھ نہ کچھ علم ہوگا کہ آپ کی بیٹی کے لیے کیا مناسب ہے......" میں نے فوراً جواب دیا......

"ساری بہنوں کے شوہر ایک سے بڑھ کر ایک ہیں اماں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ابا کتنے اسمارٹ تھے......آپ نے میرے لیے زندگی بھر کا ساتھی چنتے وقت ان میں سے کسی کا تو موازنہ کیا ہوتا......"

"حقیقت بڑی تلخ ہوتی ہے نا لیہ، تم نے جن سب کی مثالیں دی ہیں، ان سب کے شوہر حسن پرست تھے اور ہیں، میں نے ایسا شخص پسند کیا جو تمہاری قدر کرے......تمہاری خوبیوں کو سراہے اور جس طرح کی منہ پھٹ تم ہو، یہی ہے جو شاید برداشت کر لے کیونکہ تم اسے بدصورتی کے احساس میں مبتلا کر چکی ہو، ہوتا جو کوئی اسمارٹ تو وہ تمہیں کیوں پلّے باندھتا؟ اور کاش تم جانتی ہوتیں کہ جن مردوں کو اپنی اسمارٹ نیس کا زعم ہوتا ہے وہ بیویوں کو کس حیثیت کا مالک سمجھتے ہیں......"

"آپ تو اچھا خاصا لیکچر جھاڑ لیتی ہیں اماں......" میں نے کوشش کر کے مصنوعی ہنسی منہ پر سجائی تاکہ اماں کا غصہ ٹھنڈا ہو......"آپ میری جگہ ہوتیں اماں تو پھر میں آپ سے پوچھتی، دوسروں کو کہنا بہت آسان ہوتا ہے......"

"میں نے تو اسے بہت سمجھایا ہے اماں مگر اس کے دماغ میں ایک ایسا کیڑا گھس گیا ہے جسے میری تیری نصیحتیں نہیں تبدیل کر سکتیں، ٹھوکر کھائے گی تو سنبھلے گی......" عائشہ نے اماں کا کندھا دبایا......میں اٹھ کر واپس کمرے میں آ گئی۔ "میں نے ذاکر سے کہا ہے کہ وہ سرمد سے کہے کہ اس کا مطالبہ نہ مانے اور اسے کمپرومائز کرنے کے لیے وقت دے......" کچن سے باہر نکلی تو عائشہ اماں سے کہہ رہی تھی، ایک دفعہ تو سوچا کہ مڑ کر کچھ کہوں مگر کچھ فائدہ نہیں، سرمد سے کیوں کر نمٹنا ہے، میں جانتی تھی۔

☆☆☆

"مصروفیت میں آتی ہے بہت یاد تمہاری
فرصت میں تیری یاد سے فرصت نہیں ملتی!"

میرے فون پر پیغام آیا تھا، کھولا اور پڑھا، دائیں بائیں دیکھا اور جواب ٹائپ کیا۔

"منع کیا تھا کہ نہ پیغام بھیجنا......"

"بے بس ہو گیا تھا تمہارے پیغام کا انتظار کر کے......" میرے دھڑکن کی ترتیب بدل گئی۔

"اماں کی طرف تھی اور مجھے ڈر تھا کہ کہیں عائشہ میرا فون نہ چیک کر لے......"

"عائشہ کون ہے؟"

"ہیں......تم مجھے جانتے ہو اور عائشہ کو نہیں جانتے؟" میں نے جواب دیا۔ "میں تو سمجھی تھی کہ تم میرے کوئی کزن ہو۔"

"میرا تم سے ایسا کوئی رشتہ نہیں......بس دل کا رشتہ ہے۔"

"بتا کیوں نہیں دیتے کہ کون ہو تم......"

"اچھا تم اپنی اماں کی طرف گئی تھیں تو بتا دیتیں......میں وہاں آ کر تم سے مل لیتا تو تمہارا سارا تجسس ختم ہو جاتا......"

"مجھے کیوں تجسس ہونے لگا......" میں نے ٹائپ کیا۔ "میں وہاں اکیلی نہیں تھی، اپنے شوہر کے ساتھ گئی تھی۔"

"ہاہا......ہا......شوہر کہتی ہو تم اسے......شوفر بننے کے لائق بھی نہیں وہ تم جیسی لڑکی کا......" جانے میری شادی سے پہلے یہ کہاں تھا جسے میں خوب

صورت لگتی ہوں......میں نے دل ہی دل میں سوچا، اماں کو یہ بات سمجھانا بہت مشکل ہے کہ اس دنیا میں اب بھی ایسے مرد ہیں جنہیں میں خوب صورت دِکھتی ہوں، جن کی نظر ظاہری خوبیوں کے پار دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے......میرے عام چہرے میں انہیں وہ خاص حسن نظر آتا ہے جو میری ماں کو بھی نظر نہیں آتا۔

"کیوں ملنا چاہتے ہو تم مجھ سے؟" میں نے سوال کیا۔

"دو پیار کرنے والے کیوں ملتے ہیں؟"

"کون دو پیار کرنے والے؟" میں نے ہنس کر پیغام ٹائپ کیا اور آخر میں ہنستا ہوا چہرہ بھی ڈال دیا۔

"ہنس لو تم......میں یک طرفہ محبت میں ہی گرفتار ہوں، معلوم ہے مجھے، تم تو کسی اور کا پہلو گرماتی ہو اور اپنا یہ حال ہے کہ......

تنہائیاں تمہارا پتا پوچھتی رہیں
شب بھر تمہاری یاد نے سونے نہیں دیا"

میں فون سینے پر رکھ کر لیٹ گئی......کس قدر رومینٹک انسان تھا جو بھی تھا۔ اس کے بعد بھی پیغامات آتے رہے مگر میں پہلے پیغامات کے سحر میں گرفتار ہو گئی تھی اور دل میں اتنی خوشی محسوس کر رہی تھی، میری زندگی میں اس نے نقب لگا کر ایک چور دروازہ بنا دیا تھا جس میں سے میں اپنی زندگی کی بند اور گھٹن والی فضا میں بھی تازہ سانس لے سکتی تھی۔

☆☆☆

خواہ مخواہ میں نے تین ماہ کی چھٹی لے لی تھی، سوچ رہی تھی کہ دوبارہ جوائن کر لوں، اس شادی سے میرے کیا، کیا خواب وابستہ تھے، کیا، کیا تصورات تھے کہ دن رات تصورِ جاناں میں گزرا کریں گے......مگر میرے سارے محل مسمار ہو گئے تھے، مجھے لگتا تھا کہ میں کسی عقوبت خانے میں کسی دیو کی قید میں ہوں۔ سانس لینا محال لگتا تھا بسا اوقات......اگر کوئی اچھی بات تھی اس قید خانے میں تو وہ بابا اور خالہ کا

وجود تھا۔ وہ دونوں انتہائی بے ضرر اور انتہائی شفیق انسان تھے، ان کے پاس بیٹھ کر میں زیادہ تر وقت گزارتی اور انہیں یوں تسلی تھی کہ میں اس گھر میں خوش ہوں، ان کے سامنے میں سرمد سے کوئی آدھی ادھوری بات بھی کر لیتی تھی۔

سرمد ہر بات کا جواب اسی انداز سے دیتا جیسے نارمل میاں بیوی کے درمیان گفتگو ہوتی ہے، اپنے کمرے میں آتے ہی ہم دونوں اجنبی بن جاتے اور اسی طرح سو جاتے جس طرح سے پہلے دن سے انتظام ہم نے خود ہی طے کر لیا تھا...... وہاں آ کر ہم ایک دوسرے سے ایک لفظ تک نہ کہتے، میں سرمد کی کسی چیز کا خیال نہیں رکھتی تھی، اپنے سارے چھوٹے موٹے کام یا وہ خود کرتا تھا یا خالہ اپنی نگرانی میں کرواتی تھیں۔

ہم دونوں اپنے اپنے فون پر مصروف رہتے، کبھی ٹیب پر، سرمد تو غالباً اپنے کام کار کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ چیک کرتا تھا اور میں اپنی اس دنیا میں گم ہو جاتی جو مجھے میری اس حالیہ زندگی کی تلخیوں سے دور لے جاتی تھی۔ نیڈی سے دنیا کے ہر موضوع پر بات ہوتی، بیچ بیچ میں وہ کوئی رومینٹک بات کر جاتا، کبھی کوئی چبھتی ہوئی بات، کبھی کوئی جملہ جو مجھے ناراض کر دیتا اور وہ علامتی کان پکڑ کر مجھ سے معافی مانگتا، کبھی وہ اپنی بے تابیوں کی داستانیں سناتا۔

"کاش تم مجھے اس beast سے پہلے ملی ہوتیں، کم از کم مجھے یہ کسک نہ ہوتی کہ کسی اور نے تمہیں چھوا ہے۔"

"اگر میں یہ کہوں کہ کسی نے مجھے نہیں چھوا اور میں تمہارے لیے بالکل خالص اور ان چھوئی دستیاب ہوں تو کیا تم یقین کر لو گے......؟" میں نے جوشِ جذبات میں لکھا۔

"مجھے تم ہر حال میں قبول ہو، اگر کسی نے چھوا ہو تو بھی، آخر وہ تمہارا شوہر ہے اور پھر اس نے تمہیں مجھ سے پہلے حاصل کیا......"

"نکاح کے دو بول پڑھ لینے سے کوئی کسی کی ملکیت نہیں ہو جاتا......" میں نے جواب دیا۔

"تو میں یہ سمجھوں کہ مجھ سے بھی نکاح کے دو بول پڑھ کر بھی تم میری ملکیت نہیں بن سکو گی؟" اس کی طرف سے اداس چہرے کی تصویر کے ساتھ سوال آیا۔

"اس بات پر منحصر ہے کہ میرا دل تمہیں پسند کرے اور تمہارا مجھے......"

"میرے دل میں تو تم بس چکی ہو تتلی...... اب تمہاری طرف سے اقرار باقی ہے......" میں نے دھڑ دھڑاتے دل کو تھاما۔ کاش میں ابھی اسی وقت اس کے پاس ہوتی، اس کی بے تابیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتی اور خود کو اسے سونپ دیتی۔ میں اپنے اس ان دیکھے محبوب کی محبت میں گوڈے، گوڈے ڈوب گئی تھی اور اس کی ہر پیش قدمی کی پزیرائی کرنے کو تن من سے تیار۔

"سوتے ہیں اب......" میں نے پیغام بھیجا۔

"نیند کس کافر کو آتی ہے تمہارے بنا......" جواب آیا۔

"تو نیند کی گولی لے لو......" میں نے پیغام بھیجا۔

"رقیب پہلوئے یار میں ہو تو ہم تو سولی پر ٹنگے رہیں گے ناں......"

"پہلو خالی ہے، کوئی بھی نہیں ہے یہاں......" میں نے لکھا۔ "تمہارے پہلو میں بھی تو کوئی ہو گی ناں؟" سوال پوچھتے وقت جلن بھی محسوس ہوئی اور سوچا کہ جواب ہاں میں آیا تو......

"میرا پہلو تیری یاد سے آباد ہے ظالم"

"زیادہ فلمی ڈائیلاگ نہیں ہو گیا؟"

"ہر مجنوں کو فلمی سمجھا جاتا ہے جان......" میں نے جانے کیسے اسے یہ حق دے دیا تھا کہ وہ ہر اس لقب سے مجھے بلاتا تھا، جن کا اسے کم از کم ابھی تک حق نہ تھا، جو میں سرمد سے نجات حاصل کر لیتی اور اسے پانے کا تہیہ کر لیتی تو اسے خود بخود یہ حق مل جاتا مگر چاہ کر بھی اسے منع نہ کر سکی۔ ایک ہی تو میری زندگی میں کچھ اچھا تھا، جو وہ بھی کھو دیتی اسے ناراض کر کے تو میری تنہائیاں کس طرح سجتیں۔

☆☆☆

"سرمد میں سوچ رہی ہوں کہ تم لوگ ہنی مون کے لیے یورپ سے ہو آؤ یا جس جگہ کو دیکھنے کی تتالیہ کی خواہش ہو......" میں خالہ کی بات پر دل ہی دل میں ہنسی۔

"ہنی مون تو وہ جوڑے مناتے ہیں جو اپنی زندگی میں خوش ہوں اور مزید لطف اندوز ہونا چاہتے ہوں۔"

"کیوں بھئی، کیا خیال ہے؟" سرمد نے مسکرا کر میری طرف دیکھا جیسے میں یہ سن کر بہت خوش ہوں گی۔

"وہ میں......؟"

"اگر تمہیں یورپ دیکھنے کا زیادہ شوق نہیں تو ہم ملائشیا وغیرہ کی طرف چلتے ہیں اور پھر اس کے بعد عمرے پر چلیں گے......" سرمد نے کہا۔

"مجھے کسی جگہ پر بھی جانے کا شوق نہیں......" میں نے اپنا لہجہ نارمل رکھنے کو کوشش کی مگر مجھے اندازہ ہوا کہ ایسا ہو نہیں سکا تھا۔

"کیوں بیٹا...... کیوں شوق نہیں ہے تمہیں؟ آج کل کی لڑکیاں تو اپنے شوہروں کے ہمراہ سیر سپاٹے کر کے نہ صرف خوش ہوتی ہیں بلکہ بیرونِ ممالک کی سیر، تفریح اور خریداری کی باتیں اسٹیٹس سمبل کہلاتی ہیں......" بابا نے ہنس کر کہا تھا۔

"تو چلو پھر عمرہ کر آؤ جا کر......" خالہ نے کہا۔ "اللہ کا گھر دیکھ آؤ۔"

"پہلے نماز کی پابندی تو ہو جائے خالہ...... ٹوٹی پھوٹی اور آدھی ادھوری نمازیں پڑھ کر ہم اللہ کے گھر کی زیارت کو چل پڑتے ہیں۔" میں نے طنز سے کہا۔

"نماز تو بہر صورت پوری پڑھنی چاہیے

بیٹا......" خالہ نے کہا۔ "عمرے، حج کی نہیں بلکہ اللہ کو منہ دکھانے کی پہلی شرط نماز ہے...... اللہ کی عبادات اللہ کی جواب دہی کے لیے کی جاتی ہیں، مستحبات کے لیے نہیں......"

"کوشش تو کافی کرتی ہوں خالہ مگر ممکن نہیں ہو پاتا کہ ہر نماز وقت پر اور باقاعدگی سے پڑھوں۔" میں نے شرمندگی سے اعتراف کیا۔

"کوشش جب کسی مثبت کام کے لیے کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کبھی اسے رد نہیں کرتا......" خالہ نے حکمت کی بات کی۔

"اب میں چونکہ فارغ بھی ہوں تو اب ذرا اور کوشش کروں گی......" میں نے عہد کیا کیونکہ اس گھر میں ہر کوئی نماز کا پابند تھا اور نماز نہ پڑھنا ایک غلط بات سمجھی جاتی تھی۔

"اللہ کی مدد حاصل کرنے کے لیے، کسی بھی عہد سے پہلے انشاء اللہ کہنا اہم ہے بیٹا......" خالہ نے کہا تو میں نے انشاء اللہ کہا۔ میں واقعی بہت سست تھی اس معاملے میں اور اماں سے بھی اکثر ڈانٹ کھاتی تھی، وہاں بھی سب لوگ باقاعدگی سے نماز پڑھتے تھے اور میں کچھ مصروفیت کے باعث اور کچھ سستی کی وجہ سے ڈنڈی مار دیتی تھی۔

"وہاں جاؤ گے اللہ کے گھر تو نماز سے محبت خود ہی دل میں در آتی ہے......"

"دیکھتے ہیں خالہ...... شاید دفتر بھی جلد ہی جوائن کر لوں۔"

"کیوں مگر؟ بہن جی تو بتا رہی تھیں کہ تم نے کئی ماہ کی چھٹی لے رکھی ہے اور شاید ملازمت نہ بھی جاری رکھو۔" خالہ نے حیرت سے سوال کیا۔

"کارپوریٹ کی دنیا میں ہر کسی کی جگہ پر ملازمت کرنے کو دس بندے قطار میں ہوتے ہیں خالہ...... کوئی کسی کا وفادار نہیں ہوتا...... اتنی لمبی چھٹی کون دیتا ہے، کوئی بندہ میری جگہ پر رکھ لیں گے تو

میں کسی کا کیا بگاڑ لوں گی؟'' میں نے جواب دیا۔ ''اماں کا کہنا تھا کہ میں کم از کم چھ ماہ کی چھٹی لوں اور اگر نہ ملے تو ملازمت سے استعفیٰ دے دوں......''

''تو چھوڑ دو بیٹا...... کوئی ضرورت ہے تمہیں ملازمت کی؟''

''جب مناسب سمجھوں گی تو چھوڑ دوں گی خالہ جان......'' میں نے ان سے بحث کرنے کے بجائے انہیں مختصر جواب دے کر موضوع بدلنا بہتر سمجھا۔ میز پر رکھا میرا فون جگمگا رہا تھا۔

''تمہارا کوئی پیغام آیا ہے غالباً''...... سرمد نے کہا تو میں نے فون میز سے اٹھالیا اور ناشتے کے برتن وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ جتنی دیر میں نے آج ان تینوں کے ساتھ گزاری تھی، وہ شاید اب تک ان کے ساتھ گزارا گیا سب سے طویل وقت تھا، ورنہ تو سرسری سی ملاقات ہی ہوتی تھی۔

''ہیے...... کہاں ہو تم؟'' پیغام جگمگا رہا تھا...... میں نے وقت دیکھا، کافی دیر پہلے کا پیغام تھا، میری نظر ہی فون پر نہیں پڑی تھی پہلے۔

☆☆☆

''باز آ جاؤ تم ...... کسی وقت جوتے لگواؤ گے مجھے......''

''تمہیں کون جوتے مار سکتا ہے؟''

''میری ساس اور میرا شوہر......''

''ہاہا...... ہاہا......''

''ہنس کیوں رہے ہو؟''

''تم اور جوتے کھاؤ ان سے؟ میں نہیں مانتا۔''

''کھائے تو نہیں اب تک مگر جس دن تمہارے اور میرے چکر کا راز کھلے گا اس دن تو۔''

''چکر...... کیا مطلب ہے چکر سے تمہارا؟ پیار کرتا ہوں تم سے میں اور جان بھی دے سکتا ہوں تمہارے لیے ہاں۔''

''میں تمہاری جان لے کر کیا کروں گی بھلا؟''

''مگر مجھے تو جان چاہیے...... تتلی میری جان!''

میں اس کے ان رومانوی مکالموں سے چاروں شانے چت ہوگئی۔

''اچھا بند کرو اب پیغامات کا سلسلہ......''

''کیوں، تم ملنے آ رہی ہو مجھ سے؟''

''مل کر کیا کرنا ہے تم نے؟''

''مل کر دو پیار کرنے والے کیا کرتے ہیں؟''

''توبہ کیسی فضول باتیں کرتے ہو تم۔''

''فضول کیا ہے اس میں؟''

''نماز پڑھنے لگی ہوں میں اب۔''

''واہ! اچھی بچی...... تم نماز بھی پڑھتی ہو؟''

''ویسے مجھے کیا معلوم کہ پیار کرنے والے ملاقات پر کیا کرتے ہیں...... نہ کبھی کوئی پیار کرنے والا ملا نہ کسی سے یوں چھپ، چھپ کر باتیں کی ہیں نہ ملاقاتیں......''

''اب تو سب کچھ ہوگا ...... اور کھلے عام ہوگا...... چھپ، چھپ کر نہیں۔'' میں لجا گئی، بھول گئی کہ میں شادی شدہ ہوں، بس کنواری نوجوان لڑکیوں کی طرح اس کے سپنے آنکھوں میں بسا لیے...... جانے کون تھا جس نے خوابوں کی پگڈنڈی پر میری انگلی تھام کر مجھے بگٹٹ بھگانا شروع کر دیا تھا۔

''پہلے اپنی شکل تو دکھاؤ مجھے...... تم نے تو مجھے دیکھ رکھا ہے مگر میرا تجسس اب تک برقرار ہے......''

''دیکھ کر تاب نہ لا سکو گی!'' اس نے ہنستا ہوا چہرہ بھی پیغام کے ساتھ بھیجا۔ ''بات کرو گی مجھ سے فون پر؟''

''ابھی نہیں ......'' میں گھبرا گئی۔ ''نماز پڑھنے دو مجھے...... شیطان!''

''نماز کے بعد؟''

''نہیں بابا...... ابھی نہیں، پہلے اس سے تو جان

چھڑا لوں، جو میری جان کو چپک گیا ہے۔''

''جانے کب چھڑواؤ گی اس سے جان...... مجھے تو لگتا ہے کہ تم اسے چھوڑنا ہی نہیں چاہتیں...... مزے لوٹ رہی ہو اس کے ساتھ اور میرے ساتھ مظلومیت کا ناٹک......''

''شرم کرو...... میرے کردار پر شک کر رہے ہو تم؟''

''کردار پر شک کیوں کروں گا، شوہر ہے تمہارا...... چاہے شوفر لگتا ہے مگر ہے تو شوہر اور پورا شرعی حق رکھتا ہے تم پر......''

''میں نے اسے یہ حق ابھی تفویض نہیں کیا......''

''اچھا؟'' مجھے لگا وہ ہنس رہا ہوگا۔ ''دے دو بے چارے کو اس کا حق!'' اس کے کہنے پر مجھے شک ہوا کہ کہیں سرمد خود ہی تو نہیں مجھے یہ پیغامات بھیج رہا...... مگر سرمد کا فون عین میری نظروں کے سامنے میز پر پڑا تھا...... اور پھر میرا نام تتلی ...... چار لوگ ہی تو جانتے تھے اس نام کو اور ان میں سے کوئی بھی سرمد کو نہیں بتا سکتا تھا...... کوئی سرمد سے ملا ہی کب تھا۔

''تم نے مجھے دیکھا ہے؟'' میں نے سوال ٹائپ کیا۔ ''اور سرمد کو؟''

''ہاں میں نے beauty and the beast دیکھے ہیں......''

''تمہیں کس نے بتایا کہ میرا نام تتلی ہے؟''

''کسی کو مجھے بتانے کی ضرورت نہیں......'' جواب آیا۔ ''اچھا اٹھو اب نماز پڑھو، پھر بات ہوتی ہے۔''

''تم نماز پڑھتے ہو؟''

''ہاں ......'' جواب آیا۔ ''نماز پڑھوں گا تو اللہ کے سامنے اپنے مطالبات پیش کروں گا ناں۔''

''کون سے مطالبات؟'' مجھے ہنسی آ گئی۔

''ایک ہی مطالبہ ہے میرا آج کل تو...... تم!'' میں خاموش رہ گئی۔ ''تم نماز پڑھ کر مجھے مانگو گی اللہ سے؟''

''نماز اس طرح غرض سے پڑھی جاتی ہے بھلا؟'' میں نے لکھا۔

''اچھا نماز پڑھو اور مجھے بتانا کہ کیا دعا مانگی تھی......'' اس کے بعد کوئی پیغام نہ آیا، میں نے وضو کر کے نماز پڑھی اور جب وقتِ دعا آیا تو وہ چھم سے میرے تصور میں آ گیا، نہ مانگتی تو اور کیا کرتی۔

''اے اللہ تو اس چاہنے والے کو میرا مقدر کر دے......'' جانماز تہ کر کے میں نے فون اٹھایا تاکہ اسے بتاؤں کہ میں نے کیا دعا مانگی تھی۔

☆☆☆

ہر وقت میں اس کے ساتھ ہوتی تھی، تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اس کا پیغام آتا، وہ نہ بھیجتا تو میں بھیجتی، بے قراری قرار کہاں لینے دیتی تھی۔ سوتے میں، جاگتے میں، کھاتے میں، غسل خانے میں، ٹی وی روم میں، پڑھتے ہوئے، گاڑی چلاتے ہوئے، بازار میں گھومتے ہوئے...... سارا وقت ٹک ٹک ہوتی رہتی...... میں ہر وقت اسے اپنے ساتھ ساتھ محسوس کرتی، اب میں کہاں ہوں اور کیا کر رہی ہوں، اسے میں ''لمحہ بہ لمحہ'' رپورٹ دیتی...... خریداری کے دوران کسی چیز کے انتخاب میں الجھ جاتی تو فوراً اسے تصویر کھینچ کر بھیجتی اور میرا مسئلہ حل ہو جاتا۔

شاعری اور لطائف کا تو جیسے کوئی ذخیرہ تھا اس کے پاس، دن بھر وہ یہی کرتا رہتا تھا کیا؟ میں کبھی کبھار سوچتی......

میں فون کا پہرہ دیتی تھی کہ یہ میرے سارے رازوں کا امین بن گیا تھا، یہ میرے اس عشق کا ذریعہ بن گیا تھا جو مجھے بن دیکھے کسی سے ہو گیا تھا۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ کیسا ہوگا، وہم بھی نہیں آیا تھا کہ وہ بدصورت بھی ہو سکتا ہے، بھلا بدصورت لوگ ایسی خوب صورت باتیں کر سکتے ہیں...... ایک اندھا راستہ تھا جس پر میں زینہ بہ زینہ چڑھے جا رہی تھی۔

اتنی فرصت بھی نہ تھی کہ کبھی آئینہ ہی دیکھ لیتی، خود سے پوچھ لیتی کہ مجھ میں کیا نیا آ گیا تھا جو میں کسی کو اس حد تک بھانے لگی تھی، کیا اس سے پہلے میں

اندھوں کے شہر میں رہتی تھی جو میں کسی کو دِکھی ہی نہ تھی؟ اس سے بھی پوچھتی کہ وہ پہلے کہاں تھا جو میں اس پھندے میں پھنس گئی تھی کہ جس سے رہائی پا کر ہی اسے پا سکتی تھی۔

''دوستی تو ہے ناں ہمارے بیچ......'' وہ کہتا مگر مجھے دوستی نہیں، محبت چاہیے تھی، تعلق چاہیے تھا، اس کے اور اس گمنام تعلق کا کوئی نام چاہیے تھا...... عورت کو رشتوں کے نام کا تحفظ ہی مطمئن کرتا ہے کچھ اور نہیں۔

یہ محبت ہے ہی ایسی چیز...... کتابوں میں جس طرح کی کہانیوں پر میں ہنس دیا کرتی تھی، اب میں انہی میں سے ایک کا کردار بن کر اس راہ کی مسافر ہو گئی تھی۔ مجھے کوئی کھائی نظر آتی تھی نہ موڑ......

''مجھ سے ملو یار...... اب انتظار نہیں ہوتا...... جانے تم کب اس سے جان چھڑاؤ گی؟'' اس کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔ دفتر جوائن کر لینے کے بعد تو اب مجھے کافی وقت کی آزادی مل گئی تھی، کام کے دوران بھی اس سے ''گفتگو'' جاری رہتی۔ ایک دوسرے کو ہم اتنی تفصیل سے اپنے گرد ہونے والے واقعات بتاتے کہ لگتا ہم دونوں ساتھ ساتھ ہی ہیں۔

☆☆☆

سرمد نے کام دوبارہ شروع کرنے پر مجھے تحفے میں گاڑی دی تھی۔

''مگر میرے پاس تو گاڑی ہے۔''

''وہ تو تمہاری نہیں ہے، میری پرانی گاڑی ہی استعمال کر رہی تھیں تم...... اب دفتر جاؤ گی تو ذرا شان سے جانا...... اور ہاں اپنا پاسپورٹ بھی دے دینا مجھے، خالہ کا کہنا ہے کہ ہمیں عمرے پر ضرور جانا چاہیے......''

''آپ کی پرانی گاڑی کی بات نہیں کر رہی، میری اپنی گاڑی جو ہے اماں کے گھر......''

''اماں کے گھر سے گاڑی کیوں لاؤ گی تم، کیا میں تمہیں ایک گاڑی لے کر دینا بھی افورڈ نہیں کر سکتا؟ اور یوں بھی یہ گاڑی تو بابا نے تمہارے لیے شادی سے پہلے سے بک کروا رکھی تھی، میں نے تو صرف رنگ اور ماڈل پسند کیا تھا...... سفید رنگ...... پیار اور امن کا رنگ، اپنا رنگ چاہے سفید نہ سہی مگر پسند ضرور ہے......'' وہ خواہ مخواہ رومینٹک ہو رہا تھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ بابا کا شکریہ ادا کرنا چاہیے مجھے۔''

''بابا کی بیٹی ہو تم اور شکریہ ادا کرو گی تو ناراض ہو جائیں گے وہ......''

''پھر بھی ...... اخلاقیات بھی کوئی چیز ہوتی ہیں......'' وہی ہوا کہ جب میں نے بابا کا شکریہ ادا کیا تو وہ مجھ سے ٹھیک ٹھاک ناراض ہو گئے۔

''تمہیں بتایا نہیں اس نالائق نے کہ میں اپنے بچوں سے شکریے کی توقع نہیں کرتا؟''

''بتایا تھا بابا......'' سرمد نے فوراً کہا۔ ''مگر محترمہ کہنے لگیں کہ اخلاقیات بھی کوئی چیز ہوتی ہے...... یہ سمجھتی ہے کہ آپ نے ہمیں اخلاقیات نہیں سکھائیں......'' سرمد نے اور شکایت لگائی تو مجھے دل ہی دل میں غصہ آیا مگر میرا اس سے کوئی قلبی تعلق نہ تھا کہ میں اس سے اسی وقت یا بعد میں لڑائی کرتی۔

''اولاد کی محبت ...... ماں باپ کے لیے تحفہ ہوتی ہے بیٹا، اور ماں باپ اپنے ہر تحفے کے ذریعے اولاد سے اظہار کرتے ہیں اور انہیں بتاتے ہیں کہ ان کے لیے بچوں سے اہم اور کچھ نہیں...... یہ تو میری طرف سے چھوٹا سا تحفہ ہے بیٹا، یہ نالائق تو خود کوئی اچھی سی گاڑی تمہارے لیے لینا چاہتا تھا، میں نے ہی اس سے کہا کہ وہ کچھ اور لے لے، گاڑی میں لے لیتا ہوں......''

''پھر بھی شکریہ بابا......!'' میں نے اظہارِ تشکر کے لیے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور انہوں نے میرے ہاتھ کو شفقت سے تھپکا۔

''بس بیٹا...... تم لوگوں کو دیکھ دیکھ کر جیتا ہوں،

اب تو دل میں سوائے اس کے اور کوئی خواہش نہیں رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا گھر دیکھ آؤں، اسی لیے اس سال حج پر جانے کا ارادہ ہے اور دوسری خواہش ہے کہ تمہارے اور سرمد کے آنگن میں اپنے پوتے پوتیوں کو کھیلتا ہوا دیکھوں...... '' ان کا کہنا تھا کہ میں شرما گئی مگر دل ہی دل میں اس تصور سے مجھے ابکائی آ گئی، سرمد کے اور میرے بچے!

☆☆☆

بابا اور خالہ کے حج پر جانے سے گھر میں ایک سناٹا سا اتر آیا تھا، میں کام سے لوٹتی تو شام ہو چکی ہوتی اور اس کے بعد سرمد کی آمد ہوتی۔ ملازم میز پر کھانا لگا چکے ہوتے اور ہم دونوں خاموشی سے...... ریلوے اسٹیشن کی انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے دو اجنبی مسافروں کی طرح اپنی، اپنی پلیٹوں میں کھانا ٹونگتے...... یہ سرمد کا حکم تھا کہ ہمیں ملازموں کے سامنے نارمل نظر آنے کی کوشش کرنی چاہیے جو میں نہ چاہتے ہوئے بھی ماننے پر مجبور تھی۔ جب کوئی ملازم سر پر کھڑا ہوتا تو سرمد مجھ سے میرے دن کی بابت کوئی نہ کوئی سوال کر لیتا تاکہ ملازم کو محسوس ہو کہ ہم دو نارمل میاں بیوی ہیں۔

میں یہ اداکاری کر کر کے تھکنے لگی تھی، جمود سا آ گیا تھا، پہلے تو سرمد کافی وقت بابا اور خالہ کے پاس گزارتے تو وہ وقت مجھے نیڈی سے بات کرنے کا مل جاتا تھا، اب چونکہ گھر پر ہم دونوں ہی تھے اور کھانے کے بعد کچھ وقت ہم لاؤنج میں گزارتے تھے، اس وقت سرمد ٹیلی وژن دیکھتا اور میں ٹیب پر کوئی نہ کوئی گیم کھیلتی رہتی۔ تھوڑی دیر میں ملازم کچن سمیٹ لیتے تو وہ اپنے کمروں میں چلے جاتے اور ہم اداکاری بند کر کے اپنے، اپنے کمروں کی راہ لیتے، مجھے موقع ہی نہیں ملتا کہ نیڈی سے پیغام رسانی کر پاتی۔ صرف دفتری اوقات میں ہی ہمارا رابطہ رہتا تھا۔

وہ بھی میرے اس معمول سے چڑنے لگا تھا اور بار بار ملنے پر اصرار کر رہا تھا، میں اسے ٹالتی جا رہی تھی اور میرا مطالبہ تھا کہ پہلے وہ مجھے اپنی تصویر بھیجے۔

'' نکما کر دیا ہے مجھے تمہارے عشق نے...... ''

اس دن ایک بہت بڑی کنسائنمنٹ کا کام وقت پر پورا نہ ہوا تو میں نے چڑ کر اس سے کہا کیونکہ تمام وقت اس کے پیغامات آ رہے تھے اور فوری جواب کا مطالبہ ہوتا۔

'' تو کیا تمہیں عشق ہو گیا ہے، مجھ سے؟ '' پیغام کے ساتھ اس نے مسکراتا ہوا چہرہ بھیجا۔

'' مجھے تم سے یوں بغیر دیکھے کیسے عشق ہو سکتا ہے؟ '' میں نے جواب لکھا۔ '' تمہارے عشق کی بات کر رہی ہوں...... ''

'' میں تو عشق کے ساتھ ساتھ پورا کام کر رہا ہوں...... '' جواب آیا۔

'' میں تم جیسی ذہین نہیں ہوں شاید اس لیے...... ''

'' تم مجھ سے بڑھ کر حسین اور ذہین ہو...... ''

'' اس کا فیصلہ تم یک طرفہ کیسے کر سکتے ہو؟ ''

'' میں کوئی فیصلہ یک طرفہ نہیں کروں گا میری جان...... '' میرا دل اس کے پیغام پر عجیب انداز سے دھڑکا، وہ ایسا نباض تھا، لڑکیوں کے دل اتھل پتھل کرنے کے گر جانتا تھا۔ میں ابھی تک خود کو لڑکی سمجھ رہی تھی اور وہ بھی بالی عمر کی الھڑ سی لڑکی۔

'' بتاؤ کب ملتے ہیں ہم؟ ''

'' کام کرنے دو گے تم مجھے یا نہیں......؟ '' اس کے بعد اس کا کوئی پیغام نہ آیا، میں اپنے کام میں مصروف ہو گئی، شام تک کوئی اور پیغام بھی نہ آیا، میرے دل میں کچھ عجیب سا ہونے لگا، ایسا تو نہیں ہونا چاہیے تھا، شاید میں نے زیادہ غصہ دکھا دیا تھا۔

گھر کی طرف ڈرائیو کرتے ہوئے بھی میں نے اسے پیغام بھیجا تو اس کا جواب نہیں آیا، میرا دل تڑپنے لگا، میں اس کی اتنی سی بے رخی بھی برداشت نہیں کر پا رہی

تھی۔ مرے مرے دل سے کھانا بھی کھایا اور سوچا کہ کمرے میں جا کر اسے ضرور پیغام بھیجوں گی چاہے کتنی بھی رات گزر جائے۔

☆☆☆

ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی میں گھڑیاں گن رہی تھی کہ کب ملازم کام ختم کر کے واپس جائیں اور کب میں کمرے میں جا سکوں۔

''ذرا تمہارا فون چاہیے......'' سرمد نے میرے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''بابا کو کال کرنا تھی اور میرے فون کی انٹرنیشنل ڈائلنگ میں کوئی مسئلہ آ رہا ہے......''

''اس وقت تو بہت دیر ہو چکی ہے......'' میں نے تاویل دی، میں اپنا فون اس کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہتی تھی کہ فون آن ہو اور کہیں نیڈی کا پیغام آ جائے تو میری چوری پکڑی جائے گی۔

''بابا اسی وقت فارغ ہوتے ہیں، میں ہر روز اسی وقت ہی تو تمہارے سامنے ان سے بات کرتا ہوں۔''

''وہ......'' مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور میں نے فون سرمد کے ہاتھ میں دے دیا اور دل ہی دل میں ورد کرنے لگی کہ اس کا پیغام نہ آئے۔ سرمد کی بات کے دوران میں ہمہ تن آنکھ بن گئی تھی، جونہی اس کی کال ختم ہوئی میں نے اپنا فون اس سے لیا اور سر درد کا بہانہ کر کے اٹھ گئی۔

''میں چائے بنوا دوں تمہارے لیے؟'' سرمد نے نرمی سے پوچھا۔ ''یا کچھ اور جو تمہیں اچھا لگتا ہو۔''

'' just leave me alone ''

میں نے تقریباً چیخ کر کہا۔ ''جو مجھے اچھا نہیں لگتا اسے دیکھنے پر مجبور نہ کرو تو کافی ہے......تم نے تو......'' میں ادھوری بات کہہ کر وہاں سے چلی، مڑ کر یہ بھی نہ دیکھا کہ اس کے سیاہ چہرے کا رنگ کیا ہوا ہوگا۔

☆☆☆

اتنی نفرت کرتی ہے وہ مجھ سے...... میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہتے کہتے رک گئی تھی، اس نے بھی اپنے چیخنے کے بعد کچن کے دروازے پر نمودار ہونے والے ملازم کو دیکھ لیا تھا اور اسی کی خاطر کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔ میں جان گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ وہ مجھ سے جان چھڑانا چاہتی تھی، وہ مجھے ناپسند کرتی ہے اور میرا چہرہ اسے برا لگتا ہے، چہرے سے بڑھ کر اس نے مجھے جانا ہی کب ہے؟ ظاہری حسن پرست...... میرے اتنا کچھ کرنے کے باوجود اس کے ماتھے کے بل نہیں ہٹتے، مجھے دیکھ کر جھوٹی مسکراہٹ تک نہیں اس کے لبوں تک آتی۔ ان دنوں میں بھی کہ جب ہم گھر میں اکیلے تھے، مجھے اتنا رومانوی لگتا کہ ہم دونوں گھر میں تنہا اور ایک دوسرے کے اتنے قریب...... میں نے پہلے ہی دن سختی سے اسے کہا تھا کہ اسے اس معمول کو اپنانا ہوگا، مجھے معلوم ہے کہ وہ بادل ناخواستہ ہی میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتی اور ٹی وی لاؤنج میں تھوڑا وقت گزارتی ہے مگر مجھے یہ وقت کتنا قیمتی لگتا۔

وہ چاہتی تو میری بات ماننے سے انکار بھی کر سکتی تھی مگر وہ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی، میں نے اس سے کہا تھا کہ جب اور جیسا وہ چاہے گی، وہی ہوگا...... علیحدگی، طلاق یا جو بھی فیصلہ وہ کرے گی مگر جب تک وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ جاتی تب تک اسے اس گھر میں اسی انداز سے رہنا ہوگا جیسے کہ ہم ہنسی خوشی رہنے والے دو میاں بیوی ہیں۔ میں نے اسے اس کی مرضی کے بغیر چھوا تک نہیں...... نہ اس کی مرضی ہوگی نہ میں اسے چھوؤں گا۔ پہلی رات کو اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنانے کے علاوہ ہمارا کوئی تعلق قائم ہی نہیں ہوا تھا۔

میں نے اس سے فون مانگا تو اس نے کتنے تذبذب کے بعد مجھے دیا، شاید اسے پسند نہیں آیا کہ میں اس کا فون استعمال کروں...... ہاں مجھے اس کی کسی بھی چیز کو استعمال کرنے کا اختیار نہیں ہے......

میری آنکھوں میں مرچیں لگنے لگیں۔ مجھے نتالیہ کی سوچ سے نفرت محسوس ہوئی، کتنی کم ظرف عورت تھی وہ، میری محبت کی، میرے جذبات کی قدر کرنا تو کجا اس نے تو انہیں جاننے کی کوشش تک نہیں کی تھی۔ میں نے کیا پایا تھا شادی کر کے...... نفرت اور مزید محرومیاں؟ اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ میں ہامی ہی نہ بھرتا اور عمر بھر کنوارا ہی رہ جاتا، اس تکلیف دہ صورت حال سے تو نہ گزرتا۔

اب وہ مانگے یا نہ مانگے...... میں خود اسے طلاق دے دوں گا، ایک بار اسے اطلاع کر دوں گا کہ میں طلاق نامہ بھجوا رہا ہوں...... میں نے کرب سے سوچا، اسے نہ سہی، مجھے تو اس سے لگاؤ ہو گیا تھا، میرا نکاح ہوا تھا اس سے اور نکاح کے دو بولوں میں وہ طاقت ہوتی ہے جو بسا اوقات خونی رشتوں سے بڑھ جاتی ہے۔

☆☆☆

''بس اب ملنا ہی ہوگا......'' میں نے پیغام بھیجا۔

''تم ڈرائیونگ کرتے ہوئے کیوں پیغام لکھ رہی تھیں؟''

''کیونکہ تم جواب جو نہیں دے رہے تھے......''

''تم نے خود ہی کہا تھا کہ کام کرنے دو......''

''تمہیں برا لگا اور تم ناراض ہو گئے تھے......''

''مگر گاڑی احتیاط سے چلایا کرو...... تمہیں کچھ ہو جائے تو جانتی ہو کہ میں......''

''کیا میں؟'' میں نے فوراً ٹائپ کیا، جاننا چاہتی تھی کہ وہ کیا کہتے کہتے رک گیا تھا۔

''میں کوئی اور لڑکی ڈھونڈ لوں گا......'' اس نے مزاحیہ چہرے کے ساتھ پیغام بھیجا اور میں تپ کر رہ گئی، غصے سے فون بند کر کے لیٹ گئی، اس کے بعد ار بار اس کی طرف سے پیغامات کی ٹون بجتی رہی اور بں نظر انداز کرتی رہی۔ سرمد ان دنوں بابا کے کمرے میں سو رہا تھا اس لیے میں دھڑلے سے فون پر اس سے پیغام رسانی کرتی۔ میں نے سوچا کہ اس سے بات کروں مگر اس کا کہنا تھا کہ اسے پیغامات اچھے لگتے ہیں۔

''ہاں تاکہ ان پیغامات کو تم میرے خلاف ثبوت کے طور پر جب اور جہاں چاہے استعمال کر سکو۔'' میں نے اسے ایک بار کہا تھا، حالانکہ جانتی تھی کہ وہ ایسا نہ تھا۔ کتنا اعتبار تھا مجھے اس ان دیکھے محبوب پر۔

''ایسا گھٹیا سمجھتی ہو مجھے......'' اس کے جواب نے مجھے انتہائی شرمندہ کر دیا تھا۔ مجھے مذاق میں بھی اس سے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔

☆☆☆

''اب ملنے کے علاوہ کوئی بات نہیں ہوگی۔'' دفتر پہنچی تو اس کا پیغام موجود تھا۔

''آ جاؤ میرے دفتر میں پھر......''

''اچھا!'' جواب آیا۔ ''میں آ بھی جاؤں گا، تم بتاؤ کہ کیا تم یہ اسکینڈل افورڈ کر لوگی؟''

''مذاق کر رہی ہوں......'' میں نے ہنس کر جواب دیا۔

''جانتا ہوں......اتنی بہادر نہیں ہو تم......''

''میری بہادری کو نہ آزمانا...... پروا نہیں ہے مجھے کسی کی بھی۔'' میں نے جھوٹی تڑی لگائی۔

''آج شام کو ملیں پھر؟'' سوال آیا۔

''آج شام کو تو نہیں......'' میں نے جواب لکھا۔ ''پلان کرنا پڑے گا۔ پہلے سے گھر پر بتانا پڑے گا۔'' میں نے اس سے کہا۔ حالانکہ اس روز نہ ملنے کا تو فقط بہانہ تھا، میں اسے ملنے سے پہلے اپنے آپ کو presentable بنانا چاہتی تھی، پارلر جا کر اپنے چہرے اور بالوں کو سنوارتی اور اس کے لیے خواہ مجھے دفتر سے چھٹی ہی لینا پڑتی۔

''تین دن کے بعد ملتے ہیں......''

''بڑی پتی ورتا ہو......اور پتی کو کہاں بھیجو گی ملاقات کے دن؟''

''فضول باتیں مت کرو...... تم سب کچھ

جانتے ہو پھر بھی مجھے چڑانے کو یہ سب کچھ کہتے ہو۔"

"مذاق کر رہا تھا جان......"

"اچھا اپنے مذاق بند کرو اور اب خود بھی کام کرو اور مجھے بھی کام کرنے دو۔"

ملنے کا وقت اور جگہ طے ہونے لگی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ جو جگہ بھی بتاتا وہ مجھے مناسب محسوس نہ ہوتی۔ اسے تو شاید کسی کی پروا نہ تھی مگر مجھے اس ملاقات کو سارے شہر سے چھپانا تھا...... سرمد جلال کی بیوی کے خفیہ عشق کی داستان کو چھپانا تھا اور جب کچھ چھپانا مقصود ہو تو پوری دنیا چھوٹی محسوس ہوتی ہے۔ بالآخر ایک گمنام سے ہوٹل کے ہال میں ملنے کا فیصلہ ہوا اور میں نے دل میں پھر بھی خوف محسوس کیا کہ کہیں پکڑے نہ جائیں۔ میری شادی کی تصاویر بھی اخبارات میں چھپی تھیں اور دیکھ لیے جانے کا احتمال تھا...... اور وہ ہر فکر سے بے نیاز مگر اس سے ملنے کی لگن اور تڑپ نے میری آنکھوں پر بھی پٹی باندھ دی تھی۔

☆☆☆

پارلر سے نئے انداز میں بال بنوائے...... بہترین لباس منتخب کیا اور تیار ہو کر ناشتے کی میز پر آئی تو سرمد نے مجھے غور سے دیکھا۔

"دفتر ہی جا رہی ہو ناں آج؟" ان کے انداز میں توصیف تھی۔

"ج...جی...جی!" میں ہکلا گئی...... "شام میں ہم دوستوں نے باہر ملنے کا پروگرام بنایا ہے...... چائے پر!"

"اچھا...... پھر تو تم معمول سے دیر سے لوٹو گی۔" بے پروائی سے اپنے توس کے ساتھ انڈا کھاتے ہوئے کہا۔ ایک بار دیکھنے کے بعد وہ میری طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔

"ہاں...... دیر تو ہو ہی جائے گی۔" میں نے کہا اور ناشتا کرنے لگی، سرمد ناشتے کے ساتھ اخبار دیکھنے میں مصروف تھا، مجھے اپنے حسن کی توہین محسوس ہوئی۔ ناشتا ختم کر کے میں نے اسے خدا حافظ کہا اور چل دی۔ اس کے بعد شاید حالات مختلف ہوں گے...... میں نے دل میں سوچا۔

"نیڈی سے ملوں گی تو جلد ہی کسی فیصلے پر پہنچ کر تمہیں خدا حافظ کہہ دوں گی مسٹر سرمد۔"

"سنو......" اس نے پکارا، مجھے لگا کہ وہ مجھے روکنا چاہتا ہو مگر اسے کیا معلوم کہ میں کس مشن پر جا رہی ہوں، مجھے اپنی سوچ پر خود ہی ہنسی آئی۔

"تم بہت اچھی لگ رہی ہو آج......" اس نے کہا۔ "ہمیشہ سے بڑھ کر، اسی طرح رہا کرو...... اور ہنستی ہوئی تو تم اور بھی اچھی لگ رہی ہو۔"

"اچھا!" میں نے طنز سے کہا۔

"سچ مانو!"

"بس یا کچھ اور بھی کہنا ہے تمہیں؟" میں نے ایسے غرور سے گردن اکڑائی جیسے میں واقعی ملکۂ حسن ہوں، ایک مرد نے تو میرے حسن کو خراج دے دیا تھا، اب دوسرے کو قتل کرنا باقی تھا۔ دفتر سے لنچ کے وقفے کے بعد ہی مجھے اٹھ جانا تھا، "میں لنچ اکٹھے کرنا تھا اور نیڈی نے کہا تھا کہ واپس جانے کی بات نہ ہوگی، ہم دیر تک باتیں کریں گے۔ جانے کیا، کیا باتیں جمع کر رکھی تھیں اس نے...... میں نے اس کا شکریہ بھی ادا نہ کیا اور خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکل آئی۔

میں نے گاڑی میں خالہ جان کی ایک چادر ایک دن پہلے ہی رکھ دی تھی، اس سے مجھے کچھ نہ کچھ تحفظ مل جاتا، ہوٹل میں داخلے سے لے کر اس کیبن تک مجھے خود کو اس چادر سے کور کرنا تھا تا کہ اگر کوئی ہال میں جاننے والا بیٹھا ہو تو وہ مجھے پہچان نہ سکے۔

☆☆☆

دفتر میں کس کا دل لگنا تھا اس روز...... کام کرتی کچھ تھی اور ہوتا کچھ تھا، کچھ اس کے پیغامات بار بار آ رہے تھے...... اس کی بے تابیوں کی داستانیں...... وقت نہ گزرنے کی شکایتیں اور کیفیتِ دل کی حکایتیں...... ایسی رومانوی باتیں کہ دل ریل گاڑی

کی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔

"نتالیہ...... آپ ہوش میں تو ہیں؟" باس سر پر کھڑے تھے۔

"کیوں سر......؟" میں ہڑبڑا کر اٹھی۔

"آپ نے دفتر کے سارے کمپیوٹرز کے password تبدیل کر دیے ہیں اور مجھے بتایا تک نہیں...... صبح سے log in کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، اب جا کر علم ہوا ہے کہ کسی نے password تبدیل کر دیے ہیں اور وہ کوئی اور نہیں، میڈم نتالیہ ہیں......"

"سر p assword تو ہر ہفتے تبدیل ہوتے ہیں......"

"مگر ہر ہفتے آپ میرے کمپیوٹر میں password خود بخود آ کر save بھی تو کر دیتی ہیں......"

"سوری سر...... بھول گئی اس دفعہ...... میں ابھی کر دیتی ہوں......"

"کوئی ضرورت نہیں...... بس آپ مجھے بتا دیں......"

میں نے انہیں password بتایا۔

"ویسے سب کچھ ٹھیک تو ہے ناں؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی سر......" میں نے تھوک نگل کر کہا۔

"گھروں کے معاملات کو گھروں پر چھوڑ کر آئیں تو ہی دفتری معاملات درست رہ سکتے ہیں۔" انہوں نے مجھے تنبیہ کی۔

"نہیں سر...... ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے تصحیح کی۔ "یونہی ذرا طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔"

"ویسے دیکھنے میں تو آپ مجھے ہر روز سے زیادہ بہتر لگ رہی ہیں......" میں نظر چرا کر رہ گئی، واقعی میرا علیہ میرے بیان سے قطعی میل نہیں کھا رہا تھا۔ باس چلے گئے تو میں نے گہری سانس لی، کیا ہو گیا تھا مجھے، اپنے کام پر ایسی بڑی، بڑی غلطیاں کروں گی تو بے عزتی تو ہو گی ناں...... میں نے پیغامات بھیج کر نیڈی کو ساری بے عزتی کی تفصیل بتائی اور وہ سن کر خوب محظوظ ہوا۔

☆☆☆

دفتر سے نکلی تو دائیں بائیں دیکھ رہی تھی کہ کوئی مجھ سے پوچھ نہ لے کہ میں اس وقت کہاں جا رہی تھی، حالانکہ میری پوزیشن ایسی نہ تھی کہ کوئی مجھ سے سوال کرتا مگر دل میں چور ہو تو ساری دنیا کوتوالی نظر آتی ہے۔ گاڑی میں بیٹھ کر میں نے چادر اوڑھی، گاڑی بھی اپنی نہیں لائی تھی کہ پہچان نہ لی جاتی بلکہ اس گاڑی سے پہلے جو گاڑی میرے تصرف میں تھی وہ لے کر آئی تھی جو فالتو ہی کھڑی تھی اور کبھی کوئی چلاتا اور کبھی کوئی۔

سخت ٹینشن ہو رہی تھی، ساتھ ساتھ اس کے پیغامات آ رہے تھے، میں نے اسے بتایا کہ میں دفتر سے نکل آئی ہوں، اس نے بتایا کہ وہ بھی روانہ ہو چکا ہے۔ دل نئی تال پر دھڑک رہا تھا، عشق اور پھر چوری کی یہ ملاقات، ایک نئے تھرل کا سامنا ہونے والا تھا۔ اس وقت میں سب بھولے ہوئے تھی، اپنی حیثیت، اپنا مقام، اپنا نام...... بس یہ یاد تھا کہ اسے ملنے جا رہی ہوں۔

"کہاں پہنچی ہو؟" بار بار اس کا پیغام آ رہا تھا، میں اسے جواب دیتی اور اس کی لوکیشن کے بارے میں سوال کرتی۔ فاصلہ طے ہی نہیں ہو رہا تھا، میں نے ٹیپ کا بٹن آن کیا کہ کوئی موسیقی ہی سن لوں۔

"ابھی ہم اٹھارویں پارے سے سورۂ نور کی تلاوت اور ترجمہ سنیں گے...... آواز ہے......" کسی نے تلاوت کی کیسٹ لگا رکھی تھی، میں نے دوسری کیسٹ کی تلاش میں نظر دوڑائی مگر نہ پا کر اسے ہی آن رہنے دیا، بند کرنے کا سوچا تو ضمیر نے ملامت کی کہ اللہ کیا کہے گا کہ میں نے قرأت سننا گوارا نہیں کی۔ اس اللہ کی ناراضی کے ڈر سے میں اسے بند کرتے کرتے رک گئی اور تلاوت چلتی رہی اور میں

گاڑی چلاتے ہوئے ساتھ ساتھ اسے پیغامات بھی بھیج رہی تھی۔

''ان میں سے ہر شخص پر اتنا گناہ ہے جتنا اس نے کمایا ہے اور ان میں سے جس نے اس کے بہت بڑے حصے کو گویا انجام دیا ہے، اس کے لیے عذاب بھی بہت بڑا ہے۔''

''اللہ تعالیٰ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ پھر کبھی ایسا کام نہ کرنا اگر تم سچے مومن ہو۔''

''ایمان والو...... شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو۔ جو شخص شیطانی کاموں کی پیروی کرے تو وہ بے حیائی اور برے کاموں کا ہی حکم کرے گا۔''

''اللہ تعالیٰ جسے پاک کردینا چاہے، کردیتا ہے۔''

''کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے قصور معاف فرمادے؟ اللہ تعالیٰ قصوروں کو معاف فرمانے والا مہربان ہے۔''

ہر پیغام کے وقفے میں، میری توجہ تلاوت اور ترجمے کی طرف مبذول ہو جاتی اور میں اس طرح اسے سن رہی تھی کہ جیسے یہ سب میرے سر کے اوپر سے گزر رہا ہو۔ میں ہوٹل پہنچ گئی تھی، قرأت سورۂ نور کی چھبیسویں آیت پر تھی، میں بے ارادہ ہی رک گئی کہ یہ آیت پوری ہو جائے۔ آیت کی تلاوت اور ترجمہ تمام ہوا۔ میں نے چادر اپنے اردگرد لپیٹی اور ہر طرف دیکھتی ہوئی باہر نکل آئی۔

''میں پہنچ گئی ہوں......'' میں نے پیغام بھیجا۔

''میں دس منٹ میں پہنچتا ہوں...... تم اندر چلو یا گاڑی میں بیٹھ کر انتظار کرو......''

''میں اندر جارہی ہوں......'' میں نے لکھا اور اندر کی طرف چلی، گاڑی میں بیٹھ کر انتظار کرنے سے مجھے ہمیشہ کوفت ہوتی تھی۔

''آج تو میں تمہیں دیکھوں گا...... اور محسوس کروں گا۔''

''اچھا...... دیکھ تو لیا، محسوس کیسے کرو گے؟''

میں نے ایک کونے کی طرف کی میز سنبھال کر اسے پیغام بھیجا کہ میں کہاں بیٹھی ہوں۔

''محسوس کیسے کرتے ہیں بھلا، چھو کر......''

''چھو کر؟'' میں نے لکھا۔ ''کیسے چھوؤ گے تم مجھے...... مجھے تو ابھی تک اس نے بھی نہیں چھوا جس سے میرا نکاح ہوا ہے......''

''وہ، وہ ہے اور میں، میں ہوں......'' جواب آیا۔ ''جو حق تم نے مجھے دیا ہے وہ اسے کہاں حاصل ہے؟ مجھ سے تمہیں محبت ہے...... ہے ناں؟''

''شاید......'' میں ہاں کا لفظ بھی نہ لکھ سکی۔

''تمہیں ابھی تک اپنی محبت پر شک ہے تتلی؟''

''میں نے کب کہا یہ......''

''مطلب تو یہی سمجھ میں آیا ہے مجھے، میں تمہیں چھونا چاہتا ہوں اور تم کہتی ہو کہ ممکن نہیں...... کیا میں اس ملاقات کے بعد بھی تشنہ ہی رہوں گا؟''

''ملو تو پھر دیکھتے ہیں کہ کیا ہوگا!''

''پہلے وعدہ کرو......'' اس نے اصرار کیا۔

''میں ایک شریف لڑکی ہوں اور اس طرح کا وعدہ نہیں کرسکتی۔''

''تم شریف ہو تو میں بھی ایسا ہی شریف ہوں...... یقین کرو کہ تم میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی ہو...... اور ہم شرافت کی ایک حد تو توڑ ہی رہے ہیں ناں، میں اور تم دونوں...... یوں چوری چھپے ملنا، میری تو خیر ہے، تم جو کچھ کررہی ہو وہ اس سماج کے اصولوں کے مطابق بہت بڑا گناہ ہے۔''

''اب یہاں بلا کر تم مجھے یوں گناہ اور ثواب کے چکروں میں الجھا رہے ہو؟''

''الجھا نہیں رہا جان...... کہہ رہا ہوں کہ جب ہم مل ہی رہے ہیں، ایک گناہ کر ہی رہے ہیں تو چھو کر ایک گناہ اور سہی......'' وہ یہ پیغام بھیج کر شاید ہنس رہا ہوگا...... اور میرے کانوں میں چھبیسویں آیت کا ترجمہ گونج رہا تھا۔

''خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لائق ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لائق ہیں اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لائق ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لائق ہیں......''

میری ذات کی دھجیاں اُڑ گئیں...... میں کیا تھی اور کیا کرنے جارہی تھی، کیا میں خبیث تھی...... ہاں وہ تو جو کررہا تھا سو کررہا تھا تو کیا میں بھی اسی کے پیچھے چل پڑی تھی آنکھیں بند کیے۔

''اس نے پہلے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔'' میرے دل نے کہا۔ ''تو حوصلہ افزائی تو' تو نے خود کی ناں......'' دماغ نے جواب دیا۔ میری یاد کے نہاں خانوں سے نکل، نکل کر ایک ایک لفظ جو میں نے اس کے پیغامات کی حوصلہ افزائی کے لیے اسے بھیجا تھا مجھے سامنے نظر آنے لگا...... میں بے دیکھے اس کے عشق میں گلے، گلے ڈوب چکی تھی اور اس نے تو کہہ دیا تھا کہ ہم جو کچھ کررہے تھے وہ گناہ تھا...... مجھے کیوں اس کا احساس نہ ہوا تھا۔

''پانچ منٹ میں، میں تمہارے پاس ہوں گا اور اس کے ایک منٹ کے بعد تم میری بانہوں میں۔'' اس کے آخر میں مسکراتا ہوا چہرہ...... کتنا یقین تھا اسے اس بات پر۔ میری ٹانگیں لرزنے لگیں، میں ہمت کرکے اٹھ کھڑی ہوئی، بیرا لپک کر میرے پاس آیا کہ شاید مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوگی، میں نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور تیزی سے باہر کی طرف لپکی۔ اس سے پہلے کہ وہ آجائے۔

''میں جارہی ہوں......'' میں نے اسے آخری پیغام بھیجا۔ ''اس کے بعد مجھے کبھی پیغام نہ بھیجنا......'' اور میں نے فون بند کردیا۔ بھاگ کر گاڑی کے پاس پہنچی اور شام تک سڑکوں پر بے مقصد گاڑی میں گھومتی رہی۔ گھر پہنچی تو سرمد پہلے سے موجود تھا...... میں نے رک کر اسے دیکھا، سلام کیا اور اپنے کمرے میں آگئی۔ وضو کرکے نماز پڑھی، وہ میرے

کمرے میں آ گیا۔

''کیسی رہی پارٹی؟'' اس نے پوچھا۔

''کون سی پارٹی؟'' میں نے غائب دماغی سے پوچھا۔ ''ہاں ہاں...... وہ...... پارٹی کینسل ہوگئی۔''

''اچھا...... وہ کیوں؟'' حیرت سے اس نے پوچھا۔

''وہ جس نے پارٹی پر بلایا تھا اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہوگیا......'' میں نے بودا سا بہانہ گھڑا۔

''تم باقی لوگ خود ہی کر لیتے پارٹی۔'' سرمد نے مشورہ دیا۔ ''پیسے تو تھے ناں تم لوگوں کے پاس؟''

''آں ہاں......'' میرا چہرہ بھی شاید میری بدحواسی کی چغلی کھانے لگا تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو نتالیہ؟'' اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میں بے اختیار ہو کر اس کے سینے سے چمٹ گئی...... اس نے مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

''آئی ایم سوری سرمد......'' اس کے ہونٹوں کا لمس میرے بالوں سے ہوتا ہوا، میرے سر کی کھال سے میرے دماغ تک اتر گیا، میں نے خود کو دل و جان سے اس کے حوالے کر دیا۔

☆☆☆

خالہ کا یقین واثق تھا کہ سخت سے سخت دل عورت بھی کبھی نہ کبھی مرد کی محبت سے نرم پڑ جاتی ہے...... اور بعض عورتیں ٹھوکر کھا کر سنبھلتی ہیں...... جس سب کو آپ اتفاق سمجھ رہے ہیں، وہ سب میرے پلان کا حصہ تھا' مجھے ایک دفعہ باتوں، باتوں میں عائشہ نے بتایا تھا کہ نتالیہ کو بچپن میں کچھ کزنز شرارت سے تتلی کہتے تھے کیونکہ وہ ہر ایک کی توجہ کے لیے بھاگتی پھرتی تھی۔

میرے ذہن نے ایک منصوبہ ترتیب دیا اور اس پر عمل کر کے میں نے اسے آزمایا، سوچا کہ اگر وہ نیڈی سے ملنے کے لیے رک جاتی...... تو سرمد کو کھو دیتی، اگر وہ وہیں بیٹھی رہ جاتی تو میرے دل سے اٹھ جاتی۔ میں نے اسے للچایا اور ایک ایسی محبت میں گرفتار کیا جس کا کوئی انت نہیں ہوتا۔ اس کے اندر کی عورت کو جگایا اور دیکھنا چاہا کہ اگر میری محبت میں طاقت ہوئی اور میرے جذبوں میں صداقت...... تو وہ لوٹ آئے گی، بہ صورتِ دیگر وہی ہوتا جس کا مطالبہ اس نے اول روز ہی کر دیا تھا۔

دیر سے ہی سہی مگر میں نے اسے پا لیا تھا، اب وہ مجھے پیار کرتی ہے، کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھتی ہے اور بابا اور خالہ آئیں گے تو یہ سن کر خوش ہوں گے کہ جلد ہی ان کے آنگن میں ننھی قلقاریاں گونجیں گی، انشاء اللہ......!

☆☆☆

جس بات کو وہ دونوں نہیں جانتے تھے، وہ یہ تھی کہ جسے سرمد اپنی محبت کی طاقت سمجھ رہا تھا وہ دراصل کلامِ پاک کی وہ طاقت ہے کہ جو دلوں پر پڑے قفل توڑ دیتی ہے...... سخت سے سخت دل کو بھی موم کر دینے والی طاقت اللہ سے محبت ہے جو انسان کو راہ سے بھٹکنے نہیں دیتی، اس ٹیپ کا اس وقت اس گاڑی میں لگے ہونے میں سرمد کی کوئی پلاننگ نہیں تھی... بلکہ یہ اللہ کی پلاننگ تھی جس نے اسے اس کھائی میں گرنے سے بچا لیا۔

سرمد فتح اور نتالیہ جرم کے اس احساس میں مبتلا رہ کر جئیں گے جس کا اظہار وہ دونوں ایک دوسرے سے نہیں کر سکیں گے...... نتالیہ نے اپنا فون نمبر تبدیل کر لیا اور facebook کی اپنی اس ID کو بھی ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں اس گناہ کے باب کو ختم کر دیا ہے مگر سرمد اب بھی کبھی کبھار اس ID پر اسے پیغامات بھیجتا ہے محض یہ چیک کرنے کے لیے کہ کہیں اس کی محبت میں کمی محسوس کر کے وہ دوبارہ نیڈی کی طرف نہ پلٹ جائے۔



عیب

راحت وفا



اماں کی چبھتی ہوئی نظروں کا مطلب بھانپ کر اس نے نوالہ پلیٹ میں چھوڑا اور کرسی پرے دھکیل کر تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی...... اس کے جاتے ہی عالیہ بیگم نے شوہر کی طرف دیکھا تو وہ نظریں چرا گئے۔

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، اب تو تقریباً ہر دس پندرہ روز بعد ایسا ہی دن آتا تھا اور ایسی ہی شام جب سعدیہ کو دیکھنے کوئی فیملی آتی تھی تو ان کی نظروں

سے جھلکتی ناپسندیدگی دیکھ کر عالیہ بیگم، زوار احمد اور خود سعدیہ بھی جان لیتی تھی کہ وہ لڑکے والوں کی پسند نہیں بن سکی، بات اتنی سی تھی کہ سعدیہ اس کے بعد بھی نارمل اور مطمئن رہتی جبکہ عالیہ بیگم اور زوار احمد کے اندر تھکن اور اضطراب مزید بڑھ جاتا...... وہ سعدیہ کو زیادہ نہیں اتنا قصوروار ضرور سمجھتے تھے کہ وہ ان کی بات نہیں مانتی تھی، اس کی شکل صورت بس واجبی سی تھی اس پر البتہ نظر کا مسئلہ سنگین صورتِ حال اختیار کر چکا تھا...... اس کی دائیں آنکھ میں پیدائشی موتیا تھا جو ٹھیک بائیس سال بعد پک کر مشکلات پیدا کرنے لگا تھا آئی سرجن نے آپریشن کر کے لینس ڈال کر عینک لگا دی، دونوں آنکھوں کے نمبر الگ الگ تھے اس لیے عینک لازمی تھی...... مگر یہ مسئلہ ذہین و فطین سعدیہ کی زندگی کا عیب بن گیا تھا۔

''خدا کے لیے عینک لگا کر اندر نہیں آنا۔'' جب لڑکے والے اسے دیکھنے آتے سعدیہ کو عالیہ بیگم علیحدگی میں لے جا کر کہتیں۔

''کیوں، یہ کسی اور کی نہیں میری ہے، میری ذات کا حصہ ہے۔'' وہ بگڑ کر کہتی۔

''ہاں! لیکن اس کی پہلی بار نمائش ضروری نہیں، لڑکے والے حور تلاش کرتے ہیں، اوپر سے عینک ہو تو برا سا منہ بناتے ہیں۔''

''کمال کرتی ہیں آپ، عینک کوئی جرم یا گناہ نہیں اور اب کیا کیا کھرچ کر چہرہ تبدیل کروں؟''

''فی الحال عینک کی ضرورت نہیں۔''

''اماں! یہ اب کوئی اچنبھے کی بات نہیں، ہر دوسری لڑکی کو عینک لگی ہوئی ہے۔''

''جرح مت کیا کرو یہ لڑکے والوں کے نزدیک لڑکی کا عیب ہے۔'' عالیہ بیگم جھنجلا کر کہتیں تو وہ مزید بھڑک اٹھتی۔

''میں اسے عیب نہیں سمجھتی، میں کیوں چھپاؤں۔''

''ٹھیک ہے جو جی میں آئے کرو۔'' وہ جھنجلا کر چلی جاتیں تو سعدیہ دادا ابا کے سر ہو جاتی۔

''دادا جی...! اماں چاہتی ہیں کہ میں جھوٹ بولوں۔''

''جھوٹ بولنا نہیں، جھوٹ دکھانا چاہتی ہیں۔'' دادا جی اس کے بگڑے تیور دیکھ کر نرمی سے کہتے۔

''میں جو ہوں سو ہوں، ایسے ہی جسے قبول کرنا ہے کرے، میری مجبوری نہیں ہے۔'' وہ تلملا کر کہتی اور پھر سچ مچ وہ ویسا ہی کرتی۔

عالیہ بیگم دانا خاتون تھیں انہیں حالات بدلنے کا شعور تھا، ان کے نزدیک بھی یہ کوئی بڑی بات یا عیب نہیں تھا مگر اتفاق تھا کہ پڑھے لکھے گھروں سے آنے والے لوگوں کی سوچ نہیں بدلی تھی...... اس پریشانی کے باعث بہت سے آئی سرجن اور اسپیشلسٹ سے مشورے کر چکی تھیں مگر سعدیہ کا عینک کے سوا کوئی علاج نہیں تھا کیونکہ نہ اسے لینز لگ سکتے تھے اور نہ کوئی دوسرا حل تھا...... عالیہ بیگم کو ڈاکٹرز سے اتفاق تھا مگر رشتے کے لیے آنے والی خواتین کی باتیں برداشت کرنا بڑا کٹھن کام تھا...... مگر کیا کرتیں سعدیہ کو ایم ایس سی میتھس کیے بھی تین سال ہو گئے تھے، سب سہیلیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں...... اکلوتی بیٹی کی بڑھتی ہوئی عمر کو وہ کسی طور روک نہیں سکتی تھیں...... زوار احمد لاکھ انہیں تسلیاں دیتے...... آج بھی وہ کئی بار کی کہی ہوئی بات دُہرا رہے تھے۔

''عالیہ! بیکار میں کڑھنے کا فائدہ......؟ جہاں ہماری بیٹی کا مقدر ہوگا وہاں بات بن جائے گی۔''

''کمال کرتے ہیں آپ، عمر نکلی جا رہی ہے اور آپ کی لاڈلی میری ایک نہیں سنتی۔'' عالیہ چڑ کر بولیں تو زوار احمد نے شکست خوردہ انسان کے مانند ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

''مثلاً کیا کرے سعدیہ؟''

''جب معلوم ہے کہ لوگ ظاہری شکل صورت دیکھتے ہیں تو ذرا ڈھنگ سے اپنا خیال رکھ لے قدم قدم پر پارلر کھلے ہیں۔''

''اس سے کیا ہوگا؟ تقدیر سے لڑنے کی کوشش نہ کیا کرو اور اسے اپنی مرضی سے جینے دو۔'' وہ یہ کہہ کر اٹھنے لگے تو وہ فوراً بولیں۔

''بیٹی کو سیکھ نہ دیجیے گا۔''

''کیسی سیکھ......؟ لوگوں کی پست سوچ کا کوئی حل نہیں ہے میرے پاس، اس صدی میں بھی لوگوں کے لیے عینک معیوب ہے، ذہانت، قابلیت کی جگہ شکل صورت اہم ہے، میں اور کیا کہوں؟'' وہ کافی طویل جواب دے کر کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

عالیہ بیگم رنجیدہ خاطر سی ان خواتین کے بارے میں سوچنے لگیں۔ جنہوں نے سعدیہ کو سر سے پیر تک دیکھا اور اشارے سے عینک کے حوالے سے کوئی بات کی اور پھر جاتے ہوئے واضح طور پر کہہ گئیں۔

''معاف کرنا بہن! نظر کی کمزوری آگے بچوں میں بھی آ جاتی ہے اور پھر رنگت بھی بہت گہری ہے۔''

''ایسی بھی بات نہیں ہے، اب میں اور سعدیہ کے بابا دونوں ماشاء اللہ ٹھیک ہیں اور ٹھیک تو سعدیہ بھی ہے۔'' عالیہ بیگم نے دل مضبوط کر کے دبے دبے غصے سے کہا۔

''ویسے بھی دو چار بچوں کے بعد عینک لگے تو فرق نہیں پڑتا۔'' ان کی اس بات پر عالیہ بیگم غصہ ضبط کر کے خاموش ہو گئیں۔

''ہونہہ......! کتنی جاہلانہ سوچ رکھتی ہیں خواتین......'' وہ بڑبڑائیں۔

''عالیہ بیگم! کیوں کڑھتی ہو؟ یہ انسانی رویے ہیں، کوئی آخری رشتہ تو نہیں تھا ناں یہ......'' رات جب وہ تھک ہار کر کمرے میں آئیں تو زوار احمد ان کے چہرے کے تاثرات غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔

''بیٹی کے والدین ہونا جرم بن گیا ہے۔'' وہ افسردگی سے بولیں۔ وہ خود بھی دلی طور پر افسردہ ہوگئے مگر انہوں نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

اگلی صبح وہ معمول کے مطابق تیار ہو کر آفس چلے گئے...... سعدیہ دادا کے پاس آگئی تھی۔

''اپنی ماں کی باتوں پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں بیٹی۔'' دادا کی بات پر وہ چونکی۔

''کیا مطلب......؟''

''یہ عینک اگر صاف نہ رکھیں تو دھندلا نظر آتا ہے۔'' وہ رک کے اپنی عینک صاف کی اور اسے دوبارہ لگاتے ہوئے غیر محسوس طریقے سے اسے دیکھا اور مسکرائے۔

''یہ پینٹ بنانے والی کمپنیاں کتنا خرچہ کرتی ہیں صرف لوگوں کو یہ بتانے کے لیے وہ اپنے گھر ان سے خوب صورت بنائیں۔ شاید ٹھیک ہی کرتے ہیں گھر خوب صورت ہی اچھے لگتے ہیں۔''

''دادا جی! آپ پر اماں کی باتوں کا اثر ہوگیا ہے۔'' وہ مدہم لہجے میں بولی۔

''ہونہہ......! عام آدمی کی باتوں میں اور ایک ماں کی باتوں میں یہی تو فرق ہوتا ہے۔'' انہوں نے پیار سے اس کے ہاتھ تھام کر کہا۔

''اس گھر میں میرے سوا اور کوئی موضوع نہیں رہا......'' وہ اٹھ کر جانے لگی تو دادا جی نے اسے بٹھالیا۔

''بیٹا! سورج کی پہلی کرنیں بڑی جلدی مرجاتی ہیں انہیں زیادہ دیر زندہ نہیں رکھا جاسکتا، عالیہ اسی لیے کُڑلاتی ہے، سب سے زیادہ اسے تم سے محبت ہے۔'' وہ چند ساعت ان کی بات پر غور کرتی رہی پھر بنا کچھ کہے اٹھ کر باہر آگئی۔

دماغ کو اطمینان اور خوشی دینے کے لیے لیپ ٹاپ کے سامنے آبیٹھی مگر پھر دل اچاٹ ہوا تو نمرہ کے گھر چلی آئی...... وہی تو اس کی واحد گہری سہیلی تھی۔ اپنے ڈیڑھ سالہ بیٹے کو گود میں دبائے وہ ہمیشہ اسے تسلیاں دیتی تھی۔

''سعدی! یہ دنیا خودغرضوں سے اگر بھری نہیں ہے تو خالی بھی نہیں ہے۔''

''نمرہ...... میں اس مشق سے تنگ آگئی ہوں، مجھے نہیں کرنی شادی وادی۔''

''عورت کا یوں بھی تو گزارہ نہیں ہوتا ناں۔'' نمرہ نے آہستہ سے کہا۔

''دیکھو تم نے کُڑھ کُڑھ کر کیا حالت بنالی ہے۔'' وہ سچی دوست تھی دوست کی کیفیت پر تڑپ اٹھی۔

''میں مزید مسترد نہیں ہونا چاہتی۔''

''مسترد ہونا تو عورت کا مقدر ہے۔'' نمرہ کی آنکھوں میں اداسی اور بے بسی جھانکنے لگی۔ سعدیہ کو نمرہ کی یہ بات کچھ زیادہ پسند نہیں آئی یا پھر سمجھ میں نہیں آئی، چائے پیے بنا ہی وہ لوٹ گئی...... نمرہ اسے کیا بتاتی کہ عورت کن کن وجہ سے کب کب مسترد ہوتی ہے۔

☆☆☆

پھر کئی روز کی ذہنی کشمکش کے بعد اس نے ملازمت کرنے کا فیصلہ دادا جی کو سنایا تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوا انہوں نے بیٹے بہو کو...... سمجھا بجھا کر راضی کرلیا۔

''اس کے ذہن میں تازہ ہوا جانے دو۔'' عالیہ بیگم چپ ہوگئیں...... سعدیہ نے ایک نہیں، دو تین جگہ اپنا سی وی جمع کرایا...... ایک ملٹی نیشنل کمپنی سے اسے بطور اکاؤنٹ آفیسر کی آفر ہوئی تو اس نے جھٹ جوائن کرلیا۔ اس کا ذہن بٹ گیا، گھر کے ماحول میں بھی کچھ تبدیلی آئی، وہ کافی آسودہ ذہن ہوگئی تھی۔ کمپنی کے مالک مسٹر فیروز بہت اچھے انسان تھے، درمیانی عمر اور درمیانی شکل صورت کے مالک، انتہائی نفاست سے بال سنوارے سعدیہ کو بہت اچھے لگے، ان کے لہجے کی شائستگی کے باعث اس کی ذہنی دھند چھٹ گئی کھلکھلا کے ہنسنے لگی تھی، چڑچڑا پن ختم

ہوگیا تھا کیونکہ کام کے ساتھ ساتھ فیروز صاحب کے ساتھ کچھ دیر بیٹھنا اِدھر اُدھر کی باتیں کرنا اچھا لگتا۔

آج بھی جونہی کام ختم کر کے اس نے اپنا پرس اٹھایا تو فیروز صاحب اس کے آفس میں آگئے...... اس کے سامنے بیٹھ گئے۔

''مس سعدیہ......! آپ نے شادی کی جگہ ملازمت کیوں کرلی؟'' غیر متوقع سوال تھا اس کا چونکنا یقینی تھا...... اس نے اپنی عینک اتار کر ٹشو پیپر سے صاف کی اور کہا۔

''کیونکہ میرا بچپن میں ہی اس سے نکاح ہوگیا تھا......'' عینک کی طرف کیے گئے اشارے سے فیروز صاحب چونکے۔

''کیا مطلب......؟''

''یہ سچ ہے، یہ عینک میرے لیے بہت بڑی حقیقت ہے۔'' وہ یہ کہہ کر انتہائی سنجیدگی سے آفس سے باہر نکل گئی...... اس نے حیرت زدہ سے فیروز صاحب کو پلٹ کر نہیں دیکھا...... گھر کے راستے میں نمرہ کا گھر تھا...... نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کی طرف آگئی۔ نمرہ اپنے بیٹے کو سلا رہی تھی سعدیہ نے سر فیروز سے ہونے والی گفتگو کا تذکرہ کیا تو نمرہ پوچھ بیٹھی۔

''سر فیروز شادی شدہ ہیں؟''

''شاید نہیں۔''

''تو پھر اُن کا جواب تو لے کر آتیں۔'' نمرہ نے کہا۔

''کیسا جواب......؟''

''سچ سن کر ان کا ہاضمہ ٹھیک رہا یا خراب ہوگیا۔''

''تو، اس سے کیا ہوتا؟''

''تمہارا مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔''

''بکومت......'' اس نے کہا۔

''اب موقع ملے تو مزید سب کچھ بتا کر دیکھنا۔''

نمرہ کی بات ہوا میں اڑا کر وہ بھول بھال گئی مگر پھر ایسا موقع ہاتھ آہی گیا...... اسے نمرہ کی بات یاد آگئی...... سر فیروز کے سامنے بیٹھی وہ کچھ فائلوں پر دستخط کروا رہی تھی اور انہیں انہماک سے دیکھ بھی رہی تھی...... وہ آخری فائل پر دستخط کر کے ایک دم بولے۔

''میں نے اس وقت سے اب تک آپ کے بارے میں بہت سوچا، مجھے حیرت ہوتی رہی۔''

''حیرت کی کیا بات ہے سر؟ میں نے سچ کہا تھا، میری دائیں آنکھ کا آپریشن ہوچکا ہے، پیدائشی موتیا تھا، لینس ڈلا ہوا ہے، عینک کے بغیر میں دیکھ نہیں سکتی۔'' نمرہ کے کہنے کے مطابق اس نے سارا سچ بتادیا...... وہ پھر بنا ان کا جواب لیے آفس سے باہر آگئی۔

اگلے دو تین روز وہ موسمی بخار کے باعث آفس نہ جاسکی...... شام کو طبیعت ذرا سنبھلی تو نمرہ کی طرف آگئی...... نمرہ بہت پیار سے ننھے راجا کو کھیلتا دیکھ

خاموش گلہ

روز نظریں لاکھوں چہروں میں بکھر جاتی ہیں
میں ڈھونڈتی ہوں تمہیں زندہ تصویروں میں
بھول جاتی ہوں کہ تم ہو سراب کے مانند
تم کیا ملوگے مجھے خواب کی تعبیروں میں
کوئی تم کو دیکھ لے یا پڑھ لے میرے الفاظ
کہ تم ہی ملوگے جابجا میری تحریروں میں
تیری یادوں پر لگاؤں میں اب کیسے پہرے
کہ یادیں کب قید ہوئی ہیں زنجیروں میں
مجھے ادھورے سے لگتے ہیں اب اپنے ہاتھ بھی
کہ ایک نام جو نہیں لکھا اِن کی لکیروں میں
تمہاری بے وفائی کا شکوہ ہے نہ اپنی خاموشی کا گلہ
شاید ہماری منزل ایک نہیں تقدیر کے جزیروں میں

شاعرہ: قمرٰی، جہلم

رہی تھی اسے دیکھ کر ایک اداس سی مسکان اس کے لبوں پر پھیلی اور پھر معدوم ہوگئی...... اس نے فیروز سے ہونے والی دوسری باتیں بھی اسے بتادیں تو نمرہ بول اٹھی۔

''اللہ کرے تمہیں سچ کا انعام ملے۔''

''تم اتنی اداس کیوں ہو نمرہ؟''

''کچھ خاص بات نہیں۔''

''پھر بھی......''

''سعدیہ! رفیق نے دوسری شادی کرلی ہے۔'' یہ اطلاع سعدیہ کو برقی جھٹکے کے مانند لگی۔

''کیا......؟''

''رفیق کی ضرورت تھی۔'' نمرہ اس قدر نارمل تھی جیسے کسی غیر کی بات بتارہی ہو اور غیر بھی ایسا جو دوسرے ملک میں بستا ہو۔

''کیسی ضرورت؟''

''اسے خوب صورت ماڈل جیسی بیوی چاہیے تھی، چربی کا لوتھڑا نہیں۔''

''نان سینس...... کتنی اسٹوپڈ بات ہے...... شادی کی ہی کیوں تھی؟''

''ان کی اماں میں خوف خدا کچھ زیادہ ہی تھا۔''

''نمرہ......! یہ کیا لاجک ہے؟'' سعدیہ پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔

''لاجک تو ہے، میں پہلے بھی فربہ تھی، راجا کی پیدائش کے بعد تو اور بے ڈھنگی ہوگئی ہوں، دیکھو تو پیٹ کی کھال کتنی لٹک رہی ہے، کہاں ماڈلز؟ اور کہاں میں؟''

''کیا بکواس ہے؟ اپنے بچے کی ماں کو اس نظر سے بھی کوئی دیکھ سکتا ہے؟'' سعدیہ کو یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ تقریباً چلا اٹھی۔

''ہاں! نظر دیکھتی ہی حقیقت ہے، میرے موٹاپے کو عیب ہی سمجھنا چاہیے۔'' نمرہ جانے کس مٹی گارے سے بنی تھی یہ سب کہتے ہوئے اداس تھی اور نہ غمگین، نہ اسے احساسِ ندامت تھا اور نہ شکستگی کا ملال۔

نمرہ سے مل کر اس کا چین وقرار کھو گیا تھا، اس کی نظروں میں بار بار معصوم سی نمرہ کا چہرہ آرہا تھا...... اسے صرف ایک مرد نے اس لیے تنہا کردیا کہ وہ ٹی وی اسٹارز کی طرح شرارہ نہیں تھی، یہی اظہار غم اس نے دادا جی کی گود میں سر رکھے ہوئے کیا......

وہ چند ساعت چپ چاپ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے رہے پھر بولے۔

''یہ تو محض بہانہ ہوتا ہے، مرد بنیادی طور پر عجب مزاج کا حامل ہوتا ہے، منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ہمسائی کے گھر کی دال بھی اپنے گھر کی مرغی سے اچھی لگتی ہے...... خواہ مخواہ نمک مرچ کی تیزی کا بہانہ بناتا ہے۔''

''مگر کتنے دکھ کی بات ہے۔'' وہ بولی۔

''ہاں......! اس کا بہترین حل ہے کہ دکھ بھول جاؤ۔''

''جیسے نمرہ بھول گئی۔''

''عقلمند ہے نمرہ...... شوہر شناس ہے۔'' دادا جی نے کہا تو وہ بہت کچھ سوچ کر خاموش ہوگئی۔ پھر اگلے دو ہفتے وہ کلوزنگ کی وجہ سے آفس میں بہت مصروف رہی...... سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں تھی...... ذرا دیر جو کمر کرسی کی پشت سے لگائی تو سر فیروز کافی کے د...ے ہاتھ میں لیے اس کے آفس میں آگئے۔

''مس سعدیہ آنکھوں کے لیے اتنا کام نقصان دہ ہوتا ہے۔''

''میری آنکھیں تو پہلے سے ہی نقصان زدہ ہیں سر۔'' وہ بولی۔

''اوہ......! سوری میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' وہ شرمندہ سے ہوگئے۔

''اٹس او کے......!''

''آپ بہت اچھی ہیں پھر بھلا عینک سے یا

آنکھوں کے مسئلے سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' انہوں نے کہا تو وہ طنزیہ ہنسی۔

''پڑتا ہے مگر آپ شاید میرا دل رکھنے کو کہہ رہے ہیں۔'' نہایت چبھتے ہوئے لہجے میں وہ بولی۔

''نہیں، بخدا میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' وہ وثوق سے بولے۔

''کیا......؟''

''یہی کہ آپ بہت اچھی ہیں، آپ میں بے شمار خوبیاں ہیں، میں آپ سے بہت متاثر ہوا ہوں، وہ اور بھی جانے کیا کچھ کہتے مگر عین اس وقت ان کا موبائل فون بج اٹھا تو وہ باہر چلے گئے...... اور سعدیہ کو ایسا لگا جیسے وہ جلتی ہوئی دھوپ سے ایک دم کسی بادل کے سائے میں آگئی ہو...... اسے سر فیروز کے بارے میں سوچتے ہوئے ڈھیر سارا وقت گزر گیا۔

گھر آکر بھی وہ ان کی مثبت سوچ کو دل ہی دل میں سراہتی رہی...... اماں اس کے کمرے میں آئیں اور کسی رشتے کے بارے میں کہا تو وہ صاف انکاری ہوگئی۔

''اماں......! پلیز مجھے کسی کے سامنے حاضر نہیں ہونا۔''

''ارے بہت اچھا رشتہ ہے، انہیں عینک سے بھی کوئی مسئلہ نہیں، دل وجان سے تمہارے لیے راضی ہیں۔'' وہ بہت خوشی خوشی کہہ رہی تھیں۔

''مگر میں راضی نہیں۔''

''تو کیا شادی نہیں کرنی؟''

''کروں گی۔'' وہ بولی۔

''یہ رشتہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

''نکلنے دیں اور آجائے گا۔''

''کیا مطلب......؟''

''اماں! ہے کوئی جسے میں اچھی لگتی ہوں۔''

وہ مبہم سا کہہ کر سوتی بن گئی۔ پھر دس پندرہ روز گزر گئے، سر فیروز کسی ذاتی کام کے سلسلے میں اسلام آباد چلے گئے...... ان کا جانا اس نے بہت محسوس کیا مگر چاہتے ہوئے بھی وہ کچھ پوچھ نہ سکی...... وہ خود ہی اس کے قریب آکر اتنا کہہ گئے کہ واپسی پر سرپرائز دوں گا...... وہ سرشار ہوگئی...... پورے پانچ دن بعد سر فیروز آفس آئے تو اسے اپنے آفس میں بلایا...... بے اختیار ہی وہ مسکرانے لگی... غیر ارادی طور پر بیگ سے ہیئر برش نکال کر بال سنوارے اور ان کے آفس میں آگئی...... وہ اسے دیکھ کر مسکرائے اور بولے۔

''آیئے، آیئے مس سعدیہ، بیٹھیے......'' وہ کرسی کے قریب آئی تو میز پر چائے کے دو کپ موجود تھے...... وہ بیٹھ گئی...... سر فیروز نے دراز کھول کر مٹھائی کا ڈبا نکالا اور کھول کے اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''مس سعدیہ سب سے پہلے آپ کا منہ میٹھا کرا رہا ہوں جانتی ہیں کیوں؟''

''نہیں تو......'' وہ بولی۔

''کیونکہ آپ کی حقیقت پسندی اور صاف گوئی سے متاثر ہو کر میں نے طویل عرصے سے التوا میں پڑا ہوا اپنی پولیو زدہ کزن کا رشتہ قبول کرلیا ہے۔'' انہوں نے بات مکمل کی تو گلاب جامن اس کے گلے میں پھنس گئی، آنکھیں نمکین ہوگئیں، دل مچل کر خاموش ہوگیا۔

''یو آر گریٹ...... آپ نے مجھے بہادری کا درس دیا ورنہ میں ماریہ کی قدرتی بیماری کو اس کا بہت بڑا عیب سمجھ کر انکاری تھا۔'' وہ خود ہی بولے تو وہ بھیگی پلکوں کے ساتھ مسکرادی۔

''آپ مٹھائی اور لیں۔''

''جی، شکریہ......!'' وہ دھیرے سے کہہ کر چائے کے کپ سے اٹھتی بھاپ میں آنکھیں گاڑے جانے کیا تلاش کرنے لگی۔

✖



منی ناول

گمشدہ جنت

صائمہ اکرم



چوتھا و آخری حصہ

وہ تیزی سے بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اور تکیے میں منہ دے کر بے اختیار رونے لگی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ارسلان اس کے لیے اس قسم کے الفاظ استعمال کر سکتا ہے۔ وہ ساری دنیا سے اس بات کی توقع کر سکتی تھی لیکن ارسلان دنیا کا واحد شخص تھا جس سے اسے، اس بات کی توقع نہیں تھی لیکن آج اس نے نوریہ کو اسی کی نظروں میں گرا دیا تھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کب اور کہاں وہ بدگمانی کی سیڑھیاں

چڑھتے ہوئے اتنی بلندی پر چلا گیا کہ اسے اپنی اور نویرہ کی محبت بھی نظر آنا بند ہوگئی۔

''کیا ہوا نویرہ ایسے کیوں رو رہی ہو، کیا ہوا ہے......؟'' رومی خالہ ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ نویرہ کو اس طرح روتے دیکھ کر ایک دم حواس باختہ ہوئیں۔

''کچھ نہیں خالہ، بس ایسے ہی......'' اس نے اپنے ہاتھ کی پشت سے بے دردی سے آنسو پونچھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''پھر بھی بتاؤ ناں......؟'' انہیں سخت پریشانی ہوئی۔ وہ اب فکرمندی سے اس کا سرخ چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

''بس خالہ ایسے ہی ارسلان سے تھوڑی تلخ کلامی ہوگئی تھی اس لیے......'' اس نے بات ادھوری چھوڑی۔ اتنا تو اسے بھی پتا تھا کہ وہ اصل بات کی حقیقت جانے بغیر اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔

''کیا...... کیا کہا ہے اس نے......؟'' انہوں نے جانچتی نگاہوں سے اپنی اس بھانجی کے چہرے کا جائزہ لیا۔ جو انہیں ہمیشہ سے بہت عزیز تھی۔

''کچھ نہیں......'' نویرہ نے انہیں ٹالنے کی کوشش کی۔

''تم اگر نہیں بتاؤ گی تو میں خود جا کر ارسلان سے پوچھ لوں گی......'' رومی خالہ کی دھمکی پر اس نے بوکھلا کر انہیں دیکھا۔ ان سے کچھ بعید بھی نہیں تھی ویسے بھی ان کی ارسلان سے خاصی بے تکلفی تھی۔

''ماما کے بارے میں نیگیٹو ریمارکس دے رہا تھا کہ انہوں نے ہماری تربیت اچھی نہیں کی اور وہ صرف اپنا ہی فائدہ سوچتی ہیں......'' نویرہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''ہاں تو اس نے کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہا......'' رومی خالہ کی بات نے نویرہ کو حیران کیا۔

''یہ آپ کہہ رہی ہیں خالہ......؟''

''ہاں، میں کہہ رہی ہوں، اس لیے کہ آپی نے اپنے فائدے کے لیے سب سے زیادہ مجھے استعمال کیا لیکن مجھے اس وقت سمجھ آئی جب ساری چیزیں میرے ہاتھ سے نکل چکی تھیں۔'' رومی خالہ آج پہلی دفعہ اس کے سامنے کھلی تھیں۔ نویرہ منہ کھولے ان کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

''دیکھو ناں، تمہارے رضا چچا مجھ سے ہرگز شادی کے لیے آمادہ نہیں تھے لیکن آپی نے اس گھر میں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لیے مجھے استعمال کیا......'' رومی خالہ نے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر انکشاف کیا۔ ان کے چہرے پر دکھ کے سائے ابھرے۔

''لیکن ماما کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی بھلا......؟'' نویرہ نے اپنی ماں کی سائڈ لینے کی کوشش کی۔

''انہیں ضرورت تھی ناں......'' وہ افسردہ ہوئیں۔ ''عطیہ بھابی کا تعلق معاشی لحاظ سے ایک مضبوط گھرانے سے تھا، ان کے اس گھر میں آنے کے بعد الماس آپی بہت خوفزدہ ہوگئی تھیں، انہیں لگا کہ وہ اور ان کی ساس مل کر کہیں ان کو کونے کھدرے سے نہ لگا دیں......'' رومی خالہ کے لہجے کی سچائی کو کسی گواہ کی ضرورت نہیں تھی۔

''پھر......؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے ان کا مضطرب چہرہ دیکھا۔

''جب امی کے انتقال کے بعد میں بھی اس گھر میں آگئی تو ان کی پریشانی بڑھ گئی، انہوں نے ایک رات رضا پر شرمناک الزام لگایا کہ وہ بری نیت سے رومیصہ یعنی میرے کمرے میں آیا تھا......'' رومی خالہ کے انکشاف پر وہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس نے بے یقینی سے رومی خالہ کو دیکھا جن کے ضبط کا پیمانہ آج چھلک پڑا تھا۔

''گھر میں بے تحاشا ہنگامہ ہوا، رضا نے بہت صفائیاں دینے کی کوشش کی...... کہ وہ میرے کمرے کے شیڈ پر کیبل کی تار ٹھیک کرنے کے لیے چڑھا

تھا......'' رومی خالہ نے آج اسے بالکل ہی عجیب بات بتائی۔

''پھر کیا ہوا خالہ......؟'' نویرہ نے عجلت میں ان کی بات کاٹی۔

''بس کسی نے بھی رضا کی ایک نہ سنی، آپی نے سچویشن ہی ایسی پیدا کر دی تھی کہ سارے بھائی اور تمہاری دادو کوئی بھی رضا کا یقین کرنے کو تیار نہیں تھا اور مجبوراً رضا کو مجھ سے نکاح کرنا پڑا۔ اس کے بعد گھر والوں پر یہ حقیقت جلد ہی آشکار ہوگئی لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ آپی کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔'' ان کے لہجے میں ٹوٹے ہوئے شیشے کی چبھن تھی۔

''رضا نے مجھ سے نکاح تو کر لیا لیکن مجھے ہمیشہ جوتیوں کی نوک پر رکھا۔ وہ شادی کے بعد ملک سے جو گئے تو پھر دوبارہ کبھی نہیں لوٹے......'' رومی خالہ کی آنکھوں کی نمی نویرہ کو بے چین کر گئی۔ وہ اپنا دکھ بھول کر اب رومی خالہ کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''لیکن خالہ، آپ نے رضا چچا سے احتجاج تو کرنا تھا کہ اس میں آپ کا کیا قصور ہے......؟''

''ان کا کیا قصور تھا......؟'' رومی خالہ نے اسے لاجواب کیا۔ ''وہ بیچارے تو ساری زندگی اپنے بھائیوں سے بھی نظر ملانے سے گئے......''

''رہنے دیں خالہ......'' نویرہ نے ناک سے مکھی اڑانے کے اسٹائل میں کہا۔ ''انہوں نے تو باہر جا کر شادی بھی کر لی اور اولاد بھی پیدا کر لی، آپ کے حصے میں کیا آیا......؟'' نویرہ کا لہجہ تلخ ہوا۔

''صحیح کہا ہے تم نے لیکن یہ فصل میری سگی بہن کے ہاتھوں کی بوئی ہوئی تھی۔ مجھے ہی اس کا کڑوا کسیلا پھل کھانا تھا......'' انہوں نے ہتھیار پھینکنے کے اسٹائل میں کہا۔

''یہ تو پھر آپ کی بزدلی اور کم ہمتی ہوئی ناں......'' اسے ان کی بات بالکل اچھی نہیں لگی۔

''چلو میں تو بزدل اور کم ہمت سہی لیکن تم نے کیوں ارسلان کے معاملے میں ابھی سے ہتھیار پھینک دیے ہیں۔'' رومی خالہ کا لہجہ سادہ تھا لیکن نویرہ کئی لمحوں تک بول ہی نہ سکی۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے بس اتنا ہی بولی۔

''آپ بالکل سچ کہتی ہیں......'' وہ پھیکے سے انداز میں مسکراتے ہوئے مزید گویا ہوئی۔ ''مجھے بھی آپ ہی کی طرح، ماما کی بوئی ہوئی فصل کو کاٹنا ہے۔''

☆☆☆

''دیکھو اسود، میں تمہیں صاف، صاف بتا رہی ہوں مجھے کوئی ضرورت نہیں لگی لپٹی رکھنے کی......'' ہانیہ کی تیز اور تلخ آواز نے شرزمہ کی سماعتوں کا تعاقب کیا۔ وہ جو بڑے عجلت بھرے انداز میں سیڑھیاں چڑھ کر اپنے پورشن کی طرف آ رہی تھی.... راستے میں ہی رک گئی۔

''لیکن میں اسے پسند کرتا ہوں ہنی......'' اسود کا لہجہ احتجاجی تھا۔ وہ دونوں سیڑھیوں کے ساتھ والے کمرے میں موجود تھے جس کی کھڑکیاں باہر کی جانب کھلتی تھیں۔ اپنا نام سن کر شرزمہ ٹھٹک کر وہیں رک گئی۔ اس کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ ایک قدم بھی آگے بڑھا سکے۔

''لیکن وہ تمہیں پسند نہیں کرتی اسود......'' ہانیہ نے ناگواری سے کہا تو اس نے فوراً ہی بات قطع کی۔

''کیوں......؟ کیا کمی ہے مجھ میں......؟'' اس کے انداز میں تلخی اور لہجہ بھی خاصا بلند تھا۔

''دیکھو اسود، تم بہت اچھے اور ڈیسنٹ لڑکے ہو، اس لیے تمہیں کہہ رہی ہوں کہ شرزمہ جیسی لڑکی تمہیں سوٹ نہیں کرتی......'' ہانیہ کے لہجے میں کچھ تھا کہ باہر کھڑی شرزمہ اور اندر بیٹھا اسود دونوں ہی ایک لمحے کو ہکا بکا ہوئے۔

''آپ کہنا کیا چاہتی ہیں ہنی، صاف صاف کہیں......'' اسود کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر لفظ نکلے۔

''دیکھو اسود، یہ ٹھیک ہے کہ شرزمہ میری بھانجی

ہے اور مجھے اس سے بہت محبت ہے لیکن میں تم سے کوئی غلط بیانی نہیں کرنا چاہتی۔'' ہانیہ نے اپنی طرف سے بڑی صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ شرزمہ کی ساری حسیں کان بن کر ہانیہ کی آواز کی طرف متوجہ تھیں۔

''کیا مطلب ہے آپ کا......؟'' اسود حیران ہوا۔

''مطلب یہ ہے کہ شرزمہ کی مدر میری سگی بہن ضرور تھیں لیکن......'' ہانیہ ایک پل کو چپ ہوئیں اور باہر کھڑی شرزمہ کو دھچکا سا لگا۔ وہ گرل کو مضبوطی سے پکڑ کر کھڑی ہوگئی۔

''لیکن کیا......؟'' اسود نے بے تابی سے پوچھا۔

''وہ خاصے کمزور کردار کی حامل تھیں۔'' ہانیہ کی بات پر شرزمہ کو لگا جیسے پورے گھر کی چھت اس کے سر پر آن گری ہو۔ اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیوار کے پار دیکھنے کی کوشش کی لیکن یہ ایک ناممکن کام تھا۔

''انہوں نے ڈیڈی کے اسٹور پر کام کرنے والے ایک شادی شدہ شخص کو پھانسا اور اس سے شادی کرلی اور اس کے بعد ساری زندگی اس شخص کو پاکستان نہیں جانے دیا۔'' ہانیہ کا لہجہ زہر آلود تھا۔ باہر کھڑی شرزمہ کو ایسے لگا جیسے کسی نے اس کا دل اپنی مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ہنی ایسی بات بھی کرسکتی ہیں۔

''لیکن اس میں شرزمہ کا تو کوئی قصور نہیں......'' اسود نے تھوڑا سا منہ بنایا۔

''ظاہر ہے کہ ماں کی کوئی نہ کوئی چیز تو بیٹی میں آتی ہے ناں......'' ہنی استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

''میں نے تو شرزمہ میں کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی۔'' اسود نے تیزی سے کہا تو ہنی فوراً بولیں۔

''وہ شکل سے جتنی معصوم اور بھولی بھالی لگتی ہے، حقیقت میں ایسی نہیں ہے......'' ہنی کا سلگتا لہجہ شرزمہ کے تن بدن میں آگ لگا گیا۔ اس نے بہ مشکل خود پر ضبط کیا۔

''اسی کی وجہ سے مجھے بارسلونا سے سب کچھ لپیٹ لپاٹ کر پاکستان ایمرجنسی میں آنا پڑا۔ کچھ لڑکوں سے اس کی دوستیاں تھیں اور وہ اس کے پیچھے گھر تک آنے لگے تھے۔'' ہانیہ نے مزید زہر اگلا۔ شرزمہ کو ایسے لگا جیسے کسی نے اسے ایفل ٹاور سے دھکا دے دیا ہو۔

''شرزمہ، بس کریں، نیچے آجائیں، کیوں خود کو اذیت دیتی ہیں......'' پروفیسر آفاق سیڑھیوں پر عین اس کے پیچھے آکر بولے تھے۔ شرزمہ کو دھچکا سا لگا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو سفید کرتہ شلوار میں ملبوس پروفیسر آفاق پتا نہیں کب اس کے پیچھے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگئے تھے۔

''سوری، میں اسود کو بلانے کے لیے اوپر جا رہا تھا اس کی ماما اسکائپ پر آن لائن ہیں اور اس سے بات کرنا چاہ رہی تھیں۔'' انہوں نے بوکھلا کر صفائی دی۔ شرزمہ کی آنکھوں میں بے بسی، ذلت اور شرمندگی کے احساس کے تحت آنسو بھر آئے۔

''چلیں نیچے......'' انہوں نے نرمی سے اس کا بازو پکڑا اور اسے نیچے لے آئے۔ وہ بھی اپنے ہونٹ کاٹتی چپ چاپ اُن کے پیچھے آگئی۔

''یہی وہ باتیں اور چیزیں تھیں جو میں، آپ کو سمجھانا چاہ رہا تھا لیکن آپ کو سمجھ نہیں آ رہی تھیں......'' انہوں نے ٹشو پیپر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بہت نرم لہجے میں کہا۔

''میں اسی لیے آپ سے کہتا تھا کہ اپنے پیاروں پر اندھا اعتبار ضرور کریں لیکن ان کو یہ موقع مت دیں کہ وہ آپ کو بھی ''اندھا'' ہی سمجھنے لگیں۔'' انہوں نے تاسف بھرے انداز میں اسے روتے دیکھا۔

''لیکن مجھے ہنی سے اس بات کی توقع ہرگز نہیں تھی......'' وہ بہت بری طرح رو رہی تھی۔ پروفیسر صاحب نے بھی اسے کھل کر بولنے کا موقع دیا۔

''میں بالکل بھی ایسی نہیں ہوں......'' اس کی

آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو ابھرے۔

''مجھے پتا ہے شرزمہ، مجھے آپ سے کسی صفائی کی ضرورت نہیں، میں آپ کی اذیت کا اندازہ کرسکتا ہوں کیونکہ کردار پر ناحق الزام تراشی کا یہ دکھ میں بھی جھیل چکا ہوں......'' پروفیسر آفاق کے لہجے میں کوئی محسوس کیے جانے والا دکھ بولا، شرزمہ نے آنکھیں ان کے چہرے پر جما کر بے بسی سے کہا۔

''لیکن ہنی ایسی تو نہیں تھیں......'' اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔

''لوگ ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے اُن کی فطرت ہوتی ہے۔ بس ہمیں سمجھنے میں ہی غلطی ہوجاتی ہے۔ اس میں قصور ان کا نہیں، ہماری سمجھ کا ہوتا ہے......'' انہوں نے نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ شرزمہ کی آنکھوں سے اب بے آواز آنسو بہہ رہے تھے اور یہ آنسو پروفیسر صاحب کو اپنے دل پر گرتے محسوس ہو رہے تھے لیکن وہ اس معاملے میں بے بس تھے۔

☆☆☆

''تم اپنے تایا کی طرف کیوں نہیں چلی جاتی ہو......'' نویرہ نے ساری داستان سننے کے بعد اسے سنجیدگی سے مشورہ دیا۔ وہ دونوں اس وقت کلاس لے کر ڈیپارٹمنٹ کے سامنے والے لان میں بڑی فرصت سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ شرزمہ کے چہرے پر پھیلی اداسی کو دیکھتے ہی نویرہ نے پوچھا تو وہ جو پہلے سے بھری بیٹھی تھی اس کے ضبط کا سارا ہی پیمانہ چھلک اٹھا۔

''کیسے چلی جاؤں، مجھے ان کا کوئی اتا پتا ہی نہیں......'' اس نے فوراً ہی مسئلہ بتایا۔

''تو تمہارے فاروق انکل کس مرض کی دوا ہیں......؟'' نویرہ نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

''فاروق انکل......'' وہ پچھم سے آنے والی غبار آلود آندھی کو دیکھ کر چونکی۔ ''ہاں وہ تو جانتے ہوں گے......''

''یار اٹھو، مجھے لگتا ہے کہ گرد کا طوفان آنے

والا ہے......'' نویرہ ایک دم گھبرا کر کھڑی ہوئی۔

''جو طوفان زندگی میں آچکا ہے، اس سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ہوسکتی ہے بھلا......'' شرزمہ بیزاری کی انتہا پر تھی۔

''اچھا، یہ فلسفے بعد میں بول لینا، اندر کامن روم میں جا کر بیٹھتے ہیں......'' نویرہ اس کا بازو پکڑے زبردستی اندر کی جانب بڑھ گئی۔

''یہ آپ شرزمہ کو کہاں اغوا کیے لے جا رہی ہیں......'' پروفیسر آفاق جو لائبریری سے نکل کر اپنے آفس کی طرف جا رہے تھے۔ ان دونوں کو دیکھ کر ہلکے پھلکے لہجے میں بولے۔

''آپ کی نظروں سے دور لے کر جا رہی ہوں......'' نویرہ نے بہت ہی عجیب لہجے میں کہا۔ پروفیسر آفاق کی نگاہوں سے ایک بے ساختہ اداسی چھلکی۔

''میری نظروں سے اور زندگی سے جانے والے لوگ تو بہت پہلے ہی چلے گئے۔ اس کے بعد یہ در کھلا ہی نہیں، اس لیے آپ بے فکر رہیں......'' ان کے لہجے سے زیادہ آنکھیں بولتی تھیں۔ اس بات کا احساس شرزمہ کو آج پہلی دفعہ ہوا۔

''آپ کے بہت مضبوطی سے بند کیے گئے در ایک دفعہ پھر کھل گئے ہیں۔ آپ کو شاید تازہ ہوا کو محسوس کرنے کی عادت نہیں رہی، اس لیے خود کو ابھی تک مقفل ہی سمجھ رہے ہیں۔'' نویرہ نے کمر پر ہاتھ رکھ کر بڑے طنزیہ لہجے میں کہا اور اس کا بازو گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

''یہ تم پروفیسر صاحب سے کس لہجے میں بات کر رہی تھیں......؟'' شرزمہ نے کاریڈور میں تھوڑا سا آگے بڑھ کر پہلے پلٹ کر دیکھا۔ پروفیسر آفاق کا چہرہ دھواں دھواں تھا جبکہ نویرہ کے چہرے کے سارے نقوش تن سے گئے۔

''میں اُن سے اسی لہجے میں بات کر رہی تھی

جس کے وہ لائق ہیں......'' تیز تیز چلنے کی وجہ سے نویرہ کی سانس پھول چلی تھی۔

''لیکن مجھے تمہاری بات کی سمجھ نہیں آئی، تم ان سے کہنا کیا چاہ رہی تھیں......؟'' شرزمہ نے اس کا بازو پکڑ کر چہرہ اپنی جانب کیا۔

''بے فکر رہو، انہیں سب سمجھ آرہا تھا، جو میں اُن سے کہنا چاہتی تھی......'' نویرہ نے اسے مزید حیران کیا۔

''یہ تم مجھے کن چکروں میں ڈال رہی ہو......'' شرزمہ کو ایک دم ہی غصہ آیا۔ وہ کامن روم کے دروازے کے باہر ہی کھڑی ہوگئی۔

''چکروں سے باہر تو تم، اب نکل رہی ہو مائی ڈیئر.. اسی لیے تو قدم قدم پر تمہیں دھچکے لگ رہے ہیں......'' نویرہ نے اس کا بازو پکڑا اور بے تکلفی سے اندر داخل ہوگئی۔

''یار میرا دماغ گھومنے لگا ہے، آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے......؟'' شرزمہ اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام کر سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''سب کچھ آہستہ آہستہ تمہیں سمجھ آجائے گا......'' شرزمہ نے بے پروائی سے اپنے بیگ سے چیونگم نکال کر منہ میں ڈالی۔

''مسئلہ تو یہی ہے کہ سب کچھ آہستہ آہستہ نہیں بلکہ ایک دم ہی ہو رہا ہے، ایسے لگتا ہے کہ کوئی ہتھوڑا لے کر دماغ پر برسا رہا ہو......'' شرزمہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس آگئی۔ مٹیالے رنگ کی گرد نے سارے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

''اچھا ہے ناں جو ہوتا ہے، وہ ایک دفعہ ہی ہو جائے، ورنہ کچھ ہونے یا نہ ہونے کی کیفیت بہت اذیت ناک ہوتی ہے، دل میں بے چینی اور آنکھوں میں انوکھا سا خوف بسیرا کر لیتا ہے۔ کچھ ہونے سے پہلے ہی انسان اتنی تکلیف اٹھا چکا ہوتا ہے کہ حادثہ ہونے کے بعد وہ بہت عرصے تک اس تکلیف سے نکل ہی نہیں پاتا۔'' اس نے بڑی نرمی سے شرزمہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''تم مجھے بس ایک بات بتاؤ کہ یہ پروفیسر آفاق کیسے انسان ہیں......؟'' شرزمہ الجھن کی انتہا پر تھی۔

''دیکھو شرزمہ، تم دوسروں کی رائے پر اپنے تعلق کی عمارتیں بنانا چھوڑ دو، کب تک تم دوسروں کی انگلی تھام کر ٹھوکریں کھاتی رہو گی......؟'' نویرہ تھوڑا سا تلخ ہوئی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا......؟'' شرزمہ کو برا لگا۔

''تم لوگوں کے متعلق اپنی رائے خود قائم کیا کرو، ضروری نہیں ہوتا کہ ایک شخص کے ساتھ اگر میرے تعلقات اچھے ہوں تو وہ دنیا کا سب سے بہترین انسان ہو اور جسے میں اچھا نہیں سمجھتی وہ دنیا کا براترین انسان ہو......'' نویرہ نے اب گراؤنڈ میں اڑتے بگولے کو غور سے دیکھا۔

''تم بس مجھے یہ بتاؤ کہ تم انہیں کیسا سمجھتی ہو، میں نے جو رائے ان کے متعلق قائم کرنا تھی، وہ کر چکی ہوں......'' شرزمہ نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

''ہوں......! تم میری رائے کیوں جاننا چاہتی ہو......؟'' نویرہ بھی آج اسے تنگ کرنے کے مکمل موڈ میں تھی۔

''ویسے ہی، نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ تم انہیں ضرورت سے زیادہ جانتی ہو......'' شرزمہ نے صاف گوئی سے کہا تو وہ چونک گئی۔ گراؤنڈ میں موجود بگولا بہت سرعت سے گردش کرنے کے بعد اب رک چکا تھا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو......'' وہ زبردستی مسکرائی۔

''بتاؤ ناں کہ وہ کیسے انسان ہیں......؟'' شرزمہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو نویرہ کے چہرے پر ایک تاریک سا سایہ دوڑا۔

''پروفیسر آفاق بہت زبردست اور سحر انگیز شخصیت کے حامل ہیں۔ ان کی شخصیت میں بنگال کے جادو کا سا اثر ہے۔ ایسا جادو، جو کبھی کبھی کسی

دوسرے بندے کی جان بھی لے لیتا ہے۔'' نویرہ کی بات سے زیادہ اس کے چہرے کے تاثرات اتنے عجیب تھے کہ شرزمہ سانس لینا بھول گئی۔

☆☆☆

''یہ تمہیں کیا ہوا ہے، تم کچھ دنوں سے بہت چپ چپ سی ہو......'' اس دن ہنی نے شرزمہ سے اچانک ہی پوچھ لیا۔ وہ جو لیپ ٹاپ گود میں رکھے کسی اسائنمنٹ میں الجھی ہوئی تھی۔ ان کی بات پر چونک گئی۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہنی، سیکنڈ سمسٹر نے بزی کر رکھا ہے......'' اس نے اسکرین سے نگاہیں اٹھائے بغیر جواب دیا۔

''اسٹڈی تو تمہارا مسئلہ کبھی نہیں رہی......'' ہانیہ مطمئن نہیں ہوئیں۔ شرزمہ نے نگاہیں اٹھا کر اُن کی طرف دیکھا جو ایک فیشن میگزین کی ورق گردانی میں مگن تھیں۔

''اسٹڈی پہلے میرا مسئلہ نہیں تھی لیکن اب بن چکی ہے، مجھے اپنا کیریئر بنانا ہے جلد از جلد......'' وہ اس کی بات پر بری طرح چونکیں۔

''یہ کیریئر بنانے کی دُھن تم پر اچانک کیسے سوار ہوگئی، کس نے یہ خناس تمہارے ذہن میں ڈال دیا؟'' شرزمہ کو پہلی دفعہ اُن کا لہجہ بہت عجیب لگا۔

''پہلی بات تو یہ ہے ہنی......'' وہ سنجیدہ ہوئی۔ ''اپنے کیریئر کے بارے میں سوچنا ہر انسان کا حق ہے، یہ کوئی ایسی احمقانہ بات نہیں کہ اسے ''خناس'' کے نام سے پکارا جائے، دوسری بات یہ ہے کہ ضروری نہیں کہ کوئی دوسرا ہی مجھے سمجھائے یا میں ساری زندگی دوسروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنی رہوں، میرا اپنا بھی دماغ ہے اور اپنی بھی کوئی سوچ ہے۔'' شرزمہ کا طنزیہ لہجہ اور آنکھوں میں موجود عجیب سا تاثر ہانیہ کے لیے پریشان کن تھا۔

''شرزمہ......'' وہ صرف اتنا ہی بول پائیں۔ ''کیا ہوا، میری جان، ایسے کیوں بات کر رہی ہو......؟'' وہ ایک دم ہی پریشان ہوئیں۔

''کیسے بات کر رہی ہوں......؟'' اس نے دوبارہ انہیں لاجواب کیا۔ ''آپ کی بات کا جواب دیا ہے میں نے، بس......'' وہ ایک دفعہ پھر لیپ ٹاپ پر جھک گئی۔

''تم نے فاروق بھائی سے اپنے تایا کے بارے میں پوچھا تھا......'' ہانیہ نے ایک دم ہی پوچھا، شرزمہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا وہ حد درجہ سنجیدہ تھیں۔

''جی ہاں پوچھا تھا......'' اس نے کی پیڈ پر تیزی سے انگلیاں چلاتے ہوئے بے پروائی سے جواب دیا۔

''لیکن کیوں......؟'' ہانیہ تھوڑا سا تیز ہوئیں۔

''کیا ہو گیا ہے ہنی، وہ میرے تایا ہیں، میرا بلڈ ریلیشن ہے ان کے ساتھ......'' شرزمہ نے منہ بنا کر کہا۔

''یہ بلڈ ریلیشن تمہیں اچانک کیسے یاد آگیا، پہلے تو تم ان کا نام بھی سننا پسند نہیں کرتی تھیں......'' ہانیہ نے تلخ لہجے میں کہتے ہوئے اس کا سپاٹ چہرہ دیکھا۔ ان کے دماغ میں کچھ کِلک کر رہا تھا لیکن وہ اسے فی الحال سمجھنے سے قاصر تھیں۔

''کم آن ہنی، آپ شادی کے لیے سوچ رہی ہیں تو مجھے بھی تو اپنا کوئی نہ کوئی بندوبست کرنا ہے......'' شرزمہ نے اس دفعہ دانستہ اپنا لہجہ خوشگوار بنایا۔

''میں نے تم سے کس دن کہا کہ میں اپنی شادی کے لیے کچھ سوچ رہی ہوں، اس لیے تمہیں اپنے بارے میں کچھ سوچنا چاہیے......؟'' ان کا موڈ ٹھیک ٹھاک خراب ہوا۔

''ضروری تو نہیں ہے کہ ہر بات کہی جائے......'' شرزمہ نے ہلکے پھلکے لہجے میں بات کی سنگینی کو کم کرنا چاہا۔

''میرے جیسی لڑکی سے تم اس بات کی توقع

مت ہی رکھنا کہ میں کوئی بات گھما پھرا کر کروں گی، تمہارے دماغ میں جو خناس آگیا ہے، اسے دور کرلو تو بہتر ہے۔'' وہ ایک دم جھٹکے سے کھڑی ہوئیں اور تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

شرزمہ کا دل بھی اپنے اسائنمنٹ سے ایک دم ہی اچاٹ ہوگیا۔ وہ کچھ دیر تو وہیں بیٹھی سوچتی رہی اس کے بعد کچن کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے بلیک کافی کے دو مگ تیار کیے اور ٹرے میں رکھ کر نیچے آ گئی۔ اس کا ارادہ پروفیسر صاحب کے ساتھ بیٹھ کر کافی پینے کا تھا۔ وہ ان کے گھر کا داخلی دروازہ کھول کر اندر بڑھی، اسی لمحے اسود باہر نکلا وہ اسے دیکھ کر ایک دم حیران ہوا۔

''پروفیسر صاحب ہیں گھر میں......؟'' اس نے جھجک کر پوچھا۔

''جی بالکل ہیں، آجائیں......'' اس نے بہت ہی عجیب نگاہوں سے ٹرے میں رکھے دو کافی کے کپ دیکھے۔

''کیا اس گھر میں صرف پروفیسر صاحب ہی ہیں یا پھر آپ ہمیں اس قابل نہیں سمجھتیں کہ ساتھ بیٹھ کر ایک کپ چائے ہی پی سکیں......'' اسود کے طنز پر وہ بری طرح گڑبڑا گئی۔

''ایسی بات نہیں ہے، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ بھی گھر پر ہیں......'' شرزمہ نے بوکھلا کر صفائی دی۔

''اوہ............!'' اس نے ہونٹ سکوڑے۔ ''اس کا مطلب ہے کہ میں بہت غلط ٹائم پر گھر میں ہوں......'' اس کی نگاہوں میں عجیب سی کاٹ شرزمہ کو الجھن میں مبتلا کر رہی تھی۔

''ارے شرزمہ، آپ...... کب آئیں......؟'' پروفیسر صاحب اچانک ہی اندر سے نکلے اور اسے دروازے میں کھڑا دیکھ کر چونک گئے۔

''میں تو ابھی ابھی آئی ہوں لیکن شاید اسود کو میرا آنا اچھا نہیں لگا......'' شرزمہ کا پُراعتماد انداز پروفیسر صاحب کے ساتھ ساتھ اسود کو بھی تعجب میں مبتلا کر گیا۔

''سر میں لان میں ہوں، اگر ٹائم ملے تو آ جایئے گا......'' وہ اپنی بات کہہ کر رکی نہیں اور فوراً ہی باہر کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی ٹرے میں رکھی کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی لیکن پروفیسر صاحب اور اسود اپنی جگہ پر جمے اس کی پشت پر لمبے بالوں کی چوٹی کو پنڈولم کی طرح جھولتے دیکھتے رہ گئے۔

☆☆☆

''مجھے سمجھ نہیں آتی کہ ہنی نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا......؟'' اپنے کپ میں کافی کی بلیک سطح کو دیکھتے ہوئے اس نے افسردگی سے پروفیسر آفاق سے پوچھا جو بغور اس کا جائزہ لینے میں مگن تھے۔

''اسود کے لیے......'' پروفیسر صاحب کے جواب نے شرزمہ کو ہکا بکا کر دیا۔ وہ اپنی بادامی آنکھیں مکمل طور پر کھول کر دیکھتی رہ گئی۔

''لیکن اس بات کا مجھ سے کیا تعلق......؟'' اس کے منہ سے پھسلا۔

''یہ تو سادہ سی بات ہے جو آپ کو سمجھ نہیں آ رہی، وہ شاید آپ کو پسند کرتا تھا لیکن یہ بات ہانیہ کو پسند نہیں آئی......'' انہوں نے ہاتھ میں پکڑا اخبار طے کرتے ہوئے جواب دیا۔

''لیکن انہیں کیوں برا لگا......؟'' شرزمہ اب بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔

''آپ اتنی سادہ کیوں ہیں شرزمہ......؟'' پروفیسر صاحب نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ گڑبڑا سی گئی۔

''پتا نہیں......'' وہ پھیکے سے انداز سے مسکرا دی۔

''آپ کو پتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ سادگی بعض دفعہ آپ کو تو نقصان پہنچاتی ہی ہے لیکن آپ کے بہت سے اپنوں کو کئی ایسے مواقع بھی فراہم کر دیتی ہے جس سے تعلق کا شیشہ زنگ آلود ہو جاتا

ہے۔ اس لیے خود کو اور دوسروں کو اپنی معصومیت اور سادگی سے امتحان میں نہ ڈالا کریں۔'' پروفیسر صاحب نے کچھ دیر نگاہیں اخبار پر ٹکائے رکھنے کے بعد ایسے کہا جیسے اخبار سے کوئی خبر پڑھ کر سنا رہے ہوں۔ شرزمہ نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

''ہانیہ...... شاید نہیں... بلکہ یقیناً اسود کو پسند کرتی ہیں اور اسود اس سلسلے میں اپنی والدہ سے بھی بات کر چکا ہے......'' پروفیسر آفاق کے انکشاف پر شرزمہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا جو ٹھنڈی کافی بھی بڑی رغبت سے پی رہے تھے۔

''پھر پرابلم کیا ہے......؟'' شرزمہ نے بے ساختہ کہا۔

''پرابلم آپ ہیں......'' پروفیسر صاحب بھی آج اسے حیران کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

''میں...... ہے'' جوشِ حیرت سے اس کی آواز بلند ہوئی۔

''جی آپ......'' وہ سادگی سے مسکرائے۔ ''اسود امریکا میں جبکہ ہانیہ بارسلونا شفٹ ہونا چاہ رہی ہیں، دونوں صورتوں میں مسئلہ یہی ہے کہ شرزمہ کا کیا، کیا جائے۔'' اس نے متوحش نظروں سے پروفیسر صاحب کی طرف دیکھا۔

''اس میں مسئلہ کیا ہے، میں تو کسی ہاسٹل وغیرہ میں بھی رہ سکتی ہوں......'' اس کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا۔

''جی بس اتنا سا پوائنٹ ہانیہ کی سمجھ میں تو آ رہا ہے لیکن اسود کے نہیں......'' پروفیسر صاحب کی بات پر شرزمہ کی آنکھیں ایک دفعہ پھر پھیلیں۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

''اسود چاہتا ہے کہ آپ بھی ان دونوں کے ساتھ رہیں جبکہ ہانیہ ایسا بالکل نہیں چاہتیں......'' ان کی بات پر شرزمہ کو ایک زوردار کرنٹ لگا۔ اس سے زیادہ وہ سننے کی تاب نہیں رکھتی تھی۔ اس لیے جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ضبط کی کوشش میں اس کا چہرہ لال ہوا۔ وہ اب تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر اپنے پورشن کی طرف جا رہی تھی۔

☆☆☆

''تم اپنے تایا کے گھر کیوں جانا چاہتی ہو......؟'' فاروق انکل ایک گھنٹے کے بعد ہی اس کی فون کال کے جواب میں فوراً ہی پہنچے تھے۔ یہ تو شرزمہ کی خوش قسمتی تھی کہ اس سے کچھ دیر پہلے ہی ہانیہ، اسود کے ساتھ مارکیٹ نکلی تھیں۔

''اوہ......!'' ساری بات سننے کے بعد ان کے منہ سے اتنا ہی نکلا۔

''تم پریشان نہ ہو، میں تمہارے انکل سے بات کرتا ہوں...... بصورتِ دیگر ایسا کچھ بھی انتظام نہ ہو سکا تو میرا گھر اپنی بیٹی کے لیے حاضر ہے۔'' انکل فاروق کے شفقت بھرے لہجے نے شرزمہ کی آنکھوں کو نم کیا۔ آج کل تو ویسے ہی وہ ضرورت سے زیادہ حساس ہو رہی تھی۔

''تمہارا اپنے تایا کے گھر چلے جانا ہی بہتر ہے......'' انہوں نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ ''لیکن ابھی ایسی کسی بھی بات کا ذکر ہنی سے کرنے کی ضرورت نہیں۔'' انکل فاروق کی بات پر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کا ایسا کوئی ارادہ تھا بھی نہیں۔

صرف دو ہی دن کے بعد وہ اور فاروق انکل ''ارجمند ولا'' کے بالکل سامنے کھڑے تھے۔ فاروق انکل کے رابطہ کرنے پر اس کے تایا نے بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ شرزمہ نے بھیگی پلکوں کے ساتھ اس عالی شان گھر کو دیکھا تھا، جہاں وہ آنا نہیں چاہتی تھی لیکن آ چکی تھی۔

☆☆☆

''ارے...... شیری تم......!'' کمرے میں پھیلی عجیب سی خاموشی کے طلسم کو نویرہ کی حیرت زدہ آواز نے توڑا۔ مسز الماس کے ڈرائنگ روم میں ارجمند ولا

کے تقریباً تمام ہی مکین جمع تھے۔ رضا کی بیٹی کا استقبال ارجمند خاتون اور عطیہ نے تو بہت خوشدلی کے ساتھ جبکہ الماس بیگم نے بہت سرد مہری سے کیا تھا۔ وہ تیوری چڑھائے شرزمہ کو ایسے گھور رہی تھیں جیسے سالم نگل جانے کا اندیشہ ہو۔ جبکہ رومیصہ کا چہرہ سپاٹ تھا۔

''تم رضا چچا کی بیٹی ہو......؟ اوہ مائی گاڈ......!'' نویرہ کی جوشِ جذبات میں آواز بلند ہوئی۔ اس کے چہرے سے چھلکنے والی بے ساختہ خوشی الماس بیگم کو حد درجہ کوفت میں مبتلا کر گئی تھی۔

''تبھی میں کہوں کہ تم اتنی، اپنی اپنی کیوں لگتی ہو......'' وہ اب اسے بے تابی سے گلے سے لگائے انتہائی محبت سے کہہ رہی تھی۔

''نویرہ......!'' الماس بیگم نے تنبیہی نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے بیٹھے بیٹھے بیزاری سے پہلو بدلا۔ ''ذرا کچن میں دیکھو، کہ چائے کو کتنی دیر ہے......''

''ماما، رومی خالہ دیکھ لیں گی......'' نویرہ بے پروائی سے کہتی ہوئی شرزمہ کے ساتھ ہی اس سنگل صوفے پر گھس کر بیٹھ گئی تھی۔ جس پر شرزمہ پہلے سے براجمان تھی۔

''تمہاری رومی خالہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے......'' ماما کے سرد لہجے پر نویرہ نے چونک کر رومی خالہ کو دیکھا جو بہت ہی عجیب نگاہوں سے شرزمہ کو دیکھ رہی تھیں۔ اُن سے کچھ فاصلے پر فاروق انکل بہت آہستہ آواز میں ابراہیم صاحب اور فہیم صاحب سے گفتگو میں مشغول تھے۔ احتشام بھی انہی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ جبکہ ارجمند خاتون کی آنکھیں بار بار گیلی ہو رہی تھیں۔ عطیہ وقتاً فوقتاً اپنی ساس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں دلاسا دینے کا فریضہ جتنی دفعہ بھی انجام دیتیں، الماس بیگم کی تیوری کے بل اتنے ہی گہرے ہو جاتے۔

''عطیہ ملازم سے کہو کہ شرزمہ کا سامان اٹھائے۔ وہ اوپر رہے گی......'' ارجمند خاتون کے فیصلہ کُن انداز پر الماس بیگم کے چہرے پر سکون کی ندی بہنے لگی۔ فاروق انکل چائے پینے کے بعد مطمئن ہو کر جا چکے تھے۔

''اوپر کیوں؟ نیچے اتنا بڑا پورشن بھی تو خالی ہے......'' ابراہیم صاحب کی بات نے الماس بیگم کا سکون برباد کیا۔ ان کا سکون تو شرزمہ کا معصوم حسن دیکھتے ہی غارت ہو چکا تھا۔

''بیٹا، وہ تو ٹھیک ہے لیکن میری خواہش ہے کہ رضا کی بیٹی میرے پاس رہے......'' ارجمند خاتون کا لہجہ ایک دفعہ پھر بھیگا۔ الماس بیگم نے طنزیہ نگاہوں سے رومی کی طرف دیکھا۔

''کاش کہ کسی کو یہ بھی یاد آ جائے کہ حسن رضا کی ایک اولاد نیچے بھی دھکے کھاتی پھر رہی ہے......'' الماس بیگم کفن پھاڑ کر ہی بولی تھیں۔

''استغفر اللہ بیگم صاحبہ، بات تو سوچ سمجھ کر، کر لیا کریں، انعم کو کس نے دھکے دیے ہیں۔'' ابراہیم صاحب کو غصہ آ گیا۔

''اماں کو انعم کا تو ایسے کبھی خیال نہیں آیا، جو محبت رضا کی دوسری اولاد کے لیے چھلک رہی ہے، وہ انعم کی دفعہ کسی غار میں چھپی ہوئی تھی کیا؟'' الماس بیگم کا سارا ہی ضبط رخصت ہو گیا۔ ایک دم ہی کمرے کا ماحول تناؤ کا شکار رہوا۔ رومی خالہ ایک جھٹکے سے اٹھیں اور پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے نکلیں۔ شرزمہ نے خوفزدہ نگاہوں سے الماس بیگم کو دیکھا جن کی آنکھوں سے شعلے ہی تو نکل رہے تھے جو... سامنے والے کو جلا کر بھسم کر سکتے تھے۔

''دیکھو الماس، انعم کی بھی میرے دل میں اتنی ہی محبت ہے جتنی شرزمہ کے لیے۔'' ارجمند خاتون بڑے سبھاؤ سے بولیں۔ ''لیکن انعم کے پاس اس کی ماں، تایا، کزنز سبھی رشتے موجود ہیں جبکہ شرزمہ بیچاری تو بالکل تنہا ہے......'' دادو اس کا مقدمہ لڑنے

کے لیے میدان میں آ گئیں۔

''ہم نے تھوڑی اسے تنہا کیا ہے، اللہ کے کام ہیں یا اس کے باپ کے کارنامے......'' الماس بیگم... بدلحاظ ہوئیں۔

''شٹ اپ الماس......زبان سنبھال کر بات کریں۔'' ابرہیم صاحب کو نہ جانے کیا ہوا۔ وہ ایک دم ترخ کر بولے۔ الماس بیگم کو سکتہ ہی تو ہوا تھا۔ وہ سخت بے یقین نظروں سے ابراہیم صاحب کو دیکھنے لگیں۔ انہوں نے کبھی اس لہجے میں بات نہیں کی تھی اور اب تو بھرے مجمع میں انہیں شٹ اپ کال ملی تھی۔ ارجمند خاتون نے شرزمہ کا بازو پکڑا اور اوپر والے پورشن کی جانب بڑھ گئیں۔

''الماس بھابی کے ڈرامے تو ہر جگہ ہی شروع ہو جاتے ہیں۔ کسی آئے گئے کا بھی خیال نہیں کرتیں......'' عطیہ چچی نے اوپر آتے ہی اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

''یہ تو اس کی بہت پرانی عادت ہے......'' ارجمند خاتون نے اپنے تخت پر بیٹھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''شرزمہ آپ پریشان نہ ہوں، ممانی جان کو تھوڑا وقت لگے گا آپ کو قبول کرنے میں......'' شامی نے بالکل خاموش اور کسی حد تک خوفزدہ شرزمہ کو دیکھا جو لاؤنج کے صوفے پر بڑے تکلف سے بیٹھی ہوئی تھی۔

''ہاں، ہاں بیٹا، تمہارا اپنا گھر ہے، آرام اور سکون سے رہو، مجھے ہمیشہ اس بات کا گلہ رہتا تھا کہ اللہ نے مجھے کوئی بیٹی نہیں دی، دیکھ لو اللہ نے کتنی پیاری گڑیا میرے گھر بھیج دی۔'' عطیہ چچی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انتہائی محبت سے کہا تھا۔ شرزمہ کا چہرہ کچھ پُرسکون ہوا۔

''ہاں، ہاں شرزمہ کوئی ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں......'' حرا بھابی بھی اپنے بیٹے کو گود میں اٹھائے وہاں آ پہنچی۔ ان کی آنکھوں میں بڑی پُرخلوص سی نرمی تھی۔

''ہاں ٹینشن بس اسی وقت شروع ہوگی، جب آپ سیڑھیاں اتر کر نچلے مدار میں داخل ہوں گی......'' وہ بہت تیزی سے کچن سے نکلا تھا۔ شرزمہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''مجھے ارسلان کہتے ہیں، میں احمر بھائی سے چھوٹا ہوں......'' اس نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہہ کر فریج کا دروازہ کھولا۔

''تو یہ ہے ارسلان......'' شرزمہ نے بہت غور سے اپنے سامنے کھڑے اچھے خاصے ہینڈسم بندے کو دیکھا۔ جس کی نویرہ کی زندگی میں بڑی اہمیت تھی۔

''حرا، بھئی شرزمہ کا سامان اٹھا کر گیسٹ روم میں رکھواؤ......'' عطیہ چچی نے اپنی بہو کو مخاطب کیا جو اپنے بیٹے کے لاڈ اٹھانے میں مگن تھی۔ اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔ شرزمہ کا استقبال اس کی توقع سے بڑھ کر ہوا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اپنے ددھیال میں اسے اتنی پزیرائی ملے گی۔

☆☆☆

''ٹیک اِٹ ایزی ہنی، آپ اس طرح کیوں ری ایکٹ کر رہی ہیں ...!'' اسود نے ایک دفعہ پھر ہانیہ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اشتعال میں آ کر سارے کشن بیڈ پر ہاتھ میں آنے والی ہر چیز اٹھا اٹھا کر دیوار پر مار دی تھی۔ غیظ و غضب سے ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''اتنے سال تک میں اس ناگن کو دودھ پلاتی رہی اور مجھے پتا ہی نہیں چلا......'' انہوں نے ہاتھ میں پکڑا ریموٹ بھی اٹھا کر سامنے والی دیوار پر مارا تھا۔ ریموٹ کے سیل نکل کر کارپٹ پر دور دور تک پھیل گئے۔ ہنی کا اضطراب کسی طور بھی کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ڈیانا کٹ ہیر اسٹائل بکھرا ہوا، آنکھیں سرخ اور پپوٹے سوجے ہوئے، وہ اس حلیے میں اس وقت اپنی عمر سے کافی بڑی لگ رہی تھیں لیکن آج

انہیں سب کچھ بھولا ہوا تھا یاد تھا تو صرف اتنا کہ شرزمہ انہیں بغیر بتائے اپنے تایا کے گھر شفٹ ہو چکی ہے۔

''دیکھو، میں نے اس کے لیے اپنی زندگی کے اتنے سال ضائع کیے اور اس نے اپنی ددھیال جاتے ہوئے مجھے بتانا تک مناسب نہیں سمجھا......''

ہانیہ نے اشتعال بھرے انداز میں اب اپنا سیل فون بھی فلور کشن پر پھینکا۔ ''بس وہاں پہنچ کر مجھے ٹیکسٹ کر دیا، تم ذرا اس کی حرکتیں دیکھو۔'' وہ اب دونوں پاؤں اوپر کر کے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''لیکن سوچنے کی بات ہے کہ اس کے اندر اتنی جرأت آئی کیسے؟'' اسود نے بہت سنجیدگی سے ہانیہ کو دیکھا جو اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھیں۔

''بھاڑ میں جائے وہ اور اس کی جرأت......'' ہانیہ بولی نہیں بلکہ پھنکاری تھیں۔ ''مجھے نفرت محسوس ہو رہی ہے اس خود غرض لڑکی سے......''

''پھر بھی ہانیہ، کچھ پتا تو چلے......'' اسود نے الجھن آمیز انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

''میں نے آج اپنی زندگی کی کتاب میں سے اس کا نام نکال دیا ہے......'' ہانیہ متنفر لہجے میں بولیں۔

''ٹیک اٹ ایزی ہانیہ، بی ریلکس......'' اسود اب اٹھ کر ان کے بالکل پاس آ گیا۔ اس نے اپنے گرم ہاتھوں میں ہنی کا سرد ہاتھ تھام کر اسے حدت بخشنے کی کوشش کی۔ ہانیہ کے اعصاب کچھ پُرسکون ہوئے۔ وہ اب اپنا نچلا لب دانتوں سے چباتے ہوئے ضبط کی حدوں کو چھوتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

''آپ کے حق میں تو اچھا ہوا ناں، چلو ذمے داری ختم ہوئی......'' اسود نے انہیں ریلکس کرنے کے لیے مزید کہا۔

''ہوں......'' انہوں نے بالکل بچگانہ انداز میں ہنکارا بھرا۔ اس وقت وہ بالکل ایسے بچے کی طرح دکھائی دے رہی تھیں جس کے ہاتھ سے اس کا پسندیدہ کھلونا چھین کر کسی اور کو دے دیا جائے۔

''میں نے کیا، کیا نہیں کیا اس کے لیے......'' ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''پلیز ہنی اب رونا نہیں، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا......'' اسود کی دھمکی میں چھپی محبت اور دھونس ہانیہ کے اعصاب کو فرحت کا احساس بخش رہی تھی۔

''لوگ اتنے خود غرض ہوتے ہیں، مجھے اندازہ نہیں تھا......'' ہانیہ کا دکھ کسی طور کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں اور شرزمہ کے انداز تو مجھے کچھ دنوں سے بہت عجیب سے لگ رہے تھے......'' اسود کو بھی یاد آیا۔

''مجھے لگتا ہے کہ کسی نے بہت اچھے طریقے سے اس کی برین واشنگ کی ہے......'' اسود نے مزید کہا۔

''چلو ٹھیک ہے، اس نے اپنی برین واشنگ کی اور میں نے اپنے دل سے اس کا نام ہی واش کر دیا، حساب برابر ہو گیا۔'' ہانیہ ایک دفعہ پھر جذباتی ہوئیں۔ اسود نے تاسف بھری نگاہوں سے ان کی آنکھوں میں آئے ہوئے موٹے موٹے آنسو دیکھے جو باہر نکلنے کو بے تاب تھے۔

☆☆☆

''لگتا ہے کہ ''اوپر'' والوں نے تمہاری اچھی ٹیوننگ کر دی ہے جو تم مجھے ہی سب سے پہلے اگنور کر رہی ہو......'' اس دن اسے لان میں دیکھ کر نویرہ فوراً ہی نیچے پہنچی اور جھٹ سے گلہ کر دیا۔

''نویرہ میں تمہیں ایسی لگتی ہوں بھلا......؟'' شرزمہ نے الٹا اس سے گلہ کیا۔

''مجھے اب کسی سے کوئی توقع نہیں، جب ارسلان جیسا بندہ مجھ سے وعدے وعید کر کے مکر سکتا ہے تو باقی لوگوں سے میری شناسائی ہے ہی کتنے دنوں کی۔'' وہ تھوڑا سا تلخ ہوئی۔

''تم تمام لوگوں کو ایک ہی ترازو میں تولنا چھوڑ کیوں نہیں دیتیں......؟'' شرزمہ نے اسے غور سے

دیکھا جو چمپا کے پھولوں کی کیاری کے پاس کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے اور رنگت بھی زردی لگ رہی تھی۔

''کیا کروں؟ زندگی مجھے جو دے رہی ہے، وہ ہی لوٹا رہی ہوں......'' وہ اب لان چیئر پر بیٹھ گئی۔

''لیکن تم بہرحال مجھے اس لائن میں کھڑا کر کے دیکھنا چھوڑ دو پلیز......'' شرزمہ نے دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے ملتجی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''پھر تم پچھلے تین دنوں سے نیچے کیوں نہیں آ رہی تھیں......'' نویرہ کی آنکھوں سے ایک شکوہ چھلکا۔

''رومی آنٹی کی وجہ سے......'' شرزمہ نے اسے حیران کیا تبھی وہ برجستہ بولی۔

''رومی خالہ نے تمہیں کیا کہا ہے......؟''

''وہ بیچاری مجھے کیا کہیں گی، ان کے ساتھ جتنا برا ہو چکا ہے، اب اس سے زیادہ کیا ہوگا لیکن مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ پاپا نے ان کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ ویسے مجھے اتنا تو پتا تھا کہ پاپا کی کسی کزن سے ان کی زبردستی شادی ہو گئی تھی اور انہوں نے کافی عرصے تک ماما سے اس بات کو چھپائے رکھا اور جب ماما کو پتا چلا تو انہوں نے بہت ہنگامہ کھڑا کیا اور پاپا کو بھی پاکستان نہیں جانے دیا لیکن مجھے اور شاید ماما کو بھی یہ نہیں پتا تھا کہ پاپا کی کوئی اولاد بھی پاکستان میں......''

''ہاں، ہو سکتا ہے کہ رضا چچا نے مصلحتاً نہ بتایا ہو......'' نویرہ نے اپنا خیال ظاہر کیا تو وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دی۔

''پتا نہیں کون سی ایسی مصلحتیں تھیں، جو وہ دو دو شادیاں کرنے کے بعد بھی سکون کی زندگی نہیں گزار سکے......''

''انسان کا ضمیر تو اسے ملامت کرتا ہے ناں......'' نویرہ کی بات پر اس نے سر ہلایا۔

''یقین مانو، میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم میرے تایا کی بیٹی نکل سکتی ہو ورنہ......'' شرزمہ نے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔

''ورنہ تو تم نے تو میرے سائے سے بھی بدک جانا تھا کیونکہ تمہیں تو اپنے پاپا کی ساری فیملی سے چڑ تھی۔'' نویرہ ہنس کر بولی۔

''ٹھیک کہتی ہو، اصل میں پاپا کی پہلی شادی کے حوالے سے ماما کو بہت سے تحفظات لاحق تھے۔ اس حوالے سے ہمارے ذہنوں میں بھی پاپا کی فیملی کا منفی امیج بن گیا تھا۔ حالانکہ پاپا انہیں بارہا باور کروا چکے تھے کہ اس شادی میں ان کی مرضی شامل نہیں تھی۔'' شرزمہ کے ذہن کے پردے پر بہت سے لڑائی کے مناظر لہرائے۔

''حیرت ہے اور ہم سب یہی سمجھتے رہے کہ رضا چچا اپنی پسند کی شادی کر کے وہاں عیش کر رہے ہیں۔'' نویرہ کا لہجہ کچھ ترش ہوا۔

''ہاں لیکن میں اب سوچتی ہوں کہ ان دونوں شادیوں میں زیادہ نقصان تو میرا اور انعم کا ہوا ناں......'' وہ زبردستی مسکرائی۔

''ہوں...... کہتی تو تم ٹھیک ہو لیکن رومی خالہ کو تمہاری آمد پر ایسا سرد رویہ نہیں اپنانا چاہیے، اس میں تمہارا تو کوئی قصور نہیں۔'' نویرہ نے صاف گوئی سے کہا۔

''ہمارا سب سے بڑا المیہ ہے کہ ہم اپنے بڑوں کی، کی گئی غلطیوں کی سزا ان کے چھوٹوں کو دینا شروع کر دیتے ہیں۔ دنیا میں پچاس فیصد لوگ ان گناہوں کی سزا پاتے ہیں جو انہوں نے کیے ہی نہیں ہوتے۔'' وہ تھوڑا سا اداس ہوئی۔

''کیا رومی خالہ نے تمہیں کچھ کہا ہے......؟'' نویرہ نے جانچتی نگاہوں سے اس کا افسردہ چہرہ دوبارہ دیکھا۔

''ان بیچاری نے کیا کہنا ہے، میں خود ہی ان سے چھپتی پھر رہی ہوں......'' شرزمہ نے صاف گوئی

سے جواب دیا۔
''اگر تم ایسا خود سے کر رہی ہو تو بہت غلط کر رہی ہو کیونکہ رومی خالہ تو بہت بے ضرر سی ہیں۔ تمہیں چاہیے کہ تم ان کے پاس بیٹھو، ان کا دکھ بانٹو، میرے خیال میں اس گھر میں اگر کوئی تم سے سب سے زیادہ مخلص ہو سکتا ہے تو وہ رومی خالہ ہی ہیں......'' نویرہ کی بات پر وہ تھوڑا سا الجھی۔
''اس لیے کہ وہ واحد خاتون ہیں جو یہاں کسی کو بھی نیچا دکھانے کے گیم میں شامل نہیں۔ ان کا کسی سے کوئی مفاد وابستہ نہیں۔ وہ اگر تمہیں فائدہ نہ پہنچا سکیں تو نقصان بھی نہیں پہنچائیں گی۔'' نویرہ نے مزید بتایا تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔ اسے نویرہ کی باتوں میں سچائی محسوس ہوئی تھی۔

☆☆☆

''آپ کو پتا ہے کہ شرزمہ اپنی ددھیال کیوں گئی......؟'' اسود نے کسی گہری سوچ میں گم پروفیسر آفاق کو مخاطب کیا جو اس وقت ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ ان کی نگاہیں ٹی وی پر جبکہ دماغ کہیں اور تھا۔
''میں کیا، کہہ سکتا ہوں......'' انہوں نے بہت محتاط انداز اپنایا۔ ''یہ تم مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو......؟'' انہوں نے کھوجتے لہجے میں استفسار کیا۔
''پتا نہیں کیوں، مجھے لگا کہ شاید اس نے آپ سے کچھ شیئر کیا ہو......'' اسود نے بھی لفظوں کا چناؤ بہت سوچ سمجھ کر کیا ویسے بھی اس کی اپنے ماموں سے ایسی بے تکلفی نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے اور اس کے درمیان ایک فاصلہ رکھتے تھے۔
''ایسا تو کچھ معلوم نہیں لیکن شاید اس کے ذہن میں ہو کہ اس کی موجودگی میں ہانیہ اپنی زندگی کا کوئی فیصلہ نہ کر سکیں۔'' پروفیسر آفاق کی سنجیدگی میں اضافہ ہوا۔
''اگر اس نے یہی سوچ کر فیصلہ کیا تھا تو اسے کم از کم ہانیہ کو تو انفارم کرنا چاہیے تھا......'' اسود کے لہجے میں ناپسندیدگی کا عنصر غالب تھا۔ اسے شرزمہ کا یہ فیصلہ بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ پروفیسر آفاق نے اب اسے غور سے دیکھا جو خاصا الجھا الجھا سا دکھائی دے رہا تھا۔
''میں کیا کہہ سکتا ہوں اس سلسلے میں، یہ ان خالہ بھانجی کا پرسنل معاملہ ہے......'' انہوں نے خود کو بڑی صفائی سے سارے معاملے سے باہر نکالا۔
''ہانیہ بہت زیادہ اپ سیٹ ہیں۔ شرزمہ نے ان کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔'' اسود آج نہ جانے کیوں ان کے سامنے یہ ٹاپک کھول کر بیٹھ گیا تھا۔
''یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ کس نے کس کے ساتھ اچھا یا برا کیا، ہم انسان کیا کہہ سکتے ہیں۔ یہ سارے معاملات انسانی فہم سے بالاتر ہیں......'' پروفیسر آفاق کے چہرے پر کسی سوچ کا تاثر نمایاں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ غائب دماغی سے بیٹھے ہوں۔
''آپ کو پتا ہے کہ شرزمہ، نویرہ ابراہیم کی فرسٹ کزن ہے......!'' اسود کی بات پر پروفیسر آفاق کو ایسا لگا جیسے پورے گھر کی چھت ان کے سر پر آن گری ہو۔
''تمہیں کس نے کہا......؟'' وہ ایک دم بوکھلائے۔
''مجھے کس نے کہنا تھا، بس انکل فاروق سے ملا تھا، وہ ہی اسے وہاں چھوڑ کر آئے تھے۔'' اسود نے ایک اور انکشاف کیا۔ جبکہ پروفیسر آفاق صاحب کے چہرے پر جیسے زلزلے کے سے آثار تھے۔ دل میں لگتا تھا کہ کوئی آتش فشاں پھٹ گیا ہو جو اُن کی ذات کو ذرّوں کی صورت بہائے لیے جا رہا ہو۔
''مجھے خود ایک دم دھچکا سا لگا تھا، مجھے اب پتا چلا کہ اس کے نقوش میں ایک مخصوص سی شباہت کیوں جھلکتی تھی......'' اسود کے منہ سے پھسلنے والے یہ الفاظ پروفیسر آفاق کو کسی کھائی میں دھکا دے رہے تھے۔
''وہ ابراہیم رندھاوا کی بھتیجی ہے......؟'' کوئی ہتھوڑا لے کر اُن کے دماغ میں پوری قوت کے ساتھ برسا رہا تھا۔

''جی وہ ابراہیم رندھاوا کی بھتیجی اور جویریہ ابراہیم کی تایا زاد کزن ہے......'' اسود کی بات نے انہیں ایک دفعہ پھر اس جہنم میں دھکیلا، جس سے وہ اتنے سالوں سے نکل نہیں پا رہے تھے۔ ان کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ انہیں اب احساس ہوا تھا کہ اس کی عادتیں کیوں اس لڑکی سے اتنی ملتی ہیں۔

☆☆☆

''آپ مجھ سے خفا ہیں......؟'' وہ چائے کا کپ اٹھا کر بہت خاموشی سے رومی آنٹی کے پاس آن بیٹھیں جو انعم کو بڑی مشکلوں سے کھانا کھانے پر راضی کر رہی تھیں۔ اپنے کمرے میں ایک انجان چہرہ دیکھ کر انعم کچھ خوفزدہ ہوئی۔ حیرت تو رومیصہ کو بھی بہت ہوئی کیونکہ انعم کے کمرے میں کوئی بھی نہیں جھانکتا تھا۔
''نہیں......'' انہوں نے مختصر جواب دیا۔
''ادھر دیں آنٹی، میں اور انعم دونوں مل کر کھانا کھاتے ہیں......'' وہ بے تکلفی سے انعم کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ جبکہ انعم اس کے اس طرح قریب آنے پر سہم سی گئی۔
''کوئی کام تھا مجھ سے......؟'' رومیصہ نے سپاٹ لہجے میں پوچھا تو وہ چونک گئی۔
''نہیں، میں تو انعم سے ملنے آئی ہوں......'' وہ بڑے آرام سے ان کے پاس آن کر بیٹھ گئی تھی۔ رومیصہ کے چہرے کے نقوش کچھ تن سے گئے۔
''انعم، میں تمہاری بہن ہوں شرزمہ......'' اس کی بات پر انعم چونکی اور تھوڑا سا خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ ''ادھر آؤ، میرے پاس آ کر بیٹھو......'' اس نے انتہائی محبت بھرے انداز میں کہا لیکن انعم نے ڈر کر اپنا چہرہ دوپٹے میں چھپالیا۔
''یہ نئے لوگوں سے ڈر جاتی ہے، کسی سے نہیں ملتی......'' رومیصہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
''میں کسی نہیں، اس کی بہن ہوں......'' شرزمہ نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا اور اٹھ کر انعم کے پاس پہنچی۔ انعم بدک کر اور پیچھے ہٹی۔
''اسے پریشان مت کرو، یہ ٹینس ہو جاتی ہے......'' رومیصہ کے لہجے میں اب کہ ناگواری تھی۔ جبکہ شرزمہ نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ انعم کے چہرے سے خوف کے تاثرات کافی حد تک کم ہو گئے۔ وہ اب شرزمہ کے ساتھ بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے پلیٹ میں اپنے اور اس کے لیے چاول نکالے اور بے تکلفی سے کھانے شروع کر دیے اور رومیصہ کی حیرت کی انتہا نہیں رہی جب اس نے انعم کو بھی اس کی پیروی کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ دونوں اب مزے سے کھانا کھا رہی تھیں۔ وہ بہت خاموشی سے اٹھ کر چلی گئیں، ایک گھنٹے کے بعد وہ آئیں تو اگلا منظر اور بھی زیادہ حیران کن تھا۔
انعم کارپٹ پر بے تکلفی سے بیٹھی ہوئی تھی اور شرزمہ اس کے بالوں کی فرنچ ٹیل بنا رہی تھی۔ انعم کے چہرے کے تاثرات سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس چیز سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔ اس نے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا شیشہ پکڑ رکھا تھا اور بار بار وہ اپنا چہرہ دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔
''دیکھیں آنٹی، انعم کو یہ ہیر اسٹائل کتنا سوٹ کر رہا ہے......'' انہیں دیکھتے ہی شرزمہ بے تکلفی سے ایسے بولی جیسے دونوں کے درمیان بڑے خوشگوار قسم کے تعلقات رہے ہوں۔
''یہ انعم کے سونے کا ٹائم ہے......'' انہوں نے بہت سنجیدگی سے وال کلاک دیکھتے ہوئے کہا۔
''کیا، میں انعم کے ساتھ سو جاؤں......؟'' اس نے تھوڑا جھجک کر فرمائش کی جو رومیصہ کے لیے بالکل قابل قبول نہیں تھی۔
''ہرگز نہیں......'' ان کے برجستہ انداز پر شرزمہ کا چہرہ ایک لمحے کو تاریک ہوا۔

''اٹس او کے......'' وہ کھڑی ہوتے ہوئے بہ مشکل مسکرائی اور ہاتھ میں پکڑا برش بیڈ کے کنارے پر رکھ دیا۔
''مت جاؤ......'' انعم نے اس کا دوپٹا پکڑ کر کھینچا۔ اس کے منہ سے نکلنے والے یہ دو الفاظ رومیصہ کے لیے ایک طرف تو بے انتہا خوشی اور دوسری جانب اتنے ہی دکھ کا باعث بنے تھے۔
''انعم تم اسے جانے دو، وہ صبح دوبارہ آ جائے گی......'' رومیصہ نے اسے بہلایا اور اس نے مشکوک نگاہوں سے اپنی ماں کو دیکھا جیسے ان کی بات کا یقین نہ آیا ہو۔
''ہاں ناں انعم، آئی پرامس میں صبح جلدی ہی آ جاؤں گی۔ پھر ہم دونوں مل کر ناشتا کریں گے......'' شرزمہ نے ہاتھ پکڑ کر اسے تسلی دی تو اس کے لبوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ دوڑی۔
''یہ انعم ایسی کیوں ہے یار......؟'' رات کے کھانے کے بعد چہل قدمی کرتے ہوئے شرزمہ نے نویرہ سے پوچھا۔
''بس یار بچپن میں اس کے ساتھ حادثہ ہو گیا تھا......'' نویرہ کی بات پر وہ چونکی۔
''حادثہ...... کیسا حادثہ......؟''
''اصل میں جب انعم پانچ یا چھ سال کی تھی تو ایک رات شفق پھپو امریکا سے آ رہی تھیں تو سب لوگ انہیں ائیر پورٹ لینے گئے، کافی بارش ہو رہی تھی۔'' نویرہ نے اس دن کی تلخ یادوں کو یاد کیا۔ اس کے چہرے پر دکھ کے سائے لہرائے۔
''چوکیدار کو پتا تھا کہ سب لوگ جا رہے ہیں ائیر پورٹ، انعم سو رہی تھی اور اس لیے رومی خالہ نے اسے ساتھ لے جانا مناسب نہیں سمجھا۔'' نویرہ کی بات پر وہ چونکی۔
''پھر......؟''
''رومی خالہ نے جاتے ہوئے چوکیدار سے کہا کہ وہ اندر کا بھی دھیان رکھے لیکن انہیں اندازہ نہیں تھا کہ یہ ہدایت انہیں بہت مہنگی پڑے گی۔'' نویرہ چلتے چلتے رکی۔
''کیا مطلب......؟'' شرزمہ کو سمجھ نہیں آئی۔
''مطلب یہ کہ اس رات اس چوکیدار ظالم انسان کے اندر کا درندہ جاگ اٹھا۔ اس نے اس طوفانی بارش والی رات اس معصوم بچی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی کوشش کی۔'' نویرہ کا ایک، ایک لفظ گہرے دکھ کے احساس میں ڈوبا ہوا تھا۔
''اوہ مائی گاڈ......'' شرزمہ نے جھرجھری سی لی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ انعم کی شخصیت کی توڑ پھوڑ کے پیچھے اتنی غلیظ کہانی چھپی ہوئی ہو گی۔
''بس وہ دن اور آج کا دن، انعم ہر مرد سے ڈرتی ہے، بارشوں سے اسے خوف آتا ہے، بادل گرجنے کی آواز اسے بے تحاشا خوفزدہ کر دیتی ہے۔ وہ گھر سے باہر نہیں جاتی اور آج تک مکمل طور پر اس خوف سے باہر نہیں نکل پائی۔'' نویرہ کی بات پر شرزمہ کے دل کو کچھ ہوا۔
''اُف...... میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ انعم کے ساتھ بچپن میں ایسا ہوا ہو گا......'' شرزمہ فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں اس وقت اپنے گھر کے سامنے والی خالی سڑک پر چہل قدمی کر رہی تھیں۔
''زندگی میں اس سے بھی زیادہ خوفناک واقعات اور حادثے انسان کی قسمت میں ہو چکے ہوتے ہیں لیکن ہر انسان کو بس اپنا ہی دکھ بڑا لگتا ہے۔'' وہ سڑک کے پاس لگے پول کے نیچے کھڑی کسی اداس داستان کا ایک حصہ لگ رہی تھی۔
''اور شامی بھائی کا کیا مسئلہ ہے......؟'' شرزمہ آج اپنے ذہن کی ساری گتھیاں سلجھانا چاہتی تھی۔ اب وہ اندر لان میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔
''تم سے کسی نے ذکر کیا ہے کیا......؟'' نویرہ بھی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''نہیں ذکر تو نہیں کیا لیکن کچھ ادھورے جملے سننے کو ملے تھے لیکن مجھے اصل واقعے کا نہیں پتا تھا اس لیے ذہن الجھ گیا۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔
''ہاں عطیہ چچی اور دادو کر رہی ہوں گی، انہیں بہت شوق ہے ماضی کے زخموں کو کریدنے کا......'' نویرہ تھوڑا سا تلخ ہوئی۔ اس کی بات میں سچائی تھی اس لیے شرزمہ خاموش رہی۔
''اصل میں شامی بھائی پورے خاندان میں واحد ایسے شخص تھے جو میری ماما کو اپنے سسرالی رشتے داروں میں عزیز تھے۔ کچھ ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ میری جیا آپی کو پسند کرتے تھے۔'' نویرہ نے ایک اور داستان کا پردہ ہٹایا۔
''جیا آپی...... لیکن میں نے تو انہیں نہیں دیکھا......'' شرزمہ حیران ہوئی کیونکہ اس نے نویرہ کے علاوہ صرف عبیرہ کو ہی دیکھا تھا جو اسے لفٹ کروانے کے موڈ میں نہیں تھی۔
''وہ یہاں نہیں رہتیں......'' نویرہ کا لہجہ اداس ہوا۔
''اچھا، پھر کیا ہوا......؟'' شرزمہ کے ذہن میں کُھد بُھد ہوئی۔
''بس ماما نے جیا آپی کی سخت ناپسندیدگی کے باوجود ان کی منگنی زبردستی شامی بھائی کے ساتھ کروا دی حالانکہ پھپو، دادو، کوئی بھی راضی نہیں تھا لیکن شامی بھائی اور ماما نے پوری فیملی کے سامنے اسٹینڈ لے لیا۔'' نویرہ کی آواز پست ہوئی۔ شرزمہ نے ملامت بھرے انداز میں اسے دیکھا جس کے چہرے پر تاریکی پھیلتی جا رہی تھی۔
''جیا آپی اپنے کسی ٹیچر سے امپریس تھیں اور بے حد جذباتی اور انتہا پسند طبیعت کی مالک تھیں......'' نویرہ کا لہجہ بھیگا۔ ''انہوں نے گھر میں اپنے ٹیچر کے لیے اسٹینڈ لے لیا، ماما یا پاپا کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ بندہ کون ہے جس کے لیے جیا آپی سب کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئیں۔'' شرزمہ کو نویرہ کے لہجے میں عجیب سا تاسف محسوس ہوا۔
''ماما نے اس چیز کا علاج یہ نکالا کہ فوراً شامی بھائی کو ہنگامی بنیادوں پر بلایا اور شادی کی ڈیٹ فکس کر دی......'' نویرہ نے اپنی شال کو مضبوطی سے لپیٹتے ہوئے جواب دیا۔ فضا میں اچانک ہی خنکی کا اثر بڑھ گیا تھا۔
''پھر کیا ہوا......؟'' شرزمہ کو تجسس ہوا۔
''پھر کیا ہونا تھا، جیا آپی بھی ماما کی ہی بیٹی تھیں۔ ان کی طرح حسین، ذہین اور حد درجہ جذباتی...... وہ کسی اور کے ساتھ محبتوں کے جو وعدے کر چکی تھیں اس سے ایک انچ بھی ہٹنے کو تیار نہیں تھیں، اسی لیے ان کے پاس ایک ہی حل تھا......'' نویرہ بولتے بولتے رکی۔
''کیا......؟'' شرزمہ کی سانس اٹکی۔
''موت......'' نویرہ نے گویا سرگوشی کی تھی۔ شرزمہ کو بات سنتے سنتے جھٹکا سا لگا۔
''واٹ......؟'' اس نے بے یقینی سے نویرہ کا اداس چہرہ دیکھا۔
''انہوں نے اپنی مہندی والی رات جب سارا خاندان اکٹھا تھا، بے شمار سلیپنگ پلز کھائیں اور ہمیشہ کے لیے سو گئیں......'' نویرہ کی آنکھوں سے آنسو نکلے اور شرزمہ منہ کھولے اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس نے اپنی پوری آنکھیں کھول کر اس طرح تعجب سے نویرہ کا چہرہ دیکھا جیسے وہ کسی فلم کی داستان سنا رہی ہو۔
''ان کا خیال تھا کہ اس واقعے کے بعد ماما اپنا رویہ ٹھیک کر لیں گی اور میری اور عابی کی زندگی آسان ہو جائے گی لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ فطرت کو بدلنا آسان کام نہیں ہوتا۔ ماما نے آج تک انہیں معاف نہیں کیا، انہیں اپنی بیٹی کی موت سے زیادہ اپنی جگ ہنسائی کا دکھ نہیں بھولتا۔'' نویرہ کے چہرے پر پھیلی تلخی کو وہ اس ملگجے اندھیرے میں بھی بڑی آسانی سے پڑھ سکتی تھی۔

''آخر کون تھا وہ شخص، جس کے لیے وہ اس انتہا تک چلی گئیں......'' شرزمہ نے تعجب سے پوچھا۔

''پروفیسر آفاق......'' نویرہ نے اس کے سر پر بم ہی تو گرایا تھا۔

''پروفیسر آفاق..؟'' شرزمہ بولی نہیں بلکہ چیخی تھی۔ اس کی آواز سنسان رات میں دور دور تک پھیلتی گئی۔ اسے لگا جیسے ..آواز کی بازگشت دوبارہ اس کی سماعتوں سے آ آ کر ٹکرا رہی ہو۔

اس نام نے اس کے ذہن میں ایک بھونچال برپا کر دیا تھا۔

''ہاں پروفیسر آفاق، اور گھر میں یہ بات میرے علاوہ کوئی نہیں جانتا، ورنہ مجھے انہی کے ڈیپارٹمنٹ میں ایڈمیشن لینے کی اجازت نہ ملتی۔'' نویرہ کا لہجہ تلخی میں ڈوبا ہوا تھا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا......؟'' شرزمہ نے بے تابی سے پوچھا۔

''میں نے جیا آپی کی ڈائری میں رکھی ان کی تصویریں دیکھ لی تھیں۔'' وہ اداس ہوئی۔

''کیا پروفیسر آفاق کو پتا ہے کہ تم جیا آپی کی بہن ہو......؟'' شرزمہ حیران ہوئی۔

''پہلے پتا نہیں تھا لیکن اب پتا چل گیا ہے...... لیکن اب میں سوچتی ہوں کہ اس میں ان کا کیا قصور تھا، وہ خواہ مخواہ جیا آپی کی جذباتیت کے پیچھے اپنی ساری زندگی داؤ پر لگا گئے، زندگی کی خوشیوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا، حالانکہ اتنے ینگ اور ہینڈسم ہیں......'' نویرہ گھاس کے تنکوں سے کھیلتے ہوئے بولی تھی۔ شرزمہ کے پاس اس کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

☆☆☆

''آپ نے جیا آپی کو مرنے کیوں دیا......؟'' وہ اگلے دن ان کے آفس میں تھی۔ وہ جو فیکلٹی کی کسی میٹنگ میں شرکت کے لیے جا رہے تھے۔ اتنے دن بعد شرزمہ کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران بھی نہیں ہو پائے تھے کہ شرزمہ کے سوال نے انہیں بوکھلا دیا۔

''کیا کہہ رہی ہیں آپ......؟'' انہیں اپنی سماعتوں پر شک ہوا۔

''میں یہ کہہ رہی ہوں کہ آپ نے جیا آپی کو مرنے کیوں دیا......؟'' شرزمہ نے اپنے الفاظ دوبارہ سے دُہرا دیے۔

''کاش کہ میرے بس میں ہوتا تو میں وقت کا پہیّا الٹا چلا دیتا، اپنی زندگی کی کہانی کو اسی دن سے ریورس کر کے چلاتا، جس دن اس نے بالکل آپ کے اسٹائل میں کہنی میری میز پر ٹکا کر کہا تھا کہ سر آپ مجھے اچھے لگتے ہیں۔'' ان کی بات پر شرزمہ بوکھلا کر سیدھی ہو بیٹھی۔

''اس کی بھوری آنکھوں میں بھی بالکل آپ کی آنکھوں کی طرح اس وقت ستارے دمکتے تھے جب وہ بے تحاشا خوش ہوتی تھی۔'' شرزمہ کو لگا جیسے وہ نیند میں بول رہے ہوں۔

''مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ میرے ساتھ میرے گھر ''الجھت'' کو سجانے کے خواب دیکھتی، دیکھتی خود انجان منزلوں کی مسافر بن جائے گی۔'' وہ بڑے بوجھل انداز کے ساتھ اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے تھے۔ شرزمہ نے بہت ہی عجیب نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

''آپ نے اس اسٹیج پر انہیں جانے ہی کیوں دیا۔ آپ ان کے ساتھ کورٹ میرج کر لیتے......'' شرزمہ نے انتہائی بچگانہ انداز میں کہا۔ وہ ساری رات سو نہیں پائی تھی۔ نویرہ نے اسے جیا آپی کی تصاویر دکھائیں تو اسے اندازہ ہوا کہ اس کی شکل کافی حد تک ان سے مشابہت رکھتی ہے۔ اسی وجہ سے پروفیسر آفاق اور اسود اسے دیکھ کر بار بار چونکتے تھے۔

''میں اس سے دنیا کی ہر جگہ پر میرج کرنے کو تیار تھا لیکن وہ اپنے والدین کی رضامندی کے خلاف کوئی بھی قدم اٹھانا نہیں چاہتی تھی۔'' ان کی

صفائی پر شرزمہ کی آنکھوں سے بدگمانی کے رنگ کچھ ہلکے ہوئے۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ یہ انتہائی قدم بھی اٹھا سکتی ہے۔ وہ خود تو چلی گئی لیکن مجھے جیتے جیتے مار گئی......'' پروفیسر آفاق کا لہجہ شرزمہ کو کچھ بھیگتا ہوا محسوس ہوا۔

''وہ بالکل آپ کے جیسی تھی، تتلیوں، جگنوؤں، بارشوں اور فطری مناظر کی دیوانی، اس کی زندگی میں سارے ہی رنگ شدت پسندی کے حامل تھے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا ناں کہ اسے مجھ سے محبت ہوئی اور اس نے اگلے ہی دن مجھ سے اظہار کر دیا۔ اس کی مختصر سی محبت ہی اب میری زندگی کا کل اثاثہ ہے......'' پروفیسر آفاق اپنے حصے کا بوجھ اس کے اعصاب پر لاد کر اب کچھ مطمئن تھے۔

''آپ کو پتا تھا کہ نویرہ، جیا آپی کی بہن ہے......؟'' اسے اچانک یاد آیا۔

''ہوں پتا تھا......'' انہوں نے مختصراً جواب دیا۔ ''لیکن کافی عرصے کے بعد پتا چلا تھا۔'' انہوں نے مزید بتایا۔

''آپ کبھی انکل ابرہیم یا آنٹی الماس سے ملے ہیں......؟''

''نہیں، اس کا موقع ہی نہیں ملا......'' ان کے چہرے پر ایک حُزن آمیز مسکراہٹ پھیلی۔ ''جویریہ کے جنازے میں بس دور ہی سے دیکھا تھا ابراہیم صاحب کو۔''

''آپ کو جیا آپی کی ڈیتھ کی خبر کس نے دی تھی......؟'' شرزمہ کی تسلی ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔

''اس کی ایک قریبی دوست نے اطلاع دی تھی۔ اس دن مجھے ایسا لگا جیسے قیامت کا شاید یہی دن مقرر ہے۔ آج بھی میری سماعتوں میں سیسہ سا پگھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔'' ان کی آنکھیں ایک دم سرخ ہوئیں۔ شرزمہ کو لگا جیسے کوئی خون کی ندی بس بہنے کو تیار ہو۔ وہ نظریں چرا کر بات بدلنے کی غرض سے بولی۔

''ہنی کا کیا حال ہے......؟''

''ویسا ہی حال ہے جیسا کہ ہونا چاہیے، انہیں لگتا تھا کہ شاید شرزمہ حسن نام کی لڑکی ان کی لاٹھی پکڑے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتی۔ آپ نے تو ایک قدم نہیں بلکہ مکمل بھاگ کر انہیں دکھا دیا۔'' پروفیسر صاحب کا لہجہ عجیب سا ہوا۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ شاکڈ ہیں......'' شرزمہ نے اندازہ لگایا۔

''وہ شاکڈ ہیں نہیں بلکہ تھیں۔ آپ کو شاید پتا نہیں کہ جن لوگوں میں ''وٹامن میں'' کی زیادتی ہو، وہ زیادہ دیر تک کسی کو اپنے حواسوں پر سوار نہیں کرتے......'' انہوں نے صاف گوئی سے کہا تو ایک افسردہ سی مسکراہٹ شرزمہ کے چہرے پر دوڑ گئی۔

''نہیں آج کل آپ سے زیادہ اس چیز کی ٹینشن ہے کہ اسود کی ممی کو کس طرح امپریس کرنا ہے......'' انہوں نے ایک اور انکشاف کیا۔

''کیا اسود نے اپنی ماما سے ان کے لیے بات کرلی ہے......؟'' شرزمہ نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہاں کی تو ہے مگر......'' انہوں نے بات ادھوری چھوڑی۔

''کیا مگر......؟'' شرزمہ نے عجلت بھرے انداز میں پوچھا۔

''آپی کو ہانیہ کی ایج پر اعتراض ہے۔ اس لیے وہ مان نہیں رہیں، دیکھو کیا بنتا ہے......'' پروفیسر آفاق نے مختصراً بتایا۔

''اب ایج ڈیفرنس اتنا زیادہ بھی نہیں، ویسے بھی جہاں آپ کی انڈراسٹینڈنگ ہو، وہاں یہ چیزیں معنی نہیں رکھتیں......'' شرزمہ نے لاشعوری طور پر ہنی کی طرفداری کی۔

''اچھا تو آپ چاہتی ہیں کہ دونوں کی شادی

ہو جائے......'' انہوں نے پہلی دفعہ اس معاملے میں دلچسپی دکھائی۔

''مجھے تو اس میں کوئی مضائقہ محسوس نہیں ہوتا......'' شرزمہ نے کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر سادگی سے کہا۔

''کیا آپ کو فرق نہیں پڑتا، انہوں نے اتنی آپ کے خلاف باتیں کیں، آپ کے کردار پر انگلی اٹھائی؟'' پروفیسر آفاق حیرانی سے بولے۔

''پہلے پہل تکلیف ہوئی تھی لیکن پھر میں نے سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا۔ مجھے اب اُن سے کوئی گلہ نہیں......'' شرزمہ کی سادگی پروفیسر آفاق کے لیے اچنبھے کا باعث بنی۔

''آپ بہت حیران کن ہیں شرزمہ......'' انہوں نے کھلے دل سے اعتراف کیا تو وہ مسکرا دی۔

☆☆☆

''آپ جب مسکراتی ہیں تو آپ کے گالوں پر بھی ایسا ہی ڈمپل بنتا ہے جیسا......'' شامی نے ابھی اپنی بات مکمل نہیں کی تھی کہ شرزمہ بے ساختہ بولی۔

''جیسا کہ جیا آپی کے......'' اس کی بات پر ایک واضح تاریک سایہ احتشام کے چہرے پر دوڑا۔ اس کی پیشانی کا بل گہرا ہوا۔

''جی نہیں، میں انعم کی بات کر رہا تھا۔'' اس کی تصحیح پر شرزمہ ایک دم شرمندہ ہوئی۔

''آئی ایم سوری، اصل میں سب کہتے ہیں کہ میری شکل ان سے ملتی ہے تو میں سمجھی کہ آپ بھی یہی کہیں گے......'' اس نے سر جھکا کر خفت زدہ لہجے میں کہا۔

''کچھ کچھ مشابہت تو آتی ہے، خاص طور پر آنکھوں کا رنگ اور ستواں ناک......'' احتشام نے اس دفعہ بڑے غور سے اسے دیکھ کر کہا۔ وہ گڑبڑا سی گئی۔ دونوں اس وقت ٹیرس پر بیٹھے تھے۔ جہاں ارجمند خاتون نے آبنوسی لکڑی کا ایک بڑا سا جھولا بنوا کر رکھا ہوا تھا۔ وہ جھولے میں اور احتشام اپنا لیپ ٹاپ گود میں لیے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔

''شامی بھائی ایک بات پوچھوں......؟'' اس کے چہرے پر پھیلے تذبذب کے آثار شامی کے لیے حیرت کا باعث بنے۔

''آپ کیا ابھی تک جیا آپی سے خفا ہیں......؟'' اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سوال کر لیا جو کافی دنوں سے اس کے دماغ میں گھوم رہا تھا۔

''میں جیا سے کبھی ناراض نہیں تھا، نہ پہلے اور نہ اب......'' شامی نے اسے مزید تعجب میں مبتلا کیا۔

''مجھے جتنے بھی گلے اور شکوے تھے سب کے سب الماس ممانی سے تھے۔ انہوں نے مجھ سے غلط بیانی کی اور آخری لمحے تک لاعلم رکھا۔ اگر مجھے ذرا بھی بھنک پڑ جاتی تو وہ سب کچھ نہ ہوتا جو اَب تک ہو چکا ہے۔'' انہوں نے بہت کھل کر اپنا موقف بیان کیا۔

''ہاں جو بھی ہوا، وہ بہت غلط ہوا، اور جو اَب ہونے جا رہا ہے وہ اس سے بھی زیادہ غلط......'' وہ اپنی انگلیاں مسلتے ہوئے شامی کو کسی الجھن کا شکار لگی۔

''کیا مطلب......؟''

''مجھے ڈر ہے کہ کہیں جیا آپی والی کہانی دوبارہ نہ دُہرائی جائے......'' شرزمہ کو پہلی دفعہ احساس ہوا کہ اس نے ارجمند وِلا میں آنے کے بعد زیادہ بولنا شروع کر دیا ہے۔

''مجھے آپ کی بات سمجھ نہیں آئی، آپ پلیز کھل کر کہیں......'' شامی کی ساری توجہ اس کی جانب مبذول ہوگئی۔

''نویرہ بھی تو جیا آپی ہی کی بہن ہے اور ارسلان نے اس کے ساتھ کمٹمنٹ کر رکھی تھی کہیں......'' شرزمہ نے دانستہ بات ادھوری چھوڑی۔

''دیکھیں شرزمہ، میں سب کچھ جاننے کے باوجود بھی اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ گھریلو سیاست کی جڑیں بہت گہری ہیں......'' شامی نے

اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔
''اٹس' او کے شامی بھائی! لیکن یہ یاد رکھیے گا کہ آج اسی ٹیرس پر بیٹھ کر میں نے آپ کو خبردار کیا تھا، کل کو کم از کم آپ میرے سامنے مت کہیے گا کہ کاش مجھے بھنک بھی پڑ جاتی تو میں ایسا ہونے نہ دیتا۔''
شرزمہ نے بڑی مہارت سے گینداس کے کورٹ میں پھینکی اور وہاں سے اٹھ کر نیچے آ گئی۔ نیچے شاید آج کوئی تفصیلی صفائی کا پروگرام تھا جو ایک گرد کا طوفان آیا ہوا تھا۔ شرزمہ کی ناک میں خارش شروع ہوئی اور ساتھ ہی چھینکوں کا طوفان آ گیا۔
''اوہ مائی گاڈ......'' وہ سامنے کچن کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئی اور واش بیسن کے سامنے کھڑے ہو کر پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔ جیسے ہی مڑی سامنے ہی رومی آنٹی کو دیکھ کر سٹپٹا سی گئی۔
''آئی ایم سوری مجھے ڈسٹ الرجی ہے، ہلکی سی گرد سے برا حال ہو جاتا ہے......'' اس نے بوکھلا کر صفائی دی۔ رومیصہ کے چہرے کی رنگت تبدیل ہوئی۔
''رضا کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا......'' ساس پین میں پانی ڈالتے ہوئے وہ روانی میں بولیں۔ شرزمہ چونک گئی آج پہلی دفعہ انہوں نے شرزمہ کے سامنے ایسی بات کی تھی۔
''ہاں پاپا کا تو مجھ سے بھی زیادہ برا حال ہو جاتا تھا اس لیے ہم ایسے پروگرام اس دن رکھتے تھے جس دن پاپا کا اسٹور سے دیر سے آنے کا پروگرام ہوتا تھا۔'' شرزمہ نے بے تکلفی سے بتایا
''چائے پیو گی......؟'' انہوں نے مڑ کر اس سے پوچھا۔
''مجھے چائے اچھی نہیں لگتی، میں کافی زیادہ شوق سے پیتی ہوں......'' اس کی بات پر رومیصہ کا ہاتھ کانپا، انہوں نے فوراً ساس پین چولھے پر رکھا اور خود کرسی پر بیٹھ گئیں۔
''آنٹی آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے......؟''
شرزمہ نے فکرمندی سے انہیں دیکھا۔ ان کا چہرہ زرد اور ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں تھیں۔
''ہاں ٹھیک ہوں......'' انہوں نے خود کو سنبھالا۔ ''تم نے آج صبح سے نیچے چکر ہی نہیں لگایا، انعم تمہیں یاد کر رہی تھی......'' ان کی بات پر اسے بڑی خوشگوار حیرت ہوئی۔
''میں بس اوپر تھوڑا بزی تھی، کہاں ہے انعم......؟''
''اپنے کمرے میں ہی ہے......'' انہوں نے کافی پاؤڈر کیبنٹ سے نکالتے ہوئے اسے اطلاع دی۔ ''ذرا ٹھہرو، اپنا کافی کا کپ لے کر جانا......'' انہوں نے اسے پیچھے سے پکارا۔ وہ رک گئی۔
''آنٹی، یہ انعم کی شکل کتنی پاپا سے ملتی ہے نا......'' وہ ان کے پیچھے آن کر بولی۔
''تمہاری بھی تو ملتی ہے......'' انہوں نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔
''نہیں، میری جیا آپی اور اپنی ماما کے اوپر ہے......'' اس نے وضاحت دی۔ رومیصہ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔
''شرزمہ......'' انہوں نے بے اختیار ہی اسے پکارا۔
''آؤ میرے ساتھ رضا کی باتیں کرو، میرے اندر بہت سالوں سے جمی سوچوں کو پھپھوند لگتی جا رہی ہے......'' وہ بہ مشکل بولی تھیں لیکن شرزمہ ان کی اس عجیب و غریب فرمائش کو سن کر ہکا بکا رہ گئی۔ وہ بالکل بھی توقع نہیں کر سکتی تھی کہ رومیصہ آنٹی اس سے اس قسم کی بات کر سکتی ہیں۔ اس لیے وہ کافی دیر تک بے یقینی سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔
☆☆☆
''اتنی گرمی میں دھوپ میں بیٹھی ہوئی کیا کر رہی ہو......؟'' ارسلان جو ابھی ابھی باہر سے آیا تھا نوریہ کو لان میں بیٹھے دیکھ کر نہ جانے کیوں ادھر آ گیا، شاید رات کو شامی کی برین واشنگ کا بھی کچھ اثر تھا۔ اس

لیے چہرے پر وہی مخصوص نرمی کی جھلک تھی۔
''اپنا مقبرہ ڈیزائن کر رہی ہوں......'' اس نے ڈائری پر الٹی سیدھی لکیریں ڈالتے ہوئے اسے جواب بھی بڑا الٹا ہی دیا تھا۔ اس کے جواب پر ارسلان نے اپنے اندر سے اٹھتی غصے کی ایک بے ساختہ لہر کو بڑی مشکلوں سے دبایا۔
''دماغ ٹھیک ہے تمہارا......؟ اٹھو، اتنی گرمی میں دھوپ میں بیٹھی ہو......'' اس نے ناگواری سے کہا۔
''تم سے مطلب......؟'' نوریہ نے یہ الفاظ منہ سے بولے نہیں تھے لیکن اس کی آنکھیں چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں۔ ارسلان نے اس کے بے ساختہ شکوے پر دانستہ اپنی نظریں چرائیں۔
''میں کوئی برف کی ڈلی نہیں ہوں، جو ذرا سی دھوپ سے پگھل جاؤں۔'' نوریہ کے ہر انداز سے خفگی عیاں تھی۔
''تم اٹھتی ہو کہ میں لگاؤں ایک......'' ارسلان نے غصے میں اس کا بازو پکڑا، اگلے ہی لمحے اسے جھٹکا سا لگا۔ ''تمہیں بخار ہے کیا......؟'' نوریہ کے جسم کی حرارت اور سرخ آنکھوں نے اس کی تصدیق کی تھی۔
''میں تم سے کیا پوچھ رہا ہوں...... تمہیں بخار ہے کیا......؟'' اس کے لہجے میں جھلکتی فکرمندی نوریہ کی آنکھوں کو نم کر گئی۔
''نہیں......'' اس نے سر جھکا کر صاف انکار کیا۔
''یہ تم نے مجھ سے جھوٹ بولنے کب سے شروع کر دیے ہیں......؟'' بہت عرصے بعد وہ اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوا تو نوریہ کا دل بغاوت پر اترنے لگا۔
''جب سے تم نے مجھے اپنے گھر والوں کی نظروں سے دیکھنا شروع کیا ہے۔'' اس کے منہ سے ایک اور شکوہ پھسلا۔ ارسلان خاموش رہا۔
''تم لوگ جس دن مجھے صرف الماس ابراہیم کی اولاد سمجھنا چھوڑ دو گے اور تمہیں یہ احساس ہو گا کہ میری اور عابی کی رگوں میں ابراہیم رندھاوا کا بھی خون دوڑتا ہے، بس اسی دن تم لوگ ہمیں بھی مارجن دینا شروع کر دو گے......'' اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے دیا۔ اس کے ہر انداز سے عیاں تھا کہ وہ آج اپنی مخصوص ضد اور ہٹ دھرمی پر اتری ہوئی ہے۔ ارسلان کچھ دیر تو اسے دیکھتا رہا اور اس کے بعد تھک ہار کر اوپر چل دیا۔
''شرزمہ، پلیز اپنی اس پاگل دوست کو دیکھیے گا، وہ ٹمپریچر کے باوجود لان میں اتنی دھوپ میں بیٹھی ہوئی ہے۔'' ارسلان اسے سیڑھیوں پر ملا تو کچھ جھجک کر بولا۔
''بھئی جس کی محبت نے اسے پاگل کر رکھا ہے جب اس کی بات اسے سمجھ نہیں آ رہی تو میں کس کھیت کی مولی ہوں۔'' شرزمہ نے بھی اس سے صاف، صاف بات کرنے کی ٹھانی۔
''آپ اس کی دوست ہیں، آپ کی بات وہ سمجھ جائے گی......'' ارسلان خفت زدہ لہجے میں گویا ہوا۔
''میں تو صرف دوست ہوں، آپ نے تو اسے انگلی پکڑ کر بہت سارے خواب دکھائے تھے......'' شرزمہ نے بھی موقع ہاتھ سے نہیں گنوایا۔
''میں کیا کروں، مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا، میں الماس آنٹی اور اپنی امی کی سیاست میں پس کر رہ گیا ہوں۔'' وہ حقیقتاً پریشان تھا۔
''آپ صرف وہ کریں، جو آپ کا اور نوریہ کا دل کرتا ہے، رہی بات ان دونوں خواتین کی تو... ان کی ساری زندگی تو ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں گزر گئی اور باقی بھی ایسے ہی گزر جائے گی۔'' شرزمہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے اتنا بولنا کہاں سے آ گیا۔
''میری امی کبھی نوریہ کو قبول نہیں کریں گی......'' اس نے بے بسی کے اظہار کے لیے دیوار سے ٹیک لگائی۔
''میں نے اپنی زندگی میں پہلا فورسز کا بندہ

دیکھا ہے۔ جس میں فیصلہ کرکے اس پر ڈٹ جانے کی قوت نہیں......'' شرزمہ نے اس کا مذاق اڑایا، توہین کے گہرے احساس کے تحت ارسلان کا چہرہ سرخ ہوا۔

''ایسی کوئی بات نہیں، میں صرف نوریہ کو مستقبل کی بے تحاشا پریشانیوں سے بچانا چاہتا ہوں۔'' اس نے اپنا دفاع کرنے کی کمزوری کوشش کی۔

''کیسے مرد ہیں آپ، جو حالات کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس سے فرار حاصل کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ آپ اسے اپنے ساتھ ہر پوسٹنگ پر رکھ سکتے ہیں، جہاں تک بات گھر کی خواتین کی ہے تو وہ کب تک اپنی فضول اور چیپ قسم کی سیاست سے آپ کی زندگیوں کو تنگ کریں گی؟'' شرزمہ بڑی بہادری سے نوریہ کا مقدمہ لڑ رہی تھی۔ اس کی باتوں نے ارسلان کو کم از کم ایک دفعہ ضرور سوچنے پر مجبور کیا تھا۔

☆☆☆

''جب زندگی میں ہر طرف گھٹن یا حبس کا احساس ہو تو اپنے ذہن میں رکھنا کہ ''الجنت'' کے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کھلے ہیں......'' پروفیسر آفاق کی طرف سے ملنے والے اس ٹیکسٹ نے شرزمہ کی آدھی رات کی نیند اڑا دی تھی۔

''الجنت کے دروازے تو آپ بہت سال پہلے بند کر چکے ہیں......'' وہ اپنا سیل فون اٹھا کر ننگے پاؤں ٹیرس کی طرف چلی آئی۔ اس کا جوابی ٹیکس ہواؤں کے دوش پر پروفیسر آفاق کو موصول ہوا وہ خود بھی اس وقت اماوس کے چاند کو دیکھتے ہوئے خاصے افسردہ تھے۔

''بعض لوگوں کی آمد دروازوں یا کھڑکیوں کی محتاج نہیں ہوتی، وہ آندھی کی طرح آتے ہیں اور ہر طرف چھا جاتے ہیں......'' دوسری جانب سے فوراً ہی اگلا ٹیکسٹ آیا۔

''ہم جیسے لوگ تو طوفاں کی زد میں آئے ہوئے کسی تنکے کے مانند ہیں جنہیں ہوائیں جہاں چاہیں، اڑا کر لے جاتی ہیں۔ ہمارا اپنا کوئی دوش نہیں۔'' وہ اداس ہوئی۔

''بعض لوگ، جو دیکھنے میں کسی تنکے کی طرح لگتے ہیں لیکن ان کے اندر دوسروں کی زندگیوں کو ہلانے کی چٹانوں سے زیادہ قوت ہوتی ہے۔'' پروفیسر صاحب نے فوراً ہی جواب دیا۔

''ہم کہاں اور ہماری بساط کہاں......'' اس نے تیرگی پر نگاہیں جماتے ہوئے سیل پر تیزی سے لکھا۔

''میں زندگی کی اداس وسعتوں میں الجھ کر رہ گیا ہوں
میرے لہو میں سمٹ جانے کی ایک خواہش سی اُگ رہی ہے''

انہوں نے کسی نظم کے دو مصرعے شرزمہ کو لکھ بھیجے۔ اتنے کھلے اظہار پر شرزمہ کے دل کی دھڑکنیں بے تاب ہوئیں۔ اس کے پاس ان کی اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''کیا ہوا شرزمہ......؟ کیا آپ کو نیند نہیں آ رہی......؟'' شامی بڑی خاموشی سے اس کے پاس سیڑھیوں پر آن بیٹھا۔

''ہوں......'' اس نے آہستگی سے سر ہلایا۔

''کیا سوچا ہے، آپ نے زندگی کے بارے میں......'' وہ بہت سنجیدگی سے اس سے پوچھ رہا تھا۔

''پتا نہیں، میں نے عرصہ ہوا زندگی کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے۔'' اس نے سادگی سے جواب دیا۔ وہ خود بھی اب آسمان پر موجود تنہا چاند کو دیکھتے ہوئے اداس ہوئی۔

''وہ کیوں......؟'' شامی نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے معلوم ہے کہ انسان تقدیر کے ہاتھوں بے بس ہے، پھر کیا فائدہ خود کو کسی ذہنی مشقت میں ڈالنے کا......'' وہ حد درجہ مایوسی اور قنوطیت کا شکار تھی۔

''یہ کیا بات ہوئی، آپ خود تو دوسروں کو بڑے

بڑے بہادری کے سبق دیتی ہیں لیکن خود بغیر لڑے ہتھیار ڈال چکی ہیں۔'' شامی کو یہ گھنی پلکوں والی گڑیا نہ جانے کیوں اچھی لگ رہی تھی۔

''میں نے ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ چیزوں کو اسی انداز میں قبول کیا ہے جس انداز سے وہ رونما ہو رہی ہیں، یہ کمزوری کی نہیں بلکہ بہادری کی علامت ہے۔'' شامی اس کی دلیل پر مسکرایا۔

''میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ میں کبھی اس گھر میں آؤں گی، مجھے پاپا کی ساری فیملی سے نہ جانے کیوں چڑ تھی، حالانکہ پاپا کی ڈیتھ کے بعد انکل ابراہیم بارسلونا آئے، مجھے ڈھونڈنے اور ملنے کی کوشش کی لیکن میرے ذہن کے کسی گوشے میں نہیں تھا کہ مجھے یہاں ہی آنا ہوگا۔'' وہ کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کر رہی تھی۔

''اور اگر آپ کو اسی خاندان کے ساتھ ساری زندگی رہنا پڑ جائے تو......؟'' شامی نے بہت گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے ایک بہت عجیب سا سوال کیا۔

''نہیں، مجھے یہاں نہیں رہنا......'' اس کا دوٹوک انداز اس دفعہ شامی کو حیران کر گیا۔

''یہاں نہ سہی، امریکا سہی......'' اس دفعہ اس نے کھل کر اشارہ دیا۔ شرزمہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں اسے ایک نئی داستان سنا رہی تھیں۔

☆☆☆

''آپ اتنی زیادہ ظالم کیوں بن رہی ہیں، ایک دفعہ اس کا پتا تو کریں......'' اسود اس دن جناح سپر میں ہانیہ کے ساتھ موجود تھا۔ جو اپنے بوتیک کے کاموں کے سلسلے میں اسے ساتھ ساتھ لیے پھر رہی تھیں۔ کاموں سے فراغت پا کر آئس کریم کھاتے ہوئے اسود نے اچانک ہی ہانیہ سے کہا تو وہ چونک گئیں۔

''کس کی بات کر رہے ہو تم، شرزمہ کی......؟'' ان کے چہرے پر ناگواری کا سایہ لہرایا۔

''ظاہر ہے، آپ کے پاس ریلیشنز کے نام پر ایک ہی تو رشتہ ہے، اسی کی بات کر رہا ہوں......'' اسود نے دانستہ ہلکا پھلکا انداز اپنایا۔

''آئی ایم سوری، مجھے اس میں اب کوئی انٹرسٹ نہیں، وہ خود غرض ماں کی خود غرض بیٹی ہے......'' ہانیہ نہ جانے کیوں اس سے حد درجہ بدظن تھیں۔

''کیا مطلب ہے آپ کا......؟'' آئس کریم کھاتے ہوئے اسود چونکا، وہ دونوں گاڑی کی ڈگی سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ اس کی بات پر ہانیہ ایک دم ہڑبڑائیں۔

''کچھ نہیں یار، اس کی والدہ یعنی میری بہن صاحبہ اپنی ذاتی زندگی میں کافی خود غرض واقع ہوئی تھیں۔ ڈیڈی کا سارا بزنس میں نے سنبھال رکھا تھا اور انہیں لگتا تھا کہ میری شادی کی صورت میں سب کچھ ہاتھ سے نکل جائے گا، اس لیے انہوں نے میری شادی کے حوالے سے کبھی سیریس ہو کر سوچا ہی نہیں۔'' ہانیہ نے آج بہت ہی عجیب بات کر کے اسود کو دوبارہ چونکا دیا۔

''لیکن آپ تو خود اچھی خاصی خود مختار زندگی گزار رہی تھیں......'' اسود نے اسے یاد دلایا تو وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دی۔

''بعض دفعہ آپ کے پر کاٹ کر آپ کو قوتِ پرواز کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ ایسا پرندہ اپنے پنجرے کی دیواروں سے سر ٹکرانے کے علاوہ کر ہی کیا سکتا ہے۔'' ہانیہ نے ہاتھ میں پکڑا خالی آئس کریم کا کپ ڈسٹ بن میں اچھالا۔

''آپ کی زندگی تو واقعی بہت قابلِ رحم تھی......'' اسود کو اپنے سامنے کھڑی لڑکی سے گہری ہمدردی محسوس ہوئی۔

''اب تم دیکھو کہ شیری کے لیے میں نے کیا نہیں کیا، اس کے والدین کو تو لڑائی جھگڑوں سے فرصت نہیں ملتی تھی، وہ تو اسے پیدا کر کے بھول گئے

تھے، میں نے انگلی پکڑ کر اسے چلنا سکھایا، اس نے اپنی زندگی کا پہلا لفظ ''ہنی'' سیکھا، اور اسی ہنی کے ساتھ دیکھو، اس نے کیا کیا......'' ہانیہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''اس کو پتا ہوگا کہ آخر ہنی اس کے لیے کر ہی کیا سکتی ہے، اس نے ہر لحاظ سے اپنا فائدہ دیکھا اور اسی لیے اپنی ددھیال چلی گئی، ماں اور باپ دونوں کی ہی جائداد کی اکلوتی وارث اور میرے حصے میں کیا آیا......؟'' ہنی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی پھسلتے ہوئے ان کے لبوں تک پہنچ گئی۔

''ہانیہ، ٹینشن کیوں لیتی ہیں، میں ہوں ناں......'' اسود نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''لیکن تمہاری ماما......؟'' ہانیہ کے منہ سے پھسلا۔

''بس یار دعا کرو کہ ماما مان جائیں، میں ان کی رضا مندی کے بغیر اپنی زندگی کا فیصلہ نہیں کرنا چاہتا......'' اسود نے پریشانی سے کہا۔

''اس سلسلے میں، بتاؤ میں کیا کر سکتی ہوں، انہیں تمہارے گھر کے اوپر والے پورشن میں میرے اکیلے رہنے پر اعتراض تھا۔ میں ہاسٹل میں شفٹ ہوگئی۔ انہیں میرا بزنس کرنا پسند نہیں تھا، وہ میں تمہیں کہہ چکی ہوں کہ جیسا تم کہو گے، ویسا ہی ہو جائے گا، اب اس سے زیادہ میں کیا کر سکتی ہوں۔'' ہانیہ نے ٹشو سے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بے چارگی سے کہا۔

''مجھے معلوم ہے سب لیکن پتا نہیں پروفیسر صاحب کا رویہ بہت عجیب سا ہے۔ وہ اس موضوع پر بالکل چپ سادھ کر بیٹھے ہیں، حالانکہ وہ ماما کو منا سکتے ہیں......'' اسود نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے الجھن کا اظہار کیا۔

''ظاہر ہے کہ وہ کیوں چاہیں گے......؟'' ہانیہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ ''وہ تو خود شرزمہ کے حسن کے پیچھے پاگل تھے۔'' ہانیہ کی بات پر اسود فوراً بولا۔

''ایسی کوئی بات نہیں، مجھے معلوم ہے کہ وہ شرزمہ کو دیکھ کر کیوں چونکتے تھے کیونکہ وہ جویریہ کی کزن ہیں جن سے کسی زمانے میں پروفیسر صاحب عشق کرتے تھے۔''

''کیا......؟'' ہانیہ کو یہ بات اتنی عجیب لگی کہ وہ اپنا کھلا منہ بند کرنا بھول گئیں اور سخت الجھن بھرے انداز میں اسود کو دیکھنے لگیں جو بڑی فرصت سے گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

☆☆☆

''میں تو سمجھتی تھی کہ رضا باہر شادی کر کے بہت مطمئن زندگی گزار رہا ہوگا......'' رومیصہ کو شرزمہ کی باتوں پر یقین نہیں آیا تھا، وہ دونوں انعم کے کمرے میں تھیں۔ انعم کی زندگی میں بڑا مثبت چیلنج آیا تھا وہ شرزمہ کے ساتھ اب خاصی بے تکلف ہو چکی تھی اور اس کے ساتھ اکثر یونیورسٹی بھی چلی جاتی۔

''پتا نہیں آنٹی، میں نے تو ہمیشہ ہی ان دونوں کو لڑتے اور جھگڑتے ہی دیکھا تھا......'' شرزمہ اداس ہوئی۔

''لیکن، کیوں......؟'' رومیصہ کی آنکھوں میں تیرتی الجھن شرزمہ کے لیے حیران کن نہیں تھی۔

''کچھ لوگ زندگی کے ہر معاملے میں بہت... بدقسمت ہوتے ہیں۔ پاپا کے ساتھ یہاں بہت عجیب ہوا اور جب وہ اسپین گئے تو انہوں نے اپنی شادی کو کافی عرصے تک چھپائے رکھا اور جب اچانک یہ راز کھلا تو ماما دوبارہ ان پر اعتبار نہ کر سکیں، انہوں نے کبھی انہیں پاکستان آنے کی اجازت نہیں دی......'' شرزمہ کے ذہن میں ان کی لڑائی جھگڑوں کے ہزاروں مناظر محفوظ تھے۔

''دونوں ایک دوسرے سے دو، دو ماہ بات نہیں کرتے تھے، میں زیادہ تر ہنی کے ساتھ رہتی جو میری خالہ تھیں۔ انہوں نے ہی میری پرورش کی......'' شرزمہ کی باتیں رومیصہ کے دل کو تکلیف

دے رہی تھیں لیکن وہ اس شخص کے متعلق چھوٹی سے چھوٹی بات بھی سننا چاہتی تھیں جسے تقدیر نے ان کی زندگی میں ایسے ہی شامل کر دیا تھا۔

''ماما کو اس چیز کا بہت غرور تھا کہ پاپا ان کے ڈیڈی کے اسٹور پر کام کرتے ہیں، وہ بات بات پر انہیں طعنے دیتی تھیں اور پاپا بھی کسی سے کم نہیں تھے، وہ بھی اپنا حساب برابر رکھتے۔'' شرزمہ کو ماضی کی باتیں تکلیف دے رہی تھیں لیکن وہ آج رومیصہ آنٹی کو باور کروانا چاہتی تھی کہ وہ اپنے ذہن سے نکال دیں کہ ان کے شوہر نے ایک بھرپور کامیاب زندگی گزاری تھی۔

''لیکن ان دونوں کی تو لو میرج نہیں تھی کیا......؟'' رومیصہ نے عجلت بھرے انداز میں بات کاٹی۔

''پاکستان آنے سے پہلے تک تو میں یہی سمجھتی تھی......'' شرزمہ کی بات نے انہیں پریشان کیا۔ تب ہی انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''مجھے یہاں آ کر بہت تکلیف دہ حقیقتوں کا ادراک ہوا ہے، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے......'' شرزمہ نے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائی۔

''کیا مطلب......؟'' رومیصہ کو اپنے سامنے بیٹھی لڑکی سے پہلی دفعہ ہمدردی محسوس ہوئی۔

''بس دفع کریں آپ، ان سب تکلیف دہ باتوں کو......'' شرزمہ نے انہیں ٹالا۔ ''آپ بس یہ سوچ کر اپنی زندگی کو آسان بنا لیں کہ اگر آپ خوش نہیں تھیں تو ان کے لیے بھی زندگی پھولوں کی سیج نہیں تھی۔'' شرزمہ زبردستی مسکرائی۔

''یہ سوچ لینے سے کیا میری زندگی کے تمام قیمتی سال واپس آ جائیں گے یا میری بیٹی کی محرومیوں کا مداوا ہو جائے گا؟'' رومیصہ کے تلخ لہجے پر شرزمہ انہیں دیکھتی رہ گئی۔

''محرومیاں صرف انعم ہی کے حصے میں ہی نہیں آئیں، میں کس سے گلہ کروں......'' شرزمہ کی بات نے انہیں لاجواب کیا۔

''زندگی کے دامن میں ہر شخص کے لیے کسی نہ کسی حوالے سے محرومیاں اور دکھ ضرور ہوتے ہیں، شاید اس لیے کہ غم کی موجودگی میں ہی انسان خوشی کے خالص احساس کو دل سے محسوس کر سکتا ہے۔'' اس کا فلسفہ رومیصہ کے لیے مشکل نہیں تھا۔

''تم اس حوالے سے تو خوش قسمت ہو ناں کہ تمہیں ارجمند ولا میں فوراً ہی قبول کر لیا گیا، تمہیں وہ حیثیت فوراً ہی دے دی گئی جو رضا کی اولاد کو ملنی چاہیے تھی۔ جبکہ میری بیٹی کے مقام کو تو آج تک بھی صرف رومیصہ کی اولاد ہی سمجھتے ہیں۔'' ان کے لہجے میں رنج چھلکا۔

''آنٹی، مجھے اس لیے فوراً قبول کیا گیا کیونکہ میں کسی الماس بیگم کی بہن کی بیٹی نہیں ہوں......'' شرزمہ کے منہ سے نکلنے والی تلخ حقیقت نے رومیصہ کو فوراً ہی چپ کروا دیا۔

''آپ کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ الماس آنٹی کی بہن ہونا اور پاپا کی زندگی میں زبردستی شامل ہونا ہے۔ اگر آپ کی جگہ پر دادو کی پسند کی کوئی لڑکی ہوتی تو ارجمند ولا کے دروازے میرے لیے کھلنا تو دور کی بات، کوئی مجھے اندر جھانکنے بھی نہ دیتا۔'' اس نے ایک اور تلخ حقیقت بیان کی۔

''تم ٹھیک کہتی ہو شرزمہ......'' وہ اداس ہوئیں۔

اگلی صبح ارجمند ولا کے مکینوں کے لیے بہت اذیت ناک تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اگلے دن کا سورج اپنے ساتھ بے شمار تلخ حقیقتوں کو لیے طلوع ہوگا۔ وہ اٹھی تو اس نے پورے گھر میں ایک ہولناک خاموشی دیکھی۔

''حرا بھابی کیا ہوا ہے......؟'' اتوار ہونے کی وجہ سے وہ آج گھر پر ہی تھی، ویسے بھی آج کل وہ کیمپس کم کم ہی جا رہی تھی۔ اس دن اس نے حرا بھابی کو کچن کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کسی گہری

سوچ میں گم پایا۔

''تمہیں پتا ہے کہ نوریہ گھر چھوڑ کر چلی گئی......'' حرا بھابی نے اس کے سر پر بم ہی تو پھوڑا تھا۔

''کیا......؟'' اس نے دہل کر حرا بھابی کا انتہائی سنجیدہ چہرہ دیکھا۔ ''الماس ممانی کا بی پی شوٹ کر گیا ہے انہیں اسپتال لے کر گئے ہیں ماموں......''

''لیکن، ایسا کیسے ممکن ہے......؟'' اس کے منہ سے پھسلا۔ ''وہ کیسے اکیلے گھر چھوڑ کر جا سکتی ہے......؟''

''تو وہ اکیلے تھوڑی گئی ہے......'' حرا بھابی کے اگلے انکشاف نے شرزمہ کو مزید بوکھلا دیا۔

''کیا مطلب ہے، آپ کا......؟''

''اس نے اور ارسلان نے کورٹ میرج کر کے باقاعدہ پلاننگ سے گھر چھوڑا ہے......'' ان کے چہرے پر گہرے دکھ کا سایہ تھا۔

''اوہ، آئی سی......'' شرزمہ کے اندر کہیں دور تک سکون کی لہریں ابھریں۔ ''آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ ایسے کہیں ناں کہ وہ دونوں گئے ہیں۔'' شرزمہ نے مطمئن ہو کر ساس پین میں پانی ڈالا اور چائے کے لیے چولھے پر رکھ دیا۔ حرا بھابی نے الجھ کر اس کا چہرہ دیکھا۔

''تمہیں افسوس نہیں ہوا......؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہرگز نہیں......'' شرزمہ نے برنر آن کرتے ہوئے انہیں مزید حیران کیا۔ ''انہیں ایسا قدم بہت پہلے ہی اٹھا لینا چاہیے تھا......''

''اگر تم اس گھر میں پہلے آ جاتیں تو شاید وہ یہ گھٹیا حرکت پہلے ہی کر جاتے......'' عطیہ آنٹی اچانک ہی کچن میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے شاید نہیں یقیناً شرزمہ کی باتیں سن لی تھیں۔ جو انہیں سخت ناگوار گزری تھیں جبھی ان کے چہرے پر پھیلا تنفر شرزمہ کو بوکھلانے پر مجبور کر گیا۔

''آنٹی میرا مطلب یہ نہیں تھا......'' اس نے صفائی دینے کی کوشش کی۔

''تمہارا مطلب جو بھی ہو............'' انہوں نے فوراً ہی اس کی بات قطع کی۔ ''اپنی بے حیا، بے شرم اور کمزور کردار کی حامل دوست سے بات ہو تو میرا پیغام اسے دے دینا کہ میری زندگی میں تو ارجمند ولا کے دروازے اس کے لیے نہیں کھل سکتے، میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی......'' وہ ناک کے نتھنے پھلائے اتنی بلند آواز سے چیخیں کہ سارے ہی لوگ اپنے اپنے کمروں سے نکل آئے۔

''گھٹیا عورت کی گھٹیا بیٹی، میرے اتنے لائق فائق بیٹے کو ورغلا کر لے گئی، گندا خون......'' عطیہ آنٹی اپنے حواسوں میں کہاں تھیں۔

''منہ سنبھال کر بات کرو عطیہ......'' انکل فہیم نے انگلی اٹھا کر اشارہ کیا۔

''کیوں بات کروں میں منہ سنبھال کر، آپ کے بھائی کی ساری اولاد کی رگوں میں ہی گندا خون تھا، پہلے بڑی والی نے کسی کے عشق میں خودکشی کی اور دوسری میرے بیٹے کو بھگا کر لے گئی۔'' عطیہ خاتون کسی جاہل خاتون کی طرح چیخ رہی تھیں۔

''میرے بھائی کی اولاد کی رگوں میں اگر گندا خون تھا تو تمہارا خون کون سا نیک تھا۔ کیوں اٹھایا تمہارے بیٹے نے ایسا قدم......؟'' انکل فہیم ان سے زیادہ بلند آواز میں دہاڑے۔

''کیا ہو گیا ہے فہیم ماموں آپ کو......'' شامی نے انہیں بازو سے پکڑ کر اندر لے جانا چاہا۔

''ساری زندگی ان دونوں عورتوں نے اپنی جھوٹی انا کے لیے ہم دونوں بھائیوں کا سکون غارت کیے رکھا۔ نیچے والی اگر پڑھی لکھی جاہل تھیں تو یہ اوپر والی ان سے بڑی مکار اور سازشی۔'' انکل فہیم کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ ان کی آنکھوں سے نکلنے والے شعلوں نے عطیہ آنٹی کی قوتِ گویائی سلب کر لی تھی۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں پہلی دفعہ فہیم

صاحب کو اس لہجے میں بولتے دیکھا تھا۔

''بہو، تم چلو اندر۔ اور فہیم اب ایک لفظ بھی مزید مت بولنا......'' ارجمند خاتون کی رعب دار آواز پر بھی نے پلٹ کر دیکھا۔ اپنے پیچھے ارجمند خاتون کے ساتھ ابراہیم صاحب کو دیکھ کر عطیہ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شرزمہ دم بخود سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ پورے گھر پر ایک بھونچال سا طاری تھا۔

☆☆☆

''عیرہ آپی، الماس آنٹی کی طبیعت اب کیسی ہے......؟'' وہ اس دن دبے پاؤں نیچے اتر کر آئی تو نچلے پورشن میں بھی ہُو کا عالم تھا۔ رومیصہ اپنی بیٹی کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی ہوئی تھیں۔ سامنے ہی لاؤنج میں عیرہ کوئی جرنل کھولے انتہائی سنجیدہ انداز سے بیٹھی ہوئی تھی۔

''ماما، ٹھیک نہیں ہیں......'' اس نے چونک کر دروازے میں کھڑی شرزمہ کو دیکھا اور مختصراً بولی۔

''کیا میں ان کو ایک نظر دیکھ لوں......؟'' اس نے تھوڑا سا جھجک کر کہا، عیرہ کے چہرے پر تذبذب کے آثار ابھرے۔ کچھ لمحے سوچنے کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آؤ، میں لے چلتی ہوں تمہیں، ان کے پاس......''

''ماما......'' عیرہ نے ان کے بیڈ روم کے دروازے میں کھڑے ہو کر ہلکی آواز میں پکارا۔ کمرے میں ملگجا سا اندھیرا تھا۔ اپنے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے الماس بیگم کو دیکھ کر شرزمہ کو دھچکا سا لگا۔ صرف چار دنوں میں ان کی حالت عجیب سی ہو گئی تھی۔ سلوٹ زدہ سوٹ، سوجی ہوئی وحشت زدہ آنکھیں، پپوٹے ابھرے ہوئے، خشک ہونٹ اور بے تاثر چہرہ، شرزمہ کو ان کی حالت دیکھ کر افسوس ہوا۔

''ماما، شرزمہ آپ سے ملنے آئی ہے......'' عیرہ کی آواز پر انہوں نے اپنے دائیں طرف سر موڑ کر دیکھا، وہ ہلکا سا چونکیں۔

''جویریہ......؟'' وہ زیرِ لب بڑبڑائیں۔

''ماما جیا نہیں شرزمہ ہے یہ......'' عیرہ نے ہلکی سی ناگواری سے کہا۔ شرزمہ تھوڑا سا چل کر ان کے پاس آئی۔

''تمہاری آنکھیں بالکل جیا جیسی ہیں......'' وہ کسی خواب کے زیرِ اثر بولیں۔ شرزمہ ان کے بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔

''تم جیا ہو ناں، اپنی ماما سے ناراض ہو ناں......'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بے اختیاری کی کیفیت میں بولیں۔ شرزمہ کو ان کے ہاتھ کا لمس سرد اور بے جان سا محسوس ہوا۔

''آنٹی میں بھی تو آپ کی جیا کی طرح ہی ہوں......'' شرزمہ کو ان کی حالت دیکھ کر شدید دکھ ہوا۔ وہ آج اس الماس بیگم سے بالکل مختلف دکھائی دے رہی تھیں جنہیں اس نے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ شان و شوکت اور رعب آج ان کی شخصیت سے ناپید تھا۔

''تم بھی جیا کی طرح مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی......؟'' ان کی آنکھوں سے آنسو پھسلے۔

''کیا ہو گیا ہے ماما، یہ جیا نہیں شرزمہ ہے، حسن رضا چچا کی بیٹی......'' عیرہ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ شاید ذہنی طور پر بالکل ہی غیر حاضر تھیں۔

''مجھے پتا ہے یہ میری جیا ہی ہے......'' ان کے لہجے میں عجیب سی بچگانہ ضد محسوس کر کے شرزمہ نے فوراً ہی انہیں تسلی دی۔

''جی آنٹی میں آپ کی جیا ہی ہوں......''

شرزمہ اور عیرہ اگلے ایک گھنٹے تک انہی کے پاس بیٹھی رہیں۔ پھر انہیں میڈیسن دے کر وہ باہر آئیں تو سامنے ہی ابراہیم صاحب بڑے تھکے تھکے انداز میں بیٹھے تھے۔ عیرہ کے ساتھ شرزمہ کو دیکھ کر وہ چونکے۔

''کیسی طبیعت ہے تمہاری ماما کی......؟''

انہوں نے فکر مندی سے پوچھا۔
''پاپا، آپ ماما کو کسی سائیکا ٹرسٹ کو دکھائیں ان کی ذہنی حالت مجھے کچھ بہتر نہیں لگ رہی......'' عبیرہ نے پریشانی سے کہا۔
''کیا مطلب......؟'' تو وہ فوراً بولے۔
''وہ اب شرزمہ کو جیا سمجھ رہی ہیں......'' عبیرہ نے شرمندگی سے کہا۔
''اٹس او کے بیٹا......!'' ابراہیم صاحب رنجیدہ سے انداز میں مسکرائے۔ ''جویریہ کے انتقال کے بعد پہلی دفعہ تو وہ اس کا اس انداز سے نام لے رہی ہیں، انہیں پہلی دفعہ اپنی بیٹی کا دکھ محسوس ہو رہا ہے، ورنہ اس سے پہلے تو انہیں صرف جگ ہنسائی کا خوف ستاتا تھا......''
''پھر بھی پاپا، میں نے ماما کو کبھی ایسی حالت میں نہیں دیکھا......'' وہ دونوں ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئیں۔
''ڈونٹ ٹیک ٹینشن بیٹا، زندگی میں پہلی دفعہ تو انہوں نے پرنسپل کے بجائے ماں بن کر اپنی اولاد کا دکھ محسوس کرنا شروع کیا ہے......'' ابراہیم صاحب تھوڑا سا تلخ ہوئے۔
''نویرہ کا کچھ پتا چلا......؟'' عبیرہ نے بات بدلنے کی غرض سے پوچھا۔
''اس نے کہاں جانا تھا، دونوں جہلم میں ہیں۔ ارسلان کا فون آیا تھا مجھے......'' ابراہیم صاحب کی بات پر وہ دونوں ہی بے ساختہ چونکیں۔
''ارسلان کا......کیا کہہ رہا تھا؟'' عبیرہ نے ناگواری سے پوچھا۔
''کچھ نہیں، معافی مانگ رہا تھا......'' انہوں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر اذیت کے گہرے احساس کے ساتھ آنکھیں بند کیں۔
''پھر، آپ نے کیا کہا......؟'' عبیرہ نے عجلت بھرے انداز میں پوچھا۔
''میں نے کیا کہنا تھا بیٹا......'' ابراہیم صاحب نے ایک لمبی سانس لی۔ ''یہی کہا کہ بیٹا اپنی عزت تم لوگوں کے ہاتھ دے بیٹھے ہیں، اب تم لوگوں کی مرضی جیسے بھی ہماری پگڑیاں اچھالو۔'' ابراہیم صاحب نے پہلی دفعہ اپنے دکھ کا اظہار کیا، ورنہ نویرہ کے جانے کے بعد وہ بالکل خاموش تھے۔
''وہ واپس آنا چاہ رہا تھا......'' انہوں نے ایک اور انکشاف کیا۔ ''اس کا کہنا تھا کہ اگر اس کے والدین باقاعدہ طور پر اس کی اور نویرہ کی شادی کر دیں تو وہ دونوں واپس آنے کو تیار ہیں۔''
''دماغ ٹھیک ہے اس کا......'' عبیرہ ایک دم مشتعل ہوئی۔
''میرے خیال میں تو انکل اس میں کوئی مضائقہ نہیں، ابھی بات گھر سے نکلی نہیں، اگر ایسا کر لیا جائے تو ان حالات میں یہ مناسب ہوگا......'' شرزمہ کا تحمل بھرا انداز ابراہیم صاحب کو سوچ میں مبتلا کر گیا جبکہ عبیرہ نے کوفت سے پہلو بدلا اسے شرزمہ کا مشورہ بالکل پسند نہیں آیا تھا۔
''میرے خیال میں تو اس میں کوئی حرج نہیں......'' رومیصہ آنٹی جو ابھی ابھی اندر داخل ہوئی تھیں انہوں نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔
''رومی خالہ، آپ کو ماما اور عطیہ آنٹی کا پتا نہیں ہے کیا، وہ دونوں ہی طوفان کھڑا کر دیں گی۔'' عبیرہ نے کوفت بھرے انداز میں اپنے بالکل سامنے بڑے پُراعتماد انداز سے کھڑی خالہ کو دیکھا۔
''اگر آپی یا عطیہ بھابی کا دماغ خراب ہے تو کیا ضروری ہے کہ باقی خاندان بھی ہوش و حواس کھو بیٹھے......'' ان کی بات نے اندر داخل ہوتی ارجمند خاتون اور فہیم صاحب کو سخت حیران کیا۔
''ساری زندگی آپی اور عطیہ بھابی نے دنیا کو تماشا دکھانے کے سوا کیا ہی کیا ہے......؟'' انہوں نے کڑی نظروں سے عبیرہ کو دیکھا جو اُن کے اس

انداز پر بوکھلا سی گئی۔
''اس گھر میں اور بھی بچیاں ہیں، اگر یہی حالات رہے تو ان کے رشتوں کے لیے کون آئے گا......؟'' رومی خالہ کے تیور سبھی کے لیے انتہائی عجیب تھے۔
''مثلاً کون سی لڑکیاں......؟'' عبیرہ نے طنزیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔
''رضا کی دو بیٹیاں، انعم اور شرزمہ اور تم بھی تو ہو......'' رومیصہ خالہ کی بات نے سبھی کو دم بخود کیا۔
''تمہاری رومی خالہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں عبیرہ۔'' ارجمند خاتون نے صوفے پر تھکے تھکے انداز سے بیٹھتے ہوئے ان کی تائید کی۔
''معاف کیجیے گا اماں، میں عبیرہ کی صرف خالہ ہی نہیں چچی بھی ہوں کبھی مجھے بھی اس گھر میں رضا کے حوالے سے پکار لیا کریں......'' رومی خالہ کے پُراعتماد انداز نے ارجمند خاتون کے چھکے چھڑائے، ابراہیم صاحب اور فہیم صاحب کو ان کا انداز اچھا لگا، عبیرہ اور شرزمہ نے انہیں بے یقینی سے دیکھا جو اپنی بات کہہ کر رکی نہیں اور کچن کی طرف بڑھ گئیں۔
''بہو، ایک گلاس پانی بھجوانا، میرے لیے......'' ارجمند خاتون کے منہ سے بلا ارادہ پھسلا۔ رومیصہ نے مڑ کر حیرت سے انہیں دیکھا۔
''شکر ہے ماما، آپ نے بھی زندگی گزارنے کا انداز سیکھا......'' شرزمہ ان کے پیچھے آ کر ایک دم ہی بولی۔ انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''مجھے ماما کہنے سے منع مت کیجیے گا......'' ان کے بولنے سے پہلے ہی شرزمہ نے ہاتھ اٹھا کر انہیں اطلاع دینے کے انداز میں بتایا اور فریج سے پانی کی بوتل نکالی۔ رومیصہ اس کی بات پر ہلکا سا مسکرائیں۔

☆☆☆

''یہ شامی کو انعم سے شادی کرنے کا مشورہ تم نے کس خوشی میں دیا ہے......؟'' اس دن غیر متوقع طور پر ہی نویرہ کی اس کے سیل فون پر کال آ گئی۔
''ارسلان کو تم سے شادی کرنے کا اور ہمت دلانے کا فریضہ بھی میں نے ہی انجام دیا تھا، اس پر تو تمہیں اعتراض نہیں ہوا......'' شرزمہ اپنا سیل فون کان سے لگائے لان کی طرف نکل آئی۔ نویرہ کی کھنکتی آواز اسے اچھی لگی۔
''وہ تو مجھ سے محبت کرتا تھا بس تھوڑی سی جرأت کی کمی تھی......'' نویرہ نے شوخی سے جواب دیا۔
''کتنے گھٹیا نکلے تم دونوں، مجھے بھی بتانا مناسب نہیں سمجھا......'' شرزمہ کو اچانک ہی اپنا دکھ یاد آیا تو فوراً ہی گلہ کر بیٹھی جبکہ دوسری جانب وہ اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنسی۔
''ہم نے سوچا کہ زبانی دعوے بہت ہو گئے،

غزل

آؤ احساسِ تازہ کی اب بات کریں
بسر خوشبوؤں میں جیون کی رات کریں

چاندنی کے سفر میں ہو تمہی ہم سفر
کاشت صحنِ دل میں کچھ خواہشات کریں

تُو سامنے ہو اگر تو جھکتی نہیں نگاہیں
ایسے عالم میں کیسے ہم مناجات کریں

بھیگی بھیگی اوس میں پون کہتی ہے
چلو آج ہی ہم اقرار کی برسات کریں

چلتے چلتے ٹھہر گئے ساعتِ بے خودی پہ ہم
پھول پھول سپنوں کو یونہی کائنات کریں

پہلے باندھیں بندھن کو عہدِ وفا کی ڈور سے
پھر اپنے یقین و پیار سے ہر کسی کو مات کریں

مرسلہ: صدف جاوید قریشی، ہری پور ہزارہ

اب عملی قدم اٹھا کر ہی دنیا کو بتائیں گے......'' نویرہ نے شرارت بھرے انداز میں کہا۔

''ہوں، مطلب نکل جانے کے بعد اب تم مجھے بھی دنیا والوں میں ہی شامل کرو گی......'' شرزمہ نے مصنوعی خفگی سے جتایا تو وہ بے ساختہ ہنس دی۔

''تمہارا احسان تو میں اپنے بیٹے کی تمہاری بیٹی کے ساتھ شادی کر کے اتار دوں گی، اس لیے زیادہ گلے شکوے کرنے کی ضرورت نہیں......'' اس نے خوشگوار لہجے میں چھیڑا۔

''سوری، میں اپنی بیٹی کا رشتہ تم لوگوں کو کبھی نہیں دوں گی......'' اس نے صاف انکار کیا۔ ''تمہارا بیٹا بھی اپنے باپ کی طرح بزدل اور کم ہمت ہوگا......'' شرزمہ نے بھی شرارتی انداز میں جواب دیا تو وہ ایک دفعہ پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔

''خیر اب تو بزدلی اور کم ہمتی کے طعنے نہ دو تم میرے میاں کو، آگ کا دریا پار کر کے مجھ سے شادی کی ہے اس نے......'' نویرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بیٹا، حالات سے فرار بھی ایک طرح کی بزدلی ہی ہوتی ہے، مزہ تو تب تھا جب یہاں رہ کر سارے محاذوں پر لڑتا اور ڈنکے کی چوٹ پر شادی کر کے لے کر جاتا۔'' شرزمہ کے شریر انداز پر وہ ایک دم ہی چپ ہوئی۔

''ہاں یار! کی تو میں نے اور ارسلان نے غلط حرکت ہے لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا......'' وہ تھوڑا سا افسردہ ہوئی۔

''اچھا، اچھا، زیادہ ملکۂ جذبات بننے کی ضرورت نہیں، یہ بتاؤ کہ کیسی ہو......؟'' شرزمہ نے بات کا رخ بدلا۔

''میں ٹھیک ہوں یار، شامی کا فون آیا تھا، بہت دکھی تھا وہ......'' نویرہ کو اچانک یاد آیا کہ اس نے کس مقصد کے لیے فون کیا تھا۔

''شامی کا تم لوگوں سے رابطہ ہے......؟''

شرزمہ حیران ہوئی۔ ''اس نے ذکر تو نہیں کیا......''

''اس نے ذکر کر کے مرنا تھا کیا، میرے نکاح نامے میں ایک گواہ کے طور پر اس کے بھی دستخط ہیں......'' نویرہ کی اطلاع نے شرزمہ کو خوشگوار حیرت میں مبتلا کیا۔

''اوہ مائی گاڈ، کتنے بڑے ڈرامے ہو تم لوگ......'' شرزمہ کھلکھلا کر ہنسی۔

''تم حیران بعد میں ہونا، یہ بتاؤ کہ تم نے اسے انعم سے شادی کرنے کا مشورہ کیوں دیا جبکہ وہ تمہیں پسند کرتا ہے......'' نویرہ نے اس سے پوچھا۔

''اس کے پسند کرنے سے کیا ہوتا ہے، وہ تو جیا آپی کو بھی پسند کرتا تھا......'' شرزمہ نے اس کی بات کو چٹکیوں میں اڑایا۔

''پھر بھی شرزمہ، وہ بیچارہ بہت اپ سیٹ تھا......'' نویرہ سنجیدہ ہوئی۔

''لیکن اس کی بات مان کر میں اپنی بہن کو ساری زندگی کے لیے اپ سیٹ نہیں کر سکتی......'' شرزمہ کی اطلاع پر دوسری جانب نویرہ کو دھچکا لگا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا......؟''

''مطلب یہ ہے کہ میری معصوم سی بہن کی آنکھوں میں اس شخص کے سپنے نہ جانے کب سے ہیں جبکہ میں نے اس حوالے سے اس کے لیے کبھی نہیں سوچا اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ میرے اندر دلچسپی صرف اس بنا پر لے رہا ہے کیونکہ میری شکل جیا آپی سے ملتی ہے......'' وہ لان چیئر پر بیٹھ کر بڑے تفصیلی انداز میں گویا ہوئی۔ ''جبکہ انعم نے زندگی میں کوئی خوشی نہیں دیکھی، مجھے اپنی بہن بہت عزیز ہے، میں اسے، اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی دینا چاہتی ہوں......'' شرزمہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''لیکن شیری، ایسے کیسے ہو سکتا ہے......؟'' نویرہ نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ کوئی ایسی ناممکن بات بھی نہیں، اچھی خاصی

تو ہے انعم......'' شرزمہ نے فوراً ہی کہا۔ اس کے لہجے میں چھپی انعم کے لیے محبت، کم از کم نویرہ کے لیے حیرت کا باعث بنی۔

''اچھا......!'' وہ تھوڑا سا تذبذب کا شکار ہوئی۔

''تم بات کرو ناں اس سے......'' شرزمہ کی فرمائش پر اس نے سر ہلایا۔

''ہاں کروں گی، تم یہ بتاؤ کہ ماما کیسی ہیں......؟'' نویرہ نے تھوڑا سا جھجک کر پوچھا۔

''ویسی ہی ہیں، جیسا کہ ایک ماں کو اس سچویشن میں ہونا چاہیے......'' شرزمہ کی بات پر وہ شرمندہ ہوئی۔

''میری پاپا سے بات ہوئی تھی انہوں نے مجھے بتایا تو مجھے یقین نہیں آیا کیونکہ ماما کبھی ایسی نہیں تھیں......'' نویرہ نے افسردگی سے کہا۔

''یار تم لوگ یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ وہ بھی انسان ہیں، ٹوٹ سکتی ہیں، جھک سکتی ہیں، انہیں بھی تکلیف کا احساس ہوتا ہے......'' شرزمہ نے صاف گوئی سے کہا۔

''اصل میں ہم نے کبھی انہیں اس روپ میں دیکھا نہیں، اس لیے ذہن کو قبول کرنے میں تھوڑا وقت تو لگے گا ناں......'' نویرہ نے کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''کیا، کہا ابراہیم انکل نے......؟'' شرزمہ کو اچانک یاد آیا۔

''پاپا اور فہیم چچا آئے تھے ہمیں ملنے......'' نویرہ کی اطلاع اس کے لیے حیران کن تھی۔ ''انہوں نے کہا کہ دونوں خواتین کو تھوڑا وقت لگے گا لیکن ہمیں دونوں سے آکر معافی مانگنا ہوگی۔''

''پھر...... کیا سوچا تم لوگوں نے......؟'' شرزمہ نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہم لوگ جلد ہی آئیں گے......'' نویرہ کے فیصلے نے اسے خوشی کا احساس بخشا۔ اس نے مطمئن ہو کر سامنے پھول پر بیٹھی ایک خوب صورت تتلی کو دیکھا۔ ایسی ہی محبت کی ایک تتلی انعم کی زندگی میں بھی آنے والی تھی۔

☆☆☆

''تم نے میری بیٹی کے اوپر جو احسان کیا ہے، اس کا بدلہ میں ساری زندگی نہیں اتار سکتی......'' رومیصہ آنٹی نے اس دن اچانک ہی اسے مخاطب کیا تو وہ حیران رہ گئی۔

''میں نے تو کوئی احسان نہیں کیا......'' شرزمہ جو نوڈلز بنانے کے لیے کیبنٹ سے پیکٹ نکال رہی تھی اس نے مڑ کر کہا۔

''آج شفق آپا کی امریکا سے کال آئی تھی، انہوں نے شامی کے لیے انعم کی بات کی ہے......'' رومیصہ کے لہجے سے جھلکتی خوشی شرزمہ کو اچھی لگی۔

''یہ تو اچھی بات ہے ماما......'' اس نے پتیلی میں پانی ڈالتے ہوئے سادگی سے کہا۔

''مجھے معلوم ہے کہ احتشام کو اس رشتے کے لیے تم نے راضی کیا ہے......'' ان کی سنجیدہ آواز پر شرزمہ نے جھٹکے سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

''آپ سے کس نے کہا......؟''

''میں نے دو دن پہلے تمہاری اور نویرہ کی گفتگو سن لی تھی جو تم لان میں بیٹھی کر رہی تھیں......'' انہوں نے اس کے ہاتھ سے پتیلی لیتے ہوئے انکشاف کیا۔ شرزمہ ہڑبڑا سی گئی۔

''سچ مانو تو میرے لیے تمہاری گفتگو بہت حیران کن تھی، تم بہت اچھی لڑکی ہو، تمہارے والدین نے تمہاری بہت اچھی تربیت کی ہے......'' رومیصہ حد درجہ مشکور تھیں۔

''کم آن ماما، انعم میری بہن ہے، آپ یہ بات کیوں بھول جاتی ہیں......'' شرزمہ نے ان کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے یاد دلایا تو وہ مسکرا دیں۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اللہ میری بیٹی کا

اتنا اچھا سبب بنا دے گا......'' وہ ابھی تک خوشگوار سی بے یقینی میں مبتلا تھیں۔

''انشاء اللہ، انعم کی قسمت بہت اچھی ہوگی......'' شرزمہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر یقین دلایا۔ ''شامی بہت اچھا لڑکا ہے......''

''مجھے معلوم ہے......'' وہ کھل کر مسکرائیں۔

''شرزمہ تمہاری کال ہے لینڈ لائن نمبر پر، کوئی پروفیسر آفاق ہیں......'' عبیرہ نے کچن میں جھانک کر اطلاع دی تو وہ چونک گئی۔

''پروفیسر آفاق......'' اس نے کھوجتی نگاہوں سے عبیرہ کا چہرہ جانچا، اس پر شناسائی کا کوئی رنگ نہ پاکر مطمئن ہوئی۔ جیسے ہی اس نے ریسیور کان سے لگایا دوسری جانب پروفیسر صاحب بے تابی سے بولے۔

''آپ کل ''الجنت'' آ سکتی ہیں......؟''

پروفیسر آفاق کی بات نے شرزمہ کو حیران کیا۔

''آپ نے پی ٹی سی ایل نمبر پر کال کیوں کی ہے......؟'' اس نے فوراً ہی پوچھا۔

''آپ سیل فون اٹینڈ جو نہیں کر رہی تھیں......'' انہوں نے سنجیدگی سے جواب دیا تو شرزمہ کو یاد آیا کہ اس کا سیل فون تو بیڈ روم میں پڑا ہے۔

''آپ کو یہ نمبر کس نے بتایا......؟'' اس کے بچگانہ سوال پر پروفیسر صاحب مسکرائے۔

''جویریہ کے گھر کے تمام نمبر ابھی تک میرے دل پر تحریر ہیں......'' ان کے افسردہ لہجے پر شرزمہ فوراً خفت زدہ ہوئی۔

''اوکے، میں کل شام کو آجاؤں گی......'' اس نے ابراہیم انکل کو لاؤنج میں آتے دیکھ کر فوراً ریسیور کریڈل پر رکھا اور کمرے سے نکل گئی۔

شام کو وہ رومیصہ کو اپنی ایک دوست کے گھر جانے کا کہہ کر نکل آئی۔ آسمان آج سارے کا سارا گرد آلود تھا۔ موسم بدل رہا تھا اور درختوں کے زرد پتے گلیوں میں اڑتے پھرتے تھے۔ الجنت کا گیٹ ہمیشہ کی طرح کھلا ہوا تھا۔ لان کی شادابی کو بھی شاید خزاں کی نظر لگ گئی تھی۔

''میرا دل کہہ رہا تھا کہ آپ آ گئی ہیں......'' دروازہ کھول کر پروفیسر آفاق اسی وقت باہر نکلے۔

''آپ کے دل نے درست سگنل کب سے دینے شروع کر دیے......؟'' شرزمہ نے ہلکے پھلکے لہجے میں انہیں چھیڑا۔

''جب سے آپ نے الجنت کو چھوڑا ہے، تب سے......'' انہوں نے بھی اسی کے انداز میں جواب دے کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ دونوں لان میں ہی بیٹھ گئے تھے۔ اسی لمحے مانو بلی لپکتی ہوئی اس کی جانب آئی اس نے شرزمہ کو پہچان لیا تھا اور اب خوشی سے اس کے قدموں میں لوٹ رہی تھی۔

''ہنی آتی ہیں یہاں......؟'' اس گھر میں آتے ہی ہانیہ کی یاد نے اس کا دامن پکڑا۔ اس لیے وہ ان کے بارے میں پوچھنے سے خود کو روک نہیں پائی۔

''ایک دو دفعہ ہی آئی تھیں، اب تو وہ اسپین واپس چلی گئی ہیں۔'' پروفیسر آفاق کی بات نے اسے جی بھر کر حیران کیا۔

''کیا اسپین......؟ لیکن کیوں......؟ اور اسود بھی ساتھ گیا ہے کیا......؟'' اس نے ایک ہی سانس میں تین سوال کیے۔

''اسود تو سان فرانسسکو چلا گیا اپنے والدین کے پاس......'' پروفیسر صاحب نے ایک دفعہ پھر اسے تعجب میں مبتلا کیا۔

''لیکن ہانیہ......؟'' شرزمہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس طرح سے پوچھے۔ اس کی آنکھوں میں سمٹے استعجاب سے نظریں چراتے ہوئے وہ آہستگی سے بولے۔

''جو لوگ دل کی بساط پر ہمیشہ اپنے مطلب کی چال کھیلنا چاہتے ہیں ضروری نہیں ہوتا کہ ہر دفعہ اُن کے حصے میں جیت ہی آئے......''

''مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں......؟'' وہ ہانیہ کے واپس چلے جانے کی اطلاع پر ایک دم ہی پریشان ہوئی۔

''اصل میں اسود کی ماما، ان دونوں کے رشتے کے لیے مانی نہیں اور اسود ان کی رضامندی کے خلاف کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا......'' پروفیسر صاحب نے اصل بات کی جانب آتے ہوئے تمہید باندھی۔ شرزمہ نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

''انہی دنوں اسود کی تمہارے فاروق انکل سے ملاقات ہوگئی جو ہانیہ کی اصلیت سے بخوبی واقف تھے، انہوں نے اسود کو بتایا کہ ہانیہ آپ کے پاپا حسن رضا کو پسند کرتی تھیں جبکہ حسن رضا، آپ کی ماما پر فریفتہ تھے، دونوں کی شادی تو ہوگئی لیکن ہانیہ نے ہمیشہ انہیں ایک دوسرے کے خلاف بھڑکائے رکھا۔ وہ دونوں کو پمپ کرتی تھیں جس کے نتیجے میں آپ کے والدین کے درمیان ناچاقیاں بڑھتی گئیں۔ حتیٰ کہ ایک حادثے میں دونوں کا انتقال ہو گیا......'' پروفیسر آفاق کی بات پر شرزمہ نے برا سا منہ بنایا۔

''انکل فاروق کو کیا پڑی تھی کہ وہ گڑے مُردے اکھاڑتے پھریں، ایسی صورت میں جب انہیں پتا تھا کہ اسود اور ہانیہ کے درمیان کیا چل رہا ہے۔'' شرزمہ کو غصہ آیا تو پروفیسر آفاق حیران ہوئے۔

''آپ عجیب لڑکی ہیں، انہوں نے آپ کے والدین کی زندگی کو مشکل بنائے رکھا اور پھر آپ کے خلاف بھی زہر اگلتی رہیں لیکن آپ پھر بھی ان کی طرفداری کر رہی ہیں؟''

''ماما اور پاپا تو چلے گئے وہ اب کبھی واپس نہیں آئیں گے جبکہ میرے خلاف اگر وہ بولتی تھیں تو مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن انکل فاروق نے ان کے مستقبل کو خراب کر کے اچھا نہیں کیا......'' شرزمہ کی بات پر پروفیسر آفاق کافی دیر تک تو بول ہی نہ سکے۔

''اور جو اسود کی زندگی خراب ہونے جا رہی تھی وہ......؟'' انہوں نے اچانک پوچھا۔

''اسود کوئی بچہ نہیں تھا اس نے سوچ سمجھ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہوگا اور ویسے بھی ہنی اتنی بھی بری نہیں تھیں......'' شرزمہ کی سادگی پروفیسر آفاق کو قدم قدم پر تعجب میں مبتلا کر رہی تھی۔

''وہ بری نہیں حد درجہ خود غرض اور خود پرست خاتون تھیں، ایسے لوگ نہ کبھی خود خوش ہوتے ہیں اور نہ دوسروں کو ہونے دیتے ہیں۔'' پروفیسر صاحب تیز لہجے میں بولے۔

''ضروری نہیں ہوتا کہ ہمیشہ ایسا ہی ہو، انسان کو مثبت انداز میں سوچنا چاہیے......'' اس کی خوش گمانی عروج پر تھی۔

''آپ کو پتا ہے کہ اسود آپ کو پسند کرتا تھا......'' پروفیسر صاحب نے عجیب سے لہجے میں اچانک ہی کہا۔

''ہاں پتا تھا......'' شرزمہ نے بے نیازی سے کہا۔ ''اور یہ بھی پتا تھا کہ ہنی اسے پسند کرتی تھیں......'' اس کے جواب نے پروفیسر آفاق کو چونکا دیا۔

''آپ کو اس چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا......'' ان کی حیرانی کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

''مجھے اس چیز سے تب فرق پڑتا، اگر میں بھی اسود کو پسند کرتی یا میری اس کے ساتھ کوئی کمٹمنٹ ہوتی......'' اس کے لہجے کی سچائی نے پروفیسر آفاق کو مطمئن کیا۔ وہ بالکل ہی خاموش ہوگئے۔ شرزمہ بے خیالی میں مانو بلی کو دیکھنے لگی جو اپنی کرنجی آنکھیں شرزمہ پر جمائے ہوئے تھی۔

''آپ نے مجھے اس دن وہ ٹیکسٹ کیوں کیا تھا......؟'' شرزمہ کو اچانک یاد آیا۔

''کون سا......؟'' انہوں نے بے دھیانی میں پوچھا۔

''یہی کہ الجنت کے دروازے میرے لیے

ہمیشہ کُھلے رہیں گے......'' شرزمہ انہیں نظریں چراتے دیکھ کر زیرلب مسکرائی۔

''پتانہیں......'' ان کے انداز میں افسردگی کا عنصر نمایاں ہوا۔ بلیک پینٹ پر گرے شرٹ پہنے وہ ہمیشہ کی طرح بہت گریس فل لگ رہے تھے۔ شرزمہ کو نہ جانے کیوں ان کی شخصیت کسی گھنے شجرِ سایہ دار کے مانند لگتی تھی۔

''آپ حقیقت کو مان کر اپنی اور میری زندگی آسان کیوں نہیں کر لیتے......'' شرزمہ نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے پُراعتماد انداز میں کہا۔ وہ چونک گئے۔

''کون سی حقیقت......؟'' ان کے منہ سے بلا ارادہ پھسلا۔

''یہ ہی کہ آپ اور میں دو ایسے فرد ہیں جن کو تقدیر نے ان کی جنت سے نکال کر ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا ہے تاکہ ہم اپنی اپنی گمشدہ جنت کو دوبارہ پا سکیں......'' شرزمہ کا لہجہ ہی نہیں آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔

''جو چیزیں گم ہو جائیں، وہ کہاں ملتی ہیں......'' انہوں نے اس لڑکی کے شفاف چہرے سے بہت مشکل سے اپنی نگاہیں ہٹائیں۔

''انسان کی نیت صاف ہو اور ڈھونڈنے کی لگن ہو تو گمشدہ چیزیں اپنے مقام پر دوبارہ مل جاتی ہیں جہاں ہم انہیں کھو چکے ہوتے ہیں......'' شرزمہ کی آنکھوں میں مچلتے دیے پروفیسر آفاق کی زندگی کے اندھیروں کو کم کر رہے تھے۔

''میں ایسا خوش قسمت کہاں......؟'' وہ حد درجہ بے یقین ہوئے۔

''لیکن مجھے تو اپنی خوش قسمتی پر کوئی شک نہیں......'' شرزمہ اس دفعہ کھل کر مسکرائی۔ انہوں نے گڑبڑا کر اپنے سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھا جو ہمیشہ ہی انہیں اپنے دل کے بہت قریب محسوس ہوئی تھی۔

''میں جیا آپی نہ سہی، ان کے جیسی تھوڑی بہت تو ہوں ناں، الجنت کو کچھ نہ کچھ سنوار سکتی ہوں......'' اعتراف کا لمحہ آچکا تھا۔ پروفیسر آفاق نے بڑی گہری نظروں سے اس کی پلکوں کو مرتعش ہوتے دیکھا۔

''آپ کو اپنا اور میرا ایج ڈیفرنس معلوم ہے؟ پورے سترہ، اٹھارہ سال چھوٹی ہیں آپ مجھ سے......'' پروفیسر آفاق نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

''آپ جسمانی عمر کی نہیں، ذہنی عمر کی بات کریں مجھ سے......'' شرزمہ کا شریر انداز انہیں اچھا لگا۔

''ذہنی عمر میں تو آپ مجھ سے شاید دو چار سال بڑی ہی ہوں......'' انہوں نے کھل کر مسکراتے ہوئے اعتراف کیا۔

''پھر ایسے فضول دلائل دینے کے بجائے وہ بات کریں جو آپ کو اس موقع پر کرنی چاہیے......'' شرزمہ نے انہیں ایک دفعہ پھر چھیڑا۔

''مجھے لگتا ہے کہ میں دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہوں جسے دنیا میں ہی اپنی جنت حاصل کرنے کا موقع مل رہا ہے......'' پروفیسر آفاق نے اپنے سامنے بیٹھی اس دلکش لڑکی کو پہلی دفعہ بڑی استحقاق بھری نظروں سے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں محبتوں کا ایک جہاں آباد تھا۔ وہ اس دفعہ مکمل یقین کے ساتھ مسکرائے، انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ ان کی گمشدہ جنت اب ان سے زیادہ فاصلے پر نہیں۔

جبکہ ان کے سامنے بیٹھی شرزمہ سوچ رہی تھی کہ اس نے ہانیہ اور اسود کی زندگی میں بدگمانی کے اندھیروں کو کیسے کم کرنا ہے، ہانیہ لاکھ خودغرض سہی لیکن شرزمہ پر ان کی محبتوں کے کچھ قرض باقی تھے اور قرض جتنی جلدی ادا کر دیے جائیں زندگی اتنی ہی سہل اور خوب صورت بن جاتی ہے۔

ناولٹ



”جان گئے جاناں“

نبیلہ ابر راجا



''میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔''

''ہاں ڈریکولا سے کم تو نہیں آپ۔'' اسامہ دل میں ہی یہ بات کہہ سکا۔ منہ پر یہ بات کہنے کی صورت میں اسے اچھی طرح پتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا کچھ ہو سکتا ہے۔

''ٹانگیں توڑ دوں گی تمہاری مجھے جانتے نہیں ہو تم لوگ۔'' میرب کا لہجہ اور انداز دونوں بہت جلالی تھے۔ کسوی کو تو زور کا چانٹا پڑا تھا وہ اُدھر ہی سر جھکائے

بہتے آنسوؤں کے ساتھ کتاب پہ نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ اب اسامہ کی باری تھی۔ میرب نے خاص طور پر لکڑی کا قدرے موٹا سا ڈنڈا ان دونوں کو پڑھانے کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔ جس سے وقتاً فوقتاً ان کی خاطر تواضع ہوتی رہتی...... اور آج کا تو دن ہی برا تھا مما اور دادو دونوں گھر پر نہیں تھیں۔ اس لیے محترمہ میرب کو کھلی چھٹی تھی اس نے لگے ہاتھوں پچھلے بدلے بھی چکا دیے۔ اسامہ کا کان زور سے مروڑے جانے کے باعث لال سرخ ہوگیا تھا۔

''اب اگر میری شکایت لگائی تو بہت برا حشر کروں گی۔'' اسامہ کے بال میرب کی مٹھی میں جکڑے تھے، غصے سے سرخ چہرہ اسامہ کے لرزتے کانپتے وجود کے سامنے تھا۔ وہ رعب کی وجہ سے اٹھ کے بھاگ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اتنی ہمت اس کی جانِ ناتواں میں نہیں تھی۔ بھاگنے کی صورت میں اس کے ساتھ جو کچھ پیش آنا تھا وہ اس سے بھی آگاہ تھا۔ جبھی میرب سے اپنی دُرگت بنوانے پر مجبور تھا۔

''اب پڑھو بیٹھ کر اور اِدھر اُدھر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ورنہ تم دونوں مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔'' جان بخشی کرتے ہوئے اس نے دھمکی دینا ضروری جانا تھا۔ وہ چائے بنانے کے ارادے سے کچن میں چلی گئی۔ پیچھے سے اسامہ نے خوف ناک انداز میں اپنا مُکا فضا میں لہرایا جیسے میرب سامنے ہو اور وہ اسے کچا ہی تو چبا جائے گا۔

وہ سکس کلاس میں تھا اور کسوئی فورتھ میں...... دونوں کو گھر پر پڑھانے اور ان کی تعلیمی سرگرمیوں سے آگاہ ہونے کی ذمے داری میرب نے خود ہی اپنے سر لی ہوئی تھی۔ کسوئی نرسری سے کلاس تھری تک پہلی تین پوزیشنز میں سے ایک لیتی رہی لیکن فورتھ میں آکر وہ بے پروا ہوگئی تھی کچھ ایسا ہی حال اسامہ کا بھی تھا۔ پہلے وہ پوری دلچسپی سے امتحانات اور دیگر کوئز کی تیاری کرتا تھا لیکن اب اسکول سے شکایات آنا شروع ہوگئی تھیں۔ کسوئی تو اس معاملے میں اسامہ سے بھی دو ہاتھ آگے نکلی۔ تھرڈ ٹرم میں اس کے مارکس بہت کم تھے۔ میرب کو سخت دھچکا لگا تھا۔ صد شکر کہ اس نے اسکول میں ہی کسوئی کی پٹائی نہیں شروع کردی۔ گھر آکر اس نے زبردست تواضع کی تھی۔ ہاں نشاط بیگم نے دبے لفظوں میں میرب کو سرزنش کی کہ اتنی بھی سختی ٹھیک نہیں۔ ساریہ بھابی خاموشی سے دیکھتی رہیں، ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔ جواب میں اس کے پاس زبردست دلائل تھے۔

''میں ان کی خاطر اپنی اسٹڈیز کو بھی بھول جاتی ہوں، دن رات ان کے ایگزامز میں ان کے ساتھ ایک کردیتی ہوں پھر بھی یہ لوگ اتنا گندا رزلٹ شو کریں تو میں ہڈیوں کا سرمہ نہ بنادوں۔'' اس نے دانت کچکچا کے خاصی اونچی آواز میں کہا تا کہ دوسرے کمرے میں موجود اسامہ اور کسوئی بھی سن لیں۔

خود میرب یونیورسٹی میں بزنس ایڈمنسٹریشن کی طالبہ تھی۔ یونیورسٹی سے آنے اور کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں کو لے کر بیٹھ جاتی۔ یوں لگتا جیسے وہ ان دونوں کو سب کچھ پڑھا کر ہی دم لے گی۔ پہلے ہی یہ حال تھا کہ اب اس کی سختی حد سے سوا تھی کیونکہ دونوں کے فائنل ایگزامز تھے اور میرب کوئی رعایت کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

☆☆☆

''اپنا تو پڑھتی نہیں ہیں، ہمیں ہی ہر وقت پڑھاتی ہیں۔ خود تو جیسے بڑی لائق فائق ہیں۔ میں نے تو کبھی نہیں سنا کہ پھپو کی پوزیشن آئی ہو۔ ہمیں کہتی ہیں کہ پوزیشن نہ لی تو ہڈیاں توڑ دوں گی۔'' اسامہ بری طرح جلا بھنا تھا۔ میرب کچن میں تھی اس نے فراخدلی سے حقِ رائے دہی کا استعمال کیا۔ کسوئی بھی اس کی ہم خیال تھی مگر اسامہ کی طرح اس نے بہ آواز بلند اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا کیونکہ کچھ پتا نہیں تھا کہ کب پھپو آجائیں۔

''کاش پھپو بیمار پڑ جائیں۔'' اسامہ نے دل سے دعا کی جس پر چھوٹی بہن نے بھی آمین کہا۔ گزشتہ دنوں میرب بری طرح بیمار ہوگئی تھی۔ دس پندرہ دن اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ ان دنوں وہ دونوں ہی بہت خوش تھے یوں لگتا تھا کہ آزادی مل گئی ہو۔ اِدھر میرب صحت یاب ہوئی اُدھر پرانا معمول لوٹ آیا...... وہی راجا بھائی اور وہی رعایا...... اس کی بیماری کا زمانہ ان دونوں کے لیے سنہرا زمانہ تھا۔ کاش وہ پھر لوٹ آتا۔ اسامہ کے دل نے تمنا کی تھی...... پر ضروری نہیں تھا کہ ہر تمنا پوری ہو۔ میرب پوری طرح صحت مند ہوکر کچن میں کھڑی اپنے لیے چائے بنا رہی تھی۔ چائے کپ میں ڈال کر وہ دوبارہ ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

''کسوئی ایس ایس ٹی کی بک نکالو۔'' اسی سختی سے اس نے حکم دیا جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھا۔

کسوئی نے فوراً حکم پہ عمل درآمد کیا۔ اسامہ بھی شرافت سے اپنی کتاب پہ جھکا مصروف نظر آنے کی پوری کوشش کررہا تھا۔ میرب کی عقابی نگاہ وقتاً فوقتاً دونوں کو ٹٹول رہی تھی۔

شام ڈھل رہی تھی سارے دن کا جلتا بلتا سورج غروب ہونے کی تیاری میں تھا۔ نشاط بیگم اور ساریہ بھابی شاپنگ ختم کر کے لوٹ آئی تھیں۔ میرب کے کپڑے بھی نشاط بیگم نے لیے تھے۔ وہ ان کی طرف متوجہ تھی۔ اسامہ اور کسوئی اب قدرے سکون میں تھے۔

ساریہ کے چچازاد بھائی کی شادی تھی۔ آج کی جانے والی شاپنگ اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ وہ بہت پُرجوش تھی کیونکہ چھوٹے چچا کے گھر کی یہ پہلی خوشی تھی۔ اس کا خوش ہونا لازمی تھا۔ کچھ ایسی ہی حالت اسامہ اور کسوئی کی بھی تھی کیونکہ شادی ان کے فائنل ایگزام کے بعد تھی۔ تب پڑھائی کی کوئی ٹینشن بھی نہ ہوتی نہ پھپو صاحبہ کا خوف......

☆☆☆

ڈھلتی شام کا نظارہ بڑا دل خوش کُن تھا۔ اوائل اکتوبر کا آغاز تھا۔ اب فضا میں وہ تندی اور گرمائش نہیں رہی تھی۔ میرب لان میں بیٹھی واک مین لگائے موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی تھی جب ساتھ والے طلحہ کی بال اچھل کر دیوار سے سیدھی آکر اس کے پاؤں پر آگی۔ واک مین جو اس کی گود میں دھرا تھا گھبراہٹ کی وجہ سے زمیں بوس ہوگیا۔ یہ سب بہت تیزی سے ہوا۔ اس سے بھی زیادہ تیزی سے طلحہ اپنی بال لینے اچھلتا کودتا اس کے قریب آکھڑا ہوا۔

''آنی میری بال۔'' طلحہ، کسوئی کا ہم عمر تھا اور شرارتوں میں نمبر ون...... میرب حسبِ عادت غصے میں آگئی۔

''نہیں دیتی میں بال، تمیز نہیں ہے تم لوگوں کو...... اگر یہ میرے سر پر لگ جاتی تو؟'' وہ آگ بگولا ہو رہی تھی۔ شور سن کر نشاط بیگم بھی کمرے سے نکل آئیں۔

''کیا بات ہے میرب، کیوں غصہ ہو رہی ہو؟'' ایک پل میں ہی انہیں صورتِ حال کا کچھ کچھ اندازہ ہوچکا تھا۔ طلحہ کی معصوم آنکھوں میں چمکتے آنسو اور چہرے پر شرمندگی اور میرب کا ہٹلرانہ انداز بہت کچھ بتانے کے لیے کافی تھا۔ پھر بھی انہوں نے پوچھنا ضروری سمجھا۔

''یہ کھیلتے ہوئے گیند اِدھر آکے میرے پاؤں پر لگی ہے۔'' اس نے ادھورا جواب دیا تو نشاط بیگم نے نیچے پڑی گیند طلحہ کی طرف بڑھائی۔

''یہ لو بیٹا۔'' الیاس صاحب کا سب سے چھوٹا اور لاڈلا بیٹا طلحہ شرارتی ہونے کے باوجود انہیں بہت پسند تھا۔ وہ برسوں سے ان کے پڑوسی تھے اور آپس میں بہت اچھے تعلقات تھے لیکن میرب کی بے وجہ سختی بہت کچھ بگاڑنے پر تلی ہوئی تھی۔

طلحہ سرخ چہرے کے ساتھ بال لے کر واپس چلا گیا میرب کے تیور ابھی تک بگڑے ہوئے تھے۔

نشاط بیگم اس کے ساتھ رکھی کین کی دوسری کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"میرب بچوں کے ساتھ اتنی سختی اچھی نہیں ہوتی، ہر وقت کی روک ٹوک، بے وجہ لعن طعن بچوں پر اچھا اثر نہیں ڈالتی۔ گیند ادھر آ گئی تو تم چپ کر کے واپس کر دیتیں، اسے ڈانٹنے کی کیا ضرورت تھی۔ بچہ ہی تو ہے۔"

"امی میں کون سی سختی کرتی ہوں، کیا ڈانٹا ہے طلحہ کو؟" وہ تو گویا جلتے ہوئے توے پر بیٹھی تھی جھٹ سے اُکھڑ ہی تو گئی۔ وہ اس کے اس انداز سے خائف ہو گئیں ہمیشہ کی طرح...... میرب کو اُن کی اس کمزوری کا بخوبی علم تھا۔ تب ہی تو شیرنی بنی ہوئی تھی۔

☆☆☆

ساریہ بیاہ کر اس گھر میں آئی تب میرب چھوٹی تھی مگر بات بے بات پھٹ پڑنا، تلخ ہو جانا اس کی بچپن کی عادات میں شامل تھا۔ ساریہ جس ماحول اور جس خاندان سے آئی تھی وہاں چھوٹوں کے یہ انداز برداشت نہیں کیے جاتے تھے۔ ساریہ نے آتے کے ساتھ ہی یہ بات نوٹ کی تھی کہ اس کی ساس بیٹی کے اس رویے سے خائف سی رہتی ہیں لیکن جب بھی وہ ٹوکنے کی کوشش کریں میرب الٹا انہیں سمجھانے لگ جاتی۔ حالانکہ بڑی نند عظمیٰ بھی میرب کی بہن تھی مگر نہایت نرم گفتار تھی...... ساریہ کی شادی کے کچھ عرصے بعد اس کی بھی شادی ہو گئی تھی۔ ساریہ نے کئی بار پاس بٹھا کر پیار سے بات کرنا چاہی وقتی طور پر تو میرب نرم پڑ جاتی پر بعد میں وہ پھر پہلے جیسی ہو جاتی۔ ساریہ اندر ہی اندر کچھ خوفزدہ تھی۔ جب اس کی شادی ہوئی تب میرب ہائی اسکول میں تھی اور اب یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اس وقت سے لے کر اب تک اس کی عادات پختہ ہو چکی تھیں۔ اس نے دبے لفظوں میں کئی بار ساس سے بھی کہا کہ میرب کی شخصیت کی یہ سختی اور خود کو برتر سمجھنے کی عادت اس کے لڑکی ہونے کی وجہ سے اچھی نہیں ہے۔ اسے پرائے گھر جانا ہے، وہاں یہ سب پسند نہیں کیا جائے گا۔ وہ بے بسی سے دیکھتی رہ جاتیں۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ میرب میں کوئی خوبی نہ ہو، وہ بہت خوش اخلاق، ہمدرد اور حساس بھی تھی۔ اس کے مشورے اچھے ہوتے جن پر اعتبار کیا جا سکتا تھا، گھر میں مہمان آتے یا کوئی چھوٹی موٹی تقریب ہوتی انتظام میرب ہی کرتی اور اس میں کوئی کمی یا خامی بھی نہ ہوتی بلکہ اگر وہ خاندان کی کسی تقریب میں بھی جاتی تو بڑی عورتیں اسے انچارج بنا کر مطمئن ہو جاتیں کیونکہ پھر ساری ذمے داری میرب کی ہوتی اور ہر طرف واہ واہ ہوتی۔ اپنی تعریفیں سن سن کر میرب کی گردن اور بھی اکڑ جاتی .... اور وہ خود کو پہلے سے بھی زیادہ توپ شے تصور کرنے لگتی۔ اس کی خود اعتمادی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔

نشاط بیگم نے اگر کبھی اپنے شوہر نامدار کی توجہ بیٹی کے اس مزاج کی طرف دلائی بھی تو وہ ہنس کر ٹال گئے۔ یہی حال بڑے بھائی زوار کا تھا وہ فطرتاً بے پروا سے تھے۔ اب لے دے کے ساریہ تھی جس کی باتیں نشاط بیگم کو خدشات اور وہموں کے سپرد کیے رکھتیں۔ دراصل میرب سے بڑے دونوں بہن بھائی شادی شدہ تھے اور اپنی ہی دنیا میں سیٹ تھے۔ وہ سب سے چھوٹی تھی۔ ایسے میں اکثر اس کا جی چاہتا کہ کاش اس سے چھوٹا کوئی اور بھائی یا بہن ہوتا جس سے وہ اپنی ساری باتیں شیئر کرتی، لڑتی جھگڑتی رعب ڈالتی...... اسامہ اور کسوئی پیدا ہوئے تو وہ بے طرح خوش ہوئی۔ جوں جوں وہ بڑے ہو رہے تھے میرب نامحسوس انداز میں ان کی ذمے داری اپنے سر لیتی جا رہی تھی۔ جب دونوں بچے اسکول میں داخل ہوئے تب تو وہ ان کی پوری استانی بن گئی۔ اس کی ڈانٹ ڈپٹ سے ساریہ بھی خائف ہوتی مگر میرب سے کچھ کہنا محال تھا۔

☆☆☆

شادی کی تیاری کے لیے میرب بھاوج کے

ساتھ جا کر کپڑے، جوتے وغیرہ لے آئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے اپنے چچا کے بیٹے کی شادی ہے۔ اس کی تیاری اور جوش تو یہی ظاہر کر رہا تھا.....

دونوں بچے اپنے، اپنے امتحانات سے فارغ ہو چکے تھے۔ زوار بھائی انہیں نانو کے گھر چھوڑ آئے تھے وہ بہت خوش تھے کیونکہ میرب پھپو کے "جن" سے جان آزاد تھی ـــ وہ شاداں و فرحاں تھے۔ ساریہ کی چچی فرحت خود آ کر شادی کا دعوت نامہ دے گئی تھیں اور بطورِ خاص میرب کو بھی آنے کو کہا تھا۔

"بیٹا تم مایوں سے پہلے آ جانا۔" جاتے جاتے انہوں نے پھر اسے تاکید کی تھی۔ جواباً اس نے پورے خلوص سے اپنے آنے کی یقین دہانی کروائی تھی۔

☆☆☆

"یار میں تو تھک گیا ہوں۔" اشہل مہندی کے لیے سجائے گئے آرائشی جھولے میں ہی لمبا لیٹ گیا۔

"یار فریش ہو کے چائے پیتے ہیں۔" رامش کے چہرے سے بھی تھکن ہویدا تھی۔

وہ نیچے بیٹھا تھا گاؤ تکیہ اس کی کمر کے پیچھے تھا۔ دونوں بڑے بے فکرے موڈ میں تھے۔ جب وہ آفت نازل ہوئی۔

"کیا ہو رہا ہے یہ، کون ہیں آپ...... چلیں، اٹھیں یہاں سے، آپ کو نظر نہیں آ رہا کہ یہ دولہا کے لیے ہے، آخر ہیں کون آپ؟" انداز میں اتنا تحکم، سختی اور رعب تھا کہ اشہل اور رامش دونوں دیکھتے رہ گئے۔ اشہل غیر ارادی طور پر جھولے سے اترا۔ وہ جو کوئی بھی تھی اشہل نے پہلی بار دیکھا تھا۔

"آپ کون ہیں اور یہ پوچھنے والی کون ہوتی ہیں؟" وہ فوراً سنبھل کر اپنے حواس میں آیا تھا۔ وہ ابھی تک وہیں کھڑی کینہ توز نظروں سے تک رہی تھی۔ رامش نے کل شام کو اسے دیکھا تھا اور اپنی بہن اسما سے پوچھا بھی تھا کہ یہ کون ہے کیونکہ اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اسما نے بتایا کہ یہ ساریہ آپی کی نند ہیں وہ تو اسے جانتا تھا پر اشہل کو ابھی تک نہیں پتا تھا کہ یہ لڑاکا طیارہ کون ہے۔ رامش نے اشہل کے بگڑے تیور دیکھ لیے اور کسی متوقع بدمزگی کے خیال سے ہی گھبرا گیا کیونکہ بنیادی طور پر وہ صلح جُو قسم کا انسان تھا جبکہ اشہل اس کے الٹ تھا اور ساریہ آپی کی نند کے تیور ہرگز اچھے اور دوستانہ نہیں تھے۔ آتے ساتھ ہی اس نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی تھی کیونکہ فرحت آنٹی نے کہا تھا کہ تم بھی ہر چیز کا دھیان رکھنا اور اِدھر آتے ہی اس نے اپنے تئیں آرائشی جھولے کا حشر نوٹ کیا تھا۔ اس سے پہلے کہ یہ جنگ بڑھتی ساریہ بھابی اُدھر آ گئیں۔

"ارے واہ...... اسٹیج تو اتنا خوب صورت تیار ہوا ہے، کمال کر دیا تم دونوں نے اور میرب تم جا کر تیار ہو جاؤ۔ لڑکیاں تیار ہو رہی ہیں، میں تمہیں ہی ڈھونڈ رہی تھی۔" ان دونوں کے کیے گئے انتظامات کو سراہ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئیں تو میرب پہ کُھلا یہ دونوں لڑکے بھی ساریہ بھابی کے رشتے داروں میں سے ہیں۔ شرمندگی کی وجہ سے اس نے منظر سے ہٹنے میں ہی عافیت جانی۔

ساریہ نے اشہل کا تپا، تپا سرخ چہرہ دیکھ لیا تھا۔ چچی کا یہ بھانجا ان کی پوری فیملی میں ہر دلعزیز تھا۔ بہت مخلص اور ہمدرد دل کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ قدرے شوخ مزاج بھی تھا۔ ساریہ دل سے اسے پسند کرتی تھی اس سے پہلے کہ ساریہ صورتِ حال دریافت کرتی اسے چچی نے آواز دے ڈالی وہ اُدھر چل پڑی پھر شادی کی مصروفیات میں بھول بھال گئی پر اشہل بھولنے والوں میں سے نہیں تھا۔

"یار اب موڈ ٹھیک کر واپنا۔" رامش نے اس کا ہاتھ دبایا تو اس نے بیزاری سے جھٹک دیا۔ بڑی دیر بعد جا کر وہ نارمل ہوا۔

☆☆☆

مہندی کی تقریب عروج پر تھی۔ میرب :

اور ہر کام میں آگے آگے تھی۔ اشہل اور رامش بھی تیار ہو کر اس گہما گہمی کا حصہ بن گئے تھے۔ کسوئی اور اسامہ بھی شوخی و شرارت پر اترے ہوئے تھے۔ کسوئی چوڑی دار پاجامے اور گھیر دار فراک میں بہت کیوٹ لگ رہی تھی۔ میرب نے دیکھا تو پاس بلالیا۔ آج تو کسوئی لفٹ نہیں کرا رہی تھی۔ پھپو نے بلایا تو وہ دل سے ڈری سی گئی کہ جانے اب کیا ہوگا۔

''جی پھپو......'' وہ آرائشی ستون کی آڑ سے نکل کر سامنے آگئی۔

''زیادہ اچھل کود کرنے کی ضرورت نہیں ہے آرام سے بیٹھو، نہیں تو میں ٹانگیں توڑ دوں گی۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں سختی آگئی تھی۔

کسوئی نے سعادت مندی سے سر ہلایا اور دوبارہ اس ہنگامے کا حصہ بن گئی۔

بارات کی روانگی کی تیاری ہو رہی تھی۔ میرب تیار ہو کر کسوئی، اسامہ کو ڈھونڈنے باہر نکلی تا کہ انہیں بھی تیاری میں مدد دے سکے۔

پودوں کے پاس سے شور کی آوازیں آرہی تھیں۔ میرب آواز کی سمت بڑھی۔

''آپی آپی...... کسوئی نے مجھے مارا ہے۔'' دس سال کی ایک بچی فوراً لپک کر اس کی طرف آئی۔ یہ بچی ساریہ بھابی کی ایک کزن کی بیٹی تھی اور آفت کی پرکالہ تھی۔ کسوئی بال بکھیرے سرخ چہرہ لیے تین چار بچوں میں گھری ہوئی تھی۔ بچے اسے دیکھتے ہی شور کرنے لگے۔ میرب کو زبردست غصہ آیا۔ اس نے کسوئی کو گھسیٹ کر بچوں کے درمیان سے نکالا اور اکھٹے تین چار چانٹے رسید کیے حالانکہ وہ بولے بھی جارہی تھی کہ پھپو میں نے نہیں مارا پر میرب کہاں ماننے والی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے یہ؟'' اس سے پہلے کہ وہ کسوئی پہ مزید غصہ کرتی کسی نے کسوئی کو اس کے شکنجے سے نکالا ساتھ ہی اس کا ہاتھ بھی روک دیا۔ یہ اشہل تھا جو زور شور سے روتی کسوئی کو چپ کرانے میں لگا ہوا تھا۔

ایک بچہ اشہل کو بتا رہا تھا کہ کسوئی نے نہیں بلکہ ماریہ نے فضہ کو مارا ہے اور دھکا دے کر گرایا بھی ہے۔

''آپ اتنے چھوٹے بچوں کو اتنی بے دردی سے مارتی ہیں۔'' وہ غصے سے میرب کو دیکھ رہا تھا۔ کسوئی ابھی تک اس کے ساتھ لگی ہچکیاں لے رہی تھی پھر وہ اسے اپنے ساتھ ہی وہاں سے لے گیا۔

''یہ لڑکی...... ذرا بھی نہیں ڈرتی کہ ساریہ آپی مائنڈ بھی کر سکتی ہیں، بچوں سے غلطی ہو جاتی ہے، انہیں پیار سے ڈیل کرنا چاہیے نہ کہ وحشیانہ طریقے سے مارنا چاہیے۔ تھوڑی خود پسند اور مغرور لگتی ہے، لگتا ہے اپنے آگے کسی کو کچھ نہیں سمجھتی محترمہ۔'' وہ سارہ آپی کی اس ہلاکو ٹائپ مغرور نند کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اشہل کی رائے اس کے بارے میں بہت منفی تھی۔

ولیمے کے بعد وہ گھر آگئی۔ سارہ بھابی دونوں بچوں کے ساتھ بعد میں واپس آئیں ان کے پاس دو خوشخبریاں تھیں۔ وہاں وہاب کی شادی میں میرب کچھ خواتین کو بہت پسند آگئی تھی ایک تو وہاب کے جگری دوست یاسر کی والدہ کو اور دوسری اشہل کی فیملی کو...... باتوں، باتوں میں سارہ سے بہت کچھ پوچھا گیا اور اچھی طرح تسلی بھی کی گئی۔

میں نے جو کام اس کے ذمے لگایا اس نے بڑی ذمے داری اور خوش اسلوبی سے پورا کیا۔ بہت کیئرنگ ہے احساس ذمے داری کوٹ کوٹ کر بھرا ہے اس بچی میں۔'' خود فرحت چچی بھی میرب کی بہت تعریف کر رہی تھیں۔

سارہ جواب میں ہاں یا نہ کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔

وہ جس خاندان اور گھر سے بیاہ کر آئی تھی وہاں سب دھیمے مزاج کے تھے، کسی کی آواز اونچی اور لہجہ سخت نہیں تھا بلکہ سسرال میں میرب کی شخصیت ایسی تھی جو اس کے مزاج سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ وہ تو اونچا بھی بولتی، غصہ بھی کرتی اور چیختی چلاتی بھی اس

کے مزاج میں سختی اور رعب بھی تھا ان ساری باتوں سے مل ملا کر میرب کی ذات تشکیل پاتی تھی۔

سارہ بھابی، اشہل کی فیملی سے خوب اچھی طرح واقف تھیں۔ جبکہ یاسر کے گھر والوں سے انہیں کوئی خاص آگاہی نہیں تھی۔ یاسر کی والدہ اور بہنوں کو اس نے شادی میں ہی دیکھا تھا اس کے علاوہ کچھ زیادہ نہیں جانتی تھی وہ۔ اشہل پڑھا لکھا ویل ریفائنڈ نوجوان تھا، شوخ مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی عزتِ نفس اور شخصیت کے بارے میں مضبوط اور اصولی سوچ کا مالک بھی تھا جبکہ ادھر میرب کسی کو کچھ نہ سمجھنے والی صرف اپنی برتری کے زعم مبتلا...... جانے اس رشتے کا کیا انجام ہوتا...... اس نے بہر حال اپنی ساس، سسر اور شوہر سے اس کا ذکر کر دیا۔ آگے ان کی مرضی تھی وہ ہاں کرتے یا نہ......

میرب فی الحال لاعلم تھی اس سارے قصے سے ابھی یہ موضوع گھر کے بڑوں میں ہی زیرِ بحث تھا۔ میرب سے کہنے سننے کی نوبت بعد میں آنی تھی۔

اس روز جبکہ میرب یونیورسٹی گئی ہوئی تھی۔ اشہل کی امی، بشریٰ بیگم بڑی دونوں بیٹیوں اور بہو کے ساتھ ان لوگوں کو مطلع کیے بغیر چلی آئیں۔ گھر میں سارہ اور نشاط بیگم ہی تھیں۔ سارہ کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس طرح اچانک آمد کا اس نے تصور نہیں کیا تھا۔ وہ گھنٹا ڈیڑھ بیٹھیں مگر جاتے وقت ان کے چہروں سے چھلکتا سکون کسی مثبت فیصلے کا اعلان کر رہا تھا۔

اگلے آنے والے چند دن بڑے ہنگامہ خیز تھے۔ میرب کو اشہل کے پروپوزل سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔

''بھئی میں نے ابھی بہت سارا پڑھنا ہے۔'' پروپوزل کا سن کر اس نے زندگی میں غالباً پہلی بار اپنی دلی کیفیات کو عیاں نہیں ہونے دیا تھا۔

''ایم بی اے کر لو کافی ہے۔ تمہارے ابو کی اب یہی خواہش ہے کہ تم عزت سے ہمارے جیتے جی اپنے گھر کی ہو جاؤ، ہمیں یہ رشتہ ہر لحاظ سے مناسب لگا ہے۔ اچھا خاندان ہے، لڑکا بہت قابل اور سمجھدار ہے، ایسے رشتے روز روز نہیں ملتے۔ تم سوچ لو اچھی طرح۔'' امی اسے سوچتا چھوڑ کر چلی گئیں۔ میرب نے غصے سے تکیہ کارپٹ پر پھینکا اور پاؤں سے زوردار ٹھوکر لگائی۔

''ہونہہ ایسے رشتے روز روز نہیں ملتے۔'' اس نے منہ بگاڑتے ہوئے الفاظ کو نئے سرے سے دہرایا۔ لمبے چوڑے اشہل کا سراپا اس کی نگاہوں میں از سرِ نو لہرایا تو سب کچھ یاد سا آگیا۔ وہ اس سے خائف سی تھی۔ اشہل جیسے چھا جانے والے اور مضبوط پرسنالٹی رکھنے والے لوگ اسے کچھ خاص پسند نہیں تھے۔ اس کے سامنے تو میرب کی اپنی شخصیت دب کر رہ جاتی۔ دوسرے وہ ابھی شادی کرنے کے حق میں نہیں تھی۔ وہ پڑھ لکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتی تھی تا کہ اپنی صلاحیتوں سے کما حقہ فائدہ اٹھا سکے۔ یہ سراسر اس کے اپنے ذاتی خیالات تھے جسے گھر کے دوسرے افراد کا ماننا ضروری نہیں تھا۔

☆☆☆

مما اور بہنوں نے میرب کے گھر جانے سے پہلے سرسری سا اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ جواب میں اشہل خاموش رہا تھا کیونکہ مما اور بہنیں اس کی اچھی خاصی تعریف کر رہی تھیں۔ دوسرے دن جا کر اسے پتا چلا کہ وہ لوگ میرب کے گھر سے ہو آئی ہیں۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا تھا لیکن کسی مصلحت کے تحت چپ ہو گیا مگر ایک معنی خیز سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آکے معدوم ہو گئی تھی۔

وہاب کی شادی میں کئی بار ان دونوں کا آمنا سامنا ہوا تھا۔ ہر بار ہی اس کے چہرے سے بیزاری ہی جھلکتی دیکھی گئی جیسے وہ یہاں آکر بڑا احسان کر رہی ہے۔ عجیب مغرورانہ سے تاثرات ہوتے جیسے باقی سب اس کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ اس کے یہ ''کچھ بھی نہیں......'' جیسے تاثرات نے اشہل کو کتنی ہی بار جھنجلاہٹ میں مبتلا کیا تھا۔ اپنے خاندان میں

قریبی ہم عمر کزنز کے ساتھ ساتھ باقیوں پہ اس کا بڑا رعب تھا۔ خود اپنے گھر میں بڑی بہنیں بھی اس کے سامنے بات چیت میں محتاط رہتیں حالانکہ اس کا رویہ بڑا دوستانہ ہوتا ہر موضوع پہ گپ شپ ہوتی مگر ایک حد میں رہ کر...... دیگر رشتے داروں میں بھی اس کی رائے کو اہمیت دی جاتی۔ بڑوں میں اس کے دلائل معتبر ہوتے۔ ہر کوئی اسے پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتا مگر وہ کسی پر بے جا سختی اور رعب ڈالنے کا قائل نہیں تھا۔ سب اسے پیار بھی کرتے اور احترام بھی مگر اس کا احترام کسی خوف و رعب اور ڈر کا مرہونِ منت نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے پیار اور باہمی خلوص کا جذبہ کارفرما تھا جبکہ میرب کا معاملہ الٹ تھا۔

نشاط بیگم اس دن اسے سوچنے کا ٹائم دے کر گویا سب کچھ بھول بھال گئی تھیں۔ میرب انتظار میں تھی وہ اس سے پوچھیں گی، تب وہ کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کر سکے گی مگر اس کی نوبت ہی نہیں آپائی۔ بالا ہی بالا اشہل کے گھر والوں کو رضا مندی دے دی گئی۔ سادہ سی گھریلو تقریب میں میرب کی انگلی میں منگنی کی انگوٹھی سج گئی۔ اپنی منگنی کے دن وہ بہت روئی تھی۔ کسوئی اور اسامہ نے کتنی بار اسے اپنی آنکھیں اور ناک دوپٹے سے رگڑتے ہوئے دیکھا۔ تب انہیں تھوڑی دیر کے لیے میرب پھپو پر ترس آیا تھا جو فوراً معدوم بھی ہوگیا۔ ان کے لیے یہ احساس بڑا دل خوش کُن تھا کہ اشہل اب سچ مچ ان کے انکل بن جائیں گے۔ میرب پھپو بھلے روتی رہیں انہیں فرق نہیں پڑتا تھا۔ اشہل انکل ان کی ٹکر کے تھے، نہ ڈرنے والے نہ دبنے والے۔ شادی میں کیسے پھپو ان کے سامنے بھیگی بلی بن گئی تھیں۔ کسوئی وہ وقت یاد کر کے خوش ہو رہی تھی جب اشہل انکل نے اسے پھپو کے شکنجے سے آزاد کروایا تھا۔

میرب کے ایم بی اے کے بعد ہی شادی ہونی تھی۔ تب تک اسے خوب جلنا کلسنا تھا۔ اس کی فرینڈز نے اشہل کی تصویر دیکھنے کی فرمائش کی تھی تو وہ خاموش ہوگئی پر ساریہ بھابی کے پاس وہاب کی شادی کا پورا البم پڑا تھا وہ اٹھا کے دکھانے لگیں۔ ایسے میں میرب کی لاتعلقی کمال کی تھی۔ سویرا نے اشہل کی تصویریں دیکھنے کے بعد میرب کو بھی رشک سے دیکھا۔ وہ انجان بنی ٹی وی کی طرف متوجہ رہی۔ تب ساریہ کو اس پر بے طرح غصہ آیا۔ وہ یوں ری ایکٹ کر رہی تھی جیسے اس پر بڑا ظلم ہوا ہو یا.... خدانخواستہ اشہل کسی گئے گزرے خاندان سے تعلق رکھتا ہو اور میرب کے قابل ہی نہیں ہو۔

☆☆☆

”کوئز میں تمہارے نمبر اتنے کم...... ایسا ہو نہیں سکتا۔ تم نے تو کل مجھے بتایا تھا کہ تمہاری تیاری بہت اچھی ہے۔ تم کلاس فائیو میں ہو اور مجھ سے جھوٹ بولتی ہو۔ ٹانگیں توڑ دوں گی تمہاری خون پی جاؤں گی تمہارا۔“ کسوئی کی نوٹ بک میرب کے سامنے تھی۔ مارکس دیکھ کر اس کا خون کھول رہا تھا۔ اس نے جھپٹ کر کسوئی کا کان پکڑا اور اسے اپنی طرف گھسیٹا۔

نشاط بیگم نماز پڑھ رہی تھیں اور ساریہ بھابی بوا کے ساتھ کچن میں مصروف تھیں گھر میں شاید کسی مہمان کی آمد متوقع تھی۔ اس نے نہ کسی سے پوچھا نہ اسے بتایا گیا۔ یونیورسٹی سے آنے کے بعد وہ سو گئی تھی اور خاصی دیر تک سوتی رہی۔ سو کے اٹھنے کے بعد اس نے چائے پی اور پھر دونوں بچوں کو لے کر بیٹھ گئی۔

”میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں، ہڈیاں توڑ دوں گی۔“ اس نے لکڑی کی اسٹک ہاتھ میں لیتے ہوئے اپنا پسندیدہ جملہ دُہرایا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے ارادے کو مزید عملی جامہ پہناتی کسی کے قدموں کی چاپ اس کے قریب آرکی۔ یہ ساریہ بھابی اور ان کے ساتھ اشہل تھا۔

کسوئی مجرم بنی میرب کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے بڑی سختی سے اس کا کان پکڑا ہوا تھا اور

آواز نکالنے سے منع بھی کر رکھا تھا۔ اسامہ کتاب سامنے رکھے گویا سجدے کی حالت میں تھا۔

اشہل اور ساریہ بھابی سامنے کھڑے تھے۔ بھاگنے کے لیے راستہ نہیں تھا۔ شرمندگی سے اسے آدابِ میزبانی بھول گئے۔ ٹکا سا سلام کر کے وہ جھٹ سے غائب ہوگئی۔ اس کے باہر نکلتے ہی کسوئی کے آنسو سسکیوں میں بدل گئے۔ اشہل نے جھک کر اسامہ اور کسوئی کو پیار کیا اور اپنے ساتھ ہی صوفے پر بٹھالیا۔

”کیسے ہو آپ دونوں اور کیا ہو رہا ہے؟ اور گڑیا آپ رو کیوں رہی ہیں؟“ ساریہ اس کے سوال پر شرمندہ ہوگئی۔

”کسوئی پڑھائی پہ ذرا بھی توجہ نہیں دیتی، کوئز میں مارکس کم آئے ہیں میرب نے تھوڑی ڈانٹ ڈپٹ کی ہوگی۔“ اس نے کسوئی کے سرخ چہرے اور کانوں سے نظر چراتے ہوئے کسی حد تک ماحول پر چھائی سختی کم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اتنے میں نشاط آنٹی بھی نماز سے فارغ ہو کر اِدھر چلی آئیں تب کہیں جا کر اس نے قدرے سکون محسوس کیا۔

نشاط آنٹی بڑے پیار سے ملیں سب کا حال احوال پوچھا۔ تب تک کسوئی بھی نارمل ہوگئی۔ ساریہ نے کچن کی راہ لی۔ ابو اور زوار بھائی بھی آچکے تھے۔ اندر خوب محفل جمی تھی میرب کافی دیر بعد اپنے کمرے سے نکلی۔ وہ کچھ شرمندہ شرمندہ سی تھی، جانے کیوں ہر بار اس شخص سے عجیب صورتِ حال میں آمنا سامنا ہوتا تھا۔

وہ کچن میں ساریہ بھابی کی طرف آگئی جو کھانا ڈونگوں میں ڈال رہی تھیں۔

”بھابی میں بھی مدد کراؤں؟“ وہ یوں بولی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہو۔

”ارے نہیں، سب کچھ تیار ہے بس ٹیبل پر رکھنا ہے۔“ ساریہ خاصے مصروف اور عام سے انداز میں بولی۔ یہ بات ٹھیک تھی کہ کبھی کبھی اسے میرب پہ غصہ آتا تھا پر یہ سب وقتی ہوتا۔ وہ کینہ دل میں رکھنے کی قائل نہیں تھی یہی وجہ تھی کہ منٹوں میں سب بھول بھال جاتی۔

☆☆☆

سنہری شامیں ڈھل، ڈھل کر رخصت ہو رہی تھی۔ خنک موسم اپنی آمد کا اشارہ دے رہا تھا۔ میرب صاحبہ پر کسل مندی سوار تھی۔ امی اور بھابی اس کی شادی کی شاپنگ کر رہی تھیں اور وہ اکثر روتی پائی جاتی، اب وہ کسوئی اور اسامہ کی طرف سے قدرے بے پرواسی ہوگئی تھی۔ جس پر وہ دونوں خوش تھے پر

غزل

ہم تو دل کی کہی سنی میں رہے
عمر بھر آپ کی گلی میں رہے

کچھ بغاوت کی بھی ضرورت ہے
نہیں سب میں کسی کسی میں رہے

ان کا پہرہ ہے راہ گزاروں پر
راہ زن جن کی رہبری میں رہے

آنسوؤں تک یہ بات پہنچے گی
اس کا احساس بھی خوشی میں رہے

حوصلے چاند چھو کے لوٹ آئے
لوگ احساسِ کمتری میں رہے

یوں میرے دل میں آپ رہتے ہیں
جیسے خوشبو فری کلی میں رہے

شاعرہ: فریدہ فری یوسف زئی، لاہور

اسامہ اب بہت ذمے دار ہوگیا تھا۔ میرب کو اب کہنا نہیں پڑتا تھا کہ کتابیں کھولو یا اب اسے لمبی جوڑی نصیحتیں نہیں کرنی پڑتی تھیں پڑھائی اور فیوچر کے حوالے سے لیکن کسوئی کا وہی رویہ تھا۔ اسے سمجھ نہیں آتی کہ پھپھو روز روتی کیوں ہیں۔ آخر اس نے ایک دن اسامہ سے پوچھ لیا کہ پھپھو اتنا روتی کیوں ہیں؟

"ان کی شادی جو ہورہی ہے۔" اسامہ نے گویا اسے مسئلہ فیثا غورث سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"اچھا شادی ہوتی ہے تو سب روتے ہیں؟ تب ہی تانیہ آنی بھی روئی تھی اپنی شادی پر۔" کسوئی کو اپنی خالہ جانی یاد آگئی تھیں روتی دھوتی۔

"جی......" اسامہ اس کی بے وقوفی پہ ہنسا۔

☆☆☆

میرب کی شادی میں صرف ہفتہ دس دن ہی باقی تھے۔ ساس بہو بازار گئے ہوئے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ اسامہ نے ٹی وی لگایا ہوا تھا اور کسوئی اس کے پاس بیٹھی کارٹون دیکھ رہی تھی۔ میرب دبے پاؤں ٹی وی لاؤنج میں آئی تھی۔

"کیا ہورہا ہے؟" اس کے لہجے میں سختی نہیں تھی تو نرمی بھی نہیں تھی۔ کسوئی فوراً سیدھی ہوئی۔ اسامہ نے ٹی وی ہی آف کردیا۔

"آپ لوگوں کی پڑھائی کیسی جارہی ہے؟" اس کا مخاطب وہ دونوں تھے۔

"پھپھو بہت اچھی، منتھلی کوئز میں میرے مارکس سب سے زیادہ ہیں۔" اسامہ پُرجوش تھا جبکہ کسوئی خاموش تھی۔

"گڑیا تم چپ کیوں ہو؟" میرب کارپٹ پر اس کے قریب بیٹھی تو وہ لرزسی گئی کہ اب اس کی شامت آئی مگر ہوا اس کے بالکل برعکس۔ میرب نے نیچے ان کے پاس بیٹھ کر دونوں کے گرد اپنے بازوؤں کا گھیرا پھیلا دیا۔ اس کا وجود دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ تب اسامہ نے دیکھا پھپھو سسکیاں لے رہی ہیں۔ کسوئی کے بالوں پر میرب نے اپنا سر رکھا ہوا تھا۔

"دیکھو پڑھائی توجہ سے کرنا، اس میں تم دونوں کا فائدہ ہے۔ بھابی کے پاس اتنا ٹائم کہاں ہوتا ہے کہ ایک، ایک چیز چیک کریں، جو کرنا ہے تم دونوں نے کرنا ہے۔ کبھی بھی اسکول سے آپ دونوں کی شکایت نہیں آنی چاہیے۔" وہ رو بھی رہی تھی اور بول بھی رہی تھی۔ وہ دونوں بھی اس کے ساتھ رو پڑے۔

"پھپھو آپ کو اب بھی شکایت نہیں ہوگی۔" دونوں نے اکھٹے عہد کیا۔ میرب تو اُن سے لپٹ کے یوں دھواں دھار روئی کہ ان دونوں کو بھی رُلا یا۔ وہ جو پہلے شکر کرتے تھے کہ اس کی شادی ہوگی تو اس کی سختیوں سے جان چھوٹے گی اب روز روتے تھے کیونکہ پھپھو جو روتی تھیں۔ ان کی ساری خفگیاں اس کے آنسوؤں کے سنگ بہہ گئی تھیں۔

☆☆☆

میرب کی نئی زندگی اشہل کی ڈھیروں نصیحتوں کے ساتھ شروع ہوئی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اشہل پیار بھرے جملے بولے گا، کچھ وعدے کرے گا پر ہوا اس کے برعکس...... اس نے کوئی رومینٹک جملے نہیں بولے تھے نہ وعدے کیے تھے...... ہاں ڈھیروں نصیحتیں اور حکم ضرور دیے تھے۔ میرب کے چہرے پر اداسی اور یاسیت سی تھی۔ وہ اسے سونے کا حکم دے کر خود بھی سو گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ کسی ناگوار فرض سے جان چھڑا رہا ہو۔

آنے والے دنوں میں میرب کو کم از کم ایسے ہی لگا جیسے وہ اشہل کے لیے واقعی ناگوار سا فرض اور بوجھ ہو۔ جسے بحالتِ مجبوری اس نے اپنے سر لینے کا عہد کیا ہو۔

شادی سے پہلے وہ یونیورسٹی سے آنے کے بعد اسامہ اور کسوئی کے ساتھ مصروف ہوجاتی تھی۔ یہاں سسرال میں پورے ڈیڑھ ماہ دعوتوں نے ہی جان نہیں چھوڑی۔ آہستہ آہستہ روٹین سیٹ ہوئی تو میرب بور ہونے لگی۔ اشہل کی بڑی دونوں بھابیاں

اسے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھیں گھر میں صفائی کے لیے ملازمائیں تھیں اور کچن کے کاموں کے لیے خانساماں تھا...... باقی دیگر کام دونوں بھابیاں مل کے کرلیتی تھی۔ اشہل صبح کا گیا شام پانچ بجے آتا۔ میرب کے سامنے وہ ریزرو ہی رہتا' ہاں باقی افراد کے ساتھ اس کا خوب ہنسی مذاق چلتا۔

☆☆☆

"عائشہ بھابی میں سخت بور ہورہی ہوں کیا کروں، یہاں کرنے کو کوئی کام ہی نہیں ہے۔" اس روز وہ ہمت کر کے اپنی جیٹھانی عائشہ سے کہنے لگی تو اسے میرب پر ترس سا آگیا۔

"میرب تم یوں کرو کہ لائبہ، اسما اور ہارون کو پڑھا دیا کرو، تمہاری بوریت بھی ختم ہوجائے گی اور ایک مصروفیت بھی ہاتھ آجائے گی۔" عائشہ بھابی کا مشورہ اس کے دل کو لگا تھا۔ گھر میں پیار محبت کا ماحول تھا۔ گھر میں دو بھابیوں، ساس، سسر سمیت اشہل کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بہن صفورہ بھی تھی۔ وہ کیمسٹری میں ایم ایس سی کررہی تھی۔ اس کا نکاح اپنے کزن سے ہوا تھا۔ صفورہ بہت خاموش طبع اور پڑھاکو لڑکی تھی وہ اپنے آپ میں مگن رہتی۔ شروع میں میرب خوش ہوئی کہ وہی اس گھر میں اس کی ہم عمر تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے ساتھ اچھی کمپنی رہے گی پر وہ اپنے آپ میں رہتی اور بوقتِ ضرورت ہی بات کرتی۔ یونیورسٹی سے آنے کے بعد اس کا بیشتر وقت اپنی کتابوں اور نوٹس کے ساتھ سر کھپاتے گزرتا۔ وہ پوزیشن ہولڈر تھی اور اپنی پوزیشن برقرار رکھنا چاہتی تھی اس لیے وقت کا زیاں اس کے نزدیک فضول تھا۔ ساس صاحبہ...... سے وہ کتنی باتیں کرتی لے دے کے ٹی وی رہ جاتا وہ بھی آخر کتنا دیکھتی۔ اشہل لیے دیے رہتا۔ میرب کو یوں لگتا جیسے وہ پاگل ہوجائے گی۔ عائشہ بھابی نے ایسے میں اس کے سامنے بڑی اچھی تجویز رکھی تھی۔ وہ خوش ہوگئی۔

☆☆☆

ہارون، لائبہ اور اسما تینوں اس کے گرد جمع تھے۔ میرب نے پہلے تینوں کی کتابیں، کاپیاں پھر ڈائری چیک کی۔ لائبہ سنجیدہ اور ذمے دار تھی۔ ہارون شوخ سا تھا جبکہ اسما آفت کی پرکالہ تھی۔ اسے پکڑ کے بٹھانا اور کوئی بات سمجھانا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

اشہل گھر لوٹا تو میرب کمرے میں کہیں نظر نہیں آئی۔ ورنہ وہ جب بھی واپس آتا میرب کمرے میں ہی ملتی اور زوردار آواز میں سلام کرتی جس کا جواب وہ عام سے انداز میں دیتا۔ تب میرب کی آنکھوں کی جلتی جوت بجھ جاتی، اشہل نے اس کے ساتھ کچھ ایسا دوستانہ رویہ نہیں رکھا تھا کہ میرب سارے دن کی... روداد اس کے گوش گزار کرتی۔ وہ صرف ایک روایتی شوہر ہی لگتا۔ حقوق وفرائض پہ لیکچر دیتا اس کی خامیاں گنواتا...... اور خاص طور پر اس کی سختی اور درشتی کے حوالے سے طنز کرتا۔

میرب تو بالکل بدل گئی تھی۔ شادی سے پہلے وہ بڑھ بڑھ کر دلائل دیتی اور بولتی تھی۔ اپنے آگے وہ کسی کو بولنے ہی نہیں دیتی تھی پر اب سب کچھ بدل گیا تھا۔ اشہل اپنے سامنے اسے بولنے نہیں دیتا تھا۔ ایک دو بار اختلاف پہ میرب نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اشہل نے وہیں خاموش کروادیا۔ اپنے سامنے میرب کو وہ کچھ گردانتا نہیں تھا۔ کم از کم میرب کو تو ایسا ہی لگتا تھا۔

☆☆☆

"بھابی' میرب کہاں ہے؟" اس نے عائشہ بھابی سے پوچھا۔

"ہارون اور اسما وغیرہ کو پڑھا رہی ہے۔" انہوں نے خاصے مصروف سے انداز میں کہا۔

"زبردست۔" اشہل کے لبوں پر شرارتی سی مسکراہٹ آگئی۔

میرب، اسما کی کتاب پر جھکی ہوئی تھی۔ ہارون ایم سی کیوز کر رہا تھا لائبہ میتھ کے سوال کر رہی تھی۔ میرب کی ساری توجہ آفت کی پرکالہ اسما کی طرف تھی۔

''ہاں جی کیا ہو رہا ہے؟'' اشہل نے جاندار آواز میں اپنی آمد کی طرف توجہ دلائی۔

''چاچو آپ آگئے۔'' اسما پڑھائی بھول کر اشہل کی طرف لپکی۔

''اسما پہلے یہ کام کرلو۔'' میرب نے رعب دکھانے کی ناکام سی کوشش کی۔

''میری گڑیا......'' اشہل نے ساڑھے پانچ سالہ اسما کو بازوؤں میں بھر لیا اور اسما بھی مگن تھی۔ میرب کی طرف اس کا دھیان نہیں تھا جو بڑے صبر سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''جاؤ اسما گڑیا پہلے پڑھ لو ورنہ ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی اور خون پی لیا جائے گا تمہارا۔'' آخری دونوں جملے کسی اور کی سمجھ میں نہ آئے ہوں پر میرب سمجھ گئی تھی کہ اسے سنانے کے لیے کہا گیا ہے۔ اشہل جم کر وہیں بیٹھ گیا۔ اب بچوں کی توجہ میرب کی طرف کم اور اشہل چاچو کی طرف زیادہ تھی۔ وہ جان کر یا پھر میرب کو چڑانے کے لیے ان سے باتیں کرنے لگا۔ پڑھائی کیا خاک ہونی تھی۔ وہ تینوں اپنے چاچو کے گرد جمع ہوگئے اور وہ غصے سے اٹھ کر باہر آگئی۔

اشہل کا جی چاہ رہا تھا کہ زور زور سے قہقہے لگائے، میرب کی بے بسی دیدنی تھی۔

''محترمہ اب لائن پہ آئیں گی۔'' اشہل نے خوش دلی سے سوچا۔

☆☆☆

عائشہ بھابی بچوں کے رزلٹ سے کافی خوش تھیں کیونکہ منتھلی ٹیسٹ میں ان کی کارکردگی پہلے کی نسبت بہت اچھی تھی۔ اسما میرب کو بہت تنگ کرتی تھی۔ وہ پڑھانے بیٹھتی تو سوال کر کر کے اسے زچ کردیتی۔ اسما کے اسکول سے بھی شکایتیں آتیں کہ وہ کلاس میں جو کچھ پڑھایا جا رہا ہو اس موضوع کی... مطابقت سے سوال نہیں کرتی بلکہ بچوں کی توجہ بھی کسی اور طرف مبذول کروادیتی ہے، عائشہ بھابی اس حوالے سے بہت پریشان تھی۔ اسما نے اپنی شرارتوں سے ناک میں دم کیا ہوا تھا۔ میرب جب بھی پڑھانے بیٹھتی وہ کچھ نہ کچھ الٹا کرتی۔ پنسل شارپ کرنے یہ آتی تو شارپ کر کے ختم کردیتی سوال کرتی تو حیرت انگیز......بعض اوقات میرب بھی اتنی سی بچی کے منہ سے ایسے سوال سن کر حیران رہ جاتی۔

عائشہ بھابی نے میرب کو فری ہینڈ دے دیا تھا اور کہا تھا کہ بے شک سختی سے کام لو۔ وہ اب مطمئن تھیں...کیونکہ میرب کو بچوں کو قابو کرنا آتا تھا۔ اس نے کسوئی کو بھی تو آخر قابو کیا تھا۔ کسوئی کی یاد آتے ہی اسے گویا بہت کچھ یاد آگیا تھا۔ کتنے دن ہوگئے تھے اس نے میکے کا چکر نہیں لگایا تھا۔

''آپ مجھے امی کی طرف چھوڑ دیں گے؟'' اس نے امید طلب نگاہوں سے اشہل کی طرف دیکھا۔ ہارون اور لائبہ اپنے اپنے بیگ لے کر جا چکے تھے اسما ان سے بھی پھرتیلی تھی۔ کب کی بھاگ گئی تھی۔ اشہل اب فارغ تھا تب ہی میرب نے پوچھا تھا۔

''ٹھیک ہے؟'' اس نے مختصراً جواب دیا جو اس کی رضامندی کا مظہر تھا۔ وہ اسی وقت تیار ہونے چل دی تھی۔ کسوئی اور اسامہ اسے دیکھتے ہی دائیں بائیں چمٹے تھے۔

''پھپھو اتنے دن بعد آئی ہیں، میں نے آپ کو بہت مس کیا۔'' کسوئی بڑے لاڈ سے بولی تھی۔ میرب نے اس کے ماتھے پہ پیار کیا......میرب کے بعد وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''یار تھوڑا سا پیار ہمارے لیے بھی رکھ دو' میرے بھی کچھ احسان ہیں آپ پر۔'' اشہل نے باری باری اسامہ اور کسوئی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میرب اس کا طنز اچھی طرح سمجھ گئی۔ اتنے میں سارہ بھابی اور امی بھی اس کی طرف بڑھیں۔

اشہل دیکھ رہا تھا کہ اسامہ اور کسوئی، میرب کے پاس سے اٹھ ہی نہیں رہے تھے۔ اسامہ اسے اپنے فائنل ٹرم کے رزلٹ کا بتا رہا تھا۔ میرب بہت خوش ہوئی۔

''پھپھو میں بھی تھرڈ آئی ہوں، میں اب روز خود پڑھتی ہوں۔'' کسوئی نے بھی لہک کر بتایا جس پر میرب کی خوشی دیدنی تھی۔

☆☆☆

اسما کے ایگزام قریب تھے۔ وہ شہر کے ایک مہنگے اور بے حد معیاری اسکول میں زیرِ تعلیم تھی۔ عائشہ بھابی تینوں بچوں کی پڑھائی کی ذمے داری اس کے سپرد کر کے خوش تھیں پر اسما آئے دن ان کی خوشی کو خاک میں ملانے پر تلی رہتی۔ اس بار وہ بھی جھنجلائی ہوئی تھیں۔

''اس بار یہ کوئی سُستی دکھائے تو بے شک اس کی خاطر تواضع کرو۔'' میرب نے بھی سکون کی سانس لی ورنہ اسما جس طرح کی شرارتی بچی تھی۔ میرب بہ مشکل خود کو روک پاتی تھی۔ اب عائشہ بھابی نے اجازت دے دی تھی اب تو کوئی عذر اور خوف بھی مانع نہیں تھا۔ اسما پڑھانے کے دوران لائبہ اور ہارون کو بھی ڈسٹرب کر رہی تھی۔ ہارون سائنس کی ڈایاگرام بنا رہا تھا۔ اسما نے زور سے کہنی ماری۔ ڈایاگرام پہ بدنما سی لکیر بن گئی۔ اسما اپنے ہوم ورک کی طرف ذرا بھی متوجہ نہیں تھی۔ میرب نے دیکھ لیا تھا۔ اس کا پرانا غصہ عود آیا۔

''اب میں نے اس طرح کرتے دیکھا تو اچھا نہیں ہوگا۔'' میرب، اسما کی طرف جھکی ہی تھی کہ اشہل جو دروازے میں کھڑا تھا اندر آگیا۔

''میرب صاحبہ! یہ ہمارے بچے ہیں، گوشت پوست سے بنے ہیں کسی جانور کے بچے نہیں ہیں، جن کی آپ قربانی کریں گی۔ زمانہ قدیم میں شاید خون پینے یا ہڈیاں توڑنے کی کوئی رسم ہوتی ہوگی پر یہاں میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔'' اشہل نے آگے بڑھ کر اسما کو اس کے سامنے سے اٹھایا۔ اب وہ خود اس کے مدِمقابل تھا۔ غصے سے دہکتی آنکھیں اس پر جمائے۔ ''بچوں پہ یوں رعب ڈال کر آپ خود کو کیا ثابت کرنا چاہتی ہیں؟'' وہ غصے میں آگیا تھا۔

میرب نے بچوں کے سامنے ایسی ہتک کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اشہل نے اس کا بازو پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا تھا۔ تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''درد ہوتا ہے ناں، بہت تکلیف ہوتی ہے، ان چھوٹے معصوم سے بچوں کو بھی ایسے ہی درد ہوتا ہوگا جب ان کی خاطر تواضع کرتی ہوں گی آپ۔'' اشہل ٹھیک ٹھاک غصے میں تھا۔

ہارون، چاچو کو غصے میں دیکھ کر مما کو بلا لایا۔ میرب رو رہی تھی۔ لائبہ اور اسما بھی پاس کھڑی روتی میرب کو دیکھ رہی تھیں لیکن ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر اسے چپ کرواتے۔ لائبہ کتنی بار اسما کو ڈانٹ چکی تھی کہ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ ہارون بھی اس پر آنکھیں نکال رہا تھا۔ اب عائشہ بھی اِدھر آگئی۔

اشہل ان کے آتے ہی اپنے کمرے میں جا گھسا۔ سائڈ ٹیبل سے گاڑی کی چابی اٹھائی اور گھر سے نکل گیا۔ پیچھے میرب چھکوں پھکوں رو رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے سامنے اشہل نے اس کی انسلٹ کی تھی۔ بے دردی سے بازو پکڑا تھا۔ کیا وہ ان بچوں کی کچھ نہیں لگتی؟ کیا اسے ان بچوں سے محبت یا لگاؤ نہیں ہے۔ کیا اس کا اتنا حق بھی نہیں ہے کہ وہ کسی رشتے سے ان کی کسی کوتاہی پہ سرزنش کرسکے۔

یہ ٹھیک ہے کہ اسے رعب ڈالنے یا اپنی منوانے

کی عادت تھی مگر یہاں آ کر اس نے اپنا کوئی ایسا حق نہیں جتایا تھا۔

کسوئی اور اسامہ اس کے بھائی کی اولاد تھے۔ اس نے جب بھی سختی کی ان کی بھلائی اور پڑھائی میں اچھے رزلٹ کی خاطر ہی کی۔ بچوں کی بدتمیزی اور نالائقی وہ کسی صورت برداشت نہیں کر سکتی تھی اور یہی اس کی خامی تھی۔

اشہل نے تو پہلے دن ہی صاف کہہ دیا تھا کہ یہ رعب اور برتری یہاں نہیں چلے گی اور نہ میں کوئی سختی برداشت کروں گا۔ وہ یہ سب باتیں پیار سے بھی تو کہہ سکتا تھا پھر شاید اسے اتنا دکھ نہیں ہوتا۔ اشہل اس معاملے میں کسی رعایت کا قائل نہیں تھا۔

عائشہ بھابی نے بڑی مشکل سے اسے خاموش کروایا تھا۔ میرب نے انہیں منع کر دیا تھا کہ گھر کے کسی بھی فرد سے اس کا ذکر نہ کریں۔ عائشہ بھابی اس کی سمجھداری کی قائل ہو گئی تھیں۔ اشہل رات گئے کہیں واپس آ گیا۔ تب تک وہ سو چکی تھی۔

صبح اشہل جاگا تو میرب سو رہی تھی۔ اس کے آفس جانے کے ٹائم پہ وہ خود بخود ہی اٹھ جاتی تھی۔ اسے دیر تک سونے کی عادت نہیں تھی مگر آج وہ سو رہی تھی۔ اشہل نے بھی نہیں جگایا تھا۔

☆☆☆

صفورہ کی تاریخ طے ہو گئی تھی۔ میرب نے اشہل کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا، وہ کون سا کم تھا فوراً اکڑ میں آ گیا۔ اسے میرب کی صرف چند عادتوں سے اختلاف تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ اسے ناپسند کرتا ہو۔ بس دوبارشروع میں جس طرح بچوں کے ساتھ اس کا رویہ دیکھا اس پر وہ ڈسٹرب تھا کہ جانے آئندہ زندگی میں وہ کیسی بیوی ثابت ہو گی لیکن سسرال آ کے جانے کیوں وہ اشہل سے خائف سی تھی۔ یہاں اس کی وہ عادتیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں نظر آئیں جس پر وہ ڈسٹرب تھا۔ میرب کی خاموشی اسے کھلتی تھی۔

اکثر اوقات وہ جان کر زیادتی کر جاتا کہ جواب میں وہ کچھ تو بولے مگر لڑائی جھگڑا کرنے والی میرب جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔ اس پر بھی اشہل کی مردانہ انا جوش میں آ جاتی۔

صفورہ کے جہیز کا تقریباً تمام سامان آ گیا تھا۔ زیور بھی گھر میں ہی رکھا گیا تھا۔ میرب تمام کپڑے فائزہ کے ساتھ مل کر پیک بھی کروا چکی تھی۔ اس نے کافی بڑھ چڑھ کر تمام کاموں میں حصہ لیا تھا۔ اشہل کی والدہ حُسن آرا بیگم بہت نرم دل اور سخی تھیں۔ صفورہ کی شادی سے پہلے انہوں نے بہت سی محتاج عورتوں کی مالی مدد بھی کی تھی یہ کوئی آج کی بات نہیں تھی۔ شروع سے ہی ان کے ہاں گھر کی آمدنی میں ضرورت مندوں کا حصہ رہتا تھا۔ اس وجہ سے ان کا گھرانا آس پڑوس میں مشہور بھی تھا۔ اس مشہوری کا سبب وہ ضرورت مند عورتیں تھیں جو یہاں سے مالی امداد لے کے جاتی تھیں وہ اوروں سے بھی ذکر کرتیں۔ اس وجہ سے حسن آرا بیگم کی جان پہچان کی سب عورتیں ان کی بہت عزت کرتی تھیں۔ ان کے گھر کے دروازے ہر ضرورت مند کے لیے کھلے رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ صفورہ کی شادی میں ان محتاج عورتوں کو ان سے بہت امیدیں تھی۔ انہوں نے حتیٰ المقدور ان کی مدد بھی کی تھی۔

اس روز بھی ناشتے کے بعد باہر لان میں بیٹھی ہوئی تھیں...... بہویں اپنے کاموں میں مشغول تھیں۔ گھر کے مرد اپنے، اپنے کام پر جا چکے تھے۔ خانساماں سودا سلف لینے نکلا ہوا تھا۔

حسن آرا بیگم گھاس میں پھدکتی ننھی منی چڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ جبھی باہر کے گیٹ پر کھٹکا ہوا۔ میرب بھی اسی طرف آ رہی تھی۔

''آ جاؤ دروازہ کھلا ہے۔'' حسن آرا بیگم قدرے اونچی آواز میں بولیں تا کہ باہر جو کوئی بھی ہے اندر آ جائے۔ اتنے میں میرب بھی ان کے پاس

آ کر بیٹھ گئی۔

گیٹ سے اندر جو عورت داخل ہوئی وہ بے حد خستہ حال اور مسکین نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ اور کپڑے اس کی بدحالی کا اعلان کر رہے تھے۔

''آؤ بی بی کہاں سے آئی ہو، کون ہو؟'' وہ اپنے مخصوص نرم لہجے میں بولیں...... عورت نے ہاتھ جوڑ کر انہیں سلام کیا اور ان کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

''حاجن بی بی میں ضرورت مند ہوں۔ گھر والے کوٹی بی ہے، چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میری کچھ مدد امداد کرو۔'' عورت نہایت مسکین تاثرات لیے ان کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

میرب بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ آہستہ آواز میں اپنے دُکھڑے رو رہی تھی۔ حسن آرا اسے کچھ سمجھا رہی تھیں۔ میرب نوٹ کر رہی تھی کہ اس عورت کی عقابی نگاہ گھر کے چاروں طرف گردش کر رہی ہے۔ آخر میں اس نے میرب کا بھی بھرپور جائزہ لیا۔ میرب کی کلائی سونے کی چوڑیوں سے بھری ہوئی تھی کان میں نازک سے ٹاپس اور ہاتھ میں دو قیمتی انگوٹھیاں تھیں۔ گلے میں موٹی سی چین بھی تھی۔ عورت بار بار اسے دیکھ رہی تھی۔

''حاجن بی بی مجھے سخت بھوک لگی ہے اگر کھانے کو کچھ مل جائے تو......'' عورت نے فرمائش کی تو حسن آرا بیگم نہ نہیں کر سکیں۔

''میرب بیٹا جاؤ کچن سے کچھ کھانے کو لے آؤ۔'' وہ اپنی نرم دل فطرت سے مجبور تھی سو فوراً میرب سے کہا۔ میرب کچن میں آ گئی پر اس کا ذہن اسی عورت میں اٹکا ہوا تھا۔ جانے کیوں اس کی چھٹی حس بار بار کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔

اِدھر وہ عورت اس کی ساس سے بہت سی معلومات لے چکی تھی۔ حسن آرا اسے حقیقی معنوں میں ضرورت مند سمجھ کر اس کی دلجوئی کرنے لگیں۔ میرب ناشتا لے کر آئی تو وہ عورت اپنی جگہ

البم

تصویریں انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہیں۔ کسی اداس لمحے میں آپ اپنی البم کی ورق گردانی کرتے ہوئے سوچتے ہیں کہ گزرے برسوں میں، میں نے کیا کھویا کیا پایا؟ ایسے مواقع پر میں سوچتا ہوں کہ کیا بڑھاپے کی ایک تصویر جس میں آپ وزیراعظم سے ہنس، ہنس کر باتیں کرتے ہوئے اپنی بتیسی کو بھی باہر گرنے سے بچانے کی کوشش کر رہے ہوں، جوانی کی اس تصویر سے بہتر قرار دی جا سکتی ہے جس میں آپ گنّے کی گانٹھیں چُوستے ہوئے ہنس، ہنس کر کسی دوست سے باتیں کر رہے ہوں؟ مجھے یقین ہے کہ کچھ لوگ اس کا جواب ہاں میں دے سکتے ہیں مگر یہ وہ لوگ ہوں گے جو زندگی کی مصنوعی خوشیوں سے خوش ہونے کی استعداد رکھتے ہیں۔ میں نے گزشتہ روز ایک دفعہ پھر اپنے بچپن کی وہ مضحکہ خیز تصویر دیکھی جس میں ، میں باورچی خانے میں دودھ پر سے ملائی اتار کر کھا رہا ہوں عین اس موقع پر میری یہ تصویر اتار لی گئی تھی جو آج بھی گھر میں مجھے بلیک میل کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ میں کبھی اس تصویر سے بلیک میل نہیں ہوا بلکہ یہ تصویر دیکھ کر میرے چہرے پر ہمیشہ ایک آسودہ مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔

اقتباس: ہنسنا رونا منع ہے، از عطاالحق قاسمی

پسند: بنین عباس، کراچی

سے فوراً کھڑی ہوگئی اور تیزی سے ان دونوں کی طرف پستول تان لی اور بلند آواز میں بولی۔

''آجاؤ جلدی سے راستہ صاف ہے۔'' سب کچھ بہت اچانک ہوا تھا۔ حسن آرا کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ یہی حال میرب کا تھا گویا اس کی چھٹی حس غلط نہیں تھی۔ عورت نے یہاں آتے ہی کہا تھا کہ اسے مرزا صاحب کی بیگم نے ان کے ہاں بھیجا ہے مرزا صاحب ان کے پڑوسی تھے۔ کسی نہ کسی کے توسط سے کوئی نہ کوئی آہی جاتا تھا اور ایسا ہونا معمول تھا۔ حسن آرا بیگم کو یہ بھی خیال نہ رہا کہ میرب سے کہہ کر باہر کا گیٹ بند کروادیتیں شاید خانساماں کے لیے کھلا چھوڑا ہوا تھا۔ اس عورت نے دو آدمیوں اور ایک عورت کے اندر آتے ہی کارروائی شروع کردی۔

''چلو آگے سب سے پہلے ہمیں زیور نکال کے دو۔'' اس عورت نے میرب کے پہلو کو ٹھوکا دیا۔ حسن آرا بیگم پہ تو گویا سکتہ طاری تھا ابھی پل بھر میں صورتِ حال کچھ بھی ہوسکتی تھی۔ یہ گویا منظم گروہ تھا جو تمام معلومات حاصل کر کے یہاں تک پہنچا تھا۔ ویسے بھی شادی والے گھر کی تلاش میں یہ جرائم پیشہ افراد لگے رہتے ہیں۔ میرب کو اندازہ تھا کہ اگر وہ اندر چلی گئی تو پھر وہ سب رونما ہونے سے کوئی نہیں روک سکے گا جو کچھ دیر میں ہونے والا تھا۔

''اندر چلو....'' اس عورت نے میرب کو زور کا دھکا دیا۔ میرب کے پاس سوچنے کو زیادہ وقت نہیں تھا۔ باہر دو آدمی اور پہلے والی مظلوم عورت گھر کے چاروں طرف پھر کر راستوں کا جائزہ لے رہے تھے حسن آرا کو لان میں ہی رسیّوں سے جکڑ لیا تھا کرسی کے ساتھ۔

میرب اندر لاؤنج کی طرف بڑھتی رہی یکا یک اس نے اپنا پیر کارپٹ میں خود الجھایا اور اس عورت کو بھی ساتھ گرا کر اس پر قابو کر لیا۔ یہ سب نہایت آناً فاناً ہوا تھا۔ ساتھ ہی میرب نے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔ اتنے میں خانساماں گیٹ پر پہنچ چکا تھا۔ حسن آرا کو اس حالت میں دیکھ کر اور میرب کی چیخیں سن کر وہ واپس پلٹا اور اگلے ہی لمحے پڑوسیوں کا گن مین اور دیگر کئی آدمی اس کے ہمراہ تھے۔

میرب میں جانے کہاں سے اتنی طاقت آسمائی تھی کہ اس لمبی مرد مار عورت کو قابو کیے رکھا۔ خانساماں نے گھر کے مردوں کو فون کر کے بلایا۔ پڑوسی تو پہلے ہی اکٹھا ہو چکے تھے۔ حسن آرا کی رسیاں کھولی گئیں۔ عورت کے باقی سب ساتھی اسے چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ ساتھ والے ابرار قدوائی نے ون فائیو.... پہ کال کر کے پولیس طلب کرلی تھی۔ وہ عورت اب پولیس کسٹڈی میں تھی۔

میرب اور حسن آرا سب کے گھیرے میں تھیں۔ سب ان سے پوچھ رہے تھے کہ یہ سب کیسے ہوا۔

''سب میرب کی بدولت ہوا ہے یہ اگر حاضر دماغی اور ہوشیاری سے کام نہ لیتی تو ہم نے آج لٹ جانا تھا۔'' ساس کی نگاہوں میں اس کے لیے تشکر تھا۔

ساریہ بھابی کو بھی کسی نے فون کر کے اس واقعے کا بتا دیا تھا۔ وہ ساس کے ساتھ فوراً پہنچیں۔ میرب کی ساس سب کے سامنے اس کی بہادری اور ہوشیاری کا تذکرہ کر رہی تھیں۔ وہ سن سن کر شرمندہ ہو رہی تھی۔

اس عورت نے میرب کے شور مچانے پر جب بھاگنے کی کوشش کی تو میرب نے اس کی کلائی میں اپنے دانت گاڑ دیے تھے جس پہ اس کی کلائی ٹھیک ٹھاک زخمی ہوگئی تھی۔ پولیس جب اسے لے کر جا رہی تھی تب ان سب کو میرب کے کارنامے کا پتا چلا تھا۔ شام تک کتنی بار اس واقعے کا ذکر ہوتا رہا جس کا کریڈٹ واضح طور پر حسن آرا نے میرب کو دیا تھا۔

یہ کوئی اتنی چھوٹی بات نہیں تھی جو نظر انداز کر دی جاتی۔ میرب کی بہادری پہ واہ واہ ہو رہی تھی۔ وہ گردن اکڑائے بیٹھی تھی۔ اسامہ بھی اپنی پھپو کی بہادری کا تذکرہ سن کر مما کے ساتھ آیا تھا اور بہت خوش تھا۔ ان سب سے بڑھ کر اشہل خوش تھا کہ اسے پہلی بار میرب پہ فخر محسوس ہوا۔ اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر پورے گھر کو بہت بڑے نقصان سے بچا لیا تھا۔

وہ بچوں میں گھری ہوئی تھی جو اس سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے۔ اشہل بھی پاس آکر بیٹھ گیا۔

''پھپو آپ کو ڈر نہیں لگا اس عورت سے؟'' اسامہ نے پوچھا۔

''ہاں تھوڑا تو ڈر لگا تھا اگر میں ڈرتی رہتی تو وہ سب لوٹ کر لے جاتے۔ اسی لیے میں نے شور مچا دیا۔''

''اور آپ نے اس عورت کو کیسے پکڑ لیا تھا جبکہ اتنے خطرناک تھے وہ لوگ؟'' یہ سوال ہارون کی طرف سے آیا تھا۔

''اگر میں ایسے نہ کرتی تو وہ لوگ سب کچھ آرام سے لوٹ کر لے جاتے... میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ لوگ بچنے پائیں۔'' میرب بہت خوش اور مطمئن تھی۔

''میرب میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں، مجھے آج سمجھ آئی ہے کہ قدرت نے تمہارے مزاج میں سختی کیوں رکھی ہے۔ اگر یہ سختی نہ ہوتی تو تم اپنی جان کی پروا کیے بغیر کبھی بہادری نہ دکھاتیں۔'' اشہل واقعی بہت شکر گزار لگ رہا تھا۔

''اس میں شکر گزار ہونے کی کوئی بات نہیں، آخر یہ میرا بھی تو گھر ہے۔'' وہ پل بھر میں ساری ناراضی فراموش کر گئی تھی۔

ہارون اور اسامہ اٹھ کے جا چکے تھے۔

''واقعی تم سے اب ڈر لگنے لگا ہے کہیں میری بھی ہڈیاں نہ توڑ دو اور خون نہ پی جاؤ۔'' اشہل اسے چھیڑ رہا تھا۔

''میں آپ کو ایسی نظر آتی ہوں بھلا!'' میرب کو سب کچھ یاد آگیا تھا۔ وہ نروٹھے پن سے بولی۔

''ارے نہیں، نہیں تم تو میری جان ہو، میں تو بس ایویں تمہیں تنگ کرتا رہا۔ اب نہیں کروں گا کیونکہ مجھے پتا چل چکا ہے کہ تم بہت اچھی ہو۔''

''اور جو پہلے الٹا سیدھا کہتے رہے۔'' پرانے حساب چکانے کا اچھا موقع تھا، وہ کیسے ہاتھ سے جانے دیتی۔

''اب نہیں کہوں گا۔''

''وعدہ......'' میرب نے اس کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔

''پکا وعدہ......'' اشہل کی آنکھوں سے خلوص اور محبت اس کے لیے جھلک رہی تھی۔

''میں اپنے بچوں کو تم سے ہی ٹیوشن دلواؤں گا۔'' اس کا ہاتھ دباتے ہوئے وہ شریر ہوا تو میرب کو شرم نے آگھیرا۔

وہ اشہل کو پیچھے دھکیلتے ہوئے کچن کی طرف چلی گئی۔ خانساماں نے چائے تیار کر دی تھی۔ ٹرالی میں لوازمات رکھے وہ اندر آرہی تھی جب اشہل نے اس کا نام لیا۔ میرب کے قدم خود ہی سست پڑ گئے۔ وہ اس کی تعریف کر رہا تھا اور اس تعریف میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ اسے اشہل کے خلوص سے زیادہ کسی چیز کی طلب بھی نہیں تھی۔ وہ اعتماد سے چلتے ہوئے آگے آگئی۔ اشہل کی مسکراتی نگاہ اس کی طرف اٹھی...... جواباً میرب نے بھی نگاہوں کی زبان میں اپنا یقین دلایا۔ وہ اب اندر تک شانت اور مطمئن تھی اور یہی اطمینان اس کا سرمایہ تھا۔



مکمل ناول



پارس

نمرہ احمد

کانفرنس روم میں گفتگو کی بھنبھناہٹ سی تھی۔ لمبی میز کے گرد براجمان افراد میں سے کچھ آپس میں معمول کی بات چیت کر رہے تھے...... باقی اپنے کاغذات اور فائلز کی ورق گردانی میں مصروف تھے۔

یہ کسی اہم میٹنگ کے آغاز سے قبل کا ایک منظر تھا۔ کانفرنس ٹیبل کی سربراہی کرسی خالی تھی۔ کرسی کے دائیں طرف بیٹھے صاحب گاہے بگاہے کبھی کرسی پہ اور کبھی گھڑی پر نگاہ ڈال لیتے انتظار...... ورانتظار......



اس کمرے کی سڑک کو رخ کرتی دیوار شیشے کی بنی تھی۔ اس کے پار نظر آتا منظر بہت حسین اور پُرفسوں تھا۔ نیلا آسماں، کپاس کے پھوں جیسے بادل جو سرسبز پہاڑیوں نے اپنے سروں پہ تاج کی صورت پہن رکھے تھے، گہری کھائیاں اور ناگن کی سی بل کھاتی سرمئی سڑک۔ کہیں چہل قدمی کرتے سیاح...... کہیں اِکادُکا گاڑیاں۔ وہ صبح اپنی تمام تر خوبصورتی اور رعنائی کے ساتھ بہت ٹھنڈی سی اتر رہی تھی۔

یہ مری سے قدرے دور ایک الگ، تھلگ سی وادی کا منظر تھا۔ یہ سارا علاقہ شہر کے رش، دھوئیں اور شور سے محفوظ کسی پوشیدہ جنت کے مانند تھا اور اپنے شیشے سے اس کا حسن دکھاتا یہ کانفرنس روم اس علاقے کے سب سے بڑے اور واحد سکس اسٹار ہوٹل کا تھا۔ یہ جس بلاک کی سب سے اوپری منزل پہ واقع تھا، وہ ہوٹل کے رہائشی بلاکس سے ہٹ کر تھا اور مینجمنٹ کے زیرِاستعمال ہی رہتا تھا۔

شیشے کے پار جو سڑک دکھائی دے رہی تھی وہ ہوٹل کے عقبی طرف تھی اور اُدھر کے ہی گیٹ سے ہوٹل مالکان اور اہم آفیسرز داخل ہوا کرتے تھے۔ ابھی کافی دیر سے وہ سڑک سنسان پڑی تھی۔ سربراہی کرسی کے ساتھ بیٹھے صاحب نے گھڑی اور خالی کرسی کو بار بار دیکھ کر اکتانے کے بعد یونہی گردن موڑ کر نیچے دیکھا تو اسی پل داخلی گیٹ سے ایک سیاہ چمکتی کار اندر داخل ہوتی دکھائی دی۔ وہ صاحب الرٹ سے واپس سیدھے ہوئے، ایک نظر اپنے اردگرد بے پروائی سے بیٹھے عملے پہ ڈالی اور پھر ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے خاموشی سے اپنی فائل کھول لی۔

وہ سیاہ کار گیٹ کے اندر آرکی۔ شوفر نے جھٹ نکل کر پچھلا دروازہ کھولا۔ ایک سیاہ کولہا پوری چپل میں مقید پیر زمین پر رکھتا دکھائی دیا اور پھر ایک لڑکی سیدھی ہوتی ہوئی باہر نکلی۔ اوپر سے اس کے چہرے کے خدوخال ٹھیک سے نظر نہیں آئے تھے۔ آنکھوں پر سیاہ گلاسز تھے۔ سانولی رنگت، سر کے وسط سے نکلی سیدھی مانگ...... مانگ کے دونوں اطراف کے بال دونوں کندھوں اور کمر کو ڈھانپتے سیدھے کہنی تک گرتے، اتنے سیاہ اور یکجا تھے جیسے شیمپو کے اشتہار میں ماڈلز کے ہوتے ہیں کہ کہیں بھی دو بالوں کے درمیان خلا نہ دِکھتا۔

ایک سیاہ ہینڈ بیگ کہنی سے لٹک رہا تھا۔ سرمئی سادہ شلوار قمیص اور کندھوں پر سیاہ شال جو پیچھے سے آتی، کندھوں کو ڈھکتی اپنے دونوں سرے سامنے گراتی، جنہیں سینے سے نیچے اس کے بازوؤں نے سہارا دیا ہوا تھا، ایسے کہ شال کی بکل نہیں ماری گئی تھی۔ اس کا چہرہ البتہ اوپر سے دیکھنے پہ قطعاً واضح نہ تھا۔

وہ سر جھکائے اندر چلی گئی اور شیشے کی دیوار سے نظر آتے منظر سے غائب ہوگئی۔

ذرا دیر گزری اور کانفرنس روم کے گلاس ڈورز کے پار جو شیشے کی دیوار کے مقابل تھے وہی لڑکی آتی دکھائی دی۔

کسی ایک کی نظر اس پہ پڑی، سرگوشی ہوئی، ایک سے دوسرے تک، نگاہیں اوپر اٹھیں، پورے کانفرنس روم میں ہلچل سی مچ گئی۔ فوراً کمریں سیدھی ہوئیں، فائلز ٹھیک کیں، لیپ ٹاپس کھل گئے، دروازہ کھلنے کی آہٹ ہوئی اور انتظار ختم۔

وہ اندر آرہی تھی۔ گلاسز جو خوب صورت سی چین سے متصل تھے گریبان پہ لٹکے تھے اور دروازے سے سربراہی کرسی پہ بیٹھنے تک اس کا چہرہ سب کی نگاہوں کا مرکز رہا تھا۔

بیضوی چہرہ، سانولی رنگت، پُرکشش نقش، سیاہ زلفیں، چوبیس پچیس سال کی عمر...... وہ سربراہی کرسی پہ آبیٹھی اور بیگ میز پہ ایک طرف رکھا۔ یوں کرتے ہوئے اس کے کانوں میں بڑی چوڑی کے سائز کی سلور بالیاں واضح ہوئیں جو اس کے چہرے کو ایک عجب جاذبیت بخشتی تھیں۔ بیگ رکھ کر اس نے سر اٹھا کر سب کو دیکھا اور تب اس کی آنکھیں دکھائی دیں۔ لانبی سیاہ آنکھیں، جن میں باہر آسمان کی سی شفافیت تھی، بادلوں کا سا مبہم سحر تھا اور پہاڑوں کی کھائی جتنی گہرائی تھی۔

اور ان آنکھوں میں کچھ اور بھی تھا...... شاید عجب خالی پن اور ویرانی...... امید اور خوشی کا یکسر ناپید ہونا۔

''گڈ مارننگ ایوری ون!'' اس نے بنا کسی مسکراہٹ کے سب کو مخاطب کیا۔ جواب میں ہلکی سی بھنبھناہٹ ہوئی، سر اثبات میں ہلے۔

''تنویر صاحب! جیسا کہ آپ نے کہا تھا کہ آپ کو آج آڈٹ کے متعلق بریف کرنا تھا۔'' وہ دائیں ہاتھ بیٹھے صاحب کی جانب متوجہ ہوئی۔ ''کیا آپ تیار ہیں' ہم شروع کریں؟''

''یس میم!'' وہ صاحب سر ہلا کر کھڑے ہوئے۔ ان کے ''میم'' کہنے کے انداز میں لاشعوری سی بے آرامی تھی، وہی جو اس کے گڈ مارننگ کے جواب میں وہاں موجود ہر شخص کے انداز میں تھی۔ عزت بھی تھی، احترام بھی تھا، تابعداری کا عہد بھی اور تعاون کی یقین دہانی بھی۔ مگر ایک ذرا سی بے آرامی، جیسے ابھی تک یقین نہ آیا ہو کہ وہ اس کی عزت، احترام، تابعداری اور تعاون پہ راضی ہوگئے ہوں۔

مگر یہ زندگی کے بہت سے دوسرے جذبوں کی طرح محض ایک آن کہا سا تاثر ہی تھا۔ پانی کے بلبلے کی طرح ذرا دیر کو فضا میں اُڑا مگر اپنی شفافیت کے باعث محسوس ہوئے بنا ہوا میں تحلیل ہوگیا۔ بات ہی ختم۔

تنویر صاحب نے کونے کی کرسی پر بیٹھی سیکرٹری کو اشارہ کیا، جس نے فوراً سر ہلاتے ہوئے لیپ ٹاپ پہ چند بٹن دبائے۔ پروجیکٹر پہ پریزنٹیشن چلنے لگی۔ میٹنگ کا آغاز ہوچکا تھا۔

تنویر صاحب ہاتھ ہلاتے ہوئے بریفنگ دے رہے تھے، اپنے تجربے، علم اور رائے کو باہم یکساں کر کے بیان کر رہے تھے اور وہ انہی کو دیکھتی، توجہ سے سن رہی تھی۔

اور اس وقت اس کی توجہ ہرگز' ہرگز بھی شیشے کے دروازے کے پار راہداری کی طرف نہیں تھی۔

راہداری میں اس پل کوئی آتا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ گرے ٹوپیس میں ملبوس، لمبا چوڑا، خوش شکل سا اٹھائیس' انتیس برس کا مرد تھا جس نے ہاتھ میں ایک فائل فولڈر پکڑ رکھا تھا۔ وہ کانفرنس روم سے ذرا دور، سیکرٹری کی ٹیبل کے ساتھ رکا، پھر متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا، چند لمحے کچھ سوچتا رہا اور ایسے کرتے ہوئے اس کی پُرکشش بھوری آنکھیں سکڑ گئیں پھر کسی نہج پہ پہنچ کر اس نے اسی ٹیبل کی کرسی کھینچی۔ اس کے انداز میں اعتماد اور آنکھوں میں عجیب سا عزم تھا۔

بیٹھتے ساتھ ہی اس نے پہلے سامنے بنے ایک آفس کی گلاس وال کے پار دیکھا۔ اندر کوئی نظر نہ آیا پھر گردن موڑ کر کانفرنس روم کو دیکھا......

اور سربراہی کرسی پہ بیٹھی لڑکی پہ نظر پڑتے ہی اس کا سارا وجود رک گیا۔

''پارس......!''

☆☆☆

وہ جس جگہ بیٹھا تھا، یہاں سے شیشے کے دروازے کے پار جاری کانفرنس صاف دکھائی دیتی، البتہ ساؤنڈ پروف گلاس کی وجہ سے آواز نہ پہنچتی۔

سربراہی کرسی پر براجمان لڑکی کا اِدھر سے نیم رخ نظر آرہا تھا، دائیں آنکھ، دایاں گال، دائیں کان میں پڑی بالی، دائیں طرف کے بال۔ وہ تنویر صاحب کی طرف پوری یکسوئی سے متوجہ تھی۔

''پارس!'' وہ بے اختیار بڑبڑایا۔ پھر چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا جیسے کسی کے سن لینے سے ڈرتا ہو مگر وہ اکیلا تھا۔ اس کے چہرے پر سکون واپس آیا۔

اس نے ، اس دفعہ قدرے اعتماد کے ساتھ، دوبارہ نگاہوں کا رخ اس لڑکی کی جانب کیا۔ منظر ویسا ہی تھا۔

مگر پھر دیکھتے ہی دیکھتے شیشے کے دروازے پر کسی ٹی وی اسکرین کی طرح ایک اور منظر چلنے لگا۔

آٹھ ماہ قبل کا منظر......

وہ ایک اپارٹمنٹ کا لونگ روم تھا، جس کی اونچی فرنچ ونڈوز سے باہر رات اور روشنی میں ڈوبی بلند عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ امریکا کی کسی ریاست کا اپارٹمنٹ لگتا تھا۔ لونگ روم کے وسط میں وہ خود، جینز اور سوئٹر میں ملبوس ایک ہاتھ میں نوڈلز سے بھری پلیٹ اور دوسرے میں موبائل پکڑے چلتا آیا اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے فون میں بولا۔

''خیریت...... بھائی جی؟ ایسی کیا بات ہے جسے بتانے کے لیے آپ اتنی لمبی تمہید باندھ رہے ہیں؟'' بولتے ہوئے اس کے چہرے پر تجسس بھرا اچنبھا تھا۔

جواب میں موبائل کے اسپیکر سے آواز گونجی ...... بھاری مردانہ آواز۔

''نامعلوم تمہیں سن کر کیسا لگے فیضی۔''

''آپ بتائیں تو سہی......!'' موبائل میز پر رکھ کر اب وہ کانٹے میں نوڈلز لپیٹ رہا تھا۔

''میں نے شادی کر لی ہے۔''

نوڈلز لپیٹتا اس کا ہاتھ ٹھہر گیا اس نے سر اٹھایا، چہرے کے تاثرات بلینک ہو گئے جیسے سمجھ نہ آیا ہو، پہلے حیرت پھر خاموشی پھر ہچکچاہٹ......

''جی؟ آ...... ویل...... مبارک ہو مگر اتنے اچانک...... میں آجاتا پہلی فلائٹ سے......'' اب کے اس کی آنکھوں میں گلہ اترا۔

''نہیں، میں ابھی پارس کو اپنے خاندان سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے خود ہی کسی کو نہیں بلایا۔''

''پارس......؟'' اس نے دُہرایا۔

''میری بیوی...... ہم نے ایک ماہ قبل شادی کی ہے، یہیں مری میں۔''

''اوہ، آپ ابھی تک مری میں ہیں؟'' وہ چونکا۔'' ابھی ڈیڑھ ماہ پہلے آپ مری گئے تھے، برفباری دیکھنے اور مری والے ہوٹل کا وزٹ کرنے، میں سمجھا تھا کہ آپ واپس لاہور آگئے ہیں۔''

''نہیں فیضان، میں واپس نہیں آیا، مجھے یہاں کی آب و ہوا راس آگئی ہے۔''

اس نے نوڈلز کی پلیٹ رکھ دی۔ چہرے کے تاثرات عجیب تھے جیسے پریشان ہو، خفا ہو مگر ظاہر نہ کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

''جیسا کہ میں نے بتایا فیضی، میں پارس کو اپنے خاندان سے دور رکھنا چاہتا تھا، اسی لیے میں تمہیں بتا نہیں سکا۔''

''مگر کیوں بھائی جی؟''

''دیکھو جب ایک چوبیس سال کی ہوٹل ریسپشنسٹ، اڑتالیس برس کے ہوٹل مالک سے شادی کرتی ہے تو لوگ ان کے رشتے کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ بالخصوص جب شادی سے قبل انہیں ایک دوسرے کو جانے محض پندرہ دن ہی ہوئے ہوں۔'' وہ لمحے بھر کو رکے۔'' میں اس پر شک نہیں کرتا مگر خاندان والے، تم، سویرا (بہن) تم لوگ اس کو اتنی جلدی قبول نہیں کرو گے۔ اس لیے میں پہلے اس رشتے کو وقت دینا چاہتا ہوں، اس کے بعد میں اپنے خاندان کو پارس سے اور پارس کو اپنے خاندان والوں سے متعارف کروادوں گا۔ تب تک وہ مری والے گھر میں ہی رہے گی، کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو؟'' وہ خاموشی سے لب کاٹ رہا تھا۔

منظر تحلیل ہوا۔ یادیں دھندلی ہو گئیں۔ حال واپس اردگرد آن ٹھہرا۔

شیشے کے دروازے کے پار کانفرنس روم میں میٹنگ ہنوز جاری تھی۔ سیاہ بالوں والی لڑکی اسی

طرح بیٹھی تنویر صاحب کو سن رہی تھی۔

اس نے سر جھٹک کر رخ پھیرا۔ سامنے سیکرٹری کی خالی نشست تھی جس پر کمر کے آرام کے لیے نیلی گدی رکھی تھی۔ وہ گدی کے نیلے فیبرک کو دیکھنے لگا۔ چند لمحے ہی گزرے کہ حال پھر سے ماضی میں گم ہونے لگا۔ گدی کا نیلا کپڑا نیلگوں آسمان میں تبدیل ہوتا گیا۔

شام کا آسمان...... لمبی سڑک، کنارے پر گھنے اونچے، درخت۔ وہ دور سے بھاگتا آرہا تھا۔ ٹریک سوٹ میں ملبوس، پسینے میں تر، کانوں میں ہینڈ فری لگائے، چہرے پر دبا دبا غصہ تھا، وہ جیسے خفگی سے فون میں کچھ بول رہا تھا۔ بولتے بولتے اب اس کی رفتار آہستہ ہو گئی تھی۔ جب وہ مزید قریب آیا تو تیز سانسوں کے درمیان الفاظ واضح ہوئے۔

''بھائی جی، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ابھی آپ کی شادی کو ڈیڑھ ماہ ہوا ہے اور آپ نے مری والا ہوٹل اس کے نام کر دیا؟''

''اُن کے نام، فیضی۔'' انہوں نے سختی سے ٹوکا۔

اس کے چہرے پہ برہمی در آئی۔ بہرحال وہ بولا۔

''سوری...... مگر 'ان' کے نام اتنی جلدی کیوں پورا ہوٹل لگا دیا؟ آپ تو کہہ رہے تھے کہ اس رشتے کو وقت دیں گے؟''

''وہ میں دے رہا ہوں مگر مری والا ہوٹل اس کے حق مہر میں لکھوایا گیا تھا فیضی۔''

''واٹ؟'' وہ اپنے قدموں پہ رک گیا۔ چہرے پر بے یقینی در آئی۔'' انہوں نے حق مہر میں آپ کا اربوں کی مالیت کا سکس اسٹار ہوٹل مانگ لیا؟''

''اس نے نہیں مانگا تھا، اس کی والدہ نے کہا تھا اور دیکھا جائے تو یہ مطالبہ حق بجانب تھا۔ میں پورے ملک میں آدھ درجن ہوٹلز کا مالک ہوں، ان میں سے ایک ہوٹل اگر وہ اس سکیورٹی کے تحت مانگتی ہیں کہ یہ امیر بڈھا چھٹیاں ختم ہوتے ہی ان کی بیٹی کو چھوڑ کر یعنی اس کی زندگی برباد کر کے کہیں نہیں چلا جائے تو وہ غلط تو نہیں ہیں۔''

''مری والا ہوٹل آپ کے باقی تمام ہوٹلز کی کل مالیت سے بھی مہنگا ہے بھائی جی۔ آپ غلطی کر رہے ہیں مگر آپ کو احساس نہیں ہے۔''

''اس کو جج مت کرو، وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔'' کانوں میں لگے ہینڈ فری سے گونجتی ان کی آواز تھکی تھکی تھی۔

''کیا کہہ سکتا ہوں۔'' اس نے آستین سے نم پیشانی رگڑی اور فون بند کر دیا۔ پھر چند لمحے دبے دبے غصے سے فون کو دیکھتا رہا پھر فون بک سے ایک نمبر نکالا۔

''سویرا آپا، آسٹریلیا۔'' ڈائل کر کے فون کان سے لگایا اور پھر سے چلنے لگا۔

''سویرا آپا...... کیا آپ یقین کریں گی رضوان بھائی نے کیا کیا؟'' وہ جھنجلایا ہوا کہہ رہا تھا۔'' انہوں نے مری والا ہوٹل اپنی بیوی کے نام کر دیا۔ بھائی بہت سادہ ہیں، اس دفعہ تو حد ہی کر دی۔ مگر میں جلد پاکستان جاؤں گا اور دیکھ لوں گا اس عورت کو۔'' وہ بات کرتے ہوئے اب دور جا رہا تھا۔ آواز مدھم ہوتی گئی...... نیلا آسمان نیلی گدی میں غائب ہوا۔

دروازہ کھلنے کی بار بار آتی آواز۔ وہ چونک کر حال میں پلٹا۔ میٹنگ برخاست ہو چکی تھی۔ تمام افراد یکے بعد دیگرے باہر نکل رہے تھے۔ وہ البتہ ویسے ہی ساکت اندر بیٹھی تھی جیسے کوئی مجسمہ ہو۔

وہ وہیں بیٹھا پارس کو دیکھتا رہا۔ کچھ تھا اس عورت میں...... سحر...... طلسم۔ بار بار نگاہ اس کی طرف اٹھتی تھی۔ اس کی نگاہیں بھی بار بار اٹھیں اور پھر پارس کی بالی سے الجھ گئیں۔

سلور بالی کے گول دائرے کے اندر یادوں کا رنگ پھر سے بھرنے لگا۔

اس کے اپارٹمنٹ کا بیڈ روم، بیڈ پہ کھلا بیگ اور

وہ ساتھ کھڑا کپڑے تہ کر کے اندر رکھ رہا تھا۔ دفعتاً سائڈ ٹیبل پر دھرے فون کی اسکرین جلنے بجھنے لگی۔

''بھائی جی۔'' اس کے چہرے پر ہیجان نمودار ہوا۔ قدرے متذبذب انداز میں فیضان نے فون اٹھالیا۔

''جی، بھائی جی۔'' وہ فون کان سے لگائے ان کی باتوں کے جوابات دینے لگا۔

''بس ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟''

''نہیں کچھ خاص نہیں، روٹین، جاب، بس......''

''نہیں، پاکستان آنے کا ابھی تو پروگرام نہیں۔'' الفاظ ذرا اٹکے، نگاہ ترچھی کر کے سائڈ ٹیبل پر ڈالی۔ پاسپورٹ، کل کی تاریخ کا پاکستان کا ٹکٹ۔ اس نے نگاہ چرالی۔

''جی، میں نے سویرا آپا کو پچھلے ہفتے کہا تھا کہ آؤں گا مگر ابھی ارادہ بدل گیا ہے۔'' کمرا مدھم ہو کر ہوا میں بہتا گیا۔ سلور بالی کے درمیان بھرے رنگ پارس کے بالوں میں مل کر سیاہ ہو گئے، وہ پھر سے چونکا۔

وہ باہر آرہی تھی۔ فیضان تیزی سے سیدھا ہوا، پھر اسے آتے دیکھ کر اپنے پتھریلے تاثرات میں زبردستی بشاشت پیدا کی۔

''مسز پارس!'' وہ اپنے آفس کی سمت جا رہی تھی، آواز پہ پلٹی۔ سیاہ آنکھوں میں اجنبیت اور استفسار در آیا۔

''جی۔''

''میں...... آپ نے مجھے پہچانا؟'' سوال کرتے ہوئے فیضان کا سارا جسم تن گیا۔ خوفزدہ، پریشان، مضطرب ......وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ فیضان جواب کی تلاش اس کی آنکھوں میں کر رہا تھا۔ ان میں دیکھتے ہوئے بھی سارے وجود پہ سحر سا چھانے لگتا تھا۔

''سوری، کیا ہم مل چکے ہیں؟'' پارس کی سیاہ آنکھوں میں اچنبھا ابھرا، انجان پن...... معذرت سے سر نفی میں ہلایا۔

''میں فائز ہوں۔'' اس نے دانستہ وقفہ دیا۔

''سوری آپ کس سلسلے میں آئے ہیں؟'' فیضان کے تنے تاثرات ریلیکس ہوئے، اطمینان، سکون۔

''آپ نے فنانشل ایڈوائزر کے لیے ایڈ دیا تھا۔ اسی سلسلے میں غالباً آپ کی سیکرٹری سے بات ہوئی تھی، مجھے گمان گزرا کہ وہ آپ تھیں، میں معذرت خواہ ہوں۔''

''اٹس او کے، انٹرویو ٹائم دس بجے ہے، آپ جلدی آگئے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے وال کلاک پہ نظر ڈالی...... ابھی سوا نو ہوئے تھے۔

''شاید مجھے اس جاب کی باقی تمام امیدواروں سے زیادہ جلدی اور ضرورت ہے۔'' وہ چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

''اندر آجائیں۔'' وہ مڑ کر اپنے آفس میں چلی گئی۔ ایک فاتحانہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر در آئی۔ وہ اس کے پیچھے آیا۔

جب پارس اپنی گھومنے والی کرسی پر بیٹھی تو وہ بھی سامنے بیٹھا اور تب اس نے دیکھا۔ پارس کے بائیں ہاتھ پر میز پر رکھے ایک فریم میں ایک ادھیڑ عمر آدمی کی تصویر لگی تھی۔ کھچڑی بال، معمولی صورت، سیاہ سفید مونچھیں، مہربان مسکراہٹ...... فائز کے چہرے پر تکلیف سی ابھری مگر اگلے ہی پل اس کی جگہ مصنوعی مسکراہٹ نے لے لی۔

''آپ کے کریڈینشلز تو متاثر کُن ہیں۔'' وہ اب اس کی فائل کے صفحے پلٹتی کہہ رہی تھی۔ فائز اب کے قدرتی پن سے مسکرایا۔ لمحے بھر کو اس کے ذہن کے پردوں پر ایک منظر ابھرا۔

وہ درمیانی عمر کا ایک آدمی اس نیم تاریک کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا اس کاغذ کو پڑھ رہا تھا۔ اس کے سامنے کاؤنٹر کے اس طرف فائز کسی اونچے اسٹول پر بیٹھا تھا۔

''مجھے یہ تمام کاغذات جلد از جلد چاہئیں۔

ڈگریاں سرٹیفکیٹ، سب۔'' آدمی نے فہرست پڑھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہوں...... ہو جائے گا مگر پیسے لگیں گے۔''

''پیسوں کی فکر مت کرو، بس کام پکا ہونا چاہیے۔''

''اتنا پکا ہوگا کہ تم ان پر الیکشن بھی لڑ سکو گے۔'' وہ چہرہ اٹھا کر بھونڈے انداز سے ہنسا۔ فیضان حیات سنجیدہ رہا۔ آدمی کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

''کس نام سے بنوانا ہے؟''

''غور سے پڑھو...... اوپر لکھا ہے فائز حسن۔''

''فائز!'' اس نے دُہرایا۔

''فیضان سے فیض...... اور وہاں گورے فیض کو فائز بنا دیتے ہیں۔'' وہ وضاحت دے رہا تھا۔

منظر تحلیل ہو کر فضا میں بکھر گیا۔ پارس اب اس کی فائل بند کر رہی تھی۔ اس نے خود کو کمپوز کر لیا۔

''تو فائز صاحب، آپ آسٹریلیا سے اِدھر کیوں آئے؟'' اس نے دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسائے سنجیدگی سے فائز کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میم میرے فادر کی کافی عرصہ پہلے ڈیتھ ہو گئی تھی۔ میں سب سے بڑا ہوں، چھوٹی چار بہنیں ہیں، ان کی پڑھائی، جہیز، شادی سب مجھے ہی کرنا ہے۔ آسٹریلیا میں رہ کر میں زیادہ کما سکتا تھا مگر امی اور بہنیں مجھ سے دور نہیں رہنا چاہتیں، ان کا کہنا ہے کہ بھلے کوئی کم آمدنی جاب ہی کر لوں مگر یہیں کروں، اسی لیے میں واپس آگیا۔''

پارس کی آنکھوں میں خوشگوار سی حیرت ابھری، وہ مسکرائی نہیں مگر اس نے ستائشی انداز میں ابرو ضرور اٹھائی تھی۔

''اچھا...... تو اب لاہور سے اتنی دور مری؟''

''آسٹریلیا سے تو قریب ہی پڑتا ہے ناں مری۔'' وہ مسکرایا۔ پارس نے بنا کسی تاثر کے اثبات میں سر ہلایا۔

''آپ اس جاب کی نوعیت سے واقف ہیں، فائز صاحب......؟ آپ جانتے ہیں میں نے یہ ہوٹل حال ہی میں سنبھالا ہے، اس لیے مجھے کسی قابلِ اعتماد اور ذہین انسان کی ضرورت ہے جو میرے فنانشل ایڈوائزر اور اسسٹنٹ کے طور پر کام کر سکے۔''

''میں اس کام لیے خود کو اہل سمجھتا ہوں۔''

''او کے، دیگر انٹرویوز کے بعد فیصلہ کیا جائے گا کہ ہمیں کس کو رکھنا ہے، آپ کو نتائج سے مطلع کر دیا جائے گا۔'' اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائی۔ یہ انٹرویو ختم ہونے کا اشارہ تھا۔ وہ کھڑا ہوا پھر جیسے متذبذب سا رکا۔

''یہ...... آپ کے ہزبینڈ رضوان حیات کی تصویر ہے ناں؟'' پارس نے اشارے کی سمت دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چبھن سی اتری۔

''جی۔'' وہ بولی تو آواز ہلکی تھی۔

''ابھی باہر مجھے علم ہوا کہ چھ ماہ قبل ہی رضوان صاحب کی ڈیتھ ہوئی ہے۔ بہت افسوس ہوا۔ یہ جان کر اور بھی زیادہ کہ اس وقت آپ کی شادی کو صرف دو ماہ کا عرصہ گزرا تھا۔'' اس نے تاسف سے سر جھٹکا۔

پارس نے ہلکے سے اثبات کے ساتھ تعزیت وصول کی۔ اس کی آنکھوں میں اضطراب آگیا تھا۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ان کا انتقال کیسے ہوا؟'' اس کا لہجہ اب بھی متاسف تھا مگر پارس کو غور سے دیکھتی آنکھوں میں پتھراہٹ سی تھی۔ پارس کی نگاہوں کا مرکز اب بھی وہی سیاہ فوٹو فریم تھا۔

''وہ...... سیڑھیوں سے...... گر گئے تھے......'' اس نے تین حصوں میں فقرہ ادا کیا پھر نگاہیں اٹھا کر فائز کو دیکھا۔

وہ سمجھ کر افسوس سے سر ہلاتا چلا گیا تھا۔ وہ پھر سے فوٹو فریم کو دیکھنے لگی۔ اس کے سارے وجود میں اضطراب و بے چینی سی نظر آنے لگی تھی۔ چند لمحے بعد اس نے دوبارہ فریم سے نظر ہٹائی تو امیدوار فائز

آفس کے باہر کھڑا تنویر صاحب سے بات کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنے پیچھے شیشے کے دروازے بند کر گیا تھا۔ آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ پارس نے سر جھٹک کر ایک فائل کھول لی۔

☆☆☆

وہ جیسے ہی پارس کے آفس سے نکلا، سامنے سے آتے تنویر صاحب اسے دیکھ کر ٹھٹکے، رکے پھر حیرت سے اس کی طرف آئے۔ وہ ذرا سا مسکرایا پھر پلٹ کر دیکھا۔ پارس ویسے ہی ٹکٹکی باندھے فوٹو فریم کو دیکھ رہی تھی۔

''فیضی...... تم امریکا سے کب آئے؟'' ساتھ ہی انہوں نے پارس کی سمت دیکھا۔ وہ اب مطالعے کے لیے کوئی فائل کھول رہی تھی۔

''آہستہ تنویر بھائی، یہاں مجھے فائز حسن کے نام سے پکارا جاتا ہے اور اسی نام سے پکارا جائے گا، جب میں میڈم پارس کا فنانشل ایڈوائزر بھرتی کر لیا جاؤں گا۔''

''کیا مطلب یعنی تم......؟'' ان کی آنکھوں میں پریشانی اتری...... پھر سے پارس کو دیکھا۔ وہ متوجہ نہیں تھی۔

''میرے آفس میں آؤ۔'' دھیمی سرگوشی میں کہہ کر وہ مڑ گئے۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ان کے پیچھے ہو لیا۔

چند منٹ بعد وہ تنویر صاحب کے آفس میں ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کا انداز پُرسکون تھا جبکہ تنویر صاحب فکرمند دکھائی دے رہے تھے۔

''مجھے شروع سے بتاؤ، سارا معاملہ کیا ہے؟''

''سمپل......! میں بھائی جی کی موت کا سراغ لگانے آیا ہوں۔'' اس کی بات پر تنویر صاحب کے چہرے پر تذبذب ابھرا۔

''تم جانتے ہو اُن کی موت کیسے ہوئی تھی!''

''آپ بتائیے، کیسے ہوئی تھی؟''

''وہ سیڑھیوں سے گرے تھے۔''

''کیا واقعی، تنویر بھائی؟'' اس کا انداز سرد سا تھا۔

''فیضی......''

''یہ سیڑھیوں والی بات تو پارس نے سب کو بتائی ہے مگر میرے لیے زیادہ اہم وہ بات ہے جو آپ نے مجھے ان کی وفات کے بعد امریکا فون کر کے بتائی تھی۔''

''وہ میرا وہم بھی ہو سکتا ہے اور......''

''وہ آپ کا وہم نہیں تھا۔ آپ بہت کلیئر تھے اس بارے میں کہ جب بھائی جی کو غسل دیا گیا تو آپ نے واضح طور پر ان کے سر کے پچھلے حصے میں کسی نوکیلی چیز کے کھب جانے کا نشان دیکھا تھا۔''

''میں اب بھی کلیئر ہوں۔'' وہ جلدی سے بولے۔ ''اور یہی وہ زخم تھا جو انہیں سیڑھیوں سے گرنے پہ آیا۔ جس کی وجہ سے اُن کا انتقال ہوا۔''

''بجا فرمایا آپ نے مگر یاد کریں، آپ ہی نے مجھے بتایا تھا کہ اس وقت سیڑھیوں پر یا ان کے دامن میں کوئی ایسی نوکیلی چیز نہیں تھی جس کے اوپر گرنے سے اس طرح کی چوٹ آتی۔''

''ایسا ہی تھا۔'' انہوں نے ہار تسلیم کر لی۔ ''میں اپنی کہی ساری باتوں پر قائم ہوں، تم سے بحث کر کے میرا مقصد تمہیں کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے سے روکنا تھا فیضی مگر حقیقت یہ ہے کہ میرے ذہن نے کبھی اس ظاہری حادثے کو قبول نہیں کیا۔''

''نہ ہی میں اسے قبول کر سکا ہوں۔'' اس کے چہرے پر کرب اتر آیا۔ چند ثانیے کو کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

''تم جنازہ بھی نہیں پڑھ سکے، کاش میرا تم سے جلدی رابطہ ہو جاتا۔ پارس نے بس تھوڑا بہت اوپر انتظار کیا پھر تدفین کروا دی۔ سویرا کی فلائٹ کا مسئلہ تھا، وہ بھی نہیں آ سکی...... اور تم سے تو بات ہی تیسرے دن ہو پائی۔'' وہ افسوس سے یاد کر کے کہہ رہے تھے۔

''اور اس سے زیادہ دردناک بات کیا ہو گی تنویر بھائی کہ بھائی جی کے انتقال والے دن میں پاکستان میں ہی تھا اور تین دن بعد ہر شے سے بے خبر جب واپس پہنچا تو آپ کے میسجز دیکھے۔''

تنویر صاحب کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''تم تب پاکستان میں تھے؟ تو کیا تم رضوان سے ملے تھے، تم کہاں تھے؟ آخری دفعہ کب بات ہوئی تھی تمہاری اُن سے؟'' وہ بے اختیار آگے کو ہوئے۔ چہرے پر پریشانی، تجسس، حیرت سب واضح تھا۔

''امریکا میں آخری بات چار دسمبر کی رات کو ہوئی تھی جب میں پاکستان آنے کے لیے پیکنگ کر رہا تھا۔ ان کا فون آیا تھا مگر میں نے انہیں اپنی آمد کا نہیں بتایا۔ اس سے ٹھیک چار دن بعد میں اِدھر پہنچ چکا تھا۔ یہ وہی دن تھا جس رات بھائی جی کی ڈیتھ ہوئی تھی۔'' وہ بول رہا تھا اور آنکھوں میں کرچیاں سی چبھ رہی تھیں۔ ''میں نے انہیں اپنی آمد کی اطلاع اس لیے نہیں دی تھی کہ میں ان سے ملنے سے پہلے پارس میڈم کے بارے میں تحقیق کرنا چاہتا تھا۔''

تنویر صاحب سانس روکے اس کی بات سن رہے تھے۔ وہ میز پر رکھے پیپر ویٹ کو دیکھتے ہوئے کہتا جا رہا تھا۔

''پہلے دو دن میں نے پارس کے بارے میں تحقیق کی، مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک عام، غریب سی لڑکی تھی جس کی گویا لاٹری نکل آئی تھی اور کچھ نہیں جان سکا پھر اسی دوپہر میں بھائی جی سے ملنے چلا آیا۔'' کہتے ہوئے اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ یہ کھڑکی چھوٹی تھی مگر اس سے بھی ہوٹل کا عقبی حصہ اور سیاہ گیٹ دکھائی دیتا تھا۔

''اُدھر اسی گیٹ پر کھڑے ہوئے میں نے دیکھا تھا، ان دونوں کو......'' کہتے ہوئے اس نے لمحے بھر کو آنکھیں موندیں۔ بند پلکوں کے پار ایک یاد جھلملانے لگی۔

ہوٹل کے عقبی گیٹ کے آس پاس پہاڑیوں اور سڑک پر برف جمی تھی۔ ہر سو سفیدی تھی۔ وہ گیٹ کے پیچھے کھڑا گردن اٹھائے اوپر دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوئٹر کے اوپر جیکٹ اور سر پر اونی ٹوپی لے رکھی تھی۔ اوپر دکھائی دیتا منظر دیکھ کر آنکھوں میں عجیب دکھ اور بےبسی سی آ گئی تھی۔

اوپر شیشے کی دیوار کے پار کانفرنس روم نمایاں تھا۔ ایک کرسی پر سیاہ بالوں والی لڑکی بیٹھی تھی اور سامنے بھائی جی۔ لڑکی سر جھکائے مسلسل روتے ہوئے بار بار نفی میں سر ہلا رہی تھی اور بھائی جی جیسے اسے چپ کروانے، بہلانے کی سعی کر رہے تھے۔

فیضی کے ابرو تن گئے۔ آنکھوں میں خفگی جھلکی۔ اس نے یخ بستہ ہاتھوں کو رگڑ کر گرم کیا اور موبائل نکالا۔ امریکا کا نمبر رومنگ پر تھا۔ بھائی جی کو کال ملا کر اس نے فون کان سے لگایا۔ گھنٹی جا رہی تھی بھائی جی نے گھنٹی سنی تو بات روکی، ذرا اکتا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ فون اٹھایا نمبر پر نگاہ ڈالی اور فون کان سے لگایا۔

''ہیلو فیضی!'' انداز مصروف تھا۔

پارس ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی جیسے جانے لگی ہو۔ جیسے بھائی جی کے منہ سے فیضان کا نام سن کر جانے لگی ہو۔ بھائی جی نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر جیسے روکا۔

''بھائی جی، مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔''

''میں بعد میں بات کرتا ہوں تم سے، ابھی میں مصروف ہوں۔''

''بھائی جی میری بات آپ کی مصروفیت سے زیادہ ضروری ہے۔'' وہ دبے دبے اشتعال سے بولا۔ اوپر جمی نگاہوں میں تپش در آئی تھی۔

''کہا ناں فیضی بعد میں بات کرتے ہیں۔'' انہوں نے عجلت میں فون بند کیا اور پارس کو واپس بٹھایا۔

وہ ساکت ہوا ہاتھ میں فون پکڑے کھڑا رہ گیا پھر چند لمحے گزرے تو وہ ایک دم مڑا اور پیچھے کھڑی سفید کار کی طرف بڑھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔

تنویر صاحب دلجمعی سے سن رہے تھے۔

''اس رات دیر تک میں انہی سڑکوں پر ڈرائیو کرتا رہا۔ میں ہوش میں نہیں تھا۔ غصہ، بے بسی، احساسِ محرومی، پارس سے نفرت، میں نے ہر شے اپنے اندر محسوس کی تھی۔ وہ ایک اداکارہ تھی جو مصنوعی آنسو بہا کر بھائی جی کو اپنے سامنے باندھے بیٹھی تھی اور اس کے لیے بھائی جی نے مجھے دھتکارا۔''

''دیکھو انہوں نے تمہیں دھتکارا نہیں تھا صرف بعد میں بات کرنے کا کہا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ کسی اہم مسئلے میں پھنسے ہوں۔''

''بات رویے کی نہیں اس سیاق و سباق کی ہے جس میں، میں نے وہ منظر دیکھا۔ صرف پارس کی وجہ سے میں ان سے نہیں مل سکا۔ اس دن انہوں نے دو تین بار مجھے کال کی، میں نے فون ہی آف کر دیا۔ بس پاگلوں کی طرح ڈرائیو کرتا رہا۔ اس رات میں ہوش میں نہیں تھا۔ دل کرتا تھا کسی پہاڑ سے گاڑی دے ماروں۔ ایسا تو نہ تھا میں مگر ...... پھر رات میں، میں اسلام آباد چلا گیا۔ فون آف رکھا۔ سب سے دور ہوٹل میں لیٹا رہا۔ اگلے دن فلائٹ تھی۔ تیسرے روز جب امریکا پہنچا تو گھر کے فون پر آپ سب کے پیغامات سنے مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔'' اس کی آنکھیں شدتِ ضبط سے سرخ پڑ رہی تھیں۔ چہرے پر نفرت کی پتھراہٹ تھی۔

چند لمحے مزید سرکے۔ آفس میں چھایا تناؤ اب ڈھل کر ترحم و ہمدردی میں بدلنے لگا۔ تنویر صاحب کی پریشانی گم ہوئی، اب فقط فکرمندی رہ گئی۔

''اب تم نام بدل کر یہاں کیوں آئے ہو؟''

''پہلے میں اپنے نام سے آنا چاہتا تھا، بھائی جی کا بھائی بن کر ان کی قبر دیکھنے مگر پھر رک گیا۔ یہ خیال کہ مجھے یہاں آپ کے اور افضل بابا کے سوا کوئی نہیں جانتا...... مجھے ایک دوسری نہج پر سوچنے پر مجبور کر گیا۔ اب اسی لیے میں فائز حسن کے روپ میں بھائی جی کے قتل کا سراغ لگانے یہاں موجود ہوں۔''

''تمہیں کیا لگتا ہے؟'' تنویر صاحب قدرے توقف سے بولے۔

''سامنے کی بات ہے، بھائی جی کو قتل کیا گیا ہے اور یہ کام پارس کے علاوہ کوئی نہیں کرسکتا۔''

کمرے میں موت کا سناٹا چھا گیا۔

''فیضی...... فائز...... یہ بہت بڑا الزام ہے۔'' وہ متذبذب تھے۔

''یہ حقیقت ہے اور ایک دن میں پارس کے خلاف تمام ثبوت اکٹھے کر کے اس کو اقرارِ جرم کرنے پر مجبور کر دوں گا۔ آپ دیکھیے گا۔'' چند ثانیے پہلے کی تکلیف اب اس کے لہجے سے غائب تھی۔ اس کی جگہ سرد مہری، چبھن اور حد درجہ اعتماد نے لے لی تھی۔

''اور اگر اس نے تمہیں پہچان لیا؟''

''وہ مجھے نہیں پہچانتی، بے فکر رہیے۔ وہ مجھ سے کبھی نہیں ملی اور نہ ہی میری شکل بھائی جی سے ملتی ہے جو وہ پہچان جائے۔ تصاویر کا ویسے بھی مجھے شوق نہیں اور جو میری پرانی تصاویر فیملی البمز میں ہیں وہ سب لاہور میں پڑے ہیں۔ بھائی جی ایک دو دن کے لیے یہاں دورے پر آئے تھے بس اچانک سے شادی کی اور یہیں رہنے لگے۔ وہ اپنے ساتھ یہاں کچھ ایسا نہیں لائے تھے جس میں میری تصویریں ہوں، نہ وہ کبھی پارس کو لاہور لے کر گئے۔ افضل بابا نے خود یہ بات کہی ہے کہ پارس نے رضوان حیات کے بھائی کو کبھی نہیں دیکھا۔'' وہ سانس لینے کو رکا۔ ''ابھی جب میں اس سے ملا تو بھی اس کے چہرے پر شناسائی کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ اچھی اداکارہ نہیں ہے۔ بھائی جی کا ذکر کیا تو اس کے تاثرات فوراً بدلے اگر وہ مجھے پہچانتی ہوتی تو اس کے تاثرات

زیادہ تیزی سے بدلنے چاہیے تھے۔'' وہ پُرسکون تھا مگر تنویر صاحب کی فکرمندی ابھی کم نہیں ہوئی تھی۔

''اور اگر وہ تمہیں پہچان گئی تو؟''

''قتل اس نے کیا ہے، ڈرنا اسے چاہیے۔ میں کس بات سے ڈروں؟'' تنویر صاحب لاجواب ہوگئے۔

''فیضی...... نہیں فائز...... تم جذباتی تو ہو مگر اس کے باوجود تم نے کبھی کوئی احمقانہ حرکت نہیں کی۔ میں تمہیں عرصے سے جانتا ہوں اس لیے میری تم سے بس ایک درخواست ہے کہ پلیز جو بھی کرنا، سوچ سمجھ کر کرنا۔ ہوسکتا ہے کہ واقعی یہ ایک حادثہ ہو۔''

''وہ بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔'' وہ پُرعزم و ٹھوس انداز میں کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔ تنویر صاحب کی فکر ابھی تک کم نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

ہوٹل کے عقبی حصے پر شام ڈھل رہی تھی۔ سرسبز پہاڑیاں، گہری کھائی، ویران مگر خوب صورت علاقہ...... وہ ہر شے سے بے نیاز صبح کے انداز میں چلتی ہوئی گیٹ سے باہر نکلی۔ بس فرق یہ تھا کہ صبح گلاسز آنکھوں پر تھے تو اب گریبان پہ اٹکے تھے۔

ڈرائیور نے اسے دیکھتے ہی کار کا پچھلا دروازہ کھولا۔ وہ چند قدم آگے آئی پھر رک گئی۔ اس کی کار سے ذرا دور ایک چھوٹی، پرانے ماڈل کی کار کا بونٹ کھولے صبح والا امیدوار پریشان سا کھڑا تھا۔ کبھی کبھار کوئی تار چھیڑتا پھر فکرمندی سے سیدھا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتا۔

پارس نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا پھر اپنے منتظر کھڑے ڈرائیور کو...... ذرا سا تذبذب اس کی خوب صورت آنکھوں میں ابھرا پھر وہ آگے آئی، کار میں بیٹھی۔ ڈرائیور نے دروازہ بند کیا تو اس نے اسے روکا۔

''فرید خان!'' ساتھ ہی اپنی طرف کا شیشہ نیچے کیا۔

''جی میڈم۔'' وہ مؤدب سا پلٹا۔

''وہ پیچھے جو صاحب کھڑے ہیں ان سے پوچھو کہ کیا مسئلہ ہوا ہے ان کی کار کے ساتھ اور دیکھو اگر تم ان کی مدد کرسکتے ہو تو میں انتظار کر لوں گی۔''

''جی میڈم۔'' وہ فوراً فائز کی طرف گیا۔ پارس نے گردن نہیں موڑی۔ محض ڈرائیونگ سیٹ کے ڈور

پر لگے بیک ویو مرر میں دیکھا۔
ڈرائیور فرید خان اب فائز حسن کے پاس کھڑا کچھ کہہ رہا تھا۔ دونوں میں چند فقروں کا تبادلہ ہوا۔ فائز نے اس کی کسی بات پر چونک کر کار کی طرف دیکھا۔ چہرے پر شرمندگی اتری، وہ تیزی سے اس طرف آیا۔
''سوری میڈم، آپ کو میری وجہ سے زحمت کرنی پڑی۔'' وہ تشکر و احسان مندی سے کار سے ذرا فاصلے پر کھڑے ہوئے کہنے لگا۔ پارس کے تاثرات ویسے ہی سنجیدہ رہے۔
''کیا آپ کی کار خراب ہے؟''
''جی، پتا نہیں ایک دم سے کیا ہوگیا ہے۔ پرانی چیز کے تو ویسے بھی سو مسائل ہوتے ہیں۔''
''یہاں قریب میں کوئی ورکشاپ نہیں ہے، آپ کو مین سٹی جانا پڑے گا۔ آپ کار اِدھر لاک کردیں۔ فرید خان آپ کو شہر لے جائے گا۔'' فائز کے چہرے پر مزید شرمندگی ابھری۔
''میم...... آپ...... تھینک یو سو مچ مگر ابھی تو ڈرائیور کو آپ کو چھوڑنا ہوگا، میں کوئی دوسری کنوینس دیکھ لیتا ہوں۔''
''یہاں آپ کو پبلک ٹرانسپورٹ نہیں ملے گی۔ آپ چاہیں تو ہمارے ساتھ آجائیں۔ مجھے گھر ڈراپ کرکے فرید خان آپ کو لے جائے گا۔'' اس کا انداز بے تاثر تھا جیسے یہ آفر کا آخری حصہ ہو۔ اگر اب وہ انکار کرے گا تو وہ جیسے آپ کی مرضی کہہ کر آگے بڑھ جائے گی۔
''بہت شکریہ میم، میں کار لاک کرکے آتا ہوں۔''
تھوڑی دیر بعد وہ فرید خان کے ہمراہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا اور پارس پچھلی سیٹ پر براجمان باہر دیکھ رہی تھی۔ کار خاموشی سے اونچے نیچے رستوں پر محوِ سفر تھی۔
فرنٹ سیٹ پر بیٹھا فائز وقفے وقفے سے ایک نظر بیک ویو مرر پر ڈالتا جو یوں سیٹ تھا کہ پارس کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ وہ رخ ذرا موڑے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ کہیں بہت دور ہو۔ ایک سڑک پر آگے مڑ کر فرید خان نے گاڑی آہستہ کردی۔
''میڈم، اندر لے جاؤں گھر تک یا آپ یہیں اتریں گی؟'' فائز نے بے اختیار ونڈ اسکرین کے پار دیکھا۔
طویل سڑک جو اونچی ہوتی جارہی تھی کے اختتام پر اونچائی پر بنا ایک خوب صورت مخروطی چھتوں والا بنگلا تھا۔ جہاں کار رکی تھی۔ وہاں سے بنگلے تک کافی فاصلہ تھا۔
پارس بنا کچھ کہے دروازہ کھول کر اتر گئی اور بنگلے کی طرف چلنے لگی۔ فائز نے بظاہر گھبرا کر فرید خان کو دیکھا۔
''آپ انہیں گھر تک چھوڑ آتے مجھے کوئی جلدی نہیں تھی، میری وجہ سے......''
''میڈم ہمیشہ یہیں اترتی ہیں۔''
''مگر کیوں؟'' وہ حقیقتاً چونکا۔ فرید خان نے جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے بلند ہوتی سڑک کو دیکھتا رہا۔ جہاں پارس قدم قدم اوپر چڑھ رہی تھی۔ جب تک وہ بحفاظت گھر نہیں پہنچتی فرید خان وہاں سے ہٹتا نہیں تھا جب وہ اندر چلی جاتی تب وہ گاڑی گھر تک لے آتا۔
فائز کی نگاہیں بھی وہیں جمی تھیں۔ پارس کے اٹھتے قدم ویسے نہیں تھے جیسے ہوٹل میں داخل ہوتے یا نکلتے وقت تھے۔ اس کی چال آہستہ تھی۔ شکست خوردہ سی اور سوچ میں گم، دنیا سے دور...... وہ دھیرے دھیرے چلتی اب آدھا راستہ عبور کرچکی تھی۔ کار میں بیٹھے دونوں افراد کی نگاہیں لمحے بھر کو بھی اس سے نہیں ہٹی تھیں۔ ایک کی ذمے داری اور وفاداری سے لبریز تھیں تو دوسرے کی گہری سوچ اور مستقبل کی منصوبہ بندی سے۔

دفعتاً پارس رکی، سڑک کے درمیان میں کھڑی اس کی ان کی جانب پشت تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ گہری کھائی اور دائیں ہاتھ پہاڑ تھا۔ وہ آگے جانے کے بجائے دائیں طرف کو آئی۔ وہاں پہاڑ کو کاٹ کر بنائی گئی سیڑھیاں تھیں جو اوپر کسی پارک تک جاتی تھیں۔ سیڑھیوں کے دونوں طرف تا سڑک، پہاڑ سے چپکا جنگلا لگا تھا جس کا واحد مقصد اس جگہ کی تخصیص تھا۔
پارس سیڑھیوں کے قدموں میں رکی اور گردن اٹھا کر اوپر دیکھا اس کا نیم رخ مزید واضح ہوا۔ گردن اونچی کرنے سے کان سے بال پیچھے کو گرے، سلور بالی چمکی پھر وہ مڑی اور جنگلے کو دیکھا جہاں تک جنگلا تھا وہاں تک نگاہ دوڑائی۔ نگاہ تھک گئی تو وہ گھر کی سمت مڑ گئی۔ ان کی طرف پشت کیے وہ اب دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی آگے جارہی تھی۔
''یہ وہ جگہ ہے جہاں ہمارے صاحب کا انتقال ہوا تھا۔'' ڈرائیور نے سادگی سے بتایا۔ فائز کو جھٹکا لگا۔ اس نے بے یقینی سے ڈرائیور کو دیکھا۔
''وہ سیڑھیاں، یہ سیڑھیاں تھیں؟ میں سمجھا تھا کہ وہ گھر کے اندر کی سیڑھیاں ہوں گی۔'' وہ لمحے بھر کو غائب دماغ ہوا۔
''وہ یہی جگہ تھی۔ یہیں گرے تھے صاحب۔'' ساتھ ہی ڈرائیور نے مغموم انداز میں سر جھکا۔ پارس گھر کے قریب پہنچ چکی تھی۔ فرید خان نے کار اسٹارٹ کردی۔ فائز ابھی تک گہری نگاہوں سے پارس کا تعاقب کررہا تھا۔

☆☆☆

پارس نے چھوٹا سا لکڑی کے جنگلے کا سفید گیٹ عبور کیا۔ اس کے قدموں میں تھکاوٹ تھی، چہرے پر بھی تھکان تھی۔ گیٹ بند کرتے ہوئے وہ پلٹی تو دور جاتی گاڑی اب موڑ کاٹ رہی تھی۔ پارس نے اب بھی گاڑی کے بجائے ان سیڑھیوں کو دیکھا۔ آنکھوں میں چھائی اداسی گہری ہوگئی۔

ہائیکو

رُت پلٹتی نہیں، وقت رکتا نہیں
زور اپنا مقدر پہ چلتا نہیں
جینے والوں کو اب کوئی روتا نہیں

مرسلہ: نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدر مرجان

وہ پلٹ کر آئی ڈھلان پر بنے لان کے زینے چڑھنے لگی۔ آدھی سیڑھیوں کے درمیان وہ رکی اور جیسے غائب دماغی سے وسطی زینے کو دیکھا۔
اس وقت شام کا نیلگوں پن گہرا ہورہا تھا۔ ایسے میں اچانک کہیں سے سیڑھیوں پر ڈھیر ساری روشنی اتر آئی۔ لمحے بھر کو وہ سیڑھیاں ایک کچے پکے مکان کے صحن کے ساتھ بنے زینے میں ڈھل گئیں۔
صحن میں چند عورتیں جمع تھیں۔ سفید چادر پر دائرے میں بیٹھی گٹھلیاں پڑھتی عورتیں...... ان سب سے الگ تھلگ زینے کے وسط میں ایک بارہ تیرہ برس کی لڑکی بیٹھی تھی۔ لمبے بال، سانولا رنگ، بڑی بڑی پُرکشش آنکھیں جن میں خوف و یاسیت اتری تھی۔ وہ گھٹنے سینے سے لگائے ہراساں سی بیٹھی تھی۔ گھٹنوں اور سینے کے درمیان ایک مردانہ گرم ٹوپی بھی جکڑ رکھی تھی۔
دفعتاً نیچے عورتوں کے درمیان سے ایک عورت اٹھ کر اوپر آتی دکھائی دی۔ اس کا رنگ سانولا، کانوں میں سونے کی بالیاں اور آنکھوں میں کرختگی و شاطر پن تھا۔ وہ اوپر وسطی زینے پر آرکی۔
''پارو، اِدھر کیوں بیٹھی ہے؟'' اس کے انداز میں نرمی و ہمدردی نہیں تھی، سختی یا کرختگی بھی نہ تھی بس مشینی سا انداز تھا۔ لڑکی نے آنکھیں اٹھائیں۔ ان میں ویرانی تھی۔
''امی...... ابا واقعی چلا گیا؟'' ساتھ میں سیاہ

آنکھوں کے کٹورے لبالب بھر گئے۔

''لے کتنی دفعہ بتاؤں، مر گیا ہے تیرا ابا۔'' آواز میں جذبہ ابھرا۔ غصہ، طیش مگر آواز ہلکی رکھی۔ ''چھوڑ گیا ہے وہ ہم سب کو اور یہ کیوں تو اس کی ٹوپی پکڑے بیٹھی ہے؟ اِدھر دے۔'' عورت نے لڑکی کے گھٹنے میں دبی ٹوپی کھینچی، وہ کراہ کر رہ گئی۔

''کس کام کی ہے یہ ٹوپی۔ ردّی والے کو بیچو تو دو آنے بھی نہ ملیں...... مگر تیرا بھی کیا قصور پارو۔ ابے نے کون سا پیچھے خزانے چھوڑے ہیں جن کو دل سے لگا کر بیٹھے...... ہک ہا!'' وہ سر ہلاتی نیچے واپس جانے لگی پھر کسی خیال کے تحت واپس مڑی۔

''اور ہاں کل سے اسکول ضرور جائیو، پڑھ لکھ کر اب تو نے ہی یہ گھر چلانا ہے پارو۔ بھائی تیرا چھوٹا ہے، آگے اسے بھی پڑھانا ہے میری ہڈیوں میں اب زور نہیں رہا اور......'' اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''اب تو وہ عدت بھی پوری کرنی ہے۔ موئے مولوی بھی معافی نہیں دیتے۔ ایسا کر، کل اسکول کے بعد تو لفافے بنانے فیکٹری جانا، یہ ساتھ والی صفیہ بھی جاتی ہے اسی کے ساتھ چلی جانا۔ اب تو نے ہی کرنا ہے جو بھی کرنا ہے پارو۔'' ایک دم کسی بچے کے زور زور سے بولنے کی آواز آئی۔ ہراساں بیٹھی لڑکی نے بے اختیار بیرونی دروازے کی سمت دیکھا۔

''امی شکیل پھر کسی سے لڑ رہا ہے۔''

''چپ کر، تیرا بھائی نہیں لڑتا وڑتا۔ یہ سارے محلے کے مرن جوگے بچے اسے تنگ کرتے ہیں۔ ٹھہر ذرا، میں ان کی خبر لیتی ہوں۔'' وہ جارحانہ انداز میں باہر کو لپکی۔

''بی بی، آپ آگئیں کھانا لگواؤں؟'' افضل بابا سیڑھیوں کے اوپر کھڑے اسے پکار بیٹھے تو وہ جیسے کسی خواب سے جاگی۔ ایک نظر پھر زینے کو دیکھا اور سر جھٹک کر اوپر چڑھنے لگی۔

''مجھے بھوک نہیں ہے بعد میں کھالوں گی۔'' سنجیدگی مگر نرمی سے کہتی وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔ بوڑھا بابا سر ہلاتا ہوا برآمدے کی دوسری سمت چلا گیا۔

پارس نے لاؤنج میں قدم رکھا۔ بڑے صوفے پر پیر اوپر کر کے بیٹھی عورت کا چہرہ اس کی یادوالے چہرے جیسا تھا۔ فرق اتنا تھا کہ اب اس کے سامنے کے بال سفید تھے، دوپٹا سر پر لے کر کانوں کے پیچھے اُڑس رکھا تھا۔ کانوں میں اب ہلکی بالیوں کی جگہ سونے کے بڑے، بڑے جھمکے تھے۔ ملازمہ پلیٹ میں روسٹ کا پیس لیے جھکی کھڑی تھی اور وہ عورت (فیروزہ مائی) نخوت سے بوٹی توڑ کر دیکھ رہی تھی۔

''ابھی پورا نہیں گلا، اندر گلابی پن ہے۔ بہت ہی ہڈحرام ہوگئی ہو تم۔ ٹھیک سے پکایا کرو، اب جاؤ اور باقی پیس ابھی تیل سے نہ نکالنا۔''

''جی میڈم۔'' ملازمہ سیدھی ہوئی اور جانے کے لیے مڑی۔

''یہ تو اِدھر دو۔'' فیروزہ مائی نے پلیٹ اسی نخوت سے اس کے ہاتھ سے لی۔ ملازمہ گڑبڑا کر پلیٹ اسے تھما کر کچن کی سمت بھاگی۔ فیروزہ مائی نے کرسپی چکن روسٹ کی ران کا پیس اٹھایا اور دانتوں سے کاٹا۔

پارس دروازے میں کھڑی تھی۔ فیروزہ مائی نے ابھی اس کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ ویسے بھی اندھیرے میں تھی۔ ماں روشنی میں بیٹھی تھی پھر بھی اس کی نگاہوں کے سامنے والا منظر اندھیرے میں ڈوب گیا۔

ایک نیم تاریک کمرا، چھت سے لٹکتا زرد بلب، چارپائی پر بیٹھی سیاہ بالوں اور مرجھائی آنکھوں والی لڑکی جس کی نگاہیں ساتھ بیٹھے اپنے سے چار پانچ سال بڑے بھائی کی پلیٹ پر تھیں جس میں سالن کے اوپر ران والی ایک بوٹی اور ایک سینے کی بوٹی رکھی تھی پھر اس نے اپنی پلیٹ کو دیکھا۔ اس میں گردن والی بوٹی تھی۔

''امی!'' اس نے منمناتی آواز سے دونوں کے مقابل بیٹھی ماں کو پکارا جو دونوں کی پلیٹ میں سالن ڈالنے کے بعد اب اپنی پلیٹ میں ڈال رہی تھی۔ ایک بڑی بوٹی کے ساتھ شوربا۔

''ہاں بول۔'' اس نے ڈونگا ڈھک کر اپنے پیچھے رکھ دیا۔ لڑکا اب دلجمعی سے بڑے بڑے لقمے لیتا کھا رہا تھا۔

''مجھے بھی ٹانگ والی بوٹی دو۔''

''چپ کر پارو۔ آدھا کلو مرغی بنائی ہے۔ ایک ہی ران تھی جو بھائی کے لیے تھی اب کیا اپنی ران کاٹ دوں؟'' وہ بگڑی۔ پارس نے سوگواری سے اپنی پلیٹ پر دوبارہ نظر کی۔

''امی مجھے گردن نہیں کھانی، دوسری بوٹی دے دوناں!''

''وہ شام کے لیے رکھا ہے، اب یہی کھا۔ زیادہ کھائے گی تو سست پڑ جائے گی پھر کام پر کون جائے گا؟'' لڑکی سر جھکائے لقمہ توڑنے لگی۔

''دیکھ رہی ہو اماں، پارو جب سے سلائی سینٹر کام پر جانے لگی ہے، بہت بولنے لگی ہے اور اب میری بوٹیاں بھی گنتی ہے۔'' لڑکا چمک کر بولا۔ پارس نے سر اٹھا کر خفگی سے اسے دیکھا۔

''زیادہ آنکھیں نہ دکھا بھائی کو اور چپ کر کے کھا۔ چل کھا میرا بچہ۔'' دونوں کو مختلف لہجوں میں مخاطب کرتی وہ اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

''ارے پارو، تم کب آئیں؟'' خوشگوار حیرت میں ڈوبی آواز پر پارس چونکی۔ فیروزہ مائی، فیروزہ بیگم بننے کی کوشش میں تُو کے بجائے تم اور آپ کا استعمال سیکھ گئی تھی۔

''ابھی۔'' وہ سنجیدگی سے کہتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

''تم فریش ہو کر آجاؤ، میں کھانا لگواتی ہوں۔ روسٹ بنوایا ہے آج۔ تمہیں پسند ہے ناں۔'' وہ مسکراتے ہوئے پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ پارس نے مڑ کر اسے دیکھا چند لمحے دیکھتی رہی۔

''نہیں، مجھے نہیں پسند، آپ کھائیے۔'' ہموار، بے تاثر لہجے میں کہہ کر اس نے پہلے زینے پر قدم رکھا۔

''اے سنو پارس۔'' فیروزہ مائی اٹھ کر اس کے قریب آئی۔ ''ایک بات کرنی تھی تم سے۔'' انداز میں لجاجت و خوشامد تھی۔ پارس نے تکان سے اسے دیکھا۔

''بولو امی۔''

''وہ شکیل کا فون آیا تھا، آج کل کاروبار مندا جا رہا ہے اس کا۔ اُدھر دبئی میں حالات اچھے نہیں ہیں۔''

''کتنے پیسے مانگے ہیں اس دفعہ؟'' وہ ماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جذبات سے عاری انداز میں بولی۔

''وہ...... زیادہ نہیں بس یہی د...... دس پندرہ لاکھ تو لگ جائیں گے۔ وہ تو منع کر رہا تھا مگر میں نے کہا آخر بہن ہے اربوں کے ہوٹل کی مالک، اس کے لیے کیا مشکل۔'' وہ رکی اور امید افزا نگاہوں سے پارس کے چہرے کو دیکھا۔ ''پھر میں اسے بتا دوں کہ تم پیسے بھیج دو گی؟''

وہ خاموش رہی، بالکل خاموش پھر ایک دم پلٹ کر اوپر زینے پر چڑھنے لگی۔

فیروزہ نے حیرت و الجھن سے اسے اوپر جاتے دیکھا، وہ زینے چڑھتی بنا رکے اوپر اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔

اندر آکر اس نے دروازہ ذرا زور سے بند کیا...... پھر شال اور پرس صوفے پر ڈالے، گلاسز اتار کر سنگار میز پر رکھے اور آئینے میں دیکھا۔

بیضوی مرر میں اس کا عکس ہلکی زرد روشنی سے جھلملا رہا تھا یا شاید اس کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ ایک آنسو ٹوٹا اور گال پر لڑھکتا فرش پر جا گرا۔

''آئینہ بھی کیا عجیب شے ہے، ہر چیز دکھا دیتا ہے

کچھ نہیں چھپاتا...... مگر پھر بھی ایک غلطی یہ کر جاتا ہے۔"
ایک تلخ مسکراہٹ پھیکے چہرے پر بکھری۔
"دائیں کو بائیں اور بائیں کو دائیں دکھاتا ہے۔ یہ کیسی شفافیت ہوئی کہ اپنا عکس ہی الٹا نظر آئے۔ یہاں کوئی سچا نہیں ہے آئینہ تک دھوکا دے جاتا ہے۔" اس نے بے دلی سے کہتے ہوئے آنسو رگڑے۔ پھر نم ہتھیلی پھیلا کر دیکھی۔ سانولی لکیروں کے درمیان تصویریں سی بننے لگیں۔ قلم در قلم چہرہ در چہرہ......

کرخت چہرے اور سونے کی بالیوں والی عورت نوٹ گن رہی تھی۔ سامنے وہ پندرہ سولہ برس کی لڑکی... سر پہ دوپٹا لیے کھڑی مضطرب انداز میں انگلیاں چٹخاتے اسے دیکھ رہی تھی۔

"بس؟ یہ تو ہوئے فیکٹری کے پیسے اور سلائی والے کدھر گئے؟" اس نے تیز نظروں سے لڑکی کو گھورا۔

"وہ...... وہ تھوڑے سے تھے، کرایے کے لیے رکھ لیے۔"

"کرایہ؟ کس کا کرایہ؟" لڑکی نے نظریں جھکا دیں۔

"سلائی سینٹر دور پڑتا ہے امی، میرے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ آئندہ حمیدہ خالہ کے ساتھ بس سے جاؤں گی۔"

"بہت پر پرزے نکل رہے ہیں تیرے پارس، میں دیکھ رہی ہوں اچھی طرح۔ انسان بن جا، کوئی ضرورت نہیں ہے بس کی عیاشیوں کی...... چار قدم اوپر چل لے گی تو کون سی قیامت آجائے گی؟" وہ پھٹ پڑی، لڑکی سہم کر پیچھے ہوئی۔

"چل نکال سلائی سینٹر والے پیسے اور آئندہ یہ ڈرامے میرے ساتھ نہ کرنا۔ چوٹی سے پکڑ کر گھر سے نکال دوں گی، سمجھی۔" لڑکی نے جلدی سے بٹوے سے مڑے تڑے چند نوٹ نکالے، عورت نے انہیں جھپٹ لیا۔

"میں نے تیرے باپ سے شادی کرتے وقت سوچا تھا، وہ میرے پہلے شوہر کا بچہ پال لے گا اور میں اس بن ماں کی بچی کو پال دوں گی تو احسان مانے گی مگر نہیں، تو...... تو بہت فراڈ نکلی پارو...... سنا ہے تیری ماں بھی ایسی تھی۔" وہ بکتی جھکتی، پیسے گنتی پلٹ گئی۔ لڑکی نے بھیگی آنکھوں سے اسے جاتے دیکھا۔ وہ گھر کی چوکھٹ پر جا کھڑی ہوئی تھی۔ دفعتاً شکیل باہر سے آتا دکھائی دیا۔

"اماں، پیسے دے جلدی، ورنہ رمضان چاچا دکان بند کر جائے گا اور صبح تک کہیں وہ اوپر پیسے نہ مانگ لے۔"

"ہاں یہ لے، جا جلدی سے سائیکل لے آ......" فیروزہ مائی کا لہجہ نرم ہوگیا۔ بیٹے کو پیار کیا، نوٹ تھمائے اور پھر ہمدردی سے خود کلامی کے انداز میں بولی۔

"اب اسکول جا کر اچھا سا پڑھنا، بے چارہ بچہ اسکول جانا بھی مشکل بنا ہوا تھا۔" اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی وہ کہہ رہی تھی۔ وہ بے نیازی سے انگلی پر تھوک لگاتا، نوٹ گن رہا تھا۔

لہجے بھی موسموں کی طرح ہوتے ہیں۔ وقت اور جگہ دیکھ کر بدل جاتے ہیں۔ اور بعض دفعہ ایک ہی وقت، ایک ہی جگہ پہ بھی وہ متضاد کیفیات میں سامنے آتے ہیں۔ جیسے ایک ساتھ دھوپ اور چھایا ہو۔ جیسے سمندر کے کڑوے اور میٹھے پانی کے درمیان ان دیکھی آڑ ہو۔ اور پھر کڑوا تو کبھی میٹھے سے مل ہی نہیں سکتا ناں!

باورچی خانے سے دیکھتی لڑکی نے سر جھکا کر اپنی پھٹی ایڑھیوں کو دیکھا۔ منظر بھیگتا چلا گیا۔ جیسے بن موسم کی بارش......

بیڈروم کا دروازہ ہلکا سا کھٹکا اور پھر چرچراہٹ سے کھلا۔ سنگار میز کے سامنے کھڑی پارس چونک کر پلٹی۔

فیروزہ مائی دروازے میں کھڑی تھی۔ اسے خود کو دیکھتا پا کر جلدی سے مسکرائی۔

"بات کرنی تھی تم سے۔" وہ تمہید باندھتی آگے بڑھی۔ پارس اسی طرح سیدھی کھڑی رہی۔ اس کی فیروزہ پہ جمی آنکھوں میں سنجیدگی اور سرد مہری تھی۔

"وہ...... تم شکیل کو پیسے کب بھجواؤ گی؟" وہ ذرا ہچکچا کر بولی تھی۔

پارس گہری سانس لے کر آئینے کی طرف پلٹی، برش اٹھایا اور اوپر سے نیچے بالوں میں پھیرنے لگی۔

"تم...... پھر کب تک بھیجو گی پیسے؟ اصل میں شکیل کو ضرورت ہے، کہہ رہا تھا ہوسکے تو کل ہی بھجوا دیں، تم یوں کرنا، کل دفتر جانا تو......"

"کیا میں نے کہا کہ میں شکیل کو پیسے بھیج رہی ہوں؟" وہ آئینے میں فیروزہ کا عکس دیکھتی، برش اوپر سے نیچے لے جاتے ہوئے پرسکون انداز میں بولی۔ فیروزہ نے الجھن سے لبوں پر زبان پھیری۔

"وہ تو تم بھیج ہی دو گی۔"

"سوری، میں نہیں بھیج سکتی۔" وہ اب اپنے عکس پہ نگاہیں جمائے سامنے کے بال سیدھے کر رہی تھی۔

"یہ کیا بات ہوئی؟ بھائی ہے تمہارا، پیسے نہیں بھیجو گی تو وہ کیا کرے گا؟"

"بینک لوٹے یا بھیک مانگے، مجھے فرق نہیں پڑتا۔" اس کی بات پر فیروزہ کے ماتھے پر بل پڑے۔

"ساری زندگی دیتی آئی ہو، اب کیوں نہیں دو گی؟"

"ساری زندگی دیتی آئی ہوں، اب نہیں دوں گی۔"

"آج کون سی انوکھی بات ہوگئی ہے؟" فیروزہ مائی کی آواز اشتعال سے بلند ہونے لگی۔ برش چلاتا پارس کا ہاتھ رکا، اس کی سماعت میں ایک آواز گونجی۔

"امی اور بہنیں مجھ سے دور نہیں رہنا چاہتی تھیں، ان کا کہنا تھا کہ بھلے کوئی کم آمدنی والی جاب ہی کرلوں مگر یہیں کروں۔" اس نے سر جھٹکا۔

"شکیل کو کہیں، میرے پاس اس کے لیے پیسے نہیں ہیں، بات ختم۔"

"کیسے بات ختم؟" وہ تلملا کر بولی۔ "اربوں روپے کا ہوٹل ہے تمہارے پاس جس کے ایک کمرے کا ایک دن کا کرایہ پچیس تیس ہزار سے کم نہیں اور بھائی کے لیے دس پندرہ لاکھ نہیں ہیں تمہارے پاس؟"

"دس پندرہ ہزار بھی نہیں ہیں، بتا دینا اسے۔" وہ ہیئر برش رکھ کر دراز کھولے کچھ ڈھونڈنے لگی تھی۔

"کیسے نہیں ہیں؟ اس بڈھے کی ساری دولت پر سانپ بن کر بیٹھ گئی ہو، شادی کے دو ماہ بعد ہی اس کو مار کر سب ہتھیا کر اب تم......" الفاظ ابھی فیروزہ مائی کے لبوں میں ہی تھے کہ پارس کرنٹ کھا کر اس تک لپکی۔ فیروزہ کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر دیوار سے لگایا اور چہرہ اس کے بہت قریب کیے، شعلہ بار آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"آج تو یہ بات منہ سے نکال دی ہے، آئندہ کہا تو دو منٹ میں......" اس نے چٹکی بجائی۔ "دو منٹ میں تمہارا سامان لپیٹ کر اس گھر سے نکال دوں گی۔ سمجھ میں آئی میری بات یا نہیں؟" چبا چبا کر سنگین لہجے میں اس نے الفاظ ادا کیے۔

دیوار سے لگی فیروزہ مائی کی آنکھوں میں ڈھیروں خوف و ہراس اتر آیا تھا۔ بہ مشکل اس کے لبوں سے کپکپاتی آواز نکلی۔

"پارس، کیا ہوگیا...... میں...... ماں ہوں تمہاری۔"

"سوتیلی ماں ہو، جسے میں نے صرف اس لیے اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے کہ میرے باپ کی بیوی ہو، رہا تمہارا بیٹا تو وہ میرے باپ کا بیٹا نہیں ہے اس لیے اسے میرا بھائی مت کہنا اور اگر آئندہ تم نے رضوان کی موت کا الزام مجھ پر لگانے کی کوشش کی تو تم دیکھنا میں کیا کرتی ہوں تمہارے ساتھ۔" ایک جھٹکے سے وہ فیروزہ کے کندھے چھوڑ کر پیچھے ہٹی۔ اس کی آنکھیں دہک رہی تھیں۔ فیروزہ فق چہرہ لیے تیزی سے

کمرے سے باہر نکل گئی۔

پارس دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں سہلاتی بیڈ پر بیٹھ گئی۔ آئینے سے جھلکتے عکس میں اس کی بالیاں ابھی تک چمکتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔

☆☆☆

آفس میں معمول کی چہل پہل تھی، شیشے کی کھڑکیوں سے جھانکتی صبح، کافی کے کپوں کی اُڑتی بھاپ، مصروف فون کالز......

فائز نے ہولے سے دروازہ کھٹکھٹایا، کام کرتی پارس نے گردن اٹھائی، اسے دیکھ کر سر کے اثبات سے آنے کا اشارہ کیا، وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے سامنے آبیٹھا۔

''جی فائز صاحب؟'' وہ اپنی پاور سیٹ پہ اب ٹیک لگا کر پیچھے ہوئے سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

''میم مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔ اس دن آپ نے مجھے لفٹ دی اور پھر تین دن کے کڑے انتظار کے بعد اپائمنٹ لیٹر کا ملنا، میں اپنی خوشی بیان نہیں کرسکتا۔'' وہ بظاہر بہت احسان مندی سے کہہ رہا تھا البتہ اس کی گہری آنکھیں کچھ اور کہتی تھیں۔

''یو آر ویلکم......!'' پارس نے اسی سنجیدگی سے فائل اسٹینڈ سے ایک فائل اٹھائی، اسے کھولا، چند صفحے پلٹائے اور پھر ایک جگہ رکی۔

''فائز صاحب! آپ نے اپنے سی وی میں تجربے کے خانے میں ایک سال کے لیے ہمارے ہوٹل کی لاہور والی شاخ میں کام کرنے کا بھی لکھا ہے۔''

''جی میم......! رضوان صاحب کی ڈیتھ سے دو تین ماہ قبل ہی میں نے وہاں سے ریزائن کیا تھا۔''

''اور آپ نے وہاں پر پورا سال کام کیا تھا؟'' پارس پُرسوچ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''جی میم، اسی لیے میں آپ سے رضوان صاحب کی تعزیت کررہا تھا، میں ان سے مل چکا ہوں، بہت مہربان آدمی تھے وہ۔''

دونوں کی نگاہیں بے اختیار کونے میں رکھے فوٹو فریم کی طرف اٹھیں، پارس اسے دیکھتے ہوئے لمحے بھر کو کہیں اور کھوئی...... فائز اپنے تمام تر کمپوژر کے باوجود اس تصویر کے ساتھ بہت پیچھے چلا گیا......

جب وہ چھوٹا تھا...... ایک ٹین ایج لڑکا......

وہ ٹین ایج لڑکا صوفے پر بیٹھا، فکر مندی سے اپنے سامنے ٹہلتی سویرا آپا کو دیکھ رہا تھا۔

''اوہو آپا، کیا ہوگیا ہے؟'' آپا رکیں، خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورا اور جیسے پھٹ پڑیں۔

''کیا ہوگیا ہے؟ دیکھا نہیں تم نے، وہ لڑکی ندا کیسے بے وقوف بنا رہی ہے ہمارے سادہ سے بھائی جی کو؟'' وہ مضطرب انداز میں پھر کمرے کے چکر لگانے لگیں۔ فربہی مائل جسم اور چھوٹی آنکھوں والی سویرا آپا بے حد بے چین نظر آرہی تھیں۔

''خود ہی تو آپ نے ان کی منگنی کروائی تھی۔''

''میں نے نہیں کروائی تھی۔'' وہ ایک دم چمک کر بولیں۔ ''بھائی جی نے کہا، دوست کی بہن ہے، پسند ہے انہیں۔ سو میں رشتہ لے گئی کہ اب نہیں شادی کریں گے تو کب کریں گے، آخر بہن ہوں، مجھے ہی سوچنا ہوگا اور وہ نیچ لوگ بھی جیسے تیار بیٹھے تھے، اِدھر رشتہ دیا اُدھر ہاں کردی...... اور وہ ندا...... سوائے خوب صورتی اور چند ڈگریوں کے اور کیا قابلیت ہے اس میں؟ مگر میں نے کہا، بھائی جی خوش تو ہم خوش...... مگر مجھے کیا پتا تھا کہ وہ دولت کے لالچی لوگ ایسے کام کرنے لگیں گے۔'' پھُولے تنفس کے ساتھ جوشِ جذبات میں بولتی، وہ سامنے صوفے پر آبیٹھیں۔ ٹین ایج لڑکا بہت دھیان سے ساری بات سن رہا تھا۔

''اب تم بتاؤ فیضی، بھائی جی کے ساتھ پوری دنیا میں ہم سے زیادہ مخلص کون ہوسکتا ہے؟ اماں، ابا رہے نہیں ہمارے، بھائی جی ہی ہمارا سب کچھ ہیں،

ایک چھوٹے ڈھابے سے شروع کیا جانے والا کاروبار آج میری دعاؤں کے سبب ہوٹلز کی ایک چین میں بدل چکا ہے، اب تم بتاؤ، ہمارا فرض نہیں ہے کہ ہم بھائی جی کا اچھا سوچیں؟''

''بالکل آپا!'' لڑکے نے سر ہلایا۔ سویرا آپا جوش سے کہتی آگے ہو بیٹھیں۔

''اب خود دیکھو، کل ندا کی سالگرہ پہ بھائی جی نے اسے ہیرے کی انگوٹھی گفٹ کی، ہیرے کی انگوٹھی فیضی...... اب یہ مت کہنا کہ مجھے بھی دی ہے کئی بار۔ بھئی میں تو بہن ہوں مگر وہ پرائی لڑکی، کبھی اس کا بھائی ٹاپ کرتا ہے تو اسے تحفے ملتے ہیں، کبھی بہن کے بچوں کے لیے خریداری کی جارہی ہوتی ہے۔ بھائی جی تو ٹھہرے معصوم اور سادہ، ہم تو اندھے نہیں ہیں، وہ اسی طرح دونوں ہاتھوں سے ان کو لوٹتی رہی تو بھائی جی کنگال ہوجائیں گے پھر امجد (سویرا کا شوہر) کا آسٹریلیا میں بزنس کون سیٹل کروا کردے گا اور تم نے بھی تو امریکا جانا ہے پڑھنے کے لیے کہ نہیں؟''

''جانا ہے...... مگر بھائی جی کے پاس بہت دولت ہے آپا۔''

''اور ہمارا فرض ہے کہ ان کی دولت کو ان مفت خوروں سے بچائیں۔ دیکھو فیضی، وہ تو بھائی جی کو لوٹ کر بھاگ جائے گی، ہرٹ کون ہوگا؟ بھائی جی! ان کا تو دل ٹوٹ جائے گا۔ اب تم بتاؤ اس لالچی لڑکی سے بھائی جی کا پیچھے چھڑانا چاہیے یا نہیں؟''

''چاہیے آپا...... مگر بھائی جی کے پاس بہت دولت ہے، لوگ کہتے ہیں وہ پارس ہیں، جس چیز میں ہاتھ ڈالیں، اسے سونا بنا دیتے ہیں۔''

''کیا آپ کی ملاقات رہتی تھی رضوان سے؟'' پارس کی آواز نے اسے چونکایا۔ لمحے بھر میں وہ یادوں کی بہتی ندی سے باہر آیا۔

''جی! چند ایک بار شرفِ ملاقات نصیب ہوا تھا۔'' وہ سنبھل کر اداسی سے مسکرایا۔ ''بہت کچھ سیکھنے کو ملا، ان فیکٹ ابھی مجھے یاد آرہا تھا کہ ان کے کام میں اللہ نے بہت برکت رکھی تھی۔ لوگ کہتے تھے، وہ پارس ہیں، ایسا آدمی جس چیز کو چھوئے اسے سونا بنا دیتا ہے۔''

پارس کے لبوں پر ہلکی سی تلخ مسکراہٹ آٹھہری...... یہ پہلی دفعہ تھا کہ جب فائز نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

''ہاں، ایسا شخص جس کو چھوئے اسے سونا بنا دے مگر خود ساری زندگی پتھر ہی رہتا ہے۔''

''بجا فرمایا......'' فائز رسمی انداز میں مسکرایا۔ ایک نظر پھر سے اس مسکراتی تصویر پر ڈالی۔ دفعتاً فون بجا۔ پارس ریسیور اٹھائے دوسری طرف کی بات سننے لگی۔

تصویر کو دیکھتی فائز کی نگاہیں پھر سے بھٹکیں، یادوں کی جھیل میں دائرے بننے لگے۔

ایک چھوٹے مگر نفیس سے ڈرائنگ روم میں وہ گوری، خوب صورت لڑکی ٹرے اٹھائے ایک نوجوان کو جوس سرو کررہی تھی۔ قریبی صوفے پر ایک معمر خاتون بیٹھی، مسکراتے ہوئے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

ان سے ذرا دور دروازے کی چوکھٹ پہ وہ ٹین ایج لڑکا اور سویرا آپا چند لمحے دیکھتے رہے۔ سویرا آپا کی آنکھوں میں چمک سی آئی تھی۔ جیسے ہی وہ لڑکی کباب کی پلیٹ اٹھائے نوجوان کے سامنے جھکی، سویرا آپا ایک دم سے اندر داخل ہوئیں۔

''بہت خوب ندا...... یہاں تو خاص الخاص مہمان آئے ہوئے ہیں، اتنے خاص کہ ہماری آمد کی خبر ہی نہیں ہوئی۔'' لڑکی سیدھی ہوتی ہوئی چونکی پھر آپا کو دیکھ کر سادگی سے مسکرائی۔

''آئیے سویرا آپا، آپ کب آئیں؟'' معمر خاتون بھی مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھنے لگیں۔

''جب تم یہاں غیر مردوں کی خاطریں کرتے

میں مصروف تھیں۔''

ان کی بلند آواز، عجیب لہجہ، لڑکی کا چہرہ فق ہوا، اس نے پریشانی سے ماں کو دیکھا۔

''نہیں ...... میں تو سرو کر رہی ...... یہ میرے کزن ہیں، ماموں کے ساتھ آئے ہیں، ماموں اوپر ہیں اور......'' سویرا آپا کے الفاظ نہیں، ان کی تندو تیز نگاہیں تھیں جو وہ تینوں پریشان ہو گئے تھے۔

''بس بس...... سب دیکھا ہے میں نے اپنی آنکھوں سے، میرے معصوم بھائی کی آنکھوں میں دھول جھونک کر تم یہاں یہ سب کر رہی ہو، بدکردار لڑکی۔'' ندا کا چہرہ سرخ ہو کر دہکنے لگا۔

''اپنی حد میں رہیں، آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ آپ جھوٹ بول رہی ہیں، مجھ پر الزام لگا رہی ہیں۔''

''بیٹا...... تم غلط سمجھی ہو یہ تو......'' ماں نے مداخلت کی کوشش کی۔

''آپ درمیان میں مت بولیں۔ میں نے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے آپ کی بدکردار بیٹی کو۔'' ندا کا کزن ہونقوں کی طرح کھڑا سب دیکھ رہا تھا چوکھٹ میں کھڑا ٹین ایج لڑکا بھی خاموش تھا، بالکل خاموش۔

''مجھے نہیں پتا آپ یہ کیوں کر رہی ہیں مگر میں اتنا جانتی ہوں کہ میرے گھر میں کھڑے ہو کر آپ مجھے یوں بدکردار نہیں کہہ سکتیں۔'' ندا حیرت زدہ بھی تھی اور اب اسے غصہ بھی آ رہا تھا۔ ''اور مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ آپ اس طرح اتنی ڈھٹائی سے جھوٹ کیوں بول رہی ہیں؟''

''میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے بی بی کہ تم کیا کر رہی تھیں؟'' وہ چمک کر بولیں۔

''کیا کر رہی تھی میں؟ جوس دے رہی تھی، کباب دے رہی تھی۔ آپ کیوں اس بات کو غلط رنگ دے رہی ہیں؟''

''یعنی کہ تم مجھے جھوٹا کہہ رہی ہو؟''

''نہیں، نہیں سویرا بیٹا، اس کا یہ مطلب نہیں...''

''آپ خاموش رہیں امی، یہ خاتون سب کچھ سوچ کر آئی ہیں، انہیں کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی اور ہاں، میں آپ کو جھوٹا اور الزام تراش کہہ رہی ہوں۔'' وہ لڑکی بہت اعتماد اور سختی سے بولی تھی۔

''بس بہت دیکھ، سن لیا...... میں بھی دیکھتی ہوں اب تم مزید کیسے میرے بھائی کو بے وقوف بناتی ہو۔ چلو فیضی!'' وہ دھڑ سے آگے پیچھے باہر نکلے تھے۔

منظر ہوا میں تحلیل ہوا، رنگ بکھرے...... یادوں کے کینوس پہ ایک اور برش اسٹروکس لگانے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پینٹنگ پھر سے بننے لگی۔

بھائی جی بڑے صوفے پر خاموش، افسردہ سے بیٹھے تھے۔ سامنے وہ لڑکا سر جھکائے بیٹھا تھا۔ سویرا آپا کرسی پر براجمان مسلسل روئے جا رہی تھیں۔

''دیدہ دلیری دیکھیں ان لوگوں کی۔ ایک تو ہم نے ان دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑا اوپر سے لڑکی نے شور کر کے سارا گھر اکٹھا کر لیا۔ کیسے لوگ ہیں، آنکھیں بند کر کے دوسرے کمروں میں پڑے تھے۔ اوپر سے اتنی بدزبانی کی مجھ سے، الٹا ہم پہ الزام لگانے لگے۔''

ٹین ایج لڑکے کا سر مزید جھک گیا۔ وہ اب اپنے پیروں کو دیکھ رہا تھا۔

''مجھے تو پہلے دن سے ہی ندا کے طور طریقے اچھے نہیں لگتے تھے لیکن میں چپ رہی، آپ کی خوشی تھی، میں بھی خوش تھی۔ آج بھی زبان نہ کھولتی کہ میں تو دوبار پہلے بھی بازار میں ندا کو اس لڑکے کے ساتھ دیکھ چکی ہوں مگر آج تو فیضی نے بھی دیکھ لیا۔ اب خاموش رہتی تو چھوٹا بھائی مجھے بڑے بھائی کا مجرم قرار دیتا۔ کیوں فیضی؟'' لڑکے نے سر اٹھایا، بھائی جی سے نظریں ملائیں۔

''جی بھائی جی...... آپا درست کہہ رہی ہیں،

ایسا ہی ہوا تھا۔'' بھائی جی کی آنکھوں میں ڈھیروں اداسی تھی۔ ویرانی تھی۔

یادوں کی پینٹنگ چند دن مزید آگے بڑھی۔ ایک فون کال ہر جگہ چھانے لگی۔ فیضی کے ہیلو کے جواب میں کہے گئے چند فقرے جو آج بھی اسے سنائی دیتے تھے۔

''ندا بول رہی ہوں، فیضان۔ بہت شکریہ تمہارا اور تمہاری آپا کا۔ آج تمہارے بھائی نے منگنی کا سامان واپس بھجوا دیا ہے اور جانتے ہو میں خوش ہوں۔ اس لیے کہ انہوں نے مجھے فون بھی کیا اور پتا ہے کیا کہا؟ انہوں نے کہا، میں جانتا ہوں تمہارا دامن بے داغ ہے مگر اس واقعے کے بعد تم بھی میرے بہن بھائی کے ساتھ خوش نہیں رہ سکو گی۔ تمہیں بڑی تکلیف سے بچانے کی خاطر چھوٹی تکلیف دے رہا ہوں۔ تمہیں ہم سے بہتر لوگ مل جائیں گے اور ملنے چاہئیں ....'' وہ رو رہی تھی۔

''یاد رکھنا فیضان، تم اور تمہاری بہن دنیا کے سب سے مفاد پرست اور خود غرض بہن بھائی ہو مگر آئے گا ایک دن جب رضوان تم لوگوں کی اصلیت ''مان'' لیں گے کیونکہ ''جانتے'' تو وہ اب بھی ہیں اور دیکھنا تب وہ تمہیں اپنی شادی میں بلانے کی زحمت بھی نہیں کریں گے۔''

''سوری، امپورٹنٹ کال تھی۔'' پارس نے ریسیور رکھتے ہوئے پیشہ ورانہ سی معذرت کی۔ اس کی آواز پہ یادوں کی رہ گزر سے وہ واپس لوٹا اور پھیکا سا مسکرایا۔

بعض یادیں ان نشتروں سے لبریز ہوتی ہیں جو دوسروں نے ہمیں ہرٹ کرنے کے لیے پھینکے ہوتے ہیں اور ہم جانتے ہوتے ہیں کہ ہم ٹھیک تھے، جو ہم نے کیا وہ قطعاً غلط نہ تھا مگر پھر ہر دفعہ وہ نشتر چبھنے پر دل کے اندر چیر دینے والی تکلیف کیوں ابھرتی ہے؟ وہ تکلیف جو کسی ایسے گلٹ سے پیدا ہوتی ہے جس کا نہ انسان اعتراف کرے نہ ہی اسے خبر ہو۔

''تو فائز صاحب، اب آپ نے ہماری لاہور والی شاخ میں اپلائی کیوں نہیں کیا؟''

''رضوان صاحب کے بعد وہ جگہ ویسی نہیں رہی۔ فیضان صاحب ویسے بھی باہر ہوتے ہیں۔'' بظاہر بے پروائی سے کہتے ہوئے اس نے غور سے پارس کا چہرہ دیکھا۔ اس کی پیشانی پہ ہلکا سا بل پڑا تھا۔ ''منیجر ہی سب سنبھالتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اُدھر اپلائی کیا تھا مگر مجھے جاب نہیں ملی۔''

''اور آپ نے وہ جاب پہلے چھوڑی کیوں تھی؟''

''رضوان صاحب کے بھائی فیضان صاحب کا کوئی سفارشی بھرتی ہونا تھا اس لیے منیجر نے مجھے ڈھکے چھپے لفظوں میں بتا دیا تھا کہ میں کوئی اور نوکری تلاش کروں سو میں نے ریزائن کر دیا۔''

پارس کے لب بھنچ گئے۔ آنکھوں کی پتلیاں ناگواری سے سکڑ گئیں...... جیسے اسے کچھ بہت ناپسند آیا ہو مگر وہ اظہار نہ کرنا چاہتی ہو۔

''فیضان صاحب ابھی تک امریکا میں ہیں؟'' اپنی ناگواری دبائے وہ سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

''دو تین ماہ قبل تک تو باہر ہی تھے، اب کا معلوم نہیں۔''

''آپ کا کوئی رابطہ ہے ان سے؟'' وہ کچھ سوچتے ہوئے مخاطب ہوئی۔ ساتھ ہی وہ اضطرابی انداز میں لاشعوری طور پر اپنی بالی کو چھیڑ رہی تھی۔

''جی میم، ایک کام کے لیے فون کیا تھا انہیں ایک دفعہ، کیا آپ کو ان کا کانٹیکٹ نمبر چاہیے؟'' وہ ذرا سا چونکا۔

''نہیں، مجھے کیوں چاہیے ہوگا۔'' وہ ایک دم اتنی ناگواری سے پہلو بدل کر بولی کہ وہ خاموش ہو گیا۔

پارس کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے انگلی بالی پر پھیرتے کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں کچھ ایسا چل رہا تھا جس سے ماتھے پر شکنیں اور آنکھوں میں نفرت میں اضافہ ہو رہا تھا۔

''مجھے اجازت ہے، میم؟'' وہ اپنی حیرت چھپاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ پارس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے چہرے پر ابھی تک وہی کلفت چھائی تھی۔

☆☆☆

سرسبز پہاڑیوں کے درمیان بل کھاتی سڑک پہ اس کی گاڑی دوڑ رہی تھی۔ باہر کے ٹھنڈے، خوشگوار موسم سے بے نیاز، اندر بیٹھا، اسٹیئرنگ وہیل پر ایک ہاتھ رکھے وہ دوسرے ہاتھ سے موبائل پر ایک نمبر ملا رہا تھا۔ سلسلہ ملتے ہی اس نے فون کان سے لگایا۔

''ہیلو سویرا آپا، کیسی ہیں؟'' کار اس نے آہستہ کر دی۔ اب اس کی ساری توجہ کال کی طرف تھی۔

''میں ٹھیک ہوں فیضی، تم کیا کرتے پھر رہے ہو؟'' وہ اس کے لیے پریشان تھیں۔

''بھائی جی کا حساب ادا کرنے آیا ہوں۔''

اسے لگا وہ اب ڈرائیو نہیں کر سکے گا سو گاڑی سائڈ پر روک دی اور شیشہ نیچے کر دیا ایک دم یخ بستہ ہوا اندر گھسی۔ ایک طرف پہاڑ دوسری طرف کھائی۔ مری کا خوب صورت، ٹھنڈا الہلہاتا موسم۔

''پارس نے تمہیں نہیں پہچانا؟'' وہ حیران تھیں۔

''اس نے میری کبھی کوئی تصویر نہیں دیکھی سو کیسے پہچان سکتی تھی!''

''ہاں یہ بھی ہے، بھائی جی نے بھی اسے ہم سے بالکل کاٹ کر رکھا تھا۔'' ان کی آواز میں گلہ در آیا۔ ''خیر، اب تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

''پارس کو سزا دوں گا یا دلواؤں گا اور وہ سب جو بھائی جی نے اس کے نام لگوایا ہے، سب واپس لوں گا۔''

''میں تمہارے ساتھ ہوں فیضی مگر ایسا کیسے ممکن ہو سکے گا؟'' وہ فکر مند تھیں۔ اس نے شانے اچکائے۔

''میں آہستہ آہستہ اس کے کاغذات تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جلد ہی مجھے کامیابی ملے گی۔ تنویر بھائی میری پوری مدد کریں گے۔'' سڑک پر اس کی کار اکیلی کھڑی تھی۔ دور دور تک ویرانی چھائی تھی۔ یہاں وہ بہت آرام دہ انداز میں بات کر رہا تھا۔

''یہ تنویر پر زیادہ اعتبار نہ کرنا۔ مجھے تو یہ پارس کے ساتھ ملا ہوا لگتا ہے۔'' وہ مشکوک انداز میں بولیں۔

''کیوں؟'' فیضی کے ابرو حیرت سے سکڑے۔

''دیکھو بھائی جی کی موت سے پارس کے بعد سب سے زیادہ فائدہ تنویر صاحب کو ہوا ہے۔ وہ سب سے سینئر عہدیدار تھے۔ بھائی جی کے بعد بہت کچھ ان کے ہاتھ میں آیا ہے۔ کیا انہوں نے فائدے نہیں اٹھائے ہوں گے؟''

''ایک تو آپا، آپ ہر کسی پر شک کرتی ہیں۔'' اسے ان کی بات ناگوار گزری تھی۔ ''وہ ایسے نہیں ہیں، بھائی جی کے پرانے دوست ہیں۔ ہمارے گھر میں برسوں سے آنا جانا تھا ان کا۔ وہ تھوڑی سی ترقی یا عہدے کے لیے ایسا نہیں کر سکتے۔''

''ارے پاکستان میں تو ایک موبائل کے پیچھے چور اُچکے گلے کاٹ جاتے ہیں اور تم کہتے ہو تھوڑی سی ترقی؟'' وہ باقاعدہ برا مان گئی تھیں۔

''پتا نہیں...... مگر میں ان پر شک نہیں کر سکتا۔ مجھے تو پارس کا ہاتھ لگتا ہے اس میں۔'' وہ متذبذب تھا۔

''ہاں تو اسی کا پلان کیا ہوگا سب ... تنویر صاحب کو کسی بڑی چیز کا وعدہ دیا ہوگا اور اب وہ ساتھ مل گئے اور تو اور ہمارے ملازم تک اس لڑکی کا دم بھرنے لگے ہیں۔'' ڈیش بورڈ پر رکھا اس کا دوسرا موبائل بجنے لگا۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا پھر

آپا سے فون پر بولا۔

''فون آرہا ہے میرا' بعد میں بات کرتا ہوں آپ سے پھر مجھے پارس کے گھر بھی جانا ہے۔''

''ہمارے گھر، فیضی۔'' انہیں اس کا لاشعوری طور پر ہی سہی اس گھر کو اس کی ملکیت تسلیم کر لینا بھی ناگوار گزر رہا تھا۔

''اونہوں، پارس ہمارے گھر میں نہیں رہتی۔ بھائی جی نے اسے اور اس کی ماں کو ہوٹل کے قریب بڑا سا بنگلا لے کر دیا تھا وہ اس کے ساتھ وہیں رہتے تھے۔ ہمارا گھر تو یہاں سے کافی دور ہے۔''

''اچھا تو وہ گھر کس کے نام ہے؟'' وہ تیزی سے بولیں۔

''پارس کے۔'' اس نے گہری سانس لے کر فون بند کر دیا اور اپنا دوسرا موبائل اٹھالیا۔ آفس کے ساتھی کی کال تھی۔ اسے سننی تھی۔

☆☆☆

ٹھنڈی ٹھنڈی سی شام پہاڑیوں پر اتر رہی تھی۔ پارس کے بنگلے کے ٹیرس سے دور دور تک پھیلے پہاڑ، کھائیاں، بل کھاتی سڑک سب نظر آرہا تھا۔ وہ وہیں ٹیرس پر کھڑی تھی۔ شال پیچھے سے دونوں کندھوں کو ڈھکتی آگے آکر بکل کی صورت تھی...... اس نے گہرا بھورا رنگ پہن رکھا تھا۔ چوڑی کے سائز کی کانوں میں بڑی بالیاں ہوا کے ساتھ ذرا ذرا سی ہلتیں۔ آنکھیں دور نیچے جمی تھیں جہاں سڑک کے ایک طرف بنی پتھریلی سیڑھیاں اوپر پارک تک جاتی تھیں۔

واقعات روشنائی کی طرح ہوتے ہیں جس جگہ ڈالے جائیں وہاں اپنا نشان ضرور چھوڑ جاتے ہیں مگر وہ ہر شخص کو نظر نہیں آتے۔ صرف وہی انہیں اس جگہ ری پلے ہوتے دیکھ سکتا ہے جس کی نظر میں یادوں کا عدسہ لگا ہو پھر ہر جگہ، ہر گھر، ہر سڑک کا نام بدل جاتا ہے۔ ہم انہیں اپنے حساب سے یاد رکھتے ہیں اور پھر ساری زندگی ہم دنیا کو اپنے نقشوں، اپنے سائن بورڈز کے تحت ہی دیکھتے رہتے ہیں۔

''پارس بی بی!'' افضل بابا کی آواز پر اس کا ارتکاز ٹوٹا۔ وہ قدرے چونک کر پلٹی۔

''جی بابا؟''

''آفس سے کوئی صاحب آئے ہیں، میں نے لان میں بٹھایا ہے۔ آپ کا پوچھ رہے ہیں۔'' بابا نگاہیں چرا کر بولے۔ جیسے انہیں بہت شرمندگی سی ہو۔

''اچھا کب؟'' اس نے محسوس کیے بنا حیرت سے نیچے لان کو دیکھا۔ فائز حسن خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ''مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ خیر میں آتی ہوں۔''

اس نے گہری سانس لے کر اپنے ذہن پر چھائے نقشے لپیٹے، خود کو کمپوز کیا اور نیچے چلی آئی۔

وہ لان میں بیٹھا تھا۔ جینز، ہلکے سویٹر اور جاگرز میں ملبوس اسے آتا دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا۔

''کہیے، کیسے آنا ہوا؟'' وہ تمکنت بھرے انداز میں سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''میم آپ نے برا تو نہیں مانا کہ میں یہاں آ گیا؟ دراصل آپ جلدی چلی گئی تھیں اور مجھے ایک ضروری درخواست کرنی تھی۔'' وہ بیٹھتے ہوئے قدرے ندامت سے بولا۔

''میں سن رہی ہوں۔''

''میم، بات یہ ہے کہ مجھے ہوٹل کی طرف سے یہاں قریب میں ہی رہائش مل گئی ہے مگر وہ بیچلرز پورشن ہے۔'' انگلیاں باہم پھنسائے وہ تذبذب سے کہہ رہا تھا۔ ''امی اور بہنیں...... کیا کروں میں ان کا...... وہ میرے ساتھ رہنا چاہتی ہیں، اصرار کر رہی ہیں۔'' پارس انہماک سے سنتی رہی کچھ بولی نہیں۔

''تنویر صاحب نے بتایا تھا کہ آپ کے گھر کی پچھلی طرف جو دو تین گھر ہیں وہ بھی ہوٹل ملازمین کے لیے ہیں۔ ان میں سے ایک گھر خالی ہے۔ میں

ایک بہت جونیئر عہدیدار ہوں، نیا ہوں پھر بھی سوچا درخواست کر لوں۔ اگر مجھے وہ گھر مل سکے تو......''

اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

شال لپیٹے پیچھے ہو کر بیٹھی پارس مسکرائی۔ کل صبح وہ تلخی سے مسکرائی تھی، آج نرمی سے، دل سے مسکرا رہی تھی۔ بعض لوگ مسکرانا بالکل بھول جاتے ہیں، یہاں تک کہ ان کے ہونٹوں کے گرد لاف لائنز بھی غائب ہو جاتی ہیں۔ پھر اگر کبھی وہ ذرا بھی مسکرا دیں تو لگتا ہے ان کی گردن پر کوئی اجنبی چہرہ آٹھہرا ہے۔ ایسا اجنبی جس سے آپ شناسا بھی ہوں اور وہ آپ کو اچھا بھی لگے۔

''میں کبھی وہ گھر آپ کو نہ دیتی اگر یہ درخواست آپ کی فیملی کی طرف سے نہ ہوتی۔ قدر کیجیے گا ایسے رشتوں کی جو آپ کے سینے کے اوپر پہنی جیب کے بجائے سینے کے اندر دھڑکتے دل میں دلچسپی رکھتے ہوں۔''

''میم میں بتا نہیں سکتا کہ میں کتنا خوش ہوں۔ عالیہ اور حمیرا تو خوشی سے پاگل ہو جائیں گی۔'' وہ بہت خوش، بہت احسان مند نظر آرہا تھا۔

پارس کی مسکراہٹ مزید نرم ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں خوشی تھی۔

''مجھے قطعاً امید نہیں تھی کہ آپ مان جائیں گی۔ امی نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر ضرورت پڑے تو وہ خود آکر درخواست کریں گی لیکن ظاہر ہے یہ مناسب نہ تھا۔''

پارس کی مسکراہٹ پھیکی پڑی۔ چہرے پر سایہ سا لہرایا تھا۔ ہوا کے گرم جھونکے کی طرح ایک یاد گالوں سے ایسی ٹکرائی کہ لمحے بھر کے لیے سب گھوم گیا۔

''میں پارو کی ماں ہوں جی، خود آئی ہوں آپ کے پاس...... ایک درخواست کرنی تھی۔ پارو کہنے میں ہچکچا رہی تھی۔'' دانت نکوس کر کہتی فیروزہ مائی نے تائیدی نظروں سے ساتھ بیٹھی مضطرب و اداس سترہ، اٹھارہ برس کی لڑکی کو دیکھا جس کی ٹھوڑی ندامت کے باعث سینے سے لگی تھی۔

''کہو۔'' سلائی سینٹر کی مالکن آنٹی نے بیزاری سے کہا۔

''پارو کی تین ماہ کی ایڈوانس تنخواہ اگر مل جائے تو آپ کا بڑا احسان ہوگا۔ اصل میں اس کا بھائی بڑا بیمار رہا ہے جی، دوا دارو پر بہت خرچا ہو گیا، قرض پڑ گیا ہے گردن پر۔ کچھ مدد ہو جائے گی......'' لڑکی کی ٹھوڑی جیسے سینے سے چپک گئی تھی۔ آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ ہر طرف دھند چھا رہی تھی۔ ماں منتیں کر رہی تھی، آنٹی انکار کر رہی تھی۔

''تین مہینے کی تو مشکل ہے ہاں دو مہینے کی مل سکتی ہے وہ بھی اس شرط پر کہ یہ کوئی ناغہ نہیں کرے گی اور ہاں یہ آخری بار ہے جب میں تنخواہ ایڈوانس میں دے رہی ہوں۔'' نخوت سے بولتی آنٹی اٹھی اور اندر چلی گئی۔ لڑکی نے بھیگا چہرہ اٹھایا۔

''شکیل نے دکان والے کا جو شیشہ توڑا تھا، وہ دو تنخواہوں سے تو نہیں پورا ہوگا۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو مگر آواز میں دبی دبی سی تلخی تھی۔

''اے شش......!'' فیروزہ مائی نے گھرکا۔ ''اعلان کرے گی کیا اب؟ اور پورا ہو جائے گا ناں ٹیوشن والی باجی سے بھی دو ماہ کی ایڈوانس پکڑ لیں گے، یہ آنٹی پیسے لے آئے تو وہیں چلتے ہیں۔''

''کیا امی، کیوں مجھے سب کے سامنے شرمندہ کرواتی ہو؟'' وہ پھر روہانسی ہوئی۔

''زیادہ بک بک نہ کر، آرام سے بیٹھ۔''

دھند میں سب غائب ہوتا گیا۔ گرم ہوا کا تھپیڑا کب کا گزر چکا تھا۔ اس نے زبردستی توجہ فائز کی جانب مبذول کی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''مجھے اس روز فیضان صاحب کا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے بعد میں بہت شرمندگی ہوئی۔ یوں لگا

جیسے میں نے آپ کو ڈسٹرب کر دیا ہو۔ غالباً آپ فیضان صاحب کو کچھ خاص پسند نہیں کرتیں۔"

پارس کی پھیکی مسکان بھی غائب ہوگئی، لب بھنچ گئے، آنکھوں میں تنفر سادر آیا۔ ایک تلخ سانس خارج کر کے اس نے سر جھٹکا۔

"پہلے مجھے لگتا تھا کہ جذبوں کے پیمانے نہیں ہوتے۔ آپ یا تو کسی سے محبت کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ نفرت کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ کم یا زیادہ محبت اور کم یا زیادہ نفرت، ایسا کچھ نہیں ہوتا۔" بات کرتے ہوئے وہ چہرہ پھیر کر دور سرسبز پہاڑیوں کو دیکھنے لگی۔ "مگر اب مجھے لگتا ہے کہ جذبے بھی ناپے جاسکتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی نفرت ہر نفرت سے بڑھ جاتی ہے۔ آپ کا قصور نہیں ہے، میں اس آدمی سے اتنی شدید نفرت کرتی ہوں کہ کسی کے بھی منہ سے اس کا ذکر سنتی تو ناگوار ہی گزرتا۔" وہ پھیکا سا مسکرائی۔

فائز نے بہ مشکل اپنے تاثرات چھپائے۔

(مجھ سے نفرت؟ میرے بھائی کو تم نے قتل کیا اور نفرت بھی تمہیں مجھ سے ہے؟ حیرت ہے!)

"بہر حال فائز صاحب، آپ اس گھر میں شفٹ ہو جائیں۔ میں تنویر صاحب کو مطلع کر دوں گی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ایک دفعہ پھر بہت شکریہ میم۔" وہ زبردستی مسکرایا۔ جیسے ذہن پچھلی باتوں میں الجھا تھا۔ "کیا میں آپ کے ملازم افضل بابا کو ساتھ لے جاؤں؟ اس گھر کی چابی انہی کے پاس ہے۔"

"اچھا۔" وہ حیران ہوئی۔ گردن موڑی تو افضل بابا چائے کی ٹرے اٹھائے چلے آرہے تھے۔

"بابا اس گھر کی چابی آپ کو کس نے دی؟"

"تنویر صاحب نے بھجوائی تھی بی بی۔" بابا نے نگاہیں جھکائے ٹرے رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"بہر حال آپ فائز صاحب کو لے جائیے گا اُدھر۔ میں چلتی ہوں مجھے کچھ کام ہے۔" وہ اٹھ کر گھر کی سمت بڑھ گئی۔ فائز واپس بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں پارس پر جمی تھیں۔ جو اَب گھر کی بیرونی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

دفعتاً اندر سے فیروزہ مائی باہر آتی دکھائی دی۔ پارس آخری اسٹیپ پر تھی جب وہ اس کے سامنے آرکی۔ پارس نے خاموش مگر گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

"وہ...... بات کرنی تھی مجھے۔" فیروزہ مائی نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"اگر شکیل کے بارے میں ہے تو مت کرنا۔" وہ دبے دبے تنبیہی انداز میں بولی۔

"نہیں، نہیں میں تو سوچ رہی تھی شاپنگ کے لیے چلی جاؤں بازار، تم بھی چلوگی؟"

"نہیں۔ ویسے بھی افضل بابا مصروف ہے اور ڈرائیور چھٹی لے کر گیا ہے۔ پیدل جاسکتی ہو تو چلی جاؤ۔" وہ کہہ کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔ فیروزہ مائی نے تلملا کر اسے دیکھا پھر دور لان میں بیٹھے آدمی کو جسے اب افضل بابا چائے سرو کر رہے تھے اور پیر پٹخ کر واپس ہولی۔

"بابا۔" فائز نے پیالی اٹھا کر لبوں سے لگاتے ہوئے انہیں پکارا۔ وہ جی کہتے ہوئے سیدھے ہاتھ باندھے کھڑے ہوگئے۔

"یہ پارس، فیضان صاحب سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہے؟" وہ چائے کے گھونٹ بھرتا اتنی احتیاط سے بول رہا تھا کہ دور سے اس کے لب ہلتے بھی نہ نظر آتے۔

"مجھے نہیں معلوم فیضی بابو۔ جب کبھی آپ کا ذکر کروں تو اٹھ کر چلی جاتی ہیں بی بی یا خاموش ہو جاتی ہیں۔" فائز نے کپ رکھا اور پُرسوچ نگاہوں سے بنگلے کی طرف دیکھا۔

"کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ مجھے پہچان گئی ہو؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں بابو۔" بابا نے افسوس

سے سر ہلایا۔

"حالانکہ غصہ مجھے اس پر ہونا چاہیے۔ وہ ہے میرے بھائی کی قاتل۔"

"اللہ توبہ استغفار فیضی بیٹے، یہ بہت بڑا الزام ہے۔" بابا نے بے حد دکھ سے کہا۔

"آپ کا بہت خیال رکھتی ہے شاید...... اسی لیے آپ اس کے خلاف کچھ نہیں بولتے۔ کیا بھائی جی کا سارا خیال اور فکر بھول گئے ہیں آپ؟" وہ خفا ہوا۔

"بڑے صاحب کو کون بھول سکتا ہے مگر یہ لڑکی بہت اچھی ہے۔ یہ کسی کا قتل نہیں کرسکتی، کبھی نہیں۔" انہوں نے جیسے جھرجھری لی۔ فائز نے خشمگیں نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"یاد ہے آپ نے بتایا تھا کہ بھائی جی کے سر کے پچھلے حصے ...... پر کسی نوکیلی چیز کا نشان تھا۔ سیڑھیوں سے گرنے پر ایسا نشان کیسے پڑ سکتا ہے؟"

"بیٹے وہ تو تھا مگر ہوسکتا ہے سیڑھیوں پر یا نیچے کچھ ایسا پڑا ہو جس پر وہ گر گئے ہوں۔ وہ رات تھی بھی تو بہت خوف ناک اور یہ لڑکی اداکاری نہیں کر رہی تھی۔" بابا نے نفی میں سر ہلایا۔ سارا منظر ایک دفعہ پھر ان کی نگاہوں کے سامنے تازہ ہوگیا۔

"میں اس وقت برآمدے میں آیا تھا اندر سے کچھ لے کر جب وہ مجھے آتی دکھائی دی......" جب وہ دونوں پچھلے گھر کی سمت چلنے لگے تو راستے میں افضل بابا بتانے لگے۔ وہ منظر انہیں آج بھی یاد تھا۔ اپنی تمام تر جزئیات سمیت۔

دسمبر کی سفید رات، برفباری، بنگلے کی مخروطی چھت برف سے اٹی تھی۔ اردگرد پہاڑیاں بھی سفید تھیں۔ بنگلے کے سامنے سڑک شام کو ہی صاف کی گئی تھی سو وہ سرمئی دکھائی دیتی تھی۔ باقی ہر سو سفیدی تھی۔

اس وقت نرم نرم سی برف گر رہی تھی جب افضل بابا، جیکٹ ٹوپی اور مفلر میں لپٹے باہر برآمدے میں آئے۔ وہ جس کام سے آئے تھے ابھی وہ انجام دینے کا سوچا ہی تھا کہ سامنے بڑے گیٹ سے وہ بھاگ کر آتی دکھائی دی۔

وہ گرتی پڑتی دوڑتی آرہی تھی۔ سیاہ لمبے اوور کوٹ میں ملبوس جس کی ہُڈ سر کی پشت پر گری تھی اور بالوں پر برف کے ذرات ٹھہرے تھے۔ وہ حواس باختہ تھی، گھبرائی ہوئی، پریشان، رو بھی رہی تھی۔

"افضل بابا...... افضل بابا......" وہ جس طرح چلّا چلّا کر انہیں پکار رہی تھی، وہ سب بھول کر پریشانی سے اُس کی طرف لپکے۔

"کیا ہوا بی بی؟"

"جلدی چلو، بڑے صاحب گر گئے ہیں اسپتال لے کر جانا ہے۔" وہ پھولے تنفس اور آنسوؤں کے درمیان تیز تیز بولتی فوراً پلٹی۔

"میں گاڑی کی چابی لے لوں۔"

"وہ میرے پاس ہے، کار وہیں کھڑی ہے۔ جلدی آئیں۔" وہ آگے دوڑتی گئی۔ افضل بابا جانتے تھے کہ پارس کو ڈرائیونگ نہیں آتی۔ وہ جتنی تیزی سے چل سکتے تھے چلتے گئے۔

وہ سیڑھیاں برف سے اٹی تھیں۔ آخری سیڑھی سے ذرا دور رضوان حیات سر کے بل گرے پڑے تھے۔ ان کی جیکٹ کی ہُڈ ان کے سر پر ہی تھی اور خون ہُڈ سے بھی باہر ابل ابل کر سڑک اور برف پر بہہ رہا تھا یعنی زخم اتنا شدید تھا کہ ہُڈ میں بھی سوراخ ہوگیا تھا۔

"رضوان، آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ بس ہم آپ کو اسپتال لے جائیں گے۔" وہ جلدی سے ان کا ہاتھ پکڑے انہیں سہارا دے کر اٹھانے لگی۔ وہ رو بھی رہی تھی، بدحواس بھی تھی۔ افضل بابا نے دوسری طرف سے سہارا دیا۔

رضوان حیات کی آنکھیں اس وقت کھلی تھیں۔ ان میں ایک عجیب سی حیرت اور شاک تھا، استعجاب...... بے یقینی......

''پارس...... پارس......!'' وہ بار بار اس کا نام پکارتے۔ آواز مشکل سے نکل رہی تھی مگر اس میں بھی حیرانی تھی، بے یقینی تھی۔

☆......☆

''میں آخری وقت تک بڑے صاحب کے ساتھ تھا۔ انہوں نے راستے میں ہی دم توڑ دیا تھا۔ آخری سانسوں میں یا تو انہوں نے پارس بی بی کا نام لیا یا آپ کا۔'' وہ دونوں اب اس چھوٹے سے مکان کے سامنے کھڑے تھے اور افضل بابا بتا رہے تھے۔

''میرا......؟'' وہ چونکا۔ ''بھائی جی نے مجھے یاد کیا؟'' اس کی آواز بھرانے لگی۔

''جی...... بہت دفعہ فیضی، فیضی کہا۔ میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ مجھے اتنا سمجھ آیا کہ وہ پارس کو مخاطب کرکے آپ کا نام لیتے تھے۔ ایک دفعہ تو مجھے لگا کہ انہوں نے کہا ہے۔ ''فیضی سے کہنا......''

''کیا...... کیا کہنا؟'' اس کی تو گویا سانس رک گئی۔

''مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ پارس بی بی ان کے قریب تھیں۔ انہوں نے ہی سنا تھا۔ وہ سمجھ کر سر ہلا رہی تھیں، رو بھی رہی تھیں۔'' فائز بالکل خاموش ہوگیا۔ پارس نے اس سے فیضان کا رابطہ نمبر بھی پوچھا تھا پھر جیسے ارادہ بدل دیا۔ ایسا کیا تھا جو بھائی جی نے فیضان کو کہنے کو کہا ہو اور وہ بتانا نہ چاہتی ہو؟ شاید انہوں نے ہوٹل آخری لمحات میں فیضان کے نام کر دیا ہو، شاید پارس کو اس کا خیال رکھنے کو کہا ہو۔ پتا نہیں وہ عجیب مخمصے میں پھنس گیا تھا۔

''میں نہیں جانتا بڑے صاحب کو قتل کیا گیا ہے یا نہیں مگر پارس بی بی ایسا نہیں کر سکتیں۔'' گھر کا تالا کھولتے ہوئے افضل بابا کہہ رہے تھے۔ فائز نے جواب نہیں دیا اس کی پیشانی پہ پُرسوچ لکیروں کا جال بچھا تھا۔

☆☆☆

ہوٹل کی لابی میں معمول کی گہما گہمی تھی۔ دوپہر کے وقت بھی رنگوں، خوشبوؤں اور روشنیوں کا سماں تھا۔ لوگوں کی چہل پہل، ویٹرز کا آنا جانا، ریسپشن ڈیسک کے پیچھے کھڑے سوٹڈ بوٹڈ افراد جو ہر ایک کو مسکراہٹ کے ساتھ خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

ایسے میں وہ کاریڈور سے چل کر آتی دکھائی دی تو ریسپشنسٹ ذرا سے مستعد ہوگئے مگر وہ ان کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ ہمیشہ کی طرح سنجیدہ چہرہ لیے، کانوں میں بالیاں، کندھوں پہ شال جو آگے لاکر بازوؤں پر اکٹھی کرکے ڈالی تھی۔ وہ چلتے ہوئے اپنے سے ایک قدم پیچھے آتے فائز کی بات سن رہی تھی۔

''میں صرف مشورہ دے سکتا ہوں، عمل کرنا یا نہ کرنا آپ کا کام ہے۔'' وہ ہاتھ میں ٹیبلیٹ پکڑے، سمجھانے والے انداز میں بولتا چلا آرہا تھا۔ ''ہمارا ہوٹل مین سٹی سے تیس چالیس منٹ کی ڈرائیو پر ہے۔ آس پاس کوئی اچھا ہوٹل تک نہیں ہے صرف رہائشی بنگلے ہیں یا چند ایک شاپس اور ایک دو ڈھابے۔ ایسے میں سیاح کرتے یہ ہیں کہ دن بھر ہمارے ہوٹل کے وسیع و عریض لان، پول، کورٹس وغیرہ میں سیر کرتے ہیں، تصویریں بنواتے ہیں اور پھر ساتھ والے کسی ڈھابے پر لنچ کرکے یہ جا وہ جا۔ ایسے میں نقصان ہمارا ہو رہا ہے۔'' لابی کے ایک طرف لگے دو آمنے سامنے صوفوں میں سے ایک پر وہ بیٹھی اور اپنا پرس میز پر رکھا پھر اسے سر کے اثبات سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ نشست سنبھالتے ہی کہنے لگا۔

''ہمیں اس خواہ مخواہ کے رش کو ذرا ڈسپلن کرنا ہوگا۔ لوگ جن کورٹس، پولز، لانز کی مفت میں سیر کرتے ہیں ان کی مین ٹیننس پر ہم مہینے کا لاکھوں روپیہ خرچ کرتے ہیں اس لیے میرا ایک مشورہ ہے میم۔''

پارس نے میز پر رکھے پانی سے بھرے وائن گلاس کو اٹھایا اور لبوں سے لگایا۔ وہ خاموشی بھرے دھیان سے سن رہی تھی۔

''ہمیں ہوٹل اینٹری کا ٹکٹ رکھنا چاہیے۔ فی

نفس چند سو روپے، یوں ہر چیز بیلنس ہوجائے گی۔''

پارس نے گلاس میز پر رکھا اور آنکھیں سکیڑے پُرسوچ انداز میں اسے دیکھا۔

''یہ تو کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے والی بات ہوئی۔''

''کیا لوگ ہماری مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھاتے؟ کیا یہ ethical ہے کہ آپ کسی ہوٹل میں جائیں، دو تین گھنٹے وہاں گھومیں پھریں اور پھر وہاں ایک پیسہ خرچ کیے بغیر واپس چلے جائیں؟ ہم بھی تو لوگوں کو زبردستی نکال نہیں سکتے۔''

''مگر صرف داخلے کا اتنا ٹیکس؟''

''میم، دیکھیں یہ ٹیکس ان کے کھانے کے بل میں ایڈجسٹ ہوجائے گا۔ ہم کہیں گے کہ جتنا آپ کا ٹیکس بن رہا ہے آپ اتنے کا کھانا فری کھا سکتے ہیں، سمپل۔''

''اوکے، اب آپ نے درست بات کی ہے۔'' اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ فائز ذرا سا مسکرایا۔

''ایسا کرتے ہیں، میں......'' پارس بولتے بولتے رکی۔ ایک ویٹر اس کے قریب آیا اور جھک کر کہنے لگا۔

''یہ صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔'' ساتھ ہی اس نے ایک کارڈ پارس کے سامنے رکھا۔ اس نے اچنبھے سے کارڈ اٹھایا۔

''شجاع طاہر علی۔''

الفاظ پڑھ کر اس کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔ آنکھوں کی پُتلیاں ساکت ہوگئیں۔ جیسے سانس رک گئی ہو پھر اس نے حیرت سے سر اٹھایا۔

''کدھر ہیں یہ صاحب؟'' اس نے دھیرے سے ویٹر سے پوچھا۔ اتنے آہستہ سے کہ فائز کو بمشکل سنائی دیا۔ وہ اب کسی بھی ڈیسنٹ آدمی کی طرح سر جھکائے بظاہر اپنے ٹیب پر کچھ کام کر رہا تھا۔

''اس طرف۔'' ویٹر نے ریسپشن پر کھڑے ایک گرے کوٹ والے شخص کی طرف آنکھوں سے اشارہ کیا۔ پارس نے اس طرف دیکھا۔ اس شخص کی پشت تھی اس جانب۔ وہ بالکل ساکت سی ہوئی چند ثانیے اسے دیکھتی رہی پھر اس کے چہرے پر اضطراب بکھرا۔

''انہیں بلا لیجیے۔'' ذرا بے چینی سے وہ بولی۔ ویٹر سر ہلا کر رخصت ہوگیا۔ پارس نے فائز کو دیکھا۔

''آپ کے وزیٹر ہیں تو میں ذرا ایڈمن بلاک سے اپنے کچھ پیپرز لے لوں۔'' وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ پارس نے بے توجہی سے سر ہلا دیا۔ اس کا دھیان بٹ چکا تھا۔

فائز نے لابی سے نکلتے ہوئے غور سے ریسپشن پر کھڑے آدمی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ یادداشت میں محفوظ کیا اور آگے بڑھ گیا۔ ویٹر نے اس آدمی کے قریب جاکر کچھ کہا وہ سر ہلا کر مڑا اور پارس کی میز کی جانب دیکھا پھر نرمی سے مسکرا دیا۔

وہ گندمی رنگت کا خوش شکل سا آدمی تھا جس کی آنکھوں پر لگے فریم لیس گلاسز اس کے چہرے کی نرمی میں اضافہ کر رہے تھے۔

پارس مسکرائے بنا اپنے گلاس کی طرف متوجہ ہوئی۔ گھونٹ بھر کر اسے واپس رکھا تو اندر موجود دو گھونٹ پانی ہولے ہولے ہلتا ساکت ہونے لگا۔ کن انکھیوں سے اسے وہ آدمی اپنی طرف آتا دکھائی دے رہا تھا۔ لابی کافی وسیع و عریض تھی۔ درمیان میں نصب فوارہ، لوگ، میزیں، وہ ہر رکاوٹ کی سائڈ سے نکلتا اپنے اور اس کے درمیان فاصلہ گھٹا رہا تھا۔

گلاس کا پانی اب ساکت ہوچکا تھا۔ شفاف مائع پر ابھی تک پارس کی آنکھیں جمی تھیں۔ کارڈ پر لکھے ایک نام نے پانی پر بہت سی تحریریں لکھنی شروع کر دی تھیں۔

ان دیکھی مگر ان مٹ تحریریں......

دروازہ دھیرے سے کھٹکا تھا۔ پہلے دو دفعہ ہلکی دستک پھر تیسری تیز دستک۔ وہ جو کتابیں کھولے صحن میں بیٹھی تھی چونک کر سر اٹھایا۔ یہ دستک وہ پہچانتی تھی۔ اس نے کتاب پرے ہٹائی، ماتھے پر شکن لیے اٹھی۔ ایک نظر برآمدے کو دیکھا۔ اماں اور شکیل دوپہر سو کر گزار رہے تھے۔ وہ دروازے پر آئی اور اسے کھولا۔

''کیا ہے؟'' اس نے اسی پُرشکن پیشانی کے ساتھ سوال کیا۔

''وہ...... تائی سو رہی ہیں؟'' سامنے کھڑا لمبا تڑنگا مگر نرمی سے مسکراتا لڑکا ذرا جھجکا۔

''ہاں، اب بتاؤ کیا کام ہے؟'' وہ جلدی میں تھی اور بیزار بھی۔

''وہ صبح میں نے تمہیں گلی میں جاتے دیکھا تھا۔ تم لنگڑا کر چل رہی تھیں۔'' وہ سر جھکائے جلدی، جلدی بولنے لگا۔ ''مجھے لگا تمہارے پاؤں میں زخم ہے پھر لگا کہ جوتا ٹوٹ گیا ہے۔''

''ہاں ٹوٹ گیا تھا جوتا، آگے بولو شجاع۔'' وہ کوفت سے بولی۔ ایک اسی کے آگے تو ساری بیزاری دکھائی جا سکتی تھی۔

''ہاں تو میں ابھی بازار جا رہا ہوں، جوتا دے دو موچی سے بنوا تا لاؤں گا۔''

''میں خود بنوالوں گی، زیاد فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب جاؤ، امی نے دیکھ لیا تو غصہ کرے گی۔'' وہ دروازہ بند کرنے لگی۔

''دے دو ناں، میں بنوا تا لاؤں گا۔ ساتھ میں ہی تو ہے۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''کہا ناں میں خود بنوالوں گی، اب جاؤ۔'' اس نے ٹھک سے دروازہ بند کر دیا۔

یہ طے تھا کہ اسے زندگی میں کوئی تبدیلی چاہیے تھی نہ ہی تبدیلی لانے کی کوشش کرتا تھی۔ اس نے خود کو پانی کے دھارے پر چھوڑ رکھا تھا...... پانی جو اب بھی گلاس میں ٹھہرا تھا۔

پارس نے نگاہیں اٹھا کر پھر دیکھا۔ شجاع فوارے کے ایک طرف سے نکل کر اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ابھی درمیان میں بہت راستہ تھا۔ ابھی اسے فوارے کا آدھا چکر پاٹنا تھا۔

فوارہ، جس سے نکلتی پانی کی دھاریں اُبل اُبل کر حوض میں گر رہی تھیں۔ ان قطروں میں چہرے تھے۔ ادھورے، ان مٹ چہرے......!

''تمہیں کس نے بولا تھا میرے لیے جوتے لانے کو؟'' اس نے چڑنے والے انداز میں پلاسٹک کے جوتوں کا تھیلا اس کے ہاتھوں میں واپس تھمایا۔ شجاع نے سر جھکا دیا۔

''میں نے آج صبح پھر دیکھا تم نے جوتا ٹھیک نہیں کروایا۔ تم تائی کی کھلی، پرانی جوتی پہن کر جا رہی تھیں۔''

''ہاں تو تمہیں کیا؟''

''مجھے اچھا نہیں لگتا پارو۔ میں تمہارے چچا کا بیٹا ہوں۔ ساتھ والے گھر میں رہتا ہوں۔ ایک جوتا بھی نہیں لا کر دے سکتا کیا؟'' اس کے انداز میں پھر بے بسی در آئی تھی۔

''نہیں...... مجھے کچھ لینا ہوگا تو اپنے پیسے سے لوں گی تمہاری خیرات نہیں چاہیے مجھے۔'' وہ چوکھٹ پر کھڑی دبے دبے غصے سے بول رہی تھی۔

اندر جمع ہوتے غصے کو اگر باہر نکلنے کے لیے صرف ایک ہی سوراخ ملے تو وہ پورے زور سے اسی جگہ سے نکلتا ہے اور پھر وہ نہیں دیکھتا کہ وہ کس پہ گر رہا ہے۔ پارس اور شجاع کا بھی یہی معاملہ تھا۔

''اچھا سارے پیسے تو تم تائی کو دے دیتی ہو اپنے لیے کیا لوگی؟'' وہ بھی جیسے جرأت کر کے بول پڑا۔ پارس لمحے بھر کو چپ ہوگئی۔

''یہ جوتے رکھ لو جب تنخواہ ملے تو پیسے دے دینا۔''

''نہیں مجھے نہیں رکھنے۔ یہ مت سمجھنا کہ میرے

پاس پیسے نہیں ہیں۔ بہت پیسے ہیں مگر...... ہاں جب تنخواہ ملے گی تو میں تمہیں پیسے دوں گی، لے آنا کچھ بازار سے مگر میرے پیسوں کا، ہاں۔'' اس نے پھر سے دروازہ ٹھک سے بند کیا۔ منظر دھندلا گیا۔ اس دھند سے ایک اور دن، ایک اور پہر، ایک اور گھڑی طلوع ہوئی۔ دھند چھٹنے لگی۔ وہ چھت کی منڈیر کے ایک طرف کھڑی تنقیدی نظروں سے الٹ پلٹ کر ان چوڑی کے سائز کی سلور بالیوں کو دیکھ رہی تھی۔

''میں نے تمہیں پچاس روپے دیے تھے۔ یہ پچاس کی تو نہیں ہیں۔''

منڈیر کے اس طرف کھڑے شجاع کا رنگ پھیکا پڑا اس نے تھوک نگلا۔

''نہیں تو.... پورے پچاس روپے کی ہیں۔''

''نہیں، میں اس دن سلائی کے لیے لیس اور بٹن لینے گئی تھی صدر، وہاں بالکل ایسی بالیاں دیکھی تھیں مگر وہ سو روپے کی تھیں۔'' وہ شش و پنج میں پڑ کر نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

''ہاں نہیں، یہ بھی ستر کی تھیں مگر میں نے بھاؤ تاؤ کر کے کم کروالی قیمت۔ تم نے بھاؤ تاؤ تھوڑی کیا ہوگا۔ ایک ہی دفعہ قیمت پوچھی ہوگی۔''

''ہاں یہ بھی ہے۔'' اس نے نیم رضامندی سے سر اثبات میں ہلا دیا پھر چھت کے دروازے کو دیکھا۔ ''اچھا اب تم جاؤ، امی نے دیکھا تو قیامت آجائے گی۔ مجھے بھی نہیں پسند یوں ملنا، آئندہ کام ہو تو سیدھے دروازے سے آنا۔'' وہ دوٹوک کہہ کر بالیوں کا پیکٹ اٹھائے اندر کی طرف بھاگ گئی۔ شجاع نرم مسکراہٹ کے ساتھ اسے جاتا دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں ڈھیروں چمک تھی۔ فوارے کے چمکیلے پانی کی طرح ٹپ ٹپ گرتے قطرے ہیروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔

پارس نے اب کی بار نگاہیں اٹھائے بغیر محض کن انکھیوں سے جانچنا چاہا کہ وہ کتنا فاصلہ عبور کر چکا ہے۔ وہ اب میزوں کے اس طرف گلاس وال کے ساتھ ساتھ چلتا آ رہا تھا۔ گلاس وال کے دوسری جانب ہوٹل کا کھلا سا شفاف نیلا چمکتا سوئمنگ پول تھا۔ وہ ایسا تھا جیسے مستطیل گڑھے میں نیلا کانچ بھر کر جما دیا ہو۔

نیلے کانچ میں بھی کہانیاں تھیں۔ ادھوری، ان مٹ کہانیاں......

وہ رات کے وقت چھت پر کرسی ڈالے بیٹھی تارے دیکھ رہی تھی۔ گردن کرسی کی پشت سے ٹکا کر، چہرہ آسمان کی طرف کر رکھا تھا۔ چوٹی پیچھے گری تھی اور بالیاں کانوں میں چمک رہی تھیں۔

''جہاں پورا سال نہیں پہنی تھیں بالیاں وہاں اب بھی نہ پہنتیں۔'' آواز پر وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔ منڈیر پہ بازو رکھے کھڑے وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ اس کی پچھلی یادوں کی نسبت وہ اب خاصا.. پُراعتماد لگ رہا تھا۔ اور خود پارس کے چہرے پر نہ کلفت آئی نہ بیزاری۔ بس سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

''کیا ہے؟''

''اس ایک سال میں تین دفعہ تائی نے تمہاری الماری سے یہ بالیاں ڈھونڈ کر کوڑے میں پھینکی ہیں، ہر دفعہ اٹھا لاتی ہو واپس اور دھو کر سنبھال لیتی ہو۔ کیا یہ اس لیے ہے کہ انہیں میں لایا تھا؟'

پارس نے ذرا سے شانے اچکائے۔

''مجھے لانے والے سے فرق نہیں پڑتا۔ اگر پڑتا ہے تو صرف اس بات سے کہ یہ میری وہ پہلی کمائی ہے جو میں نے خود پر خرچ کی ہے۔''

''اور شاید واحد بھی۔'' وہ اٹھ کر اندر جانے لگی جیسے بیٹھنا بیکار ہو۔

''میں برطانیہ جا رہا ہوں۔'' وہ ٹھٹک کر رکی اور پلٹ کر اسے دیکھا۔

''کیوں؟'' سیاہ آنکھوں میں حیرت ابھری تھی۔

''لوگ کیوں جاتے ہیں؟ پیسہ کمانے، گھر کے

حالات اچھے کرنے۔'' وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر ذرا سے کندھے اچکائے۔

''اچھی بات ہے، کرو گھر کے حالات اچھے... میں جاؤں اب؟''

''ایک منٹ سنو!'' وہ سیدھا ہو کر کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر اب سنجیدگی ہی سنجیدگی تھی۔ ''تم میرا انتظار کرو گی؟''

''نہیں۔'' وہاں تبدیلی کی کوئی خواہش نہ تھی۔

''اگر میں کہوں کہ کرنا تب بھی نہیں؟'' اسے جیسے دکھ ہوا۔

''نہیں، میرے پاس کرنے کو اور بھی بہت کام ہیں۔'' چند لمحے دونوں کے درمیان تاریک خاموشی چھائی رہی پھر وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں کہنے لگا۔

''میں خط لکھوں گا، فون بھی کروں گا۔ اماں تمہیں میرے خط ضرور دے گی۔''

''مت لکھنا، نہ ہی فون کرنا۔ اگر مجھے تمہارا انتظار کرنا ہوا تو مجھے خط یا فون کی ضرورت نہیں ہوگی۔ نہ کرنا ہوا تو تمہارے سارے خط، سارے فون بیکار۔''

''میں آؤں گا پارو، تمہارے لیے آؤں گا۔''

''بالکل ویسے ہی اگر تمہیں آنا ہوا تو آجاؤ گے اور جب آؤ گے تب کی تب دیکھی جائے گی، اللہ حافظ!'' وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ پہلی سیڑھی پر قدم رکھ کر اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے آخری بار دیکھا۔ وہ اپنی چھت کی منڈیر کے پیچھے کھڑا یاسیت سے اسی طرف دیکھ رہا تھا۔

پارو کی آنکھوں میں پانی چمکا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ بند کر دیا پھر اپنی بالیوں کو چھوا۔ پانی کا ایک قطرہ گال پر لڑھکا پھر دوسرا پھر تیسرا مگر چوتھا نہیں گر سکا۔ شعوری کوشش نہیں تھی۔ لاشعوری اسٹاپ لگ گیا تھا کہ جذبہ بس اتنا ہی تھا۔

نیلے کانچ پر سورج کی شعاعیں رقص کر رہی تھیں۔ وہ گلاس وال کے ساتھ چلتا ہوا اس کی میز کے سامنے آرکا۔ پارس نے سر اٹھایا۔ وہ نرمی سے مسکرا رہا تھا۔ وہ بدل گیا تھا۔ زیادہ خوش شکل ہو گیا تھا، کپڑے بھی اچھے تھے، سوٹ اور ڈریس شرٹ...... بہت امیر نہیں مگر ڈیسنٹ۔ وہ ہلکا سا مسکرائی، رسمی سی مسکراہٹ لیے جگہ سے اٹھی۔

''السلام علیکم، کیا میں آپ کو جانتی ہوں؟''

شجاع کی مسکراہٹ لمحے بھر کو پھیکی پڑی پھر وہ دوبارہ سے مسکرایا اور سر جھٹکا۔

''کیا تم یہ پوچھنا چاہ رہی ہو کہ میں تمہیں جانتا ہوں یا نہیں، پارس؟''

''مسز رضوان حیات...... اور نہیں، آپ مجھے نہیں جانتے، بیٹھیے۔'' وہ ہاتھ سے سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے واپس بیٹھی اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی۔ نفاست، تمکنت، اعتماد۔ شجاع نے جیسے تسلیم کرتے ہوئے سر کو اثبات میں خم دیا اور بیٹھ گیا۔

''اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ کہنا چاہوں گا کہ آپ مجھے نہیں جانتیں مگر میں آپ کو جانتا ہوں، ہمیشہ سے۔''

پارس نے مسکرا کر سر جھٹکا۔

''کتنا عجیب لگتا ہے ناں شجاع جب آپ کے ماضی سے کوئی اٹھ کر آپ کے سامنے آئے اور دعویٰ کرے کہ وہ آپ کو جانتا ہے۔ پتا ہے میں تو ہنس دیتی ہوں ایسے قرابت داروں پر۔'' وہ ہلکا سا ہنسی۔

''وہ کیسے ہمیں جان سکتے ہیں جبکہ ہمارے اور ان کے درمیان کئی برسوں کی خلیج حائل ہو چکی ہو۔ وقت اور وقت کے لگائے زخم، یہ جتنا بڑھتے جائیں اتنا ہی ماضی کے قرابت داروں سے آپ کو دور کر دیتے ہیں اور ہمارے درمیان تو آٹھ سال حائل ہیں اور پتا ہے شجاع، یہ خلیج نہیں ہے...... یہ تو خلا ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہوتا۔'' اپنی بات کہہ کر وہ پھر ذرا سا

مسکرائی۔ شجاع نے اسی نرم مسکراہٹ کے ساتھ سر ہولے سے جھٹکا۔

''مسز پارس، آپ اس خلا کے پار بھی ویسی ہی ہیں جیسا آپ کو ہونا چاہیے تھا۔ ان آٹھ سالوں میں، میں نے جتنی دفعہ بھی تمہارے بارے میں سوچا یہی لگا کہ اب تم ایسی ہو گی، بالکل ایسی ہی اور میں غلط نہ تھا۔''

''انسان بہت پیچیدہ مشین ہے۔ جتنا انسان خود اپنے آپ کو جانتا ہے اتنا کوئی دوسرا انسان اسے نہیں جان سکتا۔''

''یعنی میں اس دعوے سے پیچھے ہٹ جاؤں کہ میں آپ کو جانتا ہوں؟ ٹھیک ہے شاید اسی میں بہتری ہو۔'' پارس اسی طرح بے تاثر آنکھوں سے اسے دیکھتی، مسکرا رہی تھی۔

''سو شجاع، اب اتنے عرصے بعد اچانک کیسے آئے ہو؟'' فقرہ ختم کرتے ہی پارس نے گردن ہلائے بغیر، نگاہیں آگے پیچھے دوڑائیں۔ ہوٹل ریسپشن، لابی کی اونچی چھت، چاردیواری، باہر کے کھلے ہرے بھرے میدان، پول اور واپس اپنے پرس تک پھر نگاہیں اس کی طرف اٹھائیں اور مسکرائی۔ وہ غور سے اس کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک اداسی در آئی تھی۔

''نہیں پارس، میں ان چیزوں کے لیے نہیں آیا۔ جانتا ہوں کہ یہ ہوٹل اب تمہاری ملکیت ہے۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ تم ایک امیر بیوہ بن چکی ہو۔ یہ نہیں جانتا کہ تم نے رضوان حیات سے شادی کیوں کی تھی مگر میں صرف تم سے ملنے آیا ہوں۔''

''مل لیے؟'' اس کی مسکراہٹ سمٹی، شجاع اٹھ کھڑا ہوا۔

''تمہارے گھر کا ایڈریس ہے میرے پاس مگر تمہاری اجازت کے بغیر نہیں آنا چاہتا۔ تائی سے بھی ملاقات ہو جائے گی اس بہانے۔''

''جب جی چاہے آؤ، میرے کزن ہو مجھے کیا اعتراض ہوگا۔'' پارس نے ہلکے سے ابرو اچکائے۔

''تھینکس۔'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پلٹ گیا۔ اس کے پلٹتے ہی پارس کے چہرے کے تاثرات بدلے۔ بے رحم مسکراہٹ کی جگہ سپاٹ سنجیدگی چھا گئی۔ آنکھوں میں البتہ لمحے بھر کو اضطراب جھلکا تھا پھر خاموشی...... سرد پن۔

وہ لابی سے نکل کر باہر چلا گیا تھا۔ پارس موبائل پر فائز کا نمبر ملانے لگی۔ اس کے انداز سے البتہ بے توجہی عیاں تھی۔

☆☆☆

افضل بابا نے پانی کی ٹونٹی بند کی۔ دُھلی دیگچی سلیب پر رکھی، مگ ٹوکری میں ڈالے اور صافی سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اپنے خیال میں پلٹے کہ ایک دم ڈر گئے۔ سامنے فیضان کھڑا تھا۔ انہیں ڈرتے دیکھ کر مسکرایا۔

''سوری، میں نے آپ کو ڈرا دیا۔''

''نہیں، تم کب آئے؟'' وہ شرمندگی سے مسکرائے۔ ''بلکہ کیسے آئے؟''

''یہیں کچن کے پچھلے دروازے سے۔'' اس نے بے پروائی سے شانے اچکائے اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ افضل بابا نے پریشانی سے اسے دیکھا اور پھر لاؤنج میں کھلتے دروازے کو۔

''اس طرح تمہیں یہاں کسی نے دیکھ لیا تو؟''

''میرے ٹیرس سے سب نظر آتا ہے۔ پارس نکل چکی ہے اور اس کی ماں بھی ساتھ ہی گئی ہے۔'' وہ بے فکر تھا۔

''ہاں، انہیں دفتر جانا تھا اور فیروزہ بیگم کو کہیں راستے میں اتارنا تھا۔'' افضل بابا پھر بھی مطمئن نہیں ہوئے تھے۔ چہرے پر پریشانی ہنوز موجود تھی۔

''ان میں سے کوئی کسی بھی وقت آسکتا ہے۔''

''جانتا ہوں، میرا کام زیادہ لمبا نہیں ہے۔ پہلے مجھے بتائیں پارس کے اپنی ماں سے کیسے

تعلقات ہیں؟'' افضل بابا شش وپنج میں پڑ گئے۔

''ہاں ٹھیک ہیں، دونوں زیادہ بات نہیں کرتیں۔ ویسے وہ اس کی سوتیلی ماں ہے۔''

''اچھا!'' وہ چونکا۔ ''بھائی جی کو پتا تھی یہ بات؟''

''ظاہر ہے۔'' افضل بابا نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اب کھڑکی کے قریب آ کھڑے ہوئے تھے تاکہ باہر سے کوئی آتا تو انہیں نظر آ جاتا۔

''بھائی جی سے اس کا کیسا رویہ تھا؟''

''بہت اچھا، دونوں میں بہت محبت تھی۔'' بابا کے لہجے میں نرمی گھل گئی جیسے ان دونوں سے زیادہ بابا کو ان سے محبت ہو۔ فائز نے تنفر سے سر جھٹکا۔

''سب ڈراما ہے اس کا۔ بھائی جی کی موت کا سب سے زیادہ فائدہ پارس کو ہوا ہے۔ ان کا سب سے بڑا ہوٹل اس نے اپنے نام لکھوا لیا ہے اور جانتے ہیں بھائی جی نے کراچی اور پنڈی والا ہوٹل بھی اس کے نام کر دیا تھا۔ یہ بات مجھے دو تین ماہ پہلے معلوم ہوئی ہے۔'' وہ دبے دبے غصے سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ ''پتا نہیں ایسا کیا جادو کیا اس نے بھائی جی پر کہ وہ اس پر سب لٹاتے گئے۔''

''وہ اس سے بہت محبت کرتے تھے فیضی بیٹا۔''

''مجھے یقین نہیں ہے۔ مجھے کسی بات کا یقین نہیں ہے۔ میرے نزدیک وہ میرے بھائی کی قاتل ہے اور میں اپنے بھائی کے خون کا بدلہ ضرور لوں گا۔''

''کیا کرو گے تم؟'' افضل بابا خوف زدہ نظر آنے لگے۔

''وہی جو اس نے بھائی جی کے ساتھ کیا۔'' وہ بے رحمی سے مسکرایا پھر سر جھٹکا۔ ''خیر آپ نے مجھے بتایا تھا کہ بھائی جی کے سر پر لگی چوٹ سے ان کی جیکٹ کی ہڈ بھی پھٹ گئی تھی۔'' افضل بابا نے بہ مشکل اثبات میں سر ہلایا۔ وہ جو سمجھ رہے تھے کہ وہ صرف پارس سے متنفر ہے تو وہ غلط تھے۔ وہ تو برابر کا بدلہ چاہتا تھا۔

''وہ جیکٹ پارس نے سنبھال کر رکھی ہے، آپ نے بہت پہلے بتایا تھا؟''

''جی، ایک دن کمرے کی صفائی کرتے ہوئے مجھے وہ نظر آئی تھی۔''

''مجھے وہ جیکٹ چاہیے۔''

''فیضی بیٹا، اسے شک ہو گیا تو؟'' وہ مزید پریشان ہو گئے۔

''بے فکر رہیں بس دیکھ کر لوٹا دوں گا، ساتھ نہیں لے کر جاؤں گا۔''

''اچھا بیٹھو، لاتا ہوں۔'' وہ گومگو کیفیت میں سر ہلاتے اندر چلے گئے۔

وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور سرسری نظروں سے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ چند منٹ گزرے تو وہ آتے دکھائی دیے۔ ان کے ہاتھوں میں ایک پلاسٹک کا پیکٹ تھا جس میں ایک جیکٹ تہ کی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

''جلدی سے دیکھ لو، وہ آ نہ جائے۔'' وہ تشویش سے کہتے ہوئے کھڑکی میں جا کھڑے ہوئے۔ فائز نے پیکٹ میز پر رکھ کر کھولا۔ جیکٹ نکالی۔ اس میں سے خون کی بُو ابھی تک نہیں گئی تھی۔ اسے جیسے کبھی دھویا نہیں گیا تھا۔ پیکٹ میں بند ہونے کی وجہ سے بُو بھی اندر ہی تھی۔

اس نے جیکٹ سیدھی کی۔ اس کی ہڈ درمیان سے پھٹی ہوئی تھی۔ سوراخ اخروٹ کے سائز کا تھا اور اس کے گرد خون کے واضح نشان تھے۔ اس نے ہڈ دیکھنے کے لیے جیکٹ کو اوپر اٹھایا تو کچھ نیچے گرا۔

چھن...... چھن...... چھن۔ افضل بابا اور فائز دونوں چونکے۔ جیکٹ کے اندر شیشے کا ایک ٹکڑا تھا جو فرش سے ٹکرایا مگر ٹوٹا نہیں۔ اس نے حیرت سے ٹکڑا اٹھایا اور الٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہ سرخ نہیں تھا یعنی جیکٹ کا خون خشک ہونے کے بعد اندر ڈالا گیا تھا۔ وہ دھندلا سا تھا۔ کس چیز کا حصہ تھا؟ کچھ کہا نہیں

جا سکتا تھا۔

''کیا یہ شیشہ ان کے سر میں لگا تھا مگر یہ تو......''

وہ حیرت میں پڑ گیا دفعتاً افضل بابا کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

''فیروزہ بیگم آ گئیں، تم جاؤ جلدی۔'' وہ کرنٹ کھا کر اٹھا اور جیکٹ تہ کرنے لگا۔ افضل بابا نے تیزی سے روکا۔

''تم جاؤ میں کر لوں گا، بس جاؤ۔'' اس نے جیکٹ اور شیشہ وہیں چھوڑا پہلے متذبذب نگاہوں سے افضل بابا کو دیکھا پھر کھڑکی سے باہر جہاں فیروزہ بیگم لان کے اسٹیپس پر تھیں اور پارس پیچھے گیٹ پر تھی۔ وہ یقیناً سڑک کی سیڑھیاں دیکھنے کے لیے رکی ہو گی اسی لیے پیچھے رہ گئی تھی۔

وہ کچن کے پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ افضل بابا نے جلدی جلدی پیکٹ میں سب ڈالا، اسے بند کیا اور اوپر چلے آئے۔ اس کی الماری میں وہ رکھ کر دونوں دروازے بند کر کے جب وہ کمرے سے نکلے تو پارس سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ انہیں اپنے کمرے سے نکلتا دیکھ کر اس کی خوب صورت آنکھوں میں حیرت ابھری اس نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

''جھاڑ پونچھ صبح رہ گئی تھی آپ کے کمرے کی، وہی کر رہا تھا۔'' وہ مسکرا کر جلدی سے بتانے لگے۔ وہ ہوں کہہ کر سر ہلاتی اوپر زینے چڑھنے لگی۔

''بیٹی۔'' جب وہ ان کے ایک طرف سے ہو کر نکلنے لگی تو وہ بے اختیار پکار اٹھے۔

''جی۔'' پارس نے رک کر انہیں دیکھا۔ افضل بابا چند لمحے دکھ سے اسے دیکھتے رہے۔ ان کی آنکھیں نم ہو گئیں پھر بولے۔

''احتیاط کرنا۔''

''کس سے؟'' پارس ہلکا سا چونکی۔

''ہر کسی سے ......رضوان صاحب کے بعد تمہارے دشمن بہت سے بن گئے ہوں گے۔'' پارس اداسی سے مسکرائی۔

''بابا، اگر مجھے کسی سے خطرہ ہے کہ وہ مجھے نقصان پہنچا سکتا ہے تو وہ اور کوئی نہیں، صرف فیضان ہے، رضوان کا بھائی۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' افضل بابا کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ آنکھوں میں خوف اترا۔

''مگر فیضی تو......امریکا میں ہے۔'' پارس نے ایک نظر انہیں دیکھا۔ ایک گہری نظر پھر ہلکا سا مسکرائی۔

''جانتی ہوں۔'' وہ اندر کی سمت بڑھ گئی۔

حریص انسان

جس دن سے انسان نے اس دنیا میں قدم رکھا ہے ضرورتوں کا حصار اس کے گرد وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ بلاشبہ بعض ناگزیر ضرورتیں ہیں مگر حریص فرد اور حریص معاشرہ مادی دولت حاصل کرنے کے لیے اخلاقی قدروں کو پامال کرتا ہوا دیوانہ وار آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس ایک اخلاقی گراوٹ اور رذالت کی وجہ سے اس میں سیکڑوں دوسری خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ حسد، بخل، قطع رحم، خیانت، بزدلی، بدگمانی اور عداوت کے شعلوں میں حریص انسان عمر بھر جھلستا رہتا ہے، اس کے دل کو سکون اور طمانیت کی دولت کبھی میسر نہیں آتی۔ یہ حرص و طمع کا جذبہ ہی ہے، جو ایک دوسرے کی جان لینے اور مال چھین لینے پر ابھارتا ہے۔ ایک حدیث کے الفاظ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''حرص سے بچو کیونکہ اس نے اگلوں کو دعوت دی کہ وہ بے گناہوں کا خون بہائیں، اس نے اگلوں کو دعوت دی کہ حرام کو حلال سمجھیں۔''

اقتباس: از مضمون حرص و طمع، شہید حکیم محمد سعید
مرسلہ: فضہ بتول، اسلام آباد

افضل بابا کے قدم گویا زمین میں گڑ گئے۔

''جانتی ہوں''...... وہ کیا جانتی ہے؟

☆☆☆

رضوان حیات کے بنگلے کے عقبی طرف اونچا نیچا سا جنگل تھا۔ سروقد درخت، ویرانہ، خاموشی۔ دور کہیں جانور بولتے، پرندے چیختے تو زندگی کا گمان ہوتا ورنہ بس ایک جامد چپ سی تھی۔

صبح ابھی نیلے رنگ سے سفیدی میں تبدیلی کے ارتقا میں تھی۔ ہوا ٹھنڈی سی چل رہی تھی۔ فائز نے اپنے گھر کی اوپری منزل کی کھڑکی سے جھانکا تو وہ ڈھلان اترتی دکھائی دے رہی تھی۔ سیاہ شال اب کے اس نے بکل ڈال کر اوڑھ رکھی تھی۔ ایسے کہ سینے پر لپٹے بازو شال کے اندر تھے۔ کولہاپوری چپل کے بجائے کینوس شوز پہنے اور بالوں کو ڈھیلے جوڑے میں باندھے وہ سر جھکائے چل رہی تھی۔ وہ یقیناً واک پر نکلی تھی۔ فائز ہلکا سا مسکرایا اور جھک کر جوگرز پہننے لگا پھر سیدھا ہو کر اس نے دوبارہ نیچے دیکھا۔

وہ جنگل کی طرف جا رہی تھی۔ فائز نے ایک نگاہ اطراف میں دوڑائی جیسے اس تک پہنچنے کا متبادل مگر اتفاقیہ ٹکراؤ کا راستہ ڈھونڈ رہا ہو پھر جیسے سمجھ کر مسکرا دیا۔ اسے لمبا چکر پڑنا تھا مگر ظاہر ہے وہ ایک ''اتفاق'' ہوگا۔

پارس کے کینوس شوز بنا چاپ پیدا کیے نیچے گرے پتوں کو روندتے چلے جا رہے تھے۔ وہ زمین کو دیکھتی چل رہی تھی۔ اس کا ذہن جیسے کہیں دور الجھا تھا۔ چلتے چلتے اب وہ جنگل کے اندر پہنچ چکی تھی۔ دفعتاً اونچے درختوں کے درمیان ایک جگہ وہ رکی، جوتے کی نوک سے پتے ہٹائے۔ ایک کاکروچ کی شکل کا کیڑا پتے کے نیچے سے نکل کر تیزی سے آگے جا رہا تھا۔ پارس رک کر اس کیڑے کو دیکھنے لگی۔ وہ رینگتا ہوا اس سے دور جا رہا تھا۔ وہ پنجوں کے بل زمین پر بیٹھی اور نگاہوں سے کیڑے کا تعاقب کرنے لگی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں اداسی تھی، لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ بے حد اداس مسکراہٹ۔

درختوں کے پتے ہوا سے ذرا ذرا کھڑکنے لگے، ہلکی سرسراہٹ میں اس سے بھی ہلکی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔ اَن مٹ کہانیاں پھر سے ہر جگہ چھانے لگی تھیں......

ہوٹل کی لابی میں معمول کی گہما گہمی تھی۔ ریسپشن ڈیسک کے پیچھے سیاہ لیڈیز سوٹ میں ملبوس کھڑی لڑکی مسکرا کر سب کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ اس نے درمیان سے مانگ نکال کر بالوں کو کس کر جوڑے میں باندھ رکھا تھا۔ کانوں میں بڑی بڑی بالیاں تھیں۔

وہ بہت پیشہ ورانہ مہارت اور خوش اخلاقی سے سامنے کھڑے صاحب کو کچھ بتا رہی تھی جب لابی میں ایک غیر محسوس ہلچل مچی۔ ایک الرٹ سی کیفیت جو مہمانوں کو کبھی نہیں اور عملے کو ہمیشہ محسوس ہو جاتی تھی، تب جب باس قریب ہوتے۔

اس نے بھی بات ختم کرتے ہوئے ایک نظر کاریڈور کو دیکھا۔ رضوان حیات وہاں سے چلے آ رہے تھے۔ ان کے عقب میں سیکریٹری اور بائیں طرف ایک اعلیٰ آفیشل تھے۔ مہربان صورت، سیاہ سفید مونچھیں، سرمئی کنپٹیاں وہ سر ہلاتے ہوئے مسکرا کر ساتھ والے صاحب کی بات سن رہے تھے۔

''پارس، باس از ہیئر۔'' لڑکی کے ساتھ کھڑا سوٹ میں ملبوس ریسپشنسٹ اس کا نام لے کر زیر لب بولا۔ وہ بھی ذرا زیادہ الرٹ سی کھڑی ہو گئی۔ ہمارا بڑا ہمیں دیکھ رہا ہے، یہ احساس ہی انسان کو سیدھا کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

وہ چہرے پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ طاری کیے کھڑی کن انکھیوں سے رضوان حیات کو ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے آفیسر سے بات کرتے کرتے ایک دم رکے، ان کی نگاہیں پارس کے اوپر ٹکیں، وہ یکا یک

معذرت کرتے تیزی سے اس طرف آئے۔ پارس نے بے اختیار اُن کو دیکھا اور مسکرائی۔

''خوش آمدید، مسٹر حیات۔'' مگر انہوں نے مسکرائے بنا ذرا ناراضی بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے ریسپشن ڈیسک سے پین اٹھایا اور اس کی نوک سے پارس کی مانگ کے دائیں طرف چھوا، جیسے کچھ دھکیلا ہو۔

وہ ایک دم پیچھے ہوئی، ایک کاکروچ اُڑتا ہوا پیچھے رکھے بڑے سے گملے پر جا بیٹھا تھا۔ پارس نے بے اختیار اپنے بالوں کو چھوا اور پھر باس کو دیکھا۔ وہ برہمی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''آپ کے بالوں پر کاکروچ تھا مس اور آپ کو احساس تک نہیں ہوا؟''

''کوئی بات نہیں سر، میں اس سے تو بڑی ہی ہوں۔'' وہ بہت نرمی سے مسکرائی۔

''ناٹ فنی، لیڈی۔'' پھر انہوں نے پریشان کھڑے ساتھی لڑکے کو دیکھا۔ ''میٹرن کو بلاؤ، صفائی کے عملے کو بلاؤ۔ میرے ہوٹل کی لابی میں کیڑے کہاں سے آئے؟''

''یس سر۔'' وہ تیزی سے فون کی طرف بڑھا۔ پارس نے پلٹ کر گملے کو دیکھا۔ کاکروچ سکون سے ایک پتے پر چڑھا بیٹھا تھا۔

''سر یہ اِن ڈور پلانٹس ہیں مگر انہیں بھی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج جب دھوپ نکلی تھی تو گھنٹے بھر کے لیے انہیں باہر رکھا گیا تھا۔ یہ تبھی گملے پر چڑھ گیا ہوگا۔''

''آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ ہمارا صفائی کا عملہ اتنا بے پروا ہے کہ وہ اتنا بڑا کیڑا گملے میں نہیں دیکھ سکتا یا ہمارے ڈرین ہولز پر باقاعدہ اسپرے نہیں کیے جاتے۔''

''سر اسپرے بالکل کیے جاتے ہیں، ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا...... رہی اس بے چارے کی بات تو یہ کاکروچ ہے سر۔ ہیروشیما اور ناگاساکی میں جب ایٹم بم برسائے گئے تھے تو وہاں کتنے انسان مر گئے جو بچے ان کی نسلیں تک معذور ہو گئیں مگر ایک چیز وہاں تب بھی اثر لیے بغیر مزے سے پھر رہی تھی۔'' وہ مسکرائی۔ ''کاکروچ! اب جس چیز کو امریکا کے ایٹم بم نہیں ختم کر سکے اسے اسپرے اور دوائیاں کہاں ختم کر سکتی ہیں سر۔'' وہ بہت پُرسکون، ٹھنڈے مگر مؤدب انداز میں کہہ رہی تھی۔

''آپ کو احساس ہے کہ ہمارے ہاں کون لوگ آتے ہیں، کس اعلیٰ پائے کے عہدیدار آتے ہیں، ملٹی نیشنلز آتی ہیں۔ اگر کوئی اس کاکروچ کو ہماری لابی کا فرش استعمال کرتے دیکھ لیتا تو؟'' وہ اسی سنجیدگی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''سر یہاں تو ہمیں ساری زندگی ہمارے اپنے رشتے استعمال کرتے رہتے ہیں اگر ایک کیڑے نے ذرا سا فرش پر چل لیا تو کیا ہوا؟ اپنا دل بھی تو بار بار دھو لیتے ہیں ہم، فرش بھی دھل جائے گا۔'' پارس نے گہری سانس لے کر شانے ذرا سے اچکائے۔ وہ ہلکا سا چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ جب وہ کچھ دیر اور کچھ نہ بولے تو پارس کی مسکراہٹ پھیکی پڑی۔ اسے جیسے معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔

''سر، میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا، میں فرزانہ میڈم سے کہہ دوں گی۔ سارے عملے کو پھر سے تنبیہہ ہو جائے گی۔ میری بات کو درگزر کر دیجیے گا۔ مجھے ہوٹل یہاں کھڑے ہونے اور بڑی سے بڑی تلخ بات کو بھی خوش اخلاقی سے مٹا دینے کے پیسے دیتا ہے۔ میں بس اپنی جاب کر رہی تھی۔'' وہ محض ایک نظر اس پر ڈال کر آگے بڑھ گئے۔ صفائی کا عملہ پہنچ گیا تھا۔ پریشانی، ہلچل، مگر رضوان حیات کچھ کہنے بنا جا چکے تھے۔ پارس کو ذرا سی فکر ہوئی پھر کندھے اچکا کر کام کرنے لگی۔

اس کے سامنے ابلتے فوارے کا پانی ہنوز گر رہا

تھا۔ ہیروں کی طرح گرتے قطرے آہستہ آہستہ منظر مٹاتے گئے اور صفحے کو کورا کر دیا پھر اس سفیدی پر مٹے رنگ ابھرنے لگے۔

"دیکھ شکیل کو پیسے چاہیے ہیں۔ تو کسی بھی طرح تین لاکھ کا بندوبست کر۔" وہ کچن میں کھڑی سلیب صاف کر رہی تھی جب پیچھے سے فیروزہ مائی آکر بولی۔ اس نے جیسے تھکن سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ بال پونی میں باندھے، سادہ شلوار قمیص اور سوئٹر میں ملبوس وہ تکان زدہ لگ رہی تھی۔

"امی، تم جانتی ہو میری نئی، نئی نوکری لگی ہے۔ مجھے اتنی جلدی ایڈوانس نہیں مل سکتا اور تین لاکھ تو ایڈوانس سے بھی اکٹھا نہیں ہوگا۔"

"مجھے باتیں نہ سنا پارو۔ تیرے بھائی کا تازہ تازہ کاروبار شروع ہوا ہے دبئی میں۔ اب پیسے نہیں دے گی تو برسوں کی محنت ضائع جائے گی۔"

"کون سی محنت؟" وہ واپس سلیب پر جھکتے ہوئے ہلکا سا بڑبڑائی۔ "پہلے غیر قانونی طور پر دبئی گیا وہاں پکڑا گیا، ضمانتوں کے پیسے بھرے وہ قرضے اترے نہیں کہ......"

"منہ میں مِن مِن نہ کر، دیکھ رہی ہوں میں تجھے جب سے مری آئی ہے بہت زبان چلنے لگی ہے تیری مگر یاد رکھ میرے ساتھ جھوٹ بولا ناں تو......"

"کون سا جھوٹ امی؟" وہ روہانسی ہوئی۔

"اتنا قرضہ نہیں مل سکتا، خود کو گروی رکھ دوں کیا؟"

"زبان نہ چلا میرے آگے۔ بس مجھے اپنے باس وغیرہ کے پاس لے جا میں خود بات کرلوں گی۔"

"امی، خدا کا خوف کرو۔" وہ دہل گئی۔ "میں ہوٹل کی ایک معمولی ریسپشنسٹ ہوں۔ میں باس سے خصوصی ملاقات کا سوچ بھی نہیں سکتی کہاں یہ کہ آپ کو ساتھ لے جاؤں، ویسے بھی وہ یہاں نہیں ہوتے۔"

"مجھے سب پتا ہے یہ ہمارے آس پاس ہوٹل کا عملہ ہی رہتا ہے۔ سن لیا ہے میں نے کہ بڑے صاحب صبح سے اِدھر ہی ہیں اور فون بھی آگیا تھا ابھی تجھے رضوان صاحب نے بلایا ہے اپنے آفس۔ شام پانچ سے چھ بجے کے درمیان۔ بس میں تیرے ساتھ چل رہی ہوں۔"

"مجھے بلایا ہے رضوان صاحب نے مگر کیوں؟" وہ ہکا بکا کھڑی رہ گئی۔

"یہ ڈرامے کسی اور کے سامنے کر...... پانچ بجے تیار رہنا میں بھی ساتھ چلوں گی۔ وہ وائل کا نیلا جوڑا پہن لوں گی۔" وہ جیسے ہوش میں آئی۔

"نہیں امی پلیز، کیوں بے عزتی کرواتی ہو۔ انہوں نے مجھے ڈانٹنے کے لیے ہی بلایا ہوگا۔ خدا کے لیے میرے لیے اور مشکلیں کھڑی نہ کرو۔" وہ پریشان ہوگئی تھی۔ اسفنج، صابن سب رکھ دیا۔

"میں کچھ نہیں سن رہی۔ میں چل رہی ہوں تیرے ساتھ۔ دیکھنا وہ تجھے فوراً قرضہ دے دے گا۔" وہ حتمی لہجے میں کہہ کر دروازے سے باہر نکل گئی۔ پارس بے بسی سے اسے جاتے دیکھتی رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں متوقع توہین کے احساس سے پانی بھرنا شروع ہوگیا تھا۔

"اوہ میڈم آپ!" پھولی سانسوں کے درمیان آتی آواز۔ یادوں کا بلبلہ ٹوٹا بے رنگ پانی کے ساتھ رنگ فضا میں قطروں کی صورت بکھر گئے پارس چونک کر پلٹی۔

وہ جنگل میں تھی۔ اس کے دائیں طرف سے فائز بھاگتا چلا آرہا تھا۔ ٹریک سوٹ میں ملبوس، بال گیلے، چہرہ ورزش کی تمازت سے گلابی ہوتا ہوا۔ اس کے قریب آکر وہ رکا اور حیرت سے اسے دیکھا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ بھی اِدھر واک کرتی ہیں۔" پھر اس نے ذرا فکرمندی سے اسے دیکھا۔ "خیریت میم، آپ ٹھیک ہیں؟" پارس نے جواب دیے بِنا اس سمت دیکھا جہاں وہ کیڑا رینگ رہا تھا۔ اب وہ اُدھر نہیں تھا۔ وہ ہاتھ جھاڑتی اٹھ

کھڑی ہوئی۔

"ہاں، تھینکس۔ کچھ کھو گیا تھا تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔" پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "مگر ہر کھوئی چیز واپس نہیں ملتی۔ اپنے ہاتھوں سے کسی کو کھودو تو وہ کبھی واپس نہیں ملتا۔"

فائز کے چہرے پر سایہ سا لہرایا، لب بھنچ گئے آنکھوں میں پتھراہٹ آگئی۔

"کیا اس نے ابھی اعترافِ جرم کیا ہے؟ اپنے ہاتھوں سے بھائی جی کو کھونے کا مطلب انہیں جان سے مارنا ہے؟" پارس اسے دیکھے بِنا سست روی سے آگے چلنے لگی۔ وہ چہرے پر ڈھیروں سختی اور کرب لیے اس کے پیچھے قدم اٹھانے لگا۔

"آپ نے کس کو کھودیا؟" وہ دھیرے سے بولا حتی المقدور کوشش کی کہ آواز میں سرد پن نہ جھلکے مگر وہ اس کے لہجے کی تلخی محسوس کرنے سے بہت دور تھی۔

"میں نے بہت کچھ کھویا ہے اور سب خود ہی کھویا ہے۔ سب میرا قصور تھا۔" وہ جیسے قدم کہیں اور اٹھا رہی تھی پڑ کہیں اور رہے تھے۔

"کیوں خود کو بلیم کر رہی ہیں؟ جو ہوتا ہے قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔"

"میں نے بہت کچھ گنوادیا خود ہی۔ سب خود ہی کیا۔" وہ جیسے اس کی بات سن ہی نہیں رہی تھی۔ اپنے فارمل personna کو بھلائے وہ خود کلامی کر رہی تھی۔ کسی ایسے مسافر کی طرح جو سب کچھ ہار کر ننگے پاؤں صحرا میں چل رہا ہو۔ جسے نہ پیاس ہو نہ منزل کو پانے کی چاہ......

فائز کے ماتھے کی رگیں تن گئیں۔ آنکھوں کے سامنے ان گزرے برسوں میں بیتے بہت سے پل لہرائے۔ بھائی جی، اس کے باپ جیسے بھائی......اور اس عورت نے خود ہی انہیں مار دیا، اپنے ہاتھوں سے اور کوئی اسے سزا نہیں دے گا؟ پارس آگے چل رہی تھی۔ وہ نامحسوس انداز میں جھکا اور جوگرز کے تسمے جلدی جلدی کھول کر نکالے پھر ان کے درمیان گرہ لگائی اور سیدھا ہوگیا۔

"میڈم، آپ کو نہیں لگتا کہ آپ بے جا خود کو پریشان کر رہی ہیں؟" وہ اس کے عین عقب میں چل رہا تھا۔ لمبا تسمہ دونوں ہاتھوں میں لپیٹتے ہوئے اس کی پارس کی پشت کو دیکھتی آنکھیں نفرت سے بھری تھیں۔

"رضوان صاحب چلے گئے تو وہ اللہ کی مرضی تھی۔ اب بھی بہت کچھ ہے آپ کے پاس والدہ، خاندان والے، گھر، ہوٹل بہت کچھ۔" وہ اب اس کے بہت قریب تھا۔ صرف ذرا سے بازو آگے بڑھا کر تسمہ اس کی گردن کے گرد لپیٹ سکتا تھا۔

"پتا نہیں فائز صاحب، آپ نہیں سمجھ سکتے۔" وہ سر جھکائے بولی تو واضح ہوا کہ وہ اس کی اتنے نزدیک موجودگی سے بخوبی واقف تھی۔

"چیزیں حیثیت نہیں رکھتیں، انسان بھی نہیں رکھتے، اہم ہوتے ہیں رشتے جب ہم سے چیزیں چھین لی جائیں تو دل ڈوب ڈوب کر ابھرتا ہے مگر جب رشتے کھو جائیں تو دل ایسا ڈوبتا ہے کہ ابھر نہیں سکتا، سانس تک رک جاتی ہے پھر زندگی میں کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

"مجھے بھی کچھ اچھا نہیں لگتا پارس بی بی۔ مجھ سے میرا باپ جیسا بھائی چھین لیا تم نے۔ تمہیں حساب دینا پڑے گا، لازماً۔" اس نے تسمے ہاتھوں میں ٹائٹ کرتے ہوئے سوچا اور بازو اونچے کیے۔ پارس ایک دم رک گئی۔ فائز کے ہاتھ فضا میں ہی ٹھہر گئے، سانس بھی ٹھہر گئی۔ پارس کی پشت ابھی تک اس کی طرف ہی تھی۔

کیا رضوان حیات کا قتل فیروزہ مائی نے کیا؟ کیا فیضان اپنے مشن میں کامیاب رہا؟ کیا پارس بھی اپنے منصوبے میں کامیاب رہی......؟ یہ سب جاننے کے لیے اختتامی حصہ ضرور پڑھیے مگر اگلے ماہ۔



ولیمے کی تقریب میں محترمہ عذرا رسول' انجم انصار کے اہل خانہ کے ہمراہ

یہ تو ہونا ہی تھا

عظمیٰ آفاق سعید

پیاری قارئین بہنو! آپ کو عظمیٰ آفاق کا پرخلوص سلام! کیسے کیا حال ہیں......؟ کیا کہا؟ بالکل ٹھیک۔ ماشاءاللہ، جزاک اللہ جیتی رہیے سلامت رہیے تاقیامت رہیے۔ اللہ کرے آپ کے سارے خوابوں کو تعبیر ملے۔ خوابوں کی بات کریں تو خواب تو میں نے بھی دیکھا تھا۔ اپنے ضیا بھائی کی شادی کا خواب۔ بہنوں کو شاید یاد ہو کہ جب عمیر کی شادی کا احوال بعنوان شادی میرے شہزادے کی چھپا تھا تو میں

نے اس کے آخر میں ایک دعا کی تھی اور وہ دعا اپنے لاڈلے بھائی ضیا کی شادی کی تھی کہ اللہ رب العزت ضیا کے بھی ہاتھ پیلے کردے۔ جوان بھائی کا بوجھ اٹھانا آج کل کے زمانے میں کوئی آسان کام ہے بھلا! امی اور ابو اس احساس ذمے داری میں دبلے ہوئے جارہے تھے کہ کب اچھی سی لڑکی ملے اور کب اسے بیاہ دیں۔ میرا بھائی ضیا انتہائی پرہیزگار، خوددار اور سیلف میڈ لڑکا ہے۔ وہ یہی کہتا تھا کہ جب تک میں سیٹ نہ ہوجاؤں، شادی نہیں کروں گا۔ میری اور امی کی یہی ضد تھی کہ بھئی اب شادی ہوجانی چاہیے۔

میرے دونوں بھائی ضیا اور عمیر آسٹریلیا میں ہوتے ہیں۔ عید پر ہم چاروں بہن بھائی جمع ہوتے ہیں۔ عید پر دونوں بھائی بھی دو دن پہلے ہی باہر سے آجاتے ہیں۔ اس طرح ہماری عید، عید سے دو تین دن پہلے ہی ہوجاتی ہے۔ کیونکہ امی جب سب کو اپنی آنکھوں میں بھرلیتی ہیں اور خوش ہوجاتی ہیں تو وہ دن ہمارا عید کا ہوتا ہے۔

اس دفعہ یہ پلان عمیر نے بنایا کہ ”آپی سب لوگ عید پر آرہے ہیں۔ ضیا کی شادی کردو آخر یہ کب شادی کرے گا؟“

”یہ مانے تب ناں، لڑکی تو میں دو دن میں ڈھونڈ لوں گی۔“ میں نے عمیر کو جواب دیا۔

”آپی کچھ بھی کرو لیکن یہ کام اسی عید پر ہونا چاہیے۔“ عمیر بضد تھا اور پھر ہوتا وہی ہے جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔ اسی لیے بڑے جو کہتے ہیں وہ ٹھیک ہی کہتے کہ ہمیشہ اچھی بات منہ سے نکالنی چاہیے۔ کیا پتا کون سا وقت قبولیت کا ہو۔ میں نے اپنی دوست شازیہ جمال سے ضیا کی شادی کا تذکرہ ہی کیا تھا۔ شازیہ بیٹھے ہی بیٹھے اپنے کسی جاننے والے کا بتانے لگیں۔ بھلا ہو آج کے زمانے میں اس انٹرنیٹ کا دومنٹ میں تصویر آگئی۔ لو بھئی میں نے بھی دیکھ لی۔

امی کو بھی پسند آگئی۔ فون پر لڑکی کی بہن سے بھی بات ہوگئی۔ ضیا کو تصویریں بھیجیں، وہ بھی تھوڑی دیر میں مان گئے (آخر تھوڑا نخرہ بھی تو دکھانا تھا کہ پہلے منع کرتے رہے اور پھر فٹ سے ہاں کردی)

دلہن حنا امریکا میں رہتی ہیں، والدین حیات نہیں ہیں۔ بڑی بہن، ثنا اور بہنوئی حسن سارے معاملات دیکھ رہے تھے۔ پہلے یہ طے ہوا کہ عید پر دونوں کا نکاح کروادیتے ہیں پھر ایک سال بعد رخصتی ہوجائے گی لیکن پھر بات یہ فائنل ہوئی کہ سب لوگ اتنی دور سے آرہے ہیں۔ دولہا ضیا' عمیر اور اس کی بیوی ثمینہ آسٹریلیا سے آرہے ہیں جبکہ دلہن حنا اور اس کے گھر والے بھی امریکا سے آئیں گے تو شادی ہی کیوں نہ کردی جائے۔

سارے معاملات خوش اسلوبی سے طے کروانے میں جہاں امی ابو سرگرم تھے وہیں حنا کی خالہ طلعت اور ان کے شوہر برادرم الطاف گوہر بھی پیش پیش تھے جو کراچی میں امی کے گھر کے نزدیک ہی رہتے ہیں۔

پہلے ہم لوگ شگن کی مٹھائی لے کر حنا کی خالہ ہی کے گھر گئے بعد میں وہ لوگ بھی مٹھائی لے کر ہمارے گھر آئے۔ ہم ضیا کو اسکائپ پر مٹھائیوں کے ٹوکرے اور اس کے گفٹ دکھا دکھا کر جلا رہے تھے اور وہ دل ہی دل میں خوش ہورہا تھا یا یوں کہیے کہ دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔

طے یہ کیا گیا کہ عید کے بعد 12 اگست کی مہندی، 16 اگست کو شادی اور 18 اگست کو ولیمہ۔

ضیا بیسویں روزے کو آگیا تھا۔ اور آتے ہی اپنی شاپنگ میں لگ گیا۔

دلہن کے بہن بہنوئی ایک مہینہ پہلے ہی آگئے تھے جبکہ دلہن عید سے ایک ہفتہ پہلے اپنی دو چھوٹی بہنوں صبا اور فرحینہ کے ساتھ پہنچی تھی۔ امریکا سے

پاکستان کا سفر کافی تھکا دینے والا ہوتا ہے اس لیے ہم دو دن بعد دلہن کو دیکھنے اس کی بہن کی سسرال پہنچے کیونکہ یہ سب وہیں رکے تھے۔ دبلی پتلی سی حنا تصویروں کی طرح پیاری لگی۔ مجھے اس میں جو سب سے اچھی بات لگی وہ یہ تھی کہ پانچ وقت کی نماز پڑھتی ہے، ایک ایسے ملک میں جہاں اذان کی آواز کانوں میں نہیں پڑتی، اس ماحول میں رہتے ہوئے اپنے آپ کو دین کے قریب رکھنا اور اسے شان سے اپنانا نہ صرف قابلِ فخر ہے بلکہ قابلِ تقلید بھی ہے۔

عید کے تیسرے دن مہندی کی تقریب تھی جو امی کے گھر کے نزدیک ایک شادی ہال میں تھی۔ مہندی سے ویسے تک مون سون کی دھواں دھار بارشوں کی پیش گوئی کی جا چکی تھی۔ امی نے نفل نمازیں اور روزوں کی منت مان لی تھی کہ ساتھ خیریت کے.... سارے معاملات طے پا جائیں اور ساری تقریبات احسن طریقے سے انجام پالیں۔ اس میں ان لوگوں کی دعائیں بھی شامل ہیں جو امی سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ مہندی کی تقریب خوب شاندار رہی جب ہم ہال پہنچے تو لڑکی والوں نے پھولوں کے ہار اور پتیوں سے ہمارا استقبال کیا۔ دلہن کی سب بہنیں، کزنز، ممانیاں، ماموں، خالائیں سب پارلر سے تیار ہوئی تھیں۔ وہ تو شکر ہے کہ ہماری بیٹی اجیہ مجھے بھی پارلر لے گئی تو میرے بھی بال بن گئے اور میک اپ ہو گیا ورنہ میں سوچ رہی تھی کہ شادی اور ویسے میں پارلر سے تیار ہو جاؤں گی۔

''آپ کو میک اپ کرنا آتا ہے جو آپ کریں گی؟'' اجیہ سوالیہ انداز میں مجھ سے پوچھ رہی تھی اور بیٹی کی بات مان کر میں بھی فخریہ گردن تان کر چل رہی تھی (میک اپ بہت شاندار جو ہوا تھا) نانی امی، ندیم ماموں اور سہیل ماموں اسلام آباد سے آ چکے تھے۔ میری کزن حمیرا باجی اپنی پوری فیملی کے ساتھ لاہور سے آئی تھیں۔ نانی امی کے آنے سے ہمارے گھر میں جیسے بہار سی آ گئی تھی۔ وہ بے تحاشا محبت کرنے والی نانی ہیں۔

مہندی کی تقریب بے حد زبردست تھی۔ سب سے پہلے تو سجاوٹ بہت شاندار تھی ہر طرف پیلے پردے، گیندے کے پھولوں کی ٹوکریاں، پھولوں سے سجا جھولا۔ حد تو یہ کہ کرسیاں اور میزیں بھی پیلے پوشاک میں اترائی اترائی سی نظر آ رہی تھیں۔ مہندی کی اس تقریب میں ہم نے اپنے مہمان مدعو نہیں کیے تھے۔ صرف گھر والے اور گھر میں ٹھہرے ہوئے مہمان تھے جن کی تعداد بھی 35 کے قریب تھی۔ تقریب کی رونق اور جان میرے بیٹے ایان اور اس کے کزنز کے ڈانس تھے۔ میری سب سے چھوٹی نند امبر کی بیٹیاں چھوٹی چھوٹی ہیں مگر وہ کسی ماہر رقاص سے کم نہیں۔ ان کا ڈانس دیکھ کر ہنسی بھی آ رہی تھی اور حیرت بھی ہو رہی تھی کہ چھوٹی بچیاں کتنی عمدگی سے نقالی کر لیا کرتی ہیں۔ آخر میں عظیم بھائی کی بیٹیوں رامین، کرن اور ہماری چھوٹی شہزادی کسویٰ نے بھی مہندی کے ایک گیت پر خوب ہاتھ پیر ہلائے جسے سب نے خوب سراہا۔ میں نے اور آرزو بھابی نے ڈھولک گیتوں میں خوب خوب حلق پھاڑے جن میں پندرہ بیس لڑکیوں نے ہمارا ساتھ دیا۔ لڑکی والوں نے جب ہمارا اس قدر ہوہا دیکھا تو دلہن کی دو بہنوں نے لڈی ڈالی اور ایک کزن نے جھومر رقص پیش کیا۔ جسے ہاتھ باندھ کر ہم سب نے دیکھا۔ دلہن حنا کو پہلے ہی اسٹیج پر سجے سجائے جھولے پر ضیا کے ساتھ بٹھا دیا گیا تھا کہ وہ دونوں بھی اپنی مہندی کے ڈھولک گیتوں کو انجوائے کریں اور دونوں کے مسکراتے چہرے اس کی ترجمانی بھی کر رہے تھے۔ اس کے بعد مہندی کی رسم صدقہ اتارنے سے شروع کی گئی۔ سب نے دولہا، دلہن کے مہندی لگائی اور ڈھیروں دعائیں دیں۔ ماشاء اللہ دونوں ہی بہت پیارے لگ رہے تھے اور یوں بھی کم عمری کا



دائیں سے ہما بیگ، تسنیم ماہ پارہ، عطیہ عمر، سکینہ فرخ، عالیہ حرا، انجم انصار، عرشیہ جنید، عقیلہ حق، طلعت نیاز، عذرا رسول، شگفتہ شفیق، سیمار رضا، ناہید فاطمہ، صبیحہ شاہ، ڈاکٹر شہلا عامر، شمائلہ سہیل جاوید

حسن الگ ہی ہوتا ہے۔ دلہن ابھی امریکا میں ڈینٹل ہائی جین کا کورس کر رہی ہیں جو چار سال کا ہوتا ہے۔ آخر میں مہندی لگوائی کا مرحلہ آیا جو خاصا بھرپور رہا۔ دلہن کی بہنیں مہندی لگوائی مانگ رہی تھیں اور ضیا اپنے کُرتے میں اپنا والٹ ہی رکھنا بھول چکے تھے۔ خیر کافی ہنسی مذاق کے بعد یہ مرحلہ بھی طے ہوا اور ساتھ ہی کھانے کا دور شروع ہوا مگر دولہا دلہن سب سے بے نیاز اپنی تصویریں بنوانے میں مگن تھے۔ نزہت آنٹی امی سے باتیں کر رہی تھیں۔ نانی امی کی طبیعت ٹھیک تھی اور دونوں ماموں، نانی امی کے پاس بیٹھے تھے۔ امی کی خالہ جنہیں ہم بھی خالہ اماں کہتے ہیں وہ سب سے مل کر خوش ہو رہی تھیں۔ عذرا پھپو کی ساڑی مہندی کی مناسبت سے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ آج میں نے گولڈن غرارے کے ساتھ فیروزی کامدار شرٹ اور بڑا سا دوپٹا پہنا تھا اور ٹیکا بھی لگایا تھا۔ میری امی مجھے دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔ آرزو بھابی نے بھی گلابی سوٹ پہنا تھا اور انہوں نے بھی ٹیکا لگایا تھا۔ ثمینہ بھابی کی ساڑی بے حد اسٹائلش تھی مگر نزہت آنٹی کو ان کے ٹیکے کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ بیرے مہمانوں کی ہیلپ کر رہے تھے۔ بعض کے لیے کھانا بھی ان کی ٹیبلوں پر پہنچا رہے تھے تاکہ مہمانوں کو کسی تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

کھانے میں چکن بریانی، قورمہ، حلیم، قلفی، کولڈ ڈرنک اور تکہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد یہ تقریب خیر و خوبی سے انجام کو پہنچی۔ مہندی اور شادی میں تین دن کا گیپ تھا جو تقریب سے پہلے کافی زیادہ لگ رہا تھا کہ جلدی جلدی شادی ہوتی اللہ اللہ خیر صلا لیکن وہ کہتے ہیں ناں کہ جو ہوتا ہے اچھا ہوتا ہے۔ یہ تین دن کیسے گزر گئے پتا ہی نہیں چلا کوئی اپنی شرٹ کے لیے بھاگ رہا ہے تو کسی کو اپنی شیروانی کاٹ رہی ہے۔ کسی کا میچنگ سیٹ کھو گیا ہے تو کسی نے اپنا پیٹ خراب کیا ہوا ہے یعنی جس کو دیکھیں انٹرٹین کرنے میں لگا ہوا ہے۔ شادی کے گھر کا ماحول بنا ہوا تھا۔ امی کی میڈ انیسہ سب گھر والوں اور مہمانوں کو بھاگ بھاگ کر ناشتا کھانا کروا رہی تھی۔ اب مجھ غریب کا

بھی حال سن لیجیے۔ گانا گا گا کر اور دن رات جاگ جاگ کر میری آواز بیٹھ گئی تھی۔ بخار تو میں نے نہیں چڑھنے دیا مگر آواز نہ کھڑی ہوئی۔ میں اس پر بھی نہ گھبراتی وہ تو جب نانی امی اسلام آباد سے آئیں تو مجھے پتا چلا، وہ میری طرف پشت کیے کھڑی تھیں۔ میں تڑپ کر اُن سے ملنے بھاگی اور پیچھے ہی کھڑے ہو کر انہیں سلام کیا آواز شاید بالکل بدل گئی تھی۔

''نانی امی السلام علیکم!'' مجھے بھی اپنی آواز اجنبی سی لگی۔ نانی امی متوجہ نہیں ہوئیں۔ میں سمجھی اس دفعہ نانی کافی بوڑھی ہو کر آئی ہیں، کان کا آلہ بھی کام نہیں کر رہا ہوگا۔ ہمت نہیں ہاری دوبارہ اپنی دبی دبائی آواز جو خاصی مردانہ سی ہو گئی تھی کہا۔

''نانی امی السلام علیکم!'' نانی پھر متوجہ نہیں ہوئیں۔ میں نے دل میں سوچا میری طرف سے تو کوئی ناراضی بھی نہیں ہے پتا نہیں کیوں ناراض ہو گئی ہیں۔ اس دفعہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اب کے سوچا کہ نانی امی اب کے نہ پلٹیں تو میں پلٹ جاؤں گی پھر اپنی بلغمی آواز کو کھینچ کر کہا۔

''نانی امی السلام علیکم!'' شاید ممتا کا جذبہ تھا کہ اُن کے دل میں محبت کی گھنٹیاں بج گئیں جیسے فلموں میں ہوتا ہے کہ بچہ امریکا میں روتا ہے اور ماں افریقہ میں بستر سے چھلانگ مار کر اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ نانی امی پلٹ پڑیں۔

''ارے تم ہو، غلطی میری بچی۔'' نانی امی پیار سے لپٹا کر بولیں۔

''تو آپ کیا سمجھیں؟'' میں نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا۔

''میں سمجھی پلمبر ہے۔ ابھی انجم کے کچن کا نل بدلنے آیا تھا ناں۔ اس کی بھی ایسی ہی آواز تھی''۔ نانی سادگی میں بول گئیں۔ میں سمجھ گئی غلطی ان کی نہیں بلکہ میری ہے پھر کیا تھا آؤ دیکھا نہ تاؤ خوب غرارے کر کر کے اپنی آواز کھولی کہ شادی کے دن تک نسوانی اور مردانہ آواز کا فرق ظاہر ہو۔

اللہ اللہ کر کے 16 اگست کا دن آ ہی گیا۔ صبح سے سب جلدی جلدی ناشتا کر رہے تھے کہ کیا کام بچ گئے ہیں انہیں مکمل کروایا جائے۔ ضیا صاحب نے بھی ہیر ڈریسر سے بکنگ کروائی تھی کہ شام میں ان کے بال سیٹ کر دے۔ ہمارے امی ابو ٹائم کے معاملے میں کافی اصول پسند ہیں۔ وقت سے پہلے کام کرنے کے عادی ہیں۔ موسم دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا گیا۔ تیز تڑاکے کی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ بارش کا دور دور تک کوئی امکان نہیں تھا۔ بارات پانچ ستاروں والے ہوٹل جانی تھی اور دولہا دلہن کی رات کی اسی ہوٹل میں بکنگ تھی۔

''بھائی ضیا میرے بچوں کو بھی اپنے ساتھ لے جانا۔ دیکھ تجھے کچھ نہیں کہیں گے، اپنے بستر کے نیچے سلا لینا۔'' میں ضیا کو چھیڑ رہی تھی۔

''اور کیا ماموں، یہ تو ناانصافی ہے ہم سب آٹھ آدمی ایک کمرے میں سو رہے ہیں اور آپ لوگ صرف دو۔ پورا کمرا بیکار جائے گا۔'' ایمان ماموں کے ساتھ مذاق کے موڈ میں تھا مگر ضیا سب کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا رہے تھے۔ میری بیٹی اجیہ ماشاء اللہ سے اتنی جلدی بڑی ہو گئی ہے کہ کہیں ہم دونوں جاتے ہیں تو سب اسے میری چھوٹی بہن سمجھتے ہیں۔ مجھ سے لمبی ہے ماموں کی شادی کے لیے اس نے خاص طور پر سوٹ بنوائے تھے۔ مہندی میں غرارہ، شادی میں گاؤن اسٹائل والا سوٹ جبکہ ولیمے کے لیے فش لہنگا ڈیزائن کروایا گیا تھا۔

شام کو ہم سب لوگ پارلر سے تیار ہو کر آ گئے تھے جن میں بڑی بھابی ندرت، ثمینہ، میں، امی، اجیہ، رامین، کسوئی سب شامل تھے۔ آج ساری خواتین بجلیاں گرا رہی تھیں۔ میں نے گولڈن کلر کا سوٹ پہنا تھا جس پر خوب صورت نگوں کا گوٹے کا دبکے دھاگے کا.... کام تھا۔ ثمینہ (چھوٹی بھابی) نے فیروزی شرارہ پہنا تھا۔ ندرت بہت پیارے پرپل سوٹ میں تھیں۔ اجیہ بے بی پنک سوٹ میں تھی۔ امی نے گولڈن اور آف وائٹ ساڑی پہنی جو اُن پر بہت سوٹ کر رہی تھی۔ چھوٹی بچیوں رامین اور کرن نے چوڑی دار پاجامے کے کام والے سوٹ جبکہ ہماری کسوئی نے شاکنگ پنک شرارہ پہنا تھا۔ دولہا سمیت سب لڑکے شیروانی میں تھے۔ آفاق بھی کالی شیروانی میں غضب ڈھا رہے تھے جبکہ میرے دونوں بیٹے ایمان اور علی شہزادے لگ رہے تھے۔ ایمان کو کوئی امیتابھ کہہ رہا تھا تو کوئی عمیر جونیر۔ وہ چھوٹے بھائی عمیر سے بہت مشابہ ہے شاید اسی وجہ سے میرا بہت لاڈلا بھی ہے عمیر کی طرح۔

دولہا بھائی تیار ہو کر پھرکی کی طرح پورے گھر میں گھوم رہے تھے اور ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ جن خواتین کا میک اپ نہیں ہوا ہے ان کا میک اپ بھی وہ کر دیں مگر جلدی ہوٹل پہنچیں۔ سب لوگ وقتِ مقررہ پر گھر پر سہرابندی کے بعد ہوٹل کے لیے روانہ ہوئے۔ راستہ چونکہ گھر سے ہوٹل تک کا آدھے گھنٹے کا تھا اور دس بارہ گاڑیوں کا قافلہ تھا اس لیے سب کو جمع کر کے چلنے میں ایک گھنٹا لگ گیا۔ دلہن والے استقبالیہ پر کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ سب سے مل کر ہال کی طرف چلے جو بہت خوب صورت ارینج کیا گیا تھا۔ فریش فلاور سے اسٹیج بنایا گیا تھا۔ پورے ہال کی کلر تھیم ریڈ اور گولڈن تھی کیونکہ دلہن کا ڈریس کلر ریڈ اور گولڈن تھا۔ یہ بات پوچھ کر پہلے ہی ہوٹل والوں کو بتا دی گئی تھی۔ ڈریس کوڈ شیروانی تھی۔ اسی وجہ سے سارے لڑکے شیروانی میں ہی ملبوس تھے۔ تھوڑی دیر میں ہی نکاح کا مرحلہ طے ہو گیا۔ سب دولہا کو مبارک باد دینے بڑھے۔ دو چار مردوں کے بعد میں ضیا کے گلے مل رہی تھی جب میں مبارک باد دے کر پلٹی تو کافی مرد گلے ملنے کا انتظار کر رہے تھے۔ چھوارے بانٹنے کا کام ایمان اور علی کے سپرد تھا مجال ہے کہ وہ کسی آنٹی اور بچے کو ایک چھوارے کی تھیلی سے زیادہ تو دے دیں۔ امی ابو سب سے مبارک بادیں وصول کر رہے تھے اور کافی خوش اور مطمئن نظر آ رہے تھے۔ لڑکا ہو یا لڑکی شادی دونوں کی وقت پر ضروری ہے۔ یہ فرض امی اور ابو دونوں نے ادا کر دیا تھا۔

''ماشاء اللہ آپ دونوں کے چاروں بچے شادی شدہ ہو گئے۔'' میں نے امی ابو کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔

''اللہ کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں یہ دن دکھایا۔'' امی بولیں۔ بارات میں قریبی عزیز و اقارب مدعو تھے۔ ابو کی خالہ بھی جو ہم سب کی شمیم خالہ ہیں اور ہمارے دل کی وی آئی پی بھی وہ موجود تھیں۔ امی اور ابو کے تقریباً تمام ہی فرسٹ کزنز موجود تھے۔ نسیم باجی کی پیاری سی بیٹی فوزیہ امریکا سے آئی ہوئی تھی اس تقریب میں شرکت کے لیے آمنہ پھپوان کا بیٹا ہانی اور اس کی بیوی عذرا زہرہ (جوزی کہلاتی ہے) بطورِ خاص شرکت کے لیے امریکا سے پہنچے تھے۔ شازیہ اپنے شوہر ڈاکٹر جمال اور بیٹی ماہ نور کے ساتھ موجود تھیں۔ شازیہ بہت اسمارٹ اور خوب صورت لگ رہی تھیں۔ میری کالج کے زمانے کی دوست امبرین اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ موجود تھیں۔ امبرین ایک ماہر بیوٹیشن بھی ہے اور میری پڑوسن بھی۔ آفاق کے خاص الخاص دوست الیاس سہگل کی فیملی بھی تقریب میں شرکت کے لیے موجود تھی۔ ان کی بیگم فائزہ اور بیٹیاں مریم اور عائشہ بہت محبت کرنے والی ہیں، اجیہ کا آج کا سوٹ انہوں نے ہی ڈیزائن کروایا تھا۔ عذرا پھپو کی ساڑی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں ہی دلہن حنا کو لایا گیا، بجی سجائی دلہن تو ویسے ہی بہت پیاری لگتی ہے مگر حنا کی شکل میں اتنی معصومیت ہے کہ دل موہ لیتی ہے۔ ریڈ کلر کے ڈیزائنر شرارہ

سوٹ میں وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔ اس پر کندن کا جودھ پوری برائیڈل سیٹ جس میں ماتھا پٹی باد جھالے شامل تھی، سونے پہ سہاگا لگ رہے تھے، دونوں برابر کھڑے ہوئے تھے تو ضیا اور حنا سے نظریں نہیں ہٹ رہی تھیں۔ میں نظروں ہی نظروں میں دونوں کی بلائیں اتار رہی تھی اور زبان ماشاءاللہ کا ورد کر رہی تھی۔ بڑے بھائی، عظیم (جنہیں میں بھائی کہتی ہوں) اور میرے شوہر آفاق تقریب میں کافی پیش، پیش تھے۔ عمیر فوٹو گرافر کی سائڈ ڈیوٹی کر رہے تھے حالانکہ مووی اور پروفیشنل فوٹو گرافر موجود تھے مگر اپنے کیمرے کی تصویروں کی بات ہی الگ ہوتی ہے۔ اس کا کیمرا بھی DSLR تھا جو کافی اچھا رزلٹ دے رہا تھا۔ (مگر امی کی فیس بک پر سب سے پہلے ایمان نے اپنے موبائل سے تصویریں ڈال دی تھیں) ضیا صاحب کو سلامیاں دی جا رہی تھیں اور وہ مجھے بلوا کر رکھوا رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہی کھانا شروع ہو گیا۔ اچھے ہوٹل کا کھانا بھی اچھا ہی ہوتا ہے اور وہ لوگ اپنے ہر بڑے چھوٹے مہمان کے مزاج کا خیال رکھتے ہیں کہ بریانی، قورمہ باربی کیو کے علاوہ بچوں کے لیے میکرونی اور پزا وغیرہ بھی تھے۔ کھانے سے پہلے مہمانوں کو اسٹارٹرز بھی سرو کیے گئے تھے، جن میں فریش جوسز اور سموسے وغیرہ شامل تھے۔ تھوڑی دیر بعد سب مہمان اجازت لے رہے تھے کیونکہ واپسی کا سفر بھی لمبا تھا۔ ہم لوگوں نے بھی دولھا دلہن کو ان کے کمرے میں پہنچایا جہاں ایک رات کی ان کی بکنگ تھی۔ مووی والا کلوز اپ پہ کلوز اپ لے رہا تھا۔ ضیا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے فوراً روانہ کر دے خیر ہم نے دونوں کا کھیر سے منہ میٹھا کروا کے ان سے اجازت چاہی۔

''اپی صبح بارہ بجے تک آنا اس سے پہلے مت آنا۔'' ضیا راز دارانہ انداز میں میرے کانوں میں بول رہا تھا۔

''کیا کہا ضیا صبح سات بجے پہنچ جائیں او کے، جیسا تم ٹھیک سمجھو......'' عمیر جو پاس ہی کھڑا تھا میرے جواب دینے سے پہلے ہی چیخ کر بولا اور ضیا، بے اختیار ہنس دیا۔ خیر انہیں ان کے کمرے میں چھوڑ کر سب نے گھروں کی راہ لی۔ شادی کے ایک دن بعد ولیمے کی تقریب تھی۔ دوپہر تین بجے دلہن کو پارلر جانا تھا یہ طے ہوا کہ ولیمہ چونکہ میرے گھر کے نزدیک لان میں ہے تو میں اپنے گھر سے تیار ہو کر آٹھ بجے تک لان پہنچ جاؤں گی۔ یہاں سے سب لوگ تیار ہو کر دس بجے تک پہنچ جائیں گے اپنے گھر آ کر جلدی، جلدی بچوں کو فریش کیا اور پارلر لے جانے کی کوششوں میں لگ گئی۔ یہ شہر کا مشہور پارلر تھا سوچا تھا جلدی سے تیار ہو کر جلدی لان پہنچ جاؤں گی مگر قربان جاؤں اس پارلر کی سروسز پر دوپہر تین بجے کی گئی گئی رات کو ساڑھے نو تیار ہو کر آئی۔ اتنی سست سروس میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔ کوئی عورت اگر جلدی کرنے کو کہتی تھی تو اس پارلر کی انچارج عورتوں کو ایسے ڈانٹتی تھی جیسے کسی اسکول کی پرنسپل شیطان بچوں کو ڈانٹتی ہے۔ اس سے لڑ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ اس کے بعد اپنا منہ کسی کو دکھانے کے نہیں رہتے اسی لیے صبر کے گھونٹ پیتے رہے اور اپنی باری کا انتظار کرتے رہے۔ بچوں کو فون کر کے تیاری کی ہدایت کرتی رہی اور پھر یہی ہوا کہ جو ہوتا ہے۔ دونوں بیٹے بغیر ٹائی لگائے ولیمے کے لیے روانہ ہو گئے۔ پتا نہیں ٹائی کہاں چلی گئی ابھی تک واپس نہیں آئی۔ پارلر سے فارغ ہو کر جیسے ہی میں بچوں اور آفاق کے ساتھ لان پہنچی امی، ابو اور نانی، دونوں ماموں لان میں آ چکے تھے۔ شکر ہے دولھا، دلہن اور بھائی بھابیاں راستے میں تھے۔ دولھا، دلہن کے لیے لان سے تھوڑا پہلے بگھی اور پولیس بینڈ ان کے انتظار میں تھا، دلہن بے حد حسین لگ رہی تھی۔ آج فرحت احسان کے پارلر روز بیوٹی پارلر سے دلہن کو تیار کروایا



گیا تھا۔ (فرحت اور صائمہ آپ کا بے حد شکریہ کہ بہت پیارا تیار کروایا) جیسے ہی دولھا، دلہن کی گاڑی مطلوبہ جگہ پہنچی دونوں کو اتار کر بگھی میں سوار کروایا گیا۔ ثمینہ، ندرت، اجیہ اور میں، رامین، کرن، عبداللہ، کسوی، اجیہ کی دوست مریم غرض جتنے اس بگھی میں سوار ہو سکتے تھے ہو گئے۔ آخر کو آخری بھائی اور بچوں کے آخری ماموں، چاچو کی شادی تھی جتنا مزہ کرنا تھا ابھی کرنا تھا۔ حنا کو میں نے اب دیکھا تھا بلو اور فیروزی لہنگے میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ ولیمے کی دلہن، ویسے بھی الگ روپ لیے ہوئے ہوتی ہے، اس جیسا کوئی لگ بھی نہیں سکتا، اس کی شرماہٹ اس کی ہنسی اس کی خوشی سب اس کے چہرے پر عیاں تھی۔

جب سب بگھی میں بیٹھ گئے تو آگے پولیس بینڈ نے بینڈ بجانا شروع کر دیا اور بگھی اس کے پیچھے خراماں خراماں چل پڑی۔ بگھی کے دونوں طرف ہمارے پرائیویٹ گارڈز کے علاوہ عمیر، آفاق اور بھائی بھی چل رہے تھے، جہاں جہاں سے بینڈ گزر رہا تھا... لوگ متوجہ ہو رہے تھے، یہ مین روڈ کی چورنگی پر چل رہا تھا، کوئی اپنے موبائل سے مووی بنا رہا تھا کوئی گاڑی سے گردن نکال کر دلہن دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم سب لوگ چاروں طرف ہاتھ ہلا رہے تھے جیسے بادشاہ اپنی مملکت کی سیر پر نکلنے ہوں۔ یہ بینڈ باجا بارات جب مطلوبہ لان پہنچی تو ابھی دلہن کو لان میں نہیں اتارا گیا سب بگھی میں بیٹھے تھے۔ کوئی آ ہی نہیں رہا تھا۔ دراصل ابھی ایک سرپرائز اور باقی تھا جو ہمارے بیٹے ایمان کی طرف سے اپنے ضیا ماموں اور ان کی دلہن کے لیے گفٹ تھا اور وہ تھا فائر ورکس یعنی آتش بازی کا مظاہرہ اتنی خوب صورت آتش بازی کی گئی کہ مزہ آ گیا فلموں کا سین لگ رہا تھا۔

آدھے گھنٹے کے فائر ورکس کے بعد دلہن دولھا

کو ہال کے اندر لے جایا گیا جہاں کافی مہمان آچکے تھے (مگر یہ خوب صورت آتش بازی لوگوں کو مدتوں یاد رہے گی) امی کی کافی رائٹرز بھی آچکی تھیں جن میں سب سے پہلے ناہید فاطمہ حسنین اپنے بچوں کے ساتھ پہنچی تھیں اور ساڑی میں بے حد پیاری لگ رہی تھیں۔ عطیہ عمر اپنے شوہر عمر فاروق کے ساتھ آئی تھیں اور ہمیشہ کی طرح برقع میں تھیں مگر ان کی ... پُرکشش آنکھوں کو دیکھتے ہی میں انہیں پہچان گئی...... جیسے پاکیزہ کی تبصرہ نگار ماہ پارہ تسنیم کی آواز سن کر ہی امی انہیں فوراً پہچان گئی تھیں۔ ماہ پارہ کی تحریروں کے ساتھ ان کے لہجے میں بھی محبت کا ذائقہ بھرا ہوا تھا۔ امی کی دیرینہ دوست اور معروف کتاب ذکرِ صالحین کی مصنفہ اختر شجاعت عبائے میں تھیں مگر ان کی آنکھوں اور لبوں سے ہمیشہ پھول جھڑا کرتے ہیں، یہی وجہ ہے لوگ ان سے بات کر کے دیکھا کرتے ہیں۔ سیمارضا اب اپنے نئے بینگلو میں شفٹ ہو چکی ہیں اور... ہمارے گھر کی ہر تقریب میں ان کی شرکت لازمی ہوتی ہے اور وہ امی کی ایسی دوست ہیں جن پر امی ...فخر کرتی ہیں۔ بہت خوب صورت لباس میں وہ واقعی جچ رہی تھیں۔ طلعت جبیں نیاز کا تعلق اسلام آباد سے ہے۔ وہ بھی اسی اسکول سے پڑھی ہیں۔ جہاں سے امی نے پڑھا تھا...... ایک اچھی افسانہ نگار اور ایک اچھی شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہت اچھے اخلاق کی بھی ہیں اور امی ان کی عزت اس وجہ سے بھی بے تحاشا کرتی ہیں کہ ان کے چاروں بیٹے ماشاء اللہ قرآن پاک کے حافظ ہیں۔ (سبحان اللہ) مصنفہ نگہت اعظمی کو امی ہی لے کر پاکیزہ میں آئی تھیں۔ یہ ایک اچھی افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ گورنمنٹ کی ایک بڑی افسر بھی ہیں مگر اُن سے ملاقات کا تانا بانا اسلام آباد سے ہی تھا اور نگہت دھیمے لہجے میں بولتی ہوئی بے حد کیوٹ لگ رہی تھیں۔ لوگوں کے نام کے اثرات ان کی شخصیت پر ہوں یا نہ ہوں مگر شگفتہ شفیق کی شخصیت پر تو سوفی صد ہیں...... بے حد محبت کرنے والی یہ شاعرہ امی کی تو بیٹی بنی ہوئی ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ اب وہ ماشاء اللہ صحت مندی کی جانب گامزن ہیں ورنہ ہم سب تو ان کے لیے بہت پریشان تھے۔ عالیہ حرا کو بہت عرصے بعد دیکھا...... کافی چینج سی لگیں...... یا شاید بال کٹوا لیے ہیں مگر اچھی لگیں...... ان کی دونوں بیٹیاں بہت سمپل اور بہت اچھی لگیں...... اچھی تو بہت بہت سکینہ فرخ بھی لگیں...... مجھے ان کے افسانے بطورِ خاص پسند آتے ہیں ہاں ان کی من موہنی سی بیٹی بھی اچھی لگی۔ آنٹی صبیحہ شاہ کو میں نے بہت عرصے بعد دیکھا۔ وہی متانت، وہی رکھ رکھاؤ...... ویسی ہی ڈیسنٹ اور سمپل سی لگیں...... پیاری بہنوں کبھی غور کرنا...... صبیحہ جب ہنستی ہیں تو ان کی آنکھیں ان کا پورا پورا ساتھ دیتی ہیں...... جبکہ مصنفہ ناہید پروین بے شک قہقہہ بھی لگالیں...... ان کی آنکھیں کسی دوسری سوچ میں کھوئی کھوئی نظر آئیں گی...... مصنفہ عقیلہ حق بھی ہنستی مسکراتی مصنفات سے باتیں کرتی مجھے نظر آئیں...... ان کے لہجے میں اپنائیت تو ہوتی ہی ہے مگر رکھ رکھاؤ بھی ہے...... ہاتھ ملانے پر...... ہاتھ پکڑ کر باتیں کرتی ہیں...... شاعرہ......! سعدیہ ناز کی طرح ہاتھ ملانے میں اپنی صرف دو انگلیاں نہیں دیا کرتیں۔ (خیر یہ بھی ایک اسٹائل ہے) تبصرہ نگار ذکیہ ایوب بے حد محبت کرنے والی اور دعائیں دینے والی خاتون ہیں، وہ اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ آئی تھیں اور اپنی طبیعت ناساز ہونے کے باوجود آئی تھیں۔ (بے حد شکریہ آپ کا) اب میں جس شاعرہ اور جس مصنفہ کا ذکر کر رہی ہوں...... وہ بے حد اسمارٹ سی ہیں اور جب وہ پُرمحبت لہجے میں بات کرتی ہیں تو ان کی لونگ دالشکارہ آنکھوں کو خیرہ کر دیا کرتا ہے جی ہاں وہ ہما بیگ ہیں۔ ان کا بیٹا آسٹریلیا چلا گیا ہے (پڑھنے کے لیے) اسے بے حد

یاد کرتی ہیں، ہما بیگ ہماری فیورٹ مصنفہ اختر بیگانہ کی بیٹی ہیں۔ جن سے ہم سب بے حد محبت کرتے تھے۔ اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے...... آمین۔ امی کے آفس کی آمنہ حماد تقاریب میں نہیں جایا کرتیں مگر وہ ولیمے کی تقریب میں اپنے شوہر کے ساتھ آئیں۔ میں نے تو انہیں پہلی مرتبہ ہی دیکھا تھا۔ مگر جب سب مصنفات آگئیں تو وہ یک دم غائب ہو گئیں...... یا تو وہ اپنے شوہر کو کمپنی دینے چلی گئیں...... یا مہمانوں کے ہجوم میں نظر نہیں آئیں۔ کہ ہمارے ہاں بفضلِ خدا سب ہی مہمان آیا کرتے ہیں...... اس کی ایک خاص وجہ تو یہ ہے کہ خاندان میں اور دوست احباب کی تقاریب میں امی، ابو لازمی شریک ہوا کرتے ہیں...... اور دوسری وجہ اور خاص وجہ یہ ہے کہ امی اور ابو دونوں سے ہی عزیز رشتے دار سب بے حد محبت بھی کرتے ہیں اور عزت بھی بے حد کرتے ہیں۔ پاکیزہ کی روحِ رواں محترمہ عذرا رسول کی فیملی میں شادی کی تقریب تھی...... ان کے سب بھائی بھاوج وہیں گئے تھے مگر آنٹی عذرا رسول نے ہمارے بھائی کے ولیمے میں شرکت کی...... اور ہم سب کو یہی لگا کہ تقریب میں روشنی بڑھ گئی ہو...... اورنج رنگ کے سوٹ میں وہ بے حد خوب صورت اور نمایاں نظر آرہی تھیں۔ ان کے برجستہ اور پُرمزاح جملے جاری تھے کبھی وہ امی کو چھیڑ رہی تھیں تو کبھی مجھے...... مگر تمام رائٹرز کے لیے وہ میزبان جیسی تھیں...... شاعرہ شمائلہ سحر تمہارا بے حد شکریہ کہ تم بھی میزبان بن کر شریک ہوئیں...... اور رائٹرز کو کھانے پینے کی ہر چیز پہنچانے میں معاون رہیں۔ اس تقریب میں چینلز سے متعلقہ لوگ بھی موجود تھے...... مصنفہ، غزالہ رشید بھی گو چینل سے وابستہ ہیں مگر وہ اپنی پرانی دوستی کے ناتے آئی تھیں۔ غزالہ اچھی افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ اچھی شاعرہ بھی ہیں۔ پاکیزہ کی تبصرہ نگار اور گورنر کراچی کی بھاوج ڈاکٹر شہلا عامر بھی اس تقریب میں موجود تھیں...... اور بے حد خوب صورت دکھائی دے رہی تھیں، عرشیہ جنید مزید سرخ وسفید دکھائی دے رہی تھیں۔ (کیا کرتی ہو بھئی...... ہمیں بھی بتادو) یہ شادی چونکہ عید کے بعد ہوئی تھی...... اور رمضان میں...... روزوں کی وجہ سے شادی کے کارڈز پہنچانے کچھ مشکل ہوئے تو اس دفعہ بہت سے لوگوں کو چاہنے کے باوجود مدعو نہیں کیا جاسکا...... پھر بھی امی نے بہت سے لوگوں کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ کارڈز تقسیم کریں...... امی کے فرسٹ کزن سید فرقان بخاری نے بہت سی جگہ کارڈز بانٹے...... امی کی دوسری کزن شاہین تسنیم جو امریکا سے آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے بھی میزبان ہونے کا ثبوت دیا اور عزیزوں کو مدعو کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ شگفتہ شفیق بھی معاون رہیں تھیں میرے ساتھ ساتھ انہوں نے بھی کئی مرتبہ رخ چوہدری، زرین زبیر کوٹھاری، نگہت اور دیگر رائٹرز کو فون کیے جو شاید تبدیل ہو چکے تھے کہ کوئی رسپانس ہی نہیں ملا۔ رمضان انکل کو امی کے علاوہ...... ہما آنٹی نے بھی فون کیا...... مگر وہ بھی غائب تھے ....
بہرحال سیما مناف، رفعت سراج، یاسمین رشید، رضوانہ پرنس اپنی اپنی پرسنل وجوہات کی وجہ سے نہ آسکیں۔ کچھ کو ہم بلا نہ سکے...... اور کچھ آ نہ سکے...... کہ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں...... مگر رائٹرز کی موجودگی...... امی کے چہرے پر جو خوشی تھی...... اس کا نقشہ میں کھینچ ہی نہیں سکتی۔

امی کا بس نہیں چل رہا تھا...... کہ اپنی رائٹرز کے پاس جا کر بیٹھیں تو وہاں سے کہیں نہ جائیں مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ انہیں اپنے ہر مہمان کو وقت دینا تھا۔ نانی امی چونکہ مطالعے کی ہمیشہ سے شوقین رہی ہیں...... اور سب رائٹرز کو ان کے ناموں سے جانتی بھی ہیں تو امی نے ان کو سب سے ملوایا...... امی...... یہ عذرا رسول ہیں، یہ اختر شجاعت، یہ عقیلہ حق...... یہ سیمارضا......

اور شگفتہ...... ہماری سوئٹ سی نانی امی سے مل کر سب رائٹرز بہت خوش ہوئیں۔ شمائلہ سہیل جاوید کی تو یہ پوری کوشش تھی کہ وہ اپنے ہاتھ سے ایک نوالہ نانی امی کے منہ میں دیں۔ سب سے مل کر نانی امی نے کہا...... لڑکیاں بے حد پیاری اور بہت محبت کرنے والی لگیں...... اللہ سب کو ہمیشہ خوش رکھے۔ ''ہاں نانی...... یہ لکھنے والی سب لڑکیاں بڑی ایکٹو ہیں، مجھ سمیت'' میں نے ہنس کر کہا...... نانی میری بات پر مسکرا کر میری بھابیوں کی تعریف کرنے لگیں...... جو واقعی بجلیاں گرا رہی تھیں...... بڑی بھابی جن کا نک نیم ندرت ہے ہر روز ان کا لباس واقعی ندرت لیے ہوئے تھا...... عمیر کی دلہن ثمینہ...... اپنی خوب صورت ساڑیوں کا ایک بڑا اسٹاک لے کر آئی تھیں اور ہر دن ایک سے بڑھ کر ایک ساڑی پہن رہی تھیں جسے دیکھ کر منہ سے بے اختیار واہ نکلتا تھا۔ ضیا کے ولیمے پر امی کی ساڑی کی بھی سب تعریف کر رہے تھے نیوی بلو پر سلور کام کی ساڑی بہت سوبر اور نفیس لگ رہی تھی۔ عمیر اور ثمینہ اسے آسٹریلیا سے امی کے لیے بطورِ خاص لائے تھے۔ مرد حضرات اور لڑکوں کے لیے آج ڈریس کوڈ...... سوٹ تھا اور سب کوٹ پینٹ میں ملبوس تھے۔ ہمارے گھر کی ہر شادی میں آنٹی شمع حسین بطورِ خاص شریک ہوا کرتی تھیں اور آنٹی قیصر بھی...... مگر وہ ان دنوں بسترِ علالت پر تھیں۔ تاہم ٹیلی فونک رابطہ برقرار تھا...... یہ رابطہ آنٹی رفاقت جاوید سے بھی برقرار تھا جو اِن دنوں کالا باغ گئی ہوئی تھیں اور امی کی پیاری سی بیٹی امینہ عندلیب سے بھی...... جو اپنی دعاؤں کے ساتھ ساتھ شامل تھیں۔ ہمارے دو ماموں آسٹریلیا اور امریکا میں سیٹ ہیں' وہ بھی نہیں آسکے تھے۔ اور امی کے لبوں پر چمنا ماموں، جگنو ماموں کا نام...... بار بار آ رہا تھا۔ زیبا ممانی اور ان کے بچے تو کسی بھی شادی میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ سعدیہ مامی اور رابعہ تو عظیم بھائی کی شادی میں آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ خوشیوں میں سب کو ملائے اور سب کو شاد و آباد رکھے...... بہن بھائیوں کے رشتے ہوں یا چچا، تایا، ماموں، پھپھو' خالہ...... یہ بے حد خوب صورت اور بے حد محبت کرنے والے رشتے ہوتے ہیں...... میں تو جب بھی آنکھ بند کر کے اپنے بچپن کو دیکھتی ہوں تو دل طمانیت سے سرشار ہو جاتا ہے۔ اس تقریب میں ہمارے ابو کی پھپھو جنہیں ہم سب پھپھو ہی کہتے ہیں اپنی بیماری کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکی تھیں۔ جن کی کمی ہم سب نے بے حد محسوس کی۔ ہماری بے حد محبت کرنے والی ایک آنٹی ڈاکٹر میمونہ غوری...... اپنے پیروں کی تکلیف کے باوجود تقریب میں شریک ہوئیں...... آپ کی اس محبت کے لیے سلام کرتی ہوں اور ان تمام مہمانوں کا شکریہ جو آئے اور جنہوں نے ہماری تقریب کو اپنی آمد سے خوب صورت بنایا۔ کھانے کے بعد مہمانوں نے اجازت چاہی اور دولھا' دلہن بھی ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے گاڑی میں بیٹھ کر گھر کو روانہ ہوئے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ ضیا بھائی دلہن کا پرس بھی پکڑے ہوئے تھے تو میرے بھائی گھبرانا نہیں...... شادی نام ہی ذمّے داری کا ہے، تم نے آج پرس اٹھانے کی ذمّے داری اٹھائی ہے۔ اللہ کرے، کل تم اپنے بچوں کی ذمّے داریاں اٹھاؤ، آمین۔ میری دعا ہے کہ اللہ تم دونوں کی خوب صورت جوڑی کو ہمیشہ اپنی حفظ و امان میں رکھے اور ہر اچھی بری نظر سے محفوظ رکھے...... حاسدین اور... بدخواہوں سے بچا کر رکھے...... آمین، میرے بھائی زندگی کے کسی بھی دور میں کبھی پریشان مت ہونا کیونکہ شادی ہوئی ہے تو بچوں کے ڈائپرز تو بدلنے پڑیں گے...... ہاں...... (یہ تو ہوتا ہے) اور تم بس اپنے دل میں صرف یہ سوچنا کہ ''یہ تو ہونا ہی تھا......'' اللہ تم پر ہمیشہ اپنا کرم کرے...... آمین ثم آمین۔

☆......☆

ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا

شائستہ زریں

اقدار کی تبدیلی اگر منفی انداز سے وقوع پزیر ہو تو قوموں کی زندگی میں سانحہ بن جاتی ہے بدقسمتی سے ہم اس قوم سے تعلق رکھتے ہیں جہاں اقدار کی پامالی ایک دن کا قصہ نہیں معمول کا حصہ بن گئی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

محض ایک شعر کے طور پر نہیں لیا جاتا تھا بلکہ شاعر کا یہ خیال حقیقت میں بچوں کی تربیت کا جز ہوا کرتا جو رفتہ رفتہ ان کا مزاج بن جاتا۔ وقت اور زمانے کے تغیر کے ساتھ ساتھ مزاجوں میں بھی تبدیلی آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے مثبت رویّوں کی جگہ منفی رویّوں نے لے لی اور دوسروں کے کام آنا مقصدِ حیات کے بجائے وبالِ جان لگنے لگا اور لوگوں کی کثیر تعداد

یہاں ہر ایک ہے اپنی غرض کا دیوانہ
پرائی آگ میں ممتاز کون جلتا ہے

کی عملی تفسیر بن گئی۔ غیروں کو تو چھوڑیں لوگوں نے اپنوں کی مدد تو کیا مدد کی خواہش سے بھی ہاتھ کھینچ لیا اور کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہے ناں اوروں کے کام آنے کی خواہش تو ہوتی ہے لیکن چاہنے کے باوجود ہم اس خواہش کی تکمیل سے قاصر رہتے ہیں۔ اگر بے بسی یا مجبوری کے عالم میں کوئی کسی کے کام نہ آسکے تو یہ قابلِ اعتراض نہیں مگر اختیارات رکھتے ہوئے بھی نظر انداز کر دینا بہت تکلیف دہ ہے لیکن مقامِ تشکر ہے کہ ابھی ہمارا سارا معاشرہ بے حسی کے سانچے میں نہیں ڈھلا۔ اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو ''نیک نیتی'' سے نیکی کر کے اپنے اندر طمانیت محسوس کرتے ہیں اور یہی نیکی کا سب سے بڑا اجر ہے۔ اسی سماجی رویّے کے تحت ہم نے ایک سروے کا اہتمام کیا اور شرکا سے معلوم کیا۔

س۱: آپ کو لگتا ہے کہ لوگوں کے کام آنے کا جذبہ ختم ہوتا جا رہا ہے' کیوں؟

س۲: کیا وجہ ہے کہ اختیارات رکھتے ہوئے بھی ہم کسی کے کام نہیں آتے؟ ایسا کبھی آپ کے ساتھ ہوا کہ چاہنے کے باوجود آپ کسی کے یا کوئی آپ کے کام نہیں آیا؟ تب کیا احساسات تھے؟

س۳: کوئی ایسی نیکی جسے کر کے آپ کے دل کو سکون بھی ملا اور آپ نے اس کا اجر بھی پایا؟

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی

(مصنفہ)

۱: یہ بات درست نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ لوگ دوسروں کے بہت زیادہ کام آتے ہیں۔ آج ہمارا ملک ان ہی مخیّرات کے بل بوتے پر چل رہا ہے۔ مثلاً ایدھی، سیلانی وغیرہ انفرادی طور پر بھی لوگ گھروں میں کام کرنے والی ماسیوں کی مدد کرتے ہیں۔ بہت سے گھریلو امور میں ہم اس وجہ سے ایک دوسرے کی مدد کرنے سے قاصر رہتے ہیں کہ ملکی حالات نے ذہنوں کو منتشر کر دیا۔ لوگ ڈپریشن میں ہیں۔ مہنگائی نے کمر توڑ رکھی ہے اس



ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی

لیے رشتے داروں کی خبر گیری کرنے اور ان کی مدد کرنے کی خواہش کے باوجود ہم کبھی کبھی ایسا نہیں کرپاتے۔

۲: میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا، مجھے زندگی میں بہت اچھے لوگ ملے جس کے لیے میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں، ایک بات یہ بھی ہے کہ میں اپنا کام کسی سے نہیں کہتی صرف اور صرف اللہ سے دعا کرتی ہوں وہی میرا مددگار ہے اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے اپنے اللہ سے مدد مانگی اور مجھے نہیں ملی ہو...... یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہم ہر نماز میں کہتے ہیں کہ ''اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں''۔اس آیت کو صرف کہنا ہی نہیں اس پر عمل بھی کرنا چاہیے۔

۳: میں نے اپنی زندگی، جوانی سے بڑھاپے کا سفر، قرآن حکیم کو پڑھنے اور لکھنے میں گزارا۔ یہ چیز میرے لیے دلی سکون کا باعث ہے اور اس کا اجر اس دنیا میں یہ ملا کہ یہ دنیا میرے دل سے نکل گئی اور اللہ تعالیٰ نے مجھے فقیری کی دولت سے مالا مال کردیا۔

سید وسیم احمد

(فری لانس، ریسرچر، رائٹر، ڈائریکٹر)

۱: اس بات سے متفق ہوں کہ آج کل زندگی میں اتنے مسائل ہیں کہ ہر انسان یہ سوچتا ہے کہ پہلے وہ اپنے مسائل حل کرے اس کے بعد اپنے گھر والوں کے، اس کے بعد جنہیں وہ جانتا ہے ان کے بارے میں سوچتا ہے۔ آہستہ، آہستہ سوچنے کی صلاحیت محدود ہوتی جاتی ہے۔ اب وہ ماحول بھی نہیں رہا کہ محلے یا علاقے میں کسی ایک کو مسئلہ ہوتا تو سارے کے سارے اس کی مدد کو تیار ہو جاتے تھے۔ اس لحاظ سے لوگوں کا جذبہ کم ہوتا جارہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جذبہ تو موجود ہے مگر وسائل کم ہیں۔

۲: کسی کے کہنے کے باوجود اگر لوگ کسی کے



سید وسیم احمد

کام نہیں آتے حالانکہ آسانی سے کرسکتے ہیں تو اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ فی زمانہ ہر انسان اپنی ذات اور اپنے فائدے کے لیے سوچتا ہے لوگوں کی اکثریت وہی کام کرتے میں دلچسپی رکھتی ہے جس سے انہیں مالی یا ذاتی فائدہ ہو رہا ہو۔ یہ جاننے کے باوجود اور بار بار درخواست کے باوجود لوگ جو کام کرسکتے تھے محض اس لیے نہیں کیا کہ اس سے انہیں کوئی ذاتی فائدہ نہیں ہو رہا

تھا۔ تب یہی خیال آیا کوئی بات نہیں اللہ مالک ہے۔ اگر کبھی میں چاہنے کے باوجود کسی کے کام نہ آسکا تو کسی نہ کسی طرح سے اس کی ضرورت پوری کرنے کی کوشش ضرور کی۔

۳: ایسا کام جس کے کرنے سے کسی کی زندگی میں آسانی ہو وہ کرکے مجھے ہمیشہ بہت سکون ملتا ہے۔ کئی سال پہلے اپنے چھوٹے بھائی کے انٹر کے امتحانی فارم جمع کروانے گیا وہاں بہت رش تھا۔ اچانک امتحانی فیس میں اضافہ کردیا گیا تھا۔ میں نے دیکھا ایک لڑکا جو تقریباً میرے چھوٹے بھائی کا ہم عمر تھا اپنی والدہ کے ساتھ نہایت پریشانی کے عالم میں باری باری امتحانی فارم جمع کروانے والوں کے پاس جارہا تھا جب وہ میرے پاس آیا تو اس نے تقریباً روتے ہوئے کہا کہ آپ مجھے غلط مت سمجھیے گا میں سچ کہہ رہا ہوں میرے والد نہیں ہیں میری والدہ کپڑے سی کر گھر کا خرچہ چلاتی ہیں۔ چار بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہوں۔ سالانہ امتحان کی اس فیس کے لیے میں اور میری ماں کئی مہینوں سے پیسے کی بچت کررہے تھے یہاں آکر معلوم ہوا فیس میں ۵۰۰ روپے کا اضافہ کردیا گیا، آپ مجھے جھوٹا اور دھوکے باز نہیں سمجھیے آپ میرے پانچ سو روپے جمع کرا دیجیے، ایک لمحے کو تو میں نے سوچا پانچ سو روپے؟ کہ اس وقت وہ بڑی رقم تھی لیکن جب میں نے اس لڑکے اور اس کی ماں کی طرف دیکھا تو میرا ہاتھ بے اختیار اپنی جیب میں گیا اور میں نے رقم ان کے حوالے کردی اور بار بار ماں بیٹے کے پوچھنے پر بھی اپنا نام اور پتا نہیں بتایا۔ اس وقت ماں بیٹے کے چہرے پر اطمینان دیکھ کر مجھے دلی خوشی ہوئی یہی میرا اجر بھی ہے۔

منتہا یوسف

(سماجی کارکن)

۱: آج کا دور یا شیخ اپنی، اپنی دیکھ کا دور ہے۔ ہر کوئی اپنی ذات میں مگن ہے، والدین اور

بچوں کے پاس ایک دوسرے کے لیے وقت نہیں ہے۔ اسکولوں میں تعلیم تو ہے مگر تربیت نہیں یہی وجہ ہے کہ ہر طرف بدامنی و بے چینی ہے پہلے بچے کو گھر سے تربیت ملتی تھی کہ بزرگوں کی خدمت کرو، چھوٹے بہن بھائیوں کا خیال رکھو اساتذہ کہتے تھے اپنے سے کم تر کا خیال کرو، اپنے لنچ میں سے اپنے ساتھی کو بھی حصہ دو۔ اب نہ وہ والدین ہیں نہ وہ اساتذہ جو تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی دیں جس سے بچوں میں جذبات بیدار ہوں جب جذبہ ہی پیدا نہیں ہوگا



منتہا یوسف

تو کیا شروع اور کیا ختم؟

۲: کہتے ہیں ''طاقت کو خدا کا عطیہ سمجھو، طاقت حاصل کرکے خود کو خدا نہ سمجھو۔'' آج ہر صاحبِ اقتدار اور صاحبِ اختیار خود کو ''زمینی خدا'' سمجھنے لگا ہے، اسی وجہ سے صاحبِ اختیار کسی بے کس و مجبور کے کام آکر اس کی دعائیں تو نہیں لیتا لیکن کسی صاحبِ اختیار کے کام آکر اپنے بینک بیلنس میں اضافہ اور اپنے اختیارات سے مزید مراعات ضرور حاصل کرلیتا ہے جہاں تک میری بات ہے جو میرے کام نہیں آسکتا اسے میں معذور سمجھ کر بھول جاتی ہوں

ہاں جو مجھے دھوکا دے میں چاہنے کے باوجود اس کے کام نہیں آسکتی۔

۳: پرندوں کو آزاد کر کے مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ بھوکوں کو کھانا کھلا کر دلی سکون ملتا ہے سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے کسی مفلس کے تن کو ڈھانپ کر اطمینان ملتا ہے، گرمی میں اپنی پیاس روک کر کسی پیاسے کی پیاس بجھا کر قلب مطمئن ہوجاتا ہے۔ کسی ان پڑھ کی زندگی میں علم کا دیا روشن کر کے اپنی زندگی بھی منور لگنے لگتی ہے۔ کسی غریب کی بچی کا گھر بسا کر اپنا گھر بھی گلشن لگتا ہے۔

ڈاکٹر شاہد

(ڈاکٹر آف فزیو تھراپی & اسپورٹس فزیشن)

۱: یقیناً اور اس کی بڑی وجہ نفسا نفسی ہے۔ آج کے تیز رفتار دور میں ہر کوئی پہلے آگے بڑھنا چاہتا ہے خواہ اس کے لیے اسے کسی کو پیچھے دھکیلنا پڑے یا تباہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے اور اس چیز میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے کیونکہ لوگوں کی خود غرضی بہت بڑھ گئی ہے۔

۲: ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ لوگ اوروں کا بھلا نہیں دیکھنا چاہتے۔ ان کو ترقی کرتا نہیں دیکھ سکتے کہ



ڈاکٹر شاہد

کل یہ ہم سے زیادہ بااختیار نہ ہوجائے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ لوگ آگے کی طرف بھیج سکتے تھے لیکن اس وقت لوگوں نے بااختیار ہونے کے باوجود راستہ کاٹ دیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرے پاس اختیار ہوئے تو میں کسی نہ کسی طرح اوروں کے کام ضرور آیا اور انشاء اللہ ہمیشہ ایسا کرتا رہوں گا کہ میں کسی کی ترقی سے کبھی خائف نہیں ہوتا کیونکہ جس کے نصیب میں جتنا لکھا ہوتا ہے وہ اسے مل کر رہتا ہے۔

۳: انسانوں کے کام آنا مجھے اچھا لگتا ہے لیکن جانوروں کی مدد کرنا بھی مجھے بہت اچھا لگتا ہے ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ ایک بلی کا ہاتھ زخمی ہے میں نے نہ صرف اس کی بینڈیج کردی بلکہ ہاتھ ٹھیک ہونے تک اس کی دیکھ بھال بھی کی۔ آج بھی یہ عالم ہے کہ جب وہ بلی مجھے دیکھتی ہے تو فوراً اپنا وہی ہاتھ جس کی میں نے بینڈیج کی تھی اٹھا لیتی ہے جسے دیکھ کر مجھے بہت خوشی محسوس ہوتی ہے۔ معلوم نہیں اللہ نے اس کا کیا اجر دیا۔ شاید اس واقعے کے بعد ملنے والی بہت سی خوشیوں میں سے ایک خوشی اس کا صلہ ہو۔

فائزہ خان

(غذائی ماہر)

۱: جی ہاں، لوگوں کے کام آنے کا جذبہ ختم ہوتا جارہا ہے آج کل تو کوئی بلا غرض کسی کی مدد کرے تو لوگ شک کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ شاید اس میں بھی کوئی مقصد ہے۔

۲: ہاں بالکل کئی مرتبہ ایسا ہوا، بہت عجیب احساس ہوتا ہے جب کوئی ایسا رویہ اختیار کرے لیکن میری ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ اگر میں کسی کے کام آسکوں تو بے غرض ہو کے اس کے کام آؤں۔ ضروری نہیں کہ وہ میرے دوست احباب میں شامل ہوں۔ کوئی بھی کسی اچھے کام میں میری مدد چاہتا ہے میں اس کے ساتھ تعاون ضرور کرتی ہوں۔

۳: نیکی کرنے کے بہت مواقع مجھے اسپتال



فائزہ خان

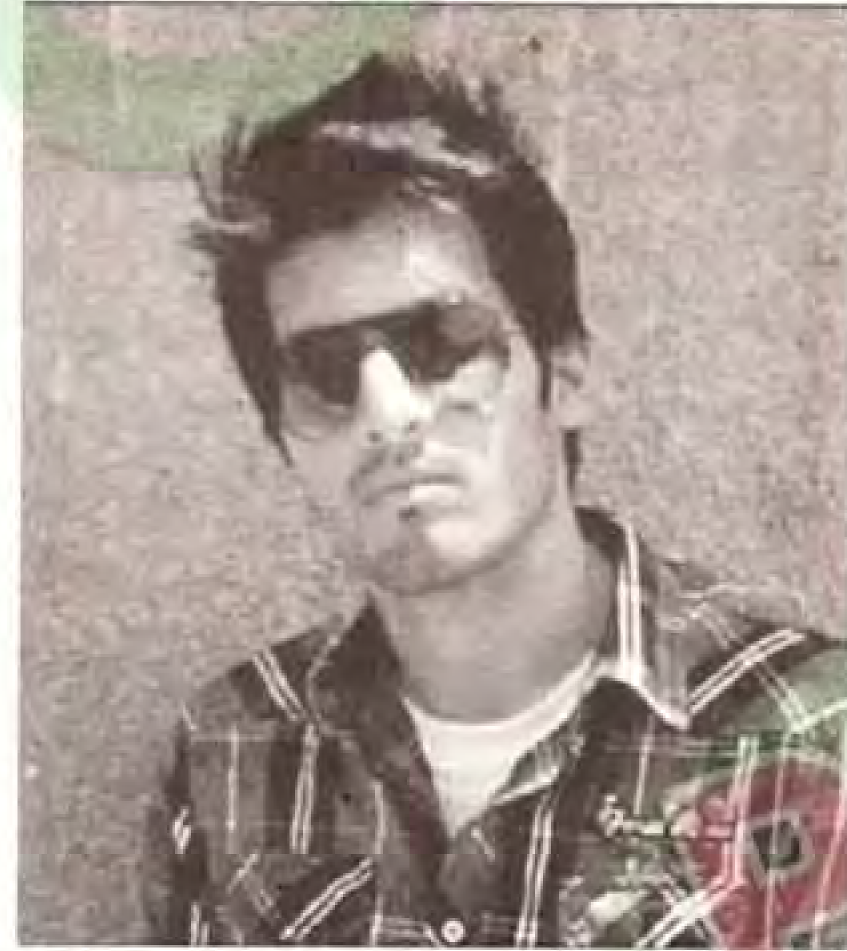
میں مریضوں کے ساتھ کام کرتے ہوئے ملتے رہتے ہیں لیکن اجر کی نیت سے میں نے کبھی کوئی نیکی نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ ان نیکیوں کا اجر خود ہی ہمارے کاموں میں آسانی کی صورت میں دے دیتا ہے۔ اللہ پاک ہمیشہ ہمارے حق میں آسانیاں پیدا کرے، آمین۔

محمد طٰہٰ

(طالب علم)

۱: میرے خیال میں یہ جذبہ ختم نہیں ہوا خاص کر نوجوان نسل اس میں بہت آگے ہے۔ کچھ عرصہ قبل زلزلہ آیا تھا تو اکثر نوجوانوں نے زلزلہ زدگان کی امداد کے لیے بڑھ چڑھ کر کام کیا تھا اور ایسا انسانیت کے ناتے کیا تھا، یہ سوچ کر کیا تھا کہ ہم سب پاکستانی ہیں۔ اگر کوئی کسی کے کام نہیں آتا تو اس کی ایک وجہ تو اس کی مجبوری ہوتی ہے اور دوسری یہ سوچ ہے کہ جب ہمارا وقت پڑا انہوں نے ہماری مدد نہیں کی تو ہم ان کے کام کیوں آئیں؟ اور یہ سوچ بہت غلط اور شرمناک ہے لیکن اب بھی اکثریت مثبت سوچ رکھنے والوں کی ہے۔

۲: اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ کبھی کبھی مدد کرنے سے الٹی آنتیں گلے پڑ جاتی ہیں اور مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی لوگ آپ کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں اگر کسی کا ایکسیڈنٹ ہوجائے آپ اسے اسپتال لے جائیں تو پولیس کے چکر میں پھنس جائیں گے۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ ضرورت پڑنے پر میں کسی کے یا کوئی میرے کام نہیں آیا۔ جب ہماری نظر اللہ پر ہوتی ہے تو وہ وسیلہ بھی بنا دیتا ہے اور جو اللہ پر نظر نہیں رکھتے وہ بس انتظار کرتے رہ جاتے ہیں مدد تو اللہ کرتا ہے لوگ تو ذریعہ ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ مجھے مشورے کی ضرورت تھی جو اس وقت نہیں دیا گیا جب وقت گزر گیا تو سب نے بڑھ چڑھ کر مشورے دیے۔ لوگوں کے اس رویے سے میں نے سیکھا۔ اللہ کا کرم ہے



محمد طٰہٰ

میں کبھی کسی کو مایوس نہیں لوٹاتا۔

۳: ماں باپ کی خدمت سے بڑھ کر کوئی نیکی نہیں۔ ایک مرتبہ ماما کے سر میں شدید درد تھا اس وقت کسی مسئلے کی وجہ سے میں بہت پریشان تھا۔ ماما کی تکلیف دیکھ کر میں اپنی پریشانی بھول گیا، میں نے ماما کا سر دبایا تو انہوں نے مجھے دعا دی اللہ تمہیں بہت سکون دے، یقین کریں میری پریشانی ختم ہوگئی اس دن سے آج تک میں بہت پُرسکون ہوں۔ ہر نیکی کا

اجر ضرور ملتا ہے شرط یہ ہے کہ صلے کی نیت سے نیکی نہ کی جائے۔خلوص سے اوروں کے کام آئیں پھر دیکھیے کیسے آپ کی پریشانی ختم ہوتی ہے، آپ کو احساس بھی نہیں ہوگا۔

بینش صدیقہ

(براڈکاسٹر)

ا: میں ایسا بالکل نہیں سمجھتی، لوگوں کے کام آنے کا جذبہ کم نہیں ہو رہا بلکہ بڑھ رہا ہے لیکن اس کی سمت درست نہیں، اس کی سب سے بڑی مثال ہے کہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ زکوٰۃ، خیرات وغیرہ پاکستان میں ادا کی جاتی ہے لیکن اپنے مال کو پاک وصاف کرنے والوں کی اکثریت کن لوگوں کی ہے؟ معذرت کے ساتھ، یہ وہ لوگ ہیں جو ان ہی غریبوں کا خون چوس کر مال بناتے ہیں اور پھر اپنے مال سے ''چند سکے'' غریبوں کے کاسے میں ڈال کر خوش ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اللہ بھی خوش ہوگا۔لیکن ایسا نہیں ہے کہ اللہ میرے یا آپ کے دیے ہوئے لاکھوں روپوں سے ہرگز خوش نہیں ہوگا۔وہ پیسے جو رشوت، بددیانتی، اسمگلنگ یا دونمبر مال کے کاروبار سے جمع کیے جائیں۔ان پیسوں کی زکوٰۃ بھی مال کو پاک نہیں کر سکتی۔''چوری میرا پیشہ اور نماز میرا فرض'' والا مکالمہ ہماری نس نس میں سما چکا ہے اس لیے ہمیں دوسروں کی مدد کرنے سے پہلے اپنی سمت درست کرنی ضروری ہے۔

۲: اختیارات رکھتے ہوئے بھی اوروں کے کام نہ آنا ہماری قومی روایت ہے مجھے اس معاملے میں اس لیے مایوسی نہیں ہوئی کہ میں نے کبھی اپنے کام کو کہا ہی نہیں کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں اس لیے آپ بھی اپنا کام خود کرنے کی عادت ڈال لیجیے اس سے مایوسی اور تکلیف کا احساس کم ہوگا۔

۳: میں نے کبھی ایسی کوئی نیکی کی ہی نہیں، اس کے باوجود اللہ کا احسان ہے کہ وہ نوازتا ہے۔اس


بینش صدیقہ

سے زیادہ جس کے ہم قابل بھی نہیں لیکن میری زندگی میں دو مقام ایسے آئے جب میں نے موت کو بہت قریب سے دیکھا لیکن اللہ نے محفوظ رکھا۔اس کا مطلب ہے یقیناً کوئی نیکی تھی جو کام آ گئی۔

فرید ضیا قریشی

(طالب علم)

ا: جی ہاں! لوگوں میں کام آنے کا جذبہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ہر انسان اپنی زندگی بہتر کرنے میں لگ گیا ہے۔یہ بات نہیں ہے کہ لوگوں کے دلوں میں احساس نہیں لیکن ان کے اپنے مسائل اتنے زیادہ ہو گئے ہیں کہ وہ چاہ کر بھی اوروں کی مدد نہیں کر پاتے اور شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگ اسلامی تعلیمات کو بھول چکے ہیں اور دنیاوی طریقوں سے چیزوں کا حل تلاش کرتے ہیں۔

۲: لوگوں میں خود غرضی بڑھ گئی ہے ہر وہ شخص جس کے پاس اختیارات ہیں وہ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے اپنا ذاتی مفاد دیکھتا ہے انسانیت یا مدد نام کی چیز لوگوں کے دلوں سے نکلتی جا رہی ہے۔اس کی بڑی مثال سرکاری دفاتر میں دیکھنے کو ملے گی ضرورت


فرید ضیا قریشی

مندوں کی فائلیں آگے بڑھتی ہی نہیں لیکن جہاں ان کا کوئی ذاتی مفاد آ جائے تو پلک جھپکتے ہی کام ہو جاتا ہے۔اس خود غرضی کے پیش نظر انسان کا دل پتھر کا ہوتا چلا جا رہا ہے اور ہر شخص یہی سوچتا ہے مصیبت میں جب کوئی اس کے کام نہیں آیا تو وہ کسی کے کام کیوں آئے؟ میرے ساتھ ایسا کئی مرتبہ ہوا کہ مراعات رکھنے کے باوجود لوگوں نے میری جائز مدد نہیں کی لیکن یہ شاید میرے والدین کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ جب میرے پاس اختیارات آئے تو میں نے سوچا اگر میں بھی دوسروں کی طرح کسی کے کام نہ آؤں تو اُن میں اور مجھ میں کیا فرق رہ جائے گا؟ شاید میرے اس عمل سے کسی ایک شخص کو ہدایت مل جائے اور یہ سلسلہ یونہی آگے بڑھتا اور جاری رہے۔

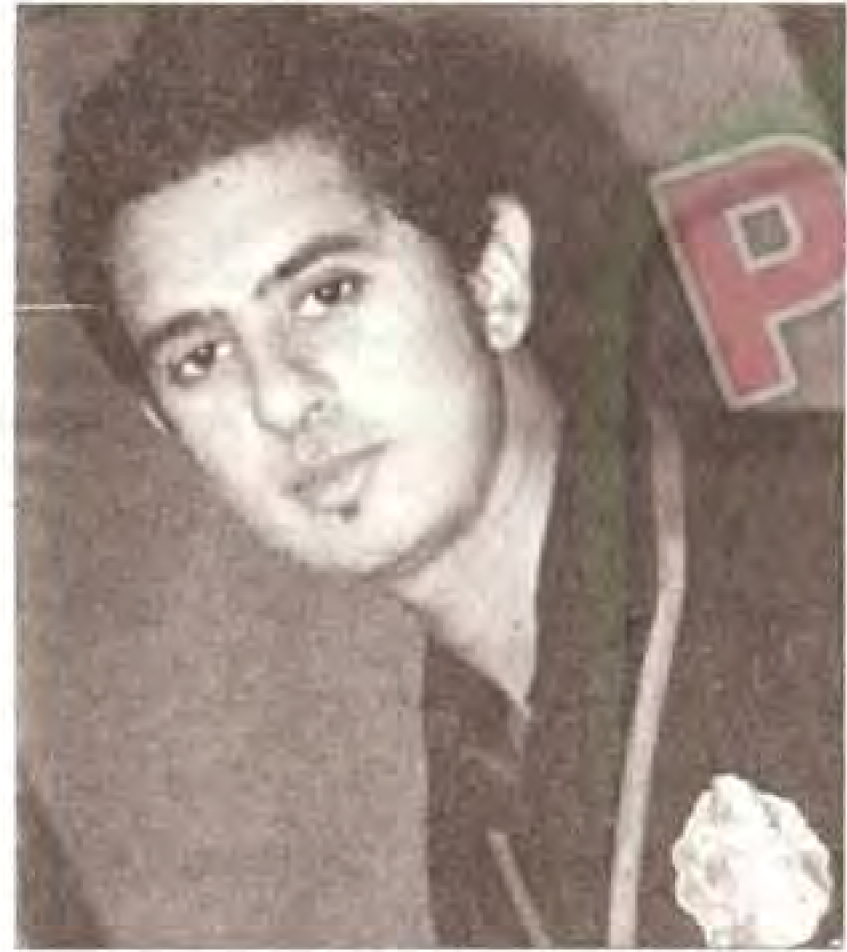
۳: شدید گرمیوں کے موسم میں ایک سرکاری اسکول میں ٹھنڈے پانی کا مستقل انتظام کروانا ایک ایسا کام ہے جسے کروا کر میرے دل کو کافی سکون ملا۔خاص طور پر جب بچے اس ٹھنڈے پانی کے حصول کے لیے ایک قطار میں کھڑے ہوتے اور پہلا گھونٹ لے کر ایک سکون کی سانس لیتے تو اس نیکی سے نہ صرف میرے دل کو بہت سکون ملا بلکہ دیکھتے ہی دیکھتے میری زندگی کے کئی مسائل حل ہو گئے، مجھے تعلیم میں کامیابی اور دوسرے شعبوں میں ترقی ملی۔میں صرف لوگوں کو یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ کسی غریب کی طرف مسکرا کر دیکھنا یا اس کے کاندھے پر محبت سے ہاتھ رکھ دینا بھی ایک نیکی ہے۔ ہر آدمی کو کم از کم یہاں سے شروعات کرنی چاہیے اور پھر وہ نیکیوں کا ٹِل باندھتا چلا جائے گا اور اس کا اجر بھی پائے گا۔

طلیب احمد

(طالب علم)

ا: لوگوں کے کام آنے کا جذبہ ختم تو نہیں ہوا بس آج کا انسان زندگی کی مصروفیات میں مگن زیادہ ہو گیا ہے۔اس کے علاوہ ایک اور بڑی وجہ حالات سے ڈر لگتا ہے کہ ہم تو چلے نیکی کرنے کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔

۲: کئی بار ایسا ہوا کہ لوگوں کے پاس اختیار تھے لیکن وہ میرے کام نہیں آئے لیکن میں نے اس لیے زیادہ محسوس نہ کیا کہ شاید اختیارات کے باوجود اُن کی کوئی مصلحت یا مجبوری ہوگی اور کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا لوگ میرے بہت کام


طلیب احمد

آئے جس کا احساس مجھے ہمیشہ رہے گا۔

۳: اپنے ساتھ ساتھ اوروں کو آگے بڑھنے کا موقع دیا، جب انہیں کامیابی ملی تو مجھے دلی خوشی ہوئی۔ بے شک اس نیکی کا میں نے اجر بھی پایا۔

سدرہ
(طالبہ)

۱: اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو بنا کسی غرض کے لوگوں کے کام آتے ہیں، خود میری اپنی کوشش یہی ہوتی ہے کہ میں کسی کے کام کو منع نہ کروں ٹی وی شوز کے ذریعے بھی لوگوں کے کام آنے کا جذبہ بیدار کیا جا رہا ہے۔

۲: اس کی سب سے بڑی وجہ خود غرضی ہے جب تک ہم اپنے اندر سے خود غرضی کا خاتمہ نہیں کریں گے، ہم کسی کے کام آنے کے جذبے سے سرشار نہیں ہو سکتے۔ میری سب سے قریبی سہیلی نے ایک مرتبہ مجھے ان وقتوں میں نظر انداز کرنا شروع کر دیا جب مجھے اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی اس وقت میری آنکھوں میں آنسو اور دل میں بہت دکھ کے سوا کچھ بھی نہ محسوس ہوا تھا۔ جب بھی میں اسے دیکھتی تو یہی سوچتی کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ تب میں نے ایک فیصلہ کیا تھا کہ آگے چل کر جب تک ہم ساتھ ہیں اسے کوئی بھی کتنے ہی رسکی کام میں میری ضرورت پڑی تو میں اس کی مدد ضرور کروں گی۔

۳: ذرا سی نیکی کے بعد کسی کی دعا اور اس کی قبولیت کی صورت میں اجر ملنا بہت بھلا لگتا ہے۔ تب نیکی کرنے والے وہاں تک بھی پہنچ جاتے ہیں جس کا وہ سوچ بھی نہیں سکتے۔ جب ہم خلوصِ نیت سے نیکی کرتے ہیں تو لوگ ہمیں سچے دل سے دعا بھی دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میں اپنے گھر والوں کے ساتھ کہیں سے آ رہی تھی چند مہمان بھی ہمارے ساتھ تھے۔ سب کو پانی پینا تھا، مجھے بھی بہت پیاس لگ رہی تھی لیکن پہلے میں نے سب کو پانی پلانا شروع کیا آخر میں ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس بچا جب میں نے اپنے لیے پانی نکالا تو میری ایک کزن نے کہا میں رہ گئی تب میں نے وہ گلاس اس کی طرف بڑھا دیا اس نے بہت اصرار کیا کہ میں اس میں سے آدھا پانی پی لوں مگر میں نے منع کر دیا اور پانی اسے پلا دیا جس کا اجر اللہ نے مجھے یہ دیا کہ پانی پیے بنا ہی میری پیاس بجھ گئی اور کافی دیر تک مجھے پیاس محسوس نہیں ہوئی۔

قارئین! ہمارے معاشرے سے کسی کے کام آنے کے جذبے کے خاتمے کے جو اسباب سامنے آئے ان میں بڑھتی ہوئی مہنگائی اور بے غرض نیکی پر سے لوگوں کا اعتبار اٹھ جانا ہے۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے۔ اس سوچ کا سب سے بڑا سبب انسانوں کا ایک دوسرے پر بھروسا نہ کرنا، معاشرے سے انسانیت کا رفتہ رفتہ ختم ہو جانا اور مفاد پرستی و خود غرضی کا حد سے زیادہ بڑھ جانا ہے جس کا اظہار تقریباً سب ہی نے کیا ہے۔ بلاشبہ ان رویوں سے چھٹکارا پانے سے معاشرے سے یہ برائی بھی از خود ختم ہو جائے گی اور یہ جب ہی ممکن ہے جب ہم ایک دوسرے کے لیے دل میں ایثار و قربانی کے جذبات کو پروان چڑھائیں، اپنے قلب و ذہن اور ظرف میں وسعت پیدا کریں۔ اختیارات ہیں تو اوروں کے کام آنے سے کبھی گریز نہ کریں ایسا نہ ہو کہ اللہ کے بندوں کی ضرورتوں سے اجتناب ہمیں اللہ کے کرم اور عنایتوں سے دور کر دے۔ زندگی کا اولین مقصد اوروں کے کام آنا ہے بلاشبہ انسان سے پیار کرنے سے بڑی کوئی عبادت نہیں اگر ہم اللہ کے بندوں کے ساتھ معاملات میں کھرے نہیں تو ہماری فرض عبادتیں بھی ہمیں اللہ کے حضور سرخرو نہیں کر سکتیں۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے نیک اعمال ہی ثواب کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اور ہم ان کا اجر بھی پا لیتے ہیں کب اور کیسے؟ ہمیں پتا بھی نہیں چلتا اور اللہ ہمارے نیک عمل کی جزا بھی عطا کر دیتا ہے۔

☆☆☆



بہنوں کی محفل

مدیرہ

عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ

☆ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد ﷺ پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

☆ عزیز بہنو! آج میں آپ کو ایک مزے کی بات بتانا چاہتی ہوں...... آپ کو معلوم ہونا چاہیے...... کہ ہم بڑھاپے کی سرحدوں پر کب قدم دھرا کرتے ہیں...... تو سنیے...... جس دن ہم یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ...... گزرے ہوئے دن کتنے خوب صورت تھے، ہم کتنے خوب صورت تھے...... بال ایسے، رنگت ویسی...... اور ذہانت تو...... واہ، واہ...... کوئی ہمارے سامنے بول ہی نہیں سکتا تھا۔ تو جان جائیے کہ بڑھاپے کا آغاز ہو چکا ہے۔

یہ حقیقت ہے جب لوگ اپنے حال اور مستقبل سے مایوس ہو جائیں...... اور ماضی کا ذکر ہر وقت لبوں پر جاری ہو جائے...... تو وہ وقت سے پہلے بوڑھے ہو جاتے ہیں مگر کسی دانا نے کیا خوب کہا ہے۔ ”40 برس کی عمر شباب کا بڑھاپا ہے اور 50 برس کی عمر بڑھاپے کا شباب ہے۔ ایک اسّی سالہ بوڑھے سے کسی نے پوچھا آپ کی طویل العمری کا راز کیا ہے؟ ”مجھے نہیں معلوم......“ اس نے جواب دیا۔ ”میں اب بھی دوبار ناشتا کرتا ہوں۔“ قصہ مختصر یہ کہ آپ کی سالگرہ کتنی ہی تیزی سے کیوں نہ آتی ہو...... وقت بے شک ہوا کے گھوڑوں پر سوار ہو...... اگر آپ اپنی جوانی میں بھی بوڑھوں کی طرح رہیں گے تو آپ بوڑھے ہو جائیں گے اور اگر اپنے بڑھاپے میں بھی چاق و چوبند رہیں گے تو طویل العمر ہونے کے باوجود بڑھاپا آپ سے قدرے دور ہی رہے گا۔

☆ پیاری بہنو! میری خوشیاں آپ کے ساتھ سانجھی رہی ہیں، میرے ہر بچے کی شادی کا احوال پاکیزہ میں شائع ہوا ہے...... کہ آپ لوگ بھی اس میں شریک ہو جائیں گے اس ماہ اپنی بہو حنا کی تصویر ٹائٹل پر اسی لیے دی گئی ہے کہ آپ بھی اپنی انجم باجی کی بہو سے مل لیں اور عظمیٰ آفاق نے آپ کی فرمائش پر شادی کا احوال بھی قلم بند کیا ہے، آپ سے دعا کی التماس ہے کہ دولہا، دلہن اپنی نئی زندگی کا سفرِ محبت، چاہت، صحت، کامیابی اور کامرانی کے ساتھ طے کریں اور نظرِ بد سے ہمیشہ محفوظ رہیں۔ آمین ثم آمین۔

☆ چند روز قبل محترمہ عذرا رسول کی جانب سے اپنی رائٹرز بہنوں کے اعزاز میں ایک عید ملن پارٹی سن سیٹ کلب ڈیفنس میں ہوئی۔ جس کا تفصیلی اور تصویری احوال آئندہ ماہ پاکیزہ کے شمارے میں آپ پڑھ سکیں گی۔ یہ رپورٹ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس تقریب میں ایک دوسرے ڈائجسٹ کی روحِ رواں نے بھی بڑی محبت سے شرکت کی...... جن سے محفل میں چاہت کے نگینے مزید منزہ ہو گئے......

☆ اب آئیے پہلے ایک بار درودِ ابراہیمی پڑھتے ہیں جو نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالمِ اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔

آیت کریمہ یہ ہے۔

لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین ۝

ترجمہ: (تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور تو ہر عیب اور کمزوری سے پاک ہے، میں قصورواروں میں سے ہوں)

(پ۔۱۷۔الانبیاء آیت، ۸۷)

نوٹ: یہ حضرت یونسؑ کی مشہور دعا ہے جو انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں اللہ تعالیٰ سے کی تھی۔ یہ آیت، آیت کریمہ بھی [illegible] کے فوائد کثرت سے ہیں۔

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ گزشتہ دنوں ہمدرد کی چیئر پرسن محترمہ سعدیہ راشد ہماری مایہ ناز مصنفہ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی رہائش گاہ پر آئیں۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی نے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے چھ قرآن شریف انہیں دیے جو بیت الحکمت میں رکھے جائیں گے۔ اب تک ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے سات قرآن پاک (جو انہوں نے اپنے ہاتھ سے کتابت کیے ہے) بیت الحکمت (ہمدرد) میں رکھے جاچکے ہیں۔ (ماشاء اللہ، بے حد مبارکباد)

☆ گزشتہ دنوں ہماری مستقل قاری اور محترمہ عذرا رسول کی پیاری سہیلی شائستہ اعجاز کے بیٹے شیراز احمد کی شادی امبر اخلاق کے ساتھ خوب دھوم دھام سے انجام پائی۔ (مبارک باد)

☆ زویا حسن کا ناول راس نہیں مجھے اپنا چہرہ کتابی شکل میں شائع ہوگیا ہے۔ جو ایک معاشرتی کہانی ہے...... اور جسے بے حد خوب صورت انداز میں لکھا گیا ہے۔ کتاب کی قیمت صرف 150 روپے ہے۔ منگوانے کا ایڈریس یہ ہے۔ علم و ادب پبلشرز الحمد مارکیٹ 40 اردو بازار، لاہور۔

☆ ہماری پیاری مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ صبا نور، لیہ نے صرف ہمارے کہنے پر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان دیا اور بہت اچھے نمبروں سے میٹرک پاس کرلیا ہے۔ (بے حد مبارک باد...... اپنا ہوم ایڈریس مجھے ارسال کرو تاکہ تمہارا تحفہ میں تمہیں جلد از جلد ارسال کروں)

☆ ہماری معروف شاعرہ فریدہ خانم کے اعزاز میں لاہور میں تواتر سے تقاریب ہو رہی ہیں ان کے پہلے شعری مجموعے مختلف کو بے حد پسند کیا گیا ہے اور فریدہ خانم کو نئی نسل کی نمائندہ شاعرہ کہا گیا ہے۔ (مبارک باد)

☆ ہماری پیاری شاعرہ اور ناول نگار فریدہ جاوید فری ان دنوں بسترِ علالت پر ہیں ان کی کلی صحت اور زندگی کے لیے دعا کریں۔

☆ ہماری نئی ڈراما رائٹر عتیقہ محمد بیگ ان دنوں کئی ٹی وی چینلز کے لیے لکھ رہی ہیں (مبارک باد)

☆ آپ کی باجی انجم انصار کا ٹی وی سوپ چاندنی تیسری مرتبہ ایک نجی چینل سے دکھایا جارہا ہے اور بہت جلد ایک اور ٹی وی سوپ محبت ہم سفر میری ایک نجی ٹی وی چینل سے دکھایا جائے گا۔ (انشاء اللہ)

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار اور شاعرہ صدف جاوید ہری پور کے بیٹے شہاب کی اس ماہ پانچویں سالگرہ ہے۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری انیلا ناہید، لیہ کی اس ماہ سالگرہ ہے۔ (مبارک باد)

☆ ڈاکٹر ندا نوید، پنڈی کی اس ماہ سالگرہ ہے (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی ایک مصنفہ ان دنوں بوتیک چلا رہی ہیں۔ پاکیزہ بہنوں کو وہ رعایتی قیمت پر کپڑے دیں گی۔ ان مصنفہ کا نام مدیحہ عدنان ہے اور اگر آپ ان سے رابطہ کرنا چاہیں تو ضرور کریں۔

☆ معروف مصنفہ عنیزہ سید کا ڈراما سیریل ان دنوں ایک نجی چینل پر شبِ آرزو کا عالم مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ (ماشاء اللہ) ہماری بے حد پیاری مصنفہ عنیزہ سید کے مقبول ناولٹ اور مکمل ناولز کا مجموعہ روشن جگنو اور جل پریاں کے نام سے شائع ہوگیا ہے۔ ہر کہانی ہر دوسرے گھر کی کہانی ہے اور اندازِ بیاں دل کو چھو لینے والا ہے۔ برادرم محمد علی قریشی نے کتاب بے حد خوب صورت انداز میں شائع کی ہے۔ جس کا انتساب نیئر باجی کے نام ہے۔ صفحات 311 ہیں اور قیمت صرف 500 روپے۔

☆ معروف مصنفہ فاخرہ جبیں کے ناولٹ کا مجموعہ بہار آنے تک کتابی شکل میں شائع ہوگیا ہے۔ جس کا انتساب حماد مصطفیٰ کے نام ہے۔ کتاب میں موجود پانچوں ناولٹ نہ صرف معاشرتی موضوعات پر ہیں بلکہ رشتوں میں گندھے ہوئے بھی ہیں اور کسی رشتے سے کوئی عداوت نظر نہیں آتی۔ صفحات 365 ہیں اور قیمت صرف 400 روپے ہے۔

☆ سعدیہ راجپوت کا ناول عشق آتش کتابی صورت میں شائع ہوگیا ہے جس کا مرکزی خیال زندگی کے توازن سے منسلک ہے اور انہوں نے عشق کے سہارے کہانی کی بیل پھیلائی ہے۔ 400 صفحات کا یہ ضخیم ناول صرف 600 روپے کا ہے۔ جس کا انتساب ان کے والد محمد یوسف، والدہ ثریا بیگم اور بھائی محمد عاصم یوسف کے نام ہے۔

☆ مصنفہ عائشہ ناز علی کا خوب صورت ناول تیرے عشق میں شائع ہوگیا ہے۔ یہ عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کی طرف سفر کرتی ایک پُراثر داستان ہے۔ جس میں خوشی اور غم نہ صرف ساتھ ساتھ چلتے نظر آتے ہیں بلکہ مثبت پہلوؤں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ اس ضخیم ناول کے صفحات 352 ہیں اور قیمت صرف 500 روپے۔

☆ میری بھتیجی ڈاکٹر ندا نوید سیٹھی اپنے شوہر نوید سیٹھی کے ساتھ حج کی سعادت حاصل کرنے کے لیے سعودی عرب روانہ ہوگئی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ صاعقہ ریاض اپنے شوہر کے ساتھ حیدر آباد سے سعودی عرب حج کے لیے روانہ ہوگئی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری شمسہ رضوان، کراچی حج کی سعادت حاصل کرنے روانہ ہوچکی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

☆ گزشتہ دنوں پاکیزہ کی قاری صائمہ نایاب کی چھوٹی بہن کی شادی خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی قاری انیسہ حامد کراچی نے بتایا ہے کہ جو افراد ڈینگی کا شکار ہوگئے ہوں وہ پپیتے کی کونپلوں کا روزانہ صبح شام ایک چمچ رس پئیں۔ اس کے پینے سے تیزی سے مطلوبہ سیل بننے شروع ہوجائیں گے۔ (جزاک اللہ)

☆ ڈاکٹر معصومہ کی گزشتہ ہفتے اپنے کزن سلمان احمد کے ساتھ منگنی ہوئی ہے۔ (مبارک باد)

انتقالِ پُرملال

☆ دبئی میں مقیم ہماری پیاری مصنفہ تسنیم منیر علوی کے شوہر جناب منیر الدین علوی طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے محترم نہ صرف معروف بیرسٹر تھے بلکہ مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کے سکریٹری بھی رہے تھے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز شجاع انتقال کرگئیں۔

نوٹ: تمام مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کرنے کے بعد صرف تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کریں۔

☆☆☆

ہٹ نیلوفر عباسی، نیویارک، امریکا سے۔ ”31 مئی 2013ء وہ تاریخ تھی جو میری دنیا تاریک کرگئی۔ میرے ہر قدم کا ساتھی میری ہر ضرورت اور خواہش کو پل بھر میں پورا کردینے والا میرا اکتالیس سال کا رفیق پل بھر میں مجھے چھوڑ گیا...... ہمیشہ کے لیے کبھی نہ واپس آنے کے لیے چلا گیا...... مجھے ہر سفر میں ساتھ رکھنے والا اس آخری سفر پر اکیلے روانہ ہوگیا...... ہر کسی کو جانا ہے اس فانی جہاں سے رخصت ہونے کا ہر ایک کا وقت مقرر ہے مگر جب وہ شخص جاتا ہے کہ جس کی باتیں، جس کی چاہتیں، جس کی شخصیت انمول ہوتی ہے تو درد و غم سوا ہوتا ہے۔ انجم میں آپ کی اور نزہت اصغر کی خاص طور پر ممنون ہوں کہ قمر علی عباسی کے لیے اتنے اچھے اور پُرخلوص جذبات کا اظہار کیا...... عذرا رسول کا خصوصی شکریہ کہ انہوں نے ایک بار نہیں بار بار فون کر کے میری دلجوئی کی اور ان بہنوں کے پیغامات پہنچائے جنہوں نے انہیں فون کر کے تعزیت کی قمر علی عباسی کے لیے، میں ان تمام بہنوں اور پڑھنے والوں کا دلی شکریہ ادا کرتی ہوں جو میرے مشکل وقت میں میرے ساتھ تھے اور دعا گو ہوں کہ وہ ہمیشہ صحت مند اور خوش رہیں۔ (آمین) دل و دماغ قابو میں آئے تو قمر علی عباسی کی ذات کے حوالے سے ان کی پاکیزہ سے وابستگی اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر کچھ لکھنا چاہوں گی۔ امید ہے کہ ان باتوں کو آپ پڑھنے والی بہنوں تک پہنچائیں گی۔“ (پیاری بہن نیلوفر...... آپ کے دلی جذبات ہم اپنے قارئین تک پہنچا رہے ہیں...... قمر علی عباسی کی باغ و بہار شخصیت ہو یا ان کی سحر انگیز تحریریں...... انہیں کوئی نہیں بھول سکتا اور اردو ادب میں ان کا نام ہمیشہ ان کی تحریروں کے حوالے سے زندہ رہے گا انشاء اللہ)

ہٹ ذکیہ ایوب کی رائے کراچی سے۔ ”انجم تمہارے بیٹے کی شادی میں آکر اور ڈھیر ساری مصنفات سے مل کر بے حد خوشی ہوئی اور اختر شجاعت اور ان کے شوہر سے باتیں کر کے بے حد اچھا لگا...... ہاں اختر تمہارا بے حد شکریہ کہ تم نے مجھے اپنی کتاب ذکرِ صالحین بھی دی۔ معذرت کے ساتھ کہوں گی کہ قیصرہ حیات کا ناولٹ ابھی تک غیر دلچسپ ہے۔ سائرہ رضا نے مشاعرہ لوٹ لیا۔ سدرہ عدن کا پیغام بھی اچھا ہے۔ نگہت نسیم نے بھی اچھا لکھا۔ نوشین ناز اختر کی تو ہمیں ہر تحریر پسند آتی ہے۔ قانتہ رابعہ، تسنیم منیر علوی، غزالہ فرخ اور زاہدہ کی تحریریں بھی ایک سے بڑھ کر ایک رہیں۔ شائستہ زریں کا سروے بہت اچھا

لگتا ہے۔غزالہ نگار نے اپنی سہیلی کے بارے میں اچھا لکھا، اب آجائیں جلترنگ کے بارے میں اس کا ہر خاکہ پسند آیا، پُر بہار باتیں بھی اور بیکار باتیں بھی...... میں یہ بات بالکل سچ کہہ رہی ہوں کہ جلترنگ ہمارے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتا ہے۔خوش رہو۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

✿ فیروزہ بیگم، کراچی سے۔''ستمبر کے پاکیزہ میں سب سے خوب صورت تحریر اس ماہ کا اداریہ ہے، جزاک اللہ، ناول ٹھیک تھے۔افسانے بہترین رہے۔قانتہ رابعہ نے سب سے زیادہ اچھا لکھا۔روحانی مشورے بہت اچھے ہوتے ہیں مگر اس کے صفحات اس دفعہ مجھے کم لگے۔نوشین ناز کے افسانے مجھے ہمیشہ اچھے لگتے ہیں۔میری ایک رائے تھی کہ سرورق پر یا تو سب لکھاریوں کے نام دیا کریں ورنہ کسی کے بھی نہ دیں...... ہاں ام ثمامہ نے بھی بہت اچھا لکھا ہے۔'' (تبصرے کا شکریہ)

✿ مسز نزہت اشفاق، کراچی سے۔''ٹائٹل اچھا لگا۔فہرست پر خطرناک سے اسکیچ نہ لگائے جائیں تو بہتر رہے گا۔سمپل سی فہرست اچھی لگے گی۔اس ماہ کے سب سے خوب صورت افسانے قانتہ رابعہ اور نوشین ناز اختر کے رہے۔عنیزہ سید کا ناول بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔رفعت سراج تو ہماری پسندیدہ ناول نگار ہیں۔عظمیٰ آفاق کا طرزِ تحریر ہمیں پسند ہے کہ وہ پاکیزہ کے لیے افسانے بھی دیا کریں۔ہاں جلترنگ کے صفحات کم نہیں ہونے چاہئیں۔'' (بہت بہتر)

✿ شمیم فضل خالق، پشاور سے۔''حسبِ معمول مجھے کچھ کہنا ہے، پڑھا...... ہمیشہ کی طرح دل کو چھو گیا...... کیا کہنے آپ کے...... دریا کو کوزے میں بند کرنا کوئی آپ سے سیکھے...... میں تو زیادہ باتونی نہیں ہوں لیکن اتنی اچھی سامع بھی نہیں ہوں لیکن اب کوشش کروں گی کہ اچھی سننے والی بن سکوں...... دین کی باتیں بھی ہمیشہ کی طرح دل پر اثر کر گئیں۔انجم کیا اعداد کا علم صحیح ہوتا ہے؟ (جی ہاں) امانت کی یہ قسط دل کو چھو گئی۔رفعت سراج نے اپنے قلم کی جادوگری دکھا ہی دی۔ام ثمامہ کا انمول خزانہ واقعی انمول خزانہ تھا۔جانے کیوں ہم دولت کے ڈھیر کو قیمتی زیورات کو خزانہ سمجھتے ہیں اور جیسی کرنی ویسی بھرنی کی کہانیاں تو ہم بچپن سے پڑھا کرتے تھے...... کاش نئی نسل اس قسم کی کہانیوں سے سبق سیکھ لے۔قیصرہ حیات کے ناولٹ کہیں دیپ جلے کہیں دل کی قسط بھرپور رہی، رضوانہ پرنس نے عید سے پہلے میں پڑھنے والوں کو مرد کا اصلی چہرہ دکھا دیا ہے۔مرد یہ چاہتے ہیں کہ وہ تو اپنی زندگی اپنی شریکِ حیات کے ساتھ ہنسی خوشی گزارے لیکن جو بھی اس سے وابستہ رہ چکی ہو وہ اس کی خاطر جوگ لے لے لیکن ہر عورت بے وقوف نہیں ہوتی خصوصاً آج کی عورت! شامِ شہر یاراں کی تو بات ہی کیا ہے...... ہر کردار انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ ہے عنیزہ سید کی ہر تحریر ہی لاجواب ہوتی ہے۔تتلی شیریں حیدر کی تحریر تو ہوتی ہی لاجواب ہے لیکن سفید رنگ خوب صورتی کی معراج نہیں ہے سانولا رنگ سفید سے زیادہ دلکش ہوتا ہے اور مرد تو کالے رنگ کے بھی برے نہیں لگتے اگر ان کی پرسنالٹی ٹھیک ٹھاک ہو، تفصیلی تبصرہ تتلی کی اگلی قسط کے بعد کروں گی۔نوشین ناز اختر کا آخری موقع اچھی تحریر تھی سید کامران کا دل بدل گیا تو خدا نے اسے بیٹے کی شکل میں انعام بھی دے دیا۔درِ رحمت میں بٹ بادشاہ کا کردار پسند آیا۔صائمہ اکرم کی گمشدہ جنت کی یہ قسط بھی بھرپور تھی۔دھوپ میں بارش، تسنیم منیر علوی نے کہانی کے اینڈ میں چونکا کر رکھ دیا۔اس اینڈ کی امید نہیں تھی، توقع کے خلاف اینڈ ہو تو اچھا بھی لگتا ہے اور مزہ بھی آتا ہے۔غزالہ فرخ کی پیاری اماں اور چاند رات میں ماں کی بے لوث محبت کو جس طرح ظاہر کیا گیا ہے وہ بے حد اچھا لگا ویسے بھی غزالہ فرخ بہت منجھی ہوئی رائٹر ہیں (ہاں یہ تو ہے) ناولٹ، سلوشن جو سائرہ رضا نے لکھا ہے مجھے بہت زیادہ پسند آیا ہے...... اگر میرے بس میں ہوتا تو میں سائرہ رضا کو اس تحریر پر ایوارڈ ضرور دیتی۔اسلام کی تعلیمات کو جیسے اس نے اپنی تحریر میں اجاگر کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی...... ویل ڈن سائرہ...... زاہدہ پروین کی تحریر عید آئی ہے بھی زبردست تحریر تھی۔جلترنگ ہمیشہ کی طرح دلچسپ تھا۔پُر بہار باتیں پڑھ کر بہت مزہ آیا۔'' (تبصرے کا شکریہ، آپ کی محبت بھری تعریف ہماری سائرہ کے لیے ایوارڈ سے کم نہیں ہے)

✿ فصیحہ آصف خان، ملتان سے۔''ستمبر کا پاکیزہ پسند آیا۔سولہ سنگار کے کیا کہنے، عذرا رسول صاحبہ کی یہ کاوش بھی سراہے جانے کے قابل ٹھہری۔آپ کی باتیں پُر اثر رہیں، اچھا اخلاق سب خوبیوں پر حاوی ہوتا ہے اور بہت سی خامیوں کو چھپانے کا باعث بھی بنتا ہے۔امانت کی قسط نمبر نو شاندار رہی۔(شکریہ) پر یہ بات کسی طرح ہضم نہیں ہو رہی کہ اتنے پہرے کے باوجود رابی کو تیزاب کیسے دستیاب ہو گیا؟ کچھ فلمی سا انداز لگا...... گل جان پر بہت ترس آتا ہے، کچھ رازوں سے پردہ اٹھا ہے...... ستارہ اپنے گردش کردہ ستاروں سے شاید نپٹ لے گی، امینہ عندلیب کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں، شیریں ظفر

آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ نے میری آمد کو پسند کیا۔(کیوں نہ پسند کرتیں) قیصرہ حیات کا ناولٹ بہت دلچسپی لیے آگے بڑھ رہا ہے۔شامِ شہر یاراں کی بات ہی کیا ہے، عنیزہ کا قوتِ مشاہدہ اور موتیوں ایسے الفاظ کہانی کے ہر کردار کے ساتھ انصاف کرتے نظر آتے ہیں، تن من ہاری، اداس کر دینے والی تلخ حقیقی تحریر تھی۔شیریں حیدر کی تتلی کے کیا کہنے، درِ رحمت سمجھنے والی تحریر تھی۔اس بار تمام تر تحاریر کا معیار بلندی پر دکھائی دیا۔کچھ مصروفیات کی وجہ سے مکمل رسالہ نہیں پڑھ سکی۔فائزہ شہزاد کی کلی صحت کے لیے دعا گو ہوں، اسی طرح اپنی فریدہ جاوید فری کے لیے بھی کہ سب بہنیں ہمارے لیے قیمتی سرمایہ ہیں، ان کے دکھ سکھ سانجھے ہیں۔(بے شک) عتیقہ بیگ کی والدہ کی رحلت کا دکھ ہوا، مائیں بچھڑ جائیں تو گھر ویرانی کی لپیٹ میں آجاتا ہے، اللہ انہیں جنت میں جگہ دے، آمین محترمہ عظمیٰ خورشید صاحبہ اللہ پاک آپ کو سکون کی دولت سے مالا مال کرے، شگفتہ شفیق صاحبہ آپ برابر حاضری دیا کریں، جی ایک نام کافی عرصے سے نظر نہیں آرہا وہ ہے پروفیسر سیما سراج کا...... پلیز وہ جہاں بھی ہیں پاکیزہ میں حاضری دیں۔ان کی شخصیت اور شاعری کی میں دلدادہ ہوں۔(جلدی سے آجاؤ کہ میں تو فین ہوں آپ سب کی) شائستہ کا سروے خوب ہوتا ہے، مختلف بہنوں کی باتیں مختلف انداز میں مزہ دیتی ہیں۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

✿ سویرا فلک، کراچی سے۔''آنٹی، امی کو امی کیوں کہتے ہیں، اس کا پتا امی کے جانے کے بعد ہی کیوں ہوتا ہے؟ آج ایک لکھاری اور شاعرہ کا قلم اس کا ساتھ نہیں دے رہا ہے، آج لفظ میری پکڑ سے باہر ہو رہے ہیں آنٹی، میں اس درد سے کیسے چھٹکارا پاؤں، اس غم کا مداوا کیا ہے آنٹی کہ آج میرے پاس میری امی نہیں رہیں صرف ان کی یادیں رہ گئیں۔(میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین) ایک اہم ترین بات محفل میں پچھلی دو بار سے میرا نام سویرا فلک کے بجائے سویرا ملک شائع ہو رہا ہے اپنے کمپوزر سے کہیے کہ اب تحریر دیکھ کر نام شناخت کرنا سیکھ جائے کیونکہ جس طرح اداکاروں کی شناخت ان کا چہرہ ہوتا ہے ایسے ہی رائٹرز کی شناخت ان کا نام ہوتا ہے۔'' (ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ آئندہ کاتب صاحب خیال رکھیں گے ویسے یہ کسی ایک جگہ ہی ہوا تھا)

✿ فرحت احمد، گلشنِ حدید کراچی سے۔''امانت مجھے تو بہت پسند آرہا ہے۔کہیں دیپ جلے کہیں دل قیصرہ حیات کا بہترین ناولٹ بہت اچھا لگا مگر اب اس کا اینڈ ہو جانا چاہیے...... بے جا طوالت تحریر کا حسن ختم کر دیتی ہے۔شامِ شہر یاراں نے آخر توجہ حاصل کر ہی لی...... اور یقین کے بارے میں صرف یہ ہی کہوں گی کہ چونکا دینے والے انجام کے ساتھ ایک بہترین تحریر جو میرے شوہر کو بھی بہت پسند آئی۔باجی آپ کا جولائی کا افسانہ واقعی رُلا گیا... صائمہ اکرم کا منی ناول گمشدہ جنت بہترین جا رہا ہے۔عالیہ حرا کافی عرصے بعد آئیں اور رشتوں کے حوالے سے معاشرے میں ہونے والے ظلم و ستم اور بے حسی کی تصویر دکھلائیں۔بہر حال اچھی تحریر ہے۔دھند کے اس پار ایک سبق آموز ناول ہے۔اس کے علاوہ باقی تمام افسانے بھی اچھے لگے مگر سب سے اچھا شیریں حیدر کا سالے کی بیوی لگا۔ایک مشکل مسئلے کو سلجھا کر انجام بھی اچھا بنا دیا۔ویل ڈن عطیہ عمر صاحبہ کا پُراثر انٹرویو بہت پسند آیا۔اس کے علاوہ پاکیزہ کے تمام سلسلے بہت اچھے لگے۔'' (شکریہ)

✿ بختاور بلوچ، لوہی بلوچستان سے۔''خط پڑھ کے صرف ایک سطری جواب ہی دیں تو ہمارا سیروں خون بڑھ جائے گا اور شاید آپ کی حوصلہ افزائی سے ہمارا برسوں سے خوابِ غفلت میں سویا ہوا ذہن اور قلم جاگ سکے۔(گڑیا آپ کا خط دیکھ کر مجھے بھی خوشی ہوتی ہے) پاکیزہ میں نو وارد بہنیں بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں، ثمرہ بخاری، ساجدہ حبیب اور اقبال بانو نظر نہیں آرہیں، ان سے کچھ لکھوائیں پلیز...... بہت فرصتیں نمٹائیں انہوں نے، صائمہ اکرم کی آمد اچھی لگی۔فائزہ افتخار کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔(ہمیں بھی کمی محسوس ہو رہی ہے) ہماری ایک آرزو ہے۔آپ کے مزاحیہ کالم منتخب کر کے سیارہ ڈائجسٹ یا اردو ڈائجسٹ میں بھیج سکیں۔خدا کرے ہماری یہ تمنا پوری ہو۔'' (پیاری بہن آپ میرے مزاحیہ کالم میرے نام کے ساتھ جہاں دل چاہے بھیج دیں مجھے آپ کی خوشی ہر حال میں عزیز ہے اب آئی ہیں تو محفل میں باقاعدگی سے حاضری دیتی رہیے گا)

✿ شائستہ بلوچ، بلوچستان سے۔''میرے چہرے اور جسم پر بے تحاشا غیر ضروری بال ہیں، ڈاکٹری علاج بھی کروایا لیکن بال ہنوز موجود ہیں۔خصوصاً چہرے پر جس کی وجہ سے کہیں آنے جانے میں بھی ندامت محسوس ہوتی ہے۔شہر سے کافی دور گاؤں کے ماحول میں جہاں کسی بیوٹی پارلر وغیرہ کا تصور بھی محال ہے۔قاری بہنوں سے گزارش ہے کہ تھریڈنگ کے علاوہ بال ختم کرنے کا کوئی آزمودہ نسخہ ہو تو پلیز آگاہ کریں، ویکسنگ کس طرح کی جاتی ہے کیا ویکسنگ کے بعد بال دوبارہ کم یا نرم

نکلتے ہیں، مشورے کی منتظر ہوں، کوئی آزمودہ دیسی نسخہ ہو پلیز...... میں بہت پریشان ہوں۔'' (بہنیں توجہ دیں آپ کے اس مسئلے کا حل ضرور بتایا جائے گا)

٭ روشانے عبدالقیوم بونیری، کراچی سے۔ '' آپ کی شفقت آپ کا لہجہ اور آپ کی محبت بھری باتیں کبھی بھلا نہ پاؤں گی، آپ کے چھوٹے چھوٹے جملوں نے مجھے کتنا اعتماد، حوصلہ اور آگے بڑھنے کی لگن دی، لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی...... مجھ ناچیز کو اتنی اہمیت دینے کا شکریہ۔ اللہ آپ کو دین و دنیا کی تمام محبتوں، عزتوں اور کامیابیوں سے نوازے...... جہاں جہاں آپ قدم رکھیں آپ کو خوشیاں ہی ملیں...... دعاؤں سے زیادہ قیمتی چیز میری نظر میں آپ کو دینے کے لیے اور کچھ نہیں۔'' (پیاری روشانے دعاؤں سے بڑھ کر کوئی قیمتی تحفہ ہو ہی نہیں سکتا...... اور ایسے تحائف کی مجھے ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے، آمین)

٭ فریدہ افتخار، پشاور سے۔ '' قیصرہ حیات کا کہیں دیپ جلے کہیں دل میں فی الحال سب کے دل جل رہے ہیں، انجام کیا ہوگا؟ (انشاء اللہ اچھا ہی ہوگا) آپ کے یقین نے کافی سے زیادہ یقین دلا دیا کہ یوں بھی ہیں زمانے کے رنگ بہت خوب۔ سالے کی بیوی ان جلد بازوں اور اپنے غصے پر قابو نہ پانے والوں کے لیے ایک سبق آموز کہانی ہے، شیریں حیدر قابلِ تحسین ہیں، معاشرے کی دُکھتی رگ پکڑی۔ ناہید فاطمہ حسنین کی دھند کے اس پار بہت بڑی نصیحت ہے ان راہ گم کردہ بچیوں کے لیے جنہیں صرف ہرا ہرا ہی دِکھتا ہے اور بڑے ان کو اپنے دشمن نظر آتے ہیں...... کاش گھر کی چوکھٹ پار کرنے سے پہلے لڑکیاں ضرور اپنا مستقبل جادوئی آئینے میں تصور کریں...... اپنی آئندہ نسلوں کا سوچیں...... پروردگار ایسی آفتوں سے ہر گھر کو بچائے رکھے، آمین۔ امانت میں بالکل جان نہیں ہے، عکس کی طرح کا کوئی دھماکا کریں۔ میری ایک ذاتی رائے ہے ضروری نہیں کہ ادارہ اور آپ اس سے متفق ہوں۔ ہومیو کلینک میں برائے مہربانی مردوں کے خطوط شائع نہیں کریں۔ صرف جوابات دیا کریں نام کے ساتھ...... اخباروں میں دیواروں پر عطائیوں کے اس قدر اشتہارات ہوتے ہیں کہ توبہ...... عطیہ عمر کی پُراثر گفتگو سے لطف اندوز ہوئی، بے حد شکریہ انٹرویو شائع کرنے کا۔ یہ بتائیں نزہت اصغر صاحبہ کہ ہماری انجم انصار کو کب ہماری بزم میں بلا رہی ہیں، ہم چشم براہ اور دیدہ و دل فرشِ راہ کیے بیٹھے ہیں۔ میں انشاء اللہ جلد اسلام آباد اپنے گھر میں شفٹ ہو رہی ہوں۔'' (میرے بارے میں تو آپ سب جانتی ہیں اس لیے دوسری رائٹرز سے مل لیں)

٭ صوفیہ امجد، پنجاب سے۔ '' کہتے ہیں زندگی میں پہلی، پہلی چیزوں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے جیسے پہلا پیار، پہلی جاب، پہلا بچہ، پہلی کامیابی یہ سب آپ کو ایک نئے احساس سے دوچار کرتے ہیں۔ اب چونکہ ہم نے لکھنے کا آغاز پاکیزہ سے کیا اور پہلی کہانی چھپنے پر خوشی کا وہ اچھوتا احساس آج بھی دل کے ایک گوشے میں محفوظ ہے اور وہی ہمیں بار بار پاکیزہ کے لیے لکھنے پر اکساتا بھی رہا ہے سو ہم نے اس کی سن لی ہے اور ایک مختصر ہلکی پھلکی تحریر کے ذریعے پرانا رشتہ استوار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بہنوں کی محفل میں آپ کا اپنائیت بھرا انداز دلوں کو اپنی طرف کھینچتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ آپ جس طرح نئے اور پرانے لکھنے اور پڑھنے والوں کو محبت اور گرمجوشی سے خوش آمدید کہتی ہیں جس طرح انہیں (own) کرتی ہیں اور جس طرح ان کے غم اور خوشی کو شیئر کرتی ہیں اور اس احساس کو پاکیزہ کے صفحات کے توسط سے پڑھنے والوں تک منتقل کرتی ہیں وہ جہاں انتہائی متاثر کن ہے وہیں قابلِ تحسین بھی ہے ہم آپ کی اس صلاحیت کے دل سے معترف ہیں۔'' (خوش آمدید، اندازِ تحریر متاثر کن ہے، تمہاری آمد اچھی لگی)

٭ مہرو میر، کشمیر سے۔ '' محترمہ رفعت سراج بہت اچھا لکھ رہی ہیں، محترمہ عنیزہ سید صاحبہ کی تحریر بہت اچھی ہے۔ مکمل ناول، ناولٹ، افسانے اچھے ہیں، محترمہ عطیہ عمر سے مل کر بہت اچھا لگا ان کی باتوں نے ہمیں اپنے سحر میں جکڑے رکھا ایسے افراد کے ساتھ ہمیں وقت گزارنا اچھا لگتا ہے بندہ بور نہیں ہوتا اور ہاں ہمیں ان کے نانا سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا اللہ ان کی مغفرت کرے، آمین۔ ویسے عطیہ جی ہم بھی آپ کی طرح علامہ اقبال کی شاعری کے دیوانے ہیں۔ (بہت خوب) انجم انصار آنٹی آپ کیا خوب لکھتی ہیں ہمیں آپ کی تحریریں و جلترنگ بہت اچھے لگتے ہیں آپ کا بات کرنے کا انداز بہت منفرد سا ہوتا ہے۔ آپ کسی اور کو مخاطب کرتی ہیں ہمیں لگتا ہے کہ ہمیں کر رہی ہیں۔ امینہ عندلیب کی صحت کے لیے ہم سچے دل سے دعا گو ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں صحتِ کاملہ عطا کرے، ہمیں بہنوں کی محفل کا کالم بہت پسند ہے کہ قارئین کیا تبصرہ کرتی ہیں ہماری بہنیں صرف حسین ہی نہیں بلکہ ذہین و فطین بھی ہیں۔'' (پیاری مہرو...... آپ کی رائے تمام مصنفات کو پہنچائی جا رہی ہے آج سے

آپ بھی ذہین و حسین کہلائی جائیں گی...... اس لیے آتی رہنا)

٭ گیتی آرا، کراچی سے۔ '' امانت میں مہر جان اور اصیل خان کے کردار نے کہانی کو اور بھی مضبوط کر دیا اور اس میں جان ڈال دی ہے۔ نسرین خالد کی ابھی تو روزے باقی ہیں اپنے دین کی طرف سے غفلت برتنے والوں کے لیے ایک سبق آموز کہانی تھی، وقت کی چال میں غزالہ عزیز نے بہت خوب صورتی سے راہ سے بھٹک جانے والوں کو سیدھی راہ دکھائی جبکہ ایسا ہوتا نہیں یا بہت کم ہوتا ہے۔ لوگ تو آج کل مرد ہو یا عورت فیشن اور گلیمر کے پیچھے ہی دیوانے ہو رہے ہیں کاش ہماری یہ تحریریں انہیں سدھار سکیں۔ عقیلہ حق کی ساون تو ہر چھت پر برستا ہے میں ساون کے موسم میں امیری، غریبی کے ماحول اور تضاد میں خوب صورت حقیقی منظر کشی تھی اور اب باری تھی اپنی بلکہ پاکیزہ کے قارئین کی پسندیدہ رائٹر انجم انصار کے یقین کی جن کی ہر تحریر کے بعد یقین ہو جاتا ہے کہ رائٹر ہونا خاص کر چوٹی کے رائٹر ہونا ہر لکھنے والے کے بس کی بات نہیں بلکہ یہ انجم باجی جیسے ممتاز رائٹر کا ہی خاصہ ہے، جس طرح وہ اپنی اس خوب صورت چھوٹی سی تحریر یقین میں شوبز کے لوگوں کی مشکلات اور زندگی کو منظر عام پر لائیں، ایک، ایک سین اور لفظ پر حقیقت کا گماں ہو رہا تھا۔ شیریں حیدر ایک اور ممتاز نام جن کی تحریر سالے کی بیوی معاشرتی مسائل اور خاص کر خواتین کے اہم مسائل پر لکھی گئی ایک خوب صورت اور سبق آموز تحریر تھی۔ راستے اور منزل نیر شفقت نے بھی بہت خوب صورتی سے خواتین کے مسائل پر قلم اٹھایا جو قابلِ تعریف ہے۔ مایہ ناز مصنفہ عطیہ عمر سے ملاقات پُرلطف رہی۔'' (گیتی آرا آپ نے تعریفوں کا سلنڈر قلم کے ذریعے چڑھا دیا۔ نوازش)

٭ ارم کمال، فیصل آباد سے۔ '' کہیں دیپ جلے کہیں دل میں یمنیٰ نے تو اپنی زندگی کا ٹریک ہی بدل ڈالا بہت مقدس اور پاکیزہ راستہ اپنایا ہے لیکن آزر کو اس کے کیے کی سزا بہت شدید ملنی چاہیے۔ ابھی تو روزے باقی ہیں واقعی ہم سب کے لیے ایک لمحۂ فکریہ بھی کوئی نیک کام کرنا ہو، کسی سے صلح میں پہل کرنی ہو، کسی کی دلجوئی کرنی ہو ہم یہی سوچتے ہیں اتنی جلدی کیا ہے کل کر لیں گے لیکن کل کیا کسی نے دیکھی ہے۔ وقت کی چال غزالہ عزیز کی تحریر نے بہت سی خواتین کی آنکھیں کھول دی ہوں گی۔ بہنوں کی محفل میرا موسٹ ہارٹ فیورٹ ہے سب بہنوں سے ملاقات دل میں ایک روح پرور سکون دیتی ہے۔ امینہ عندلیب کے لیے میں بہت دعا کرتی ہوں اللہ انہیں مکمل صحت دے اور زندگی کی ساری خوشیاں ان کے آس پاس جگمگائیں۔'' (آمین)

٭ شیریں ظفر، ملتان سے۔ '' فون کر کے آپ کی خوب صورت اور شفیق آواز بھی سن لی۔ جس محبت سے آپ کلام کرتی ہیں۔ بے اختیار دل سے دعا نکلتی ہے کہ آپ جیسے خاص لوگ ہم جیسے کم علموں سے اتنے پیار سے بات کریں گے۔ پاکیزہ خود اپنے آپ میں ایک ادارہ ہے اگر آپ جیسے لوگ اسے نہیں چلائیں گے تو یہ کچھ نہیں ہے مگر میری زندگی کے لیے یہ زادِ راہ ہے۔ Road map ہے۔ قطب تارہ ہے۔ مدد، مدد ہی مدد، سمجھ، حوصلہ، تدبر کیسے؟ اس سوال کا جواب آپ سب قاری اپنے دل سے پوچھ لیں جہاں جہاں پاکیزہ نے آپ کی مدد کی ہوگی آپ کو یاد آ جائے گا۔ رفعت سراج کے امانت میں انتہا پسند کردار ہیں۔ (ناولوں میں ہوا کرتے ہیں) دو افسانے پڑھے شیریں حیدر کا سالے کی بیوی اور نیر شفقت کا راستے اور منزل بہت ہی اعلیٰ درجے کا میسج چھپا تھا ان دونوں میں۔ ہم لوگ اخلاقی اور مذہبی فرائض کو بھول کر دنیا کے پیچھے رہتے ہیں اور کئی خوب صورت لوگ اور رشتے ان کی نذر ہو جاتے ہیں۔ عالیہ حرا کا ناولٹ اب محبت کرنی ہے کئی مرتبہ لکھا جا چکا ہے۔ کچھ واقعات اور حالات اور نام بدل دیے گئے ہیں۔ افسوس کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑا۔ اور جولائی میں انجم آنٹی سے جو اصل واقعہ افسانے کی صورت تشکیل پایا متاعِ جاں پڑھ کر عجیب و غریب کیفیت ہو گئی۔ اتنی بڑی قربانی عزت بچانے کے لیے عزت اور محبت کی قربانی اور اس بار بھی انجم آنٹی کی یقین نے رسالے کی محفل لوٹ لی۔ قلم سے موتی نکلتے ہیں انجم آنٹی آپ کے۔ ساون تو ہر چھت پر برستا ہے عقیلہ حق نے بالکل صحیح تصویر کشی کی، ہر چھت پہ ساون یکساں نہیں برستا، کہیں خوشیاں اور کہیں دکھ۔ ایک فرمائش ہے کہ اگرچہ صائمہ اکرم ایک نئی رائٹر ہیں مگر ان کا انٹرویو لگائیں۔ ایک ماہ ایک سینئر لکھاری اور ایک ماہ ایک جونیئر لکھاری۔ (آپ کی تجویز نوٹ کر لی گئی ہے) صائمہ اکرم کی گمشدہ جنت میں ابھی تک صرف چار کردار چکرا رہے ہیں۔ منی ناول تو آٹھ، دس قسطوں کا معلوم ہوتا ہے۔ ہنی یعنی کہ ہانیہ صاحبہ تو اپنی سگی بھانجی کو ہی پر نہیں پھیلانے دے رہیں۔ پروفیسر صاحب کو شرزمہ میں کسی کا عکس محسوس ہوتا ہے اور وہی ان کی گمشدہ جنت ہے۔ (تفصیلی تبصرے کا شکریہ، پاکیزہ کے ساتھ بے انتہا اچھے اور مخلص رائٹرز اور قارئین ہیں تو کیوں نہ آپ کو پسند آئے۔ ہاں عقیلہ کا یہ افسانہ واقعی بہت اچھا تھا۔ صائمہ اکرم نئی رائٹر نہیں ہیں۔ ایک عرصے سے وہ لکھ رہی ہیں۔ ان کا انٹرویو ہم جلد دیں گے)

٭ ایمان زہرا شیرازی، چکوال سے۔ ’’کہیں دیپ جلے کہیں دل، قیصرہ حیات کا ناولٹ بھی کافی اچھا جارہا ہے، مجھے آنٹی رفعت جی کے ناول نے لکھنے پر مجبور کیا یہ بھی بہت اچھا جارہا ہے ایسے لگتا ہے کہ یہ کہانی ہمارے اردگرد گھوم رہی ہے حقیقت میں ایک بات کہوں مجھے یوں محسوس ہورہا ہے جو اُن کا نوکر ہے ان کا کوئی نہ کوئی رشتے دار ہے ہوسکتا ہے شوہر نکلے یا بہن کا اس کے ساتھ کچھ محبت کا تعلق رہا ہو ڈاکٹر صاحبہ اپنا بدلہ لے رہی ہیں اس کہانی میں یہی ہے کبھی خون کے رشتے بڑے بے حس ہو جاتے ہیں مگر اس کے پیچھے بھی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ شام شہر یاراں کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ بہر حال جیسے جیسے پڑھتے جائیں گے ویسے دلچسپی بڑھتی جائے گی۔ عقیلہ حق بھی اچھا لکھتی ہیں ہر کسی کی تعریف اپنی جگہ ہے ہر کوئی کوشش کرتا ہے کہ اچھا لکھے۔ مجھے آپ سے شکوہ ہے میں نے آپ کو یہ کیسی ممتا ہے پر ایک سچی کہانی بھیجی پتا نہیں وہ کہاں گم ہوگئی۔ (تبصرے کا شکریہ آپ دوبارہ خوب محنت سے کہانی لکھ کر بھیجیں۔ میں حوصلہ افزائی ضرور کروں گی)

٭ امینہ عندلیب، سلانوالی سے۔ ’’باجی میں اپنی تمام بہنوں کی تہ دل سے مشکور ہوں جو میرے لیے اتنی دعائیں کررہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر بہن کو اجرِ عظیم عطا فرمائے، آمین۔ اللہ پاک میری تمام پیاری بہنوں کو سلامت رکھے۔ کسی بہن کی آنکھ نم نہ ہو۔ آپ کی تمام بہنوں کی محبتوں کی مقروض ہوں۔ میں اپنی فرض، نفلی نمازوں میں سب بہنوں کے لیے دعا کرتی ہوں۔ آپ سب بہنوں کو یہ پڑھ کر دلی خوشی ہوگی۔ باجی مسز توصیف امتیاز، واہ کینٹ جن سے 50 سال سے ہمارے بہت اچھے مضبوط گھریلو تعلقات ہیں۔ توصیف امتیاز، شوہر بھائی محمد امتیاز انجینئر اور ساس واہ کینٹ سے 14 ستمبر کو حج کی ادائیگی کے لیے جارہی ہیں۔ میں نے بہنوں کی لمبی لسٹ دی۔ بہنوں کے نام ڈائری میں لکھے۔ مرد حضرات کی لسٹ بھائی محمد امتیاز کو دی۔ بہت خوش ہوئیں۔ بولیں انشاء اللہ سب بہنوں کے نام لے کر دعائیں مانگوں گی۔ بے فکر رہو۔ باجی توصیف امتیاز بہت محبت، بے لوث مجھ سے پیار کرتی ہیں۔ اپنی پاکیزہ بہنوں کی طرف سے حرم پاک میں قرآن پاک کا ہدیہ دیا ہے۔ آپ سب بہنوں کی طرف سے قرآن پاک حرم پاک میں رکھیں گی۔ مسجد نبوی میں بھی قرآن پاک رکھیں گی، انشاء اللہ۔ مسجد نبوی میں خواتین میں آپ سب کی طرف سے شیرنی بھی تقسیم کریں گی آپ کی اس ناچیز بہن نے بس آپ سب کے لیے یہ چھوٹا سا کام کیا ہے۔ روضۂ اقدس پر بہنوں کا نام لے کر سلام پیش کریں گی۔ آپ سب کی صحت، زندگی، حاضری زیارتِ رسولؐ کی دعا مانگیں گی انشاء اللہ۔ کوئی نام ان کے ذہن میں نہ رہے تو تاکید کی کہ پاکیزہ بہنوں کے لیے دعا، باجی خط ٹوٹا پھوٹا سا لکھا ہے۔ لفظوں کی ترتیب نہیں ہے۔ ایک ماہ سے ٹائیفائیڈ بہت ہے اب بھی 102 ٹمپریچر کے ساتھ لکھ رہی ہوں۔ باجی نیلوفر عباسی کے دکھ پر آنکھیں نم ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین۔ میں نے ایصالِ ثواب کے لیے نفل پڑھ کر دعا مانگی تھی۔ (پیاری بٹی اللہ تمہیں صحتِ کاملہ اور زندگی دے۔ تمہاری دعائیں سن کر منہ سے صرف ایک ہی لفظ نکلتا ہے جزاک اللہ)

٭ سیدہ علیشاہ، بہاول پور سے۔ ’’اگست کا پاکیزہ دیکھ کر ایسا لگا جیسے آپ نے ہمیں عیدی دی ہو ایڈوانس میں۔ سب سے پہلے آپ کا ناولٹ یقین پڑھا سب کی بے یقینی کیفیت نے بہت مزہ دیا۔ خود مجھے بھی ماہ نور کے شادی شدہ ہونے کا یقین بڑی مشکل سے آیا۔ آسان الفاظ سے مزین شاندار تحریر بہت اچھی لگی، سچ میں آنٹی آپ بے مثال ہیں۔ اب کچھ تذکرہ صائمہ آپی کی گمشدہ جنت کا...... کہانی کافی اچھی ہے مگر لگتا ہے صائمہ آپی کو اسلام آباد کا بھوت چڑھ گیا ہے۔ ہی ہی...... It was a Joke...... سو پلیز ڈونٹ مائنڈ صائمہ آپی۔ اینی وے اسٹوری مزے کی ہے ہانیہ اینڈ اسود کی نوک جھوک بھی حالانکہ دونوں میں کافی age ڈیفرنس ہے مگر پھر بھی دونوں میں اچھی فرینڈ شپ ہے۔ کہیں دیپ جلے کہیں دل کی اس بار کی قسط کچھ اچھی تھی۔ مگر شملہ مرچ اوہ سوری شمیلہ کی حرکتیں اب ناقابلِ برداشت ہوچکی ہیں۔ ناہید فاطمہ حسنین کا مکمل ناول دھند کے اس پار بہت عمدہ تھا۔ والدین اور بچوں دونوں کے لیے سمجھداری کا ایک عمدہ پیغام گڈ ناہید فاطمہ۔ محبت اب کرنی ہے بھی زبردست تحریر تھی۔ نشاط کا دکھ دل کے قریب محسوس ہوا۔ سلسلے وار ناول اچھے جارہے ہیں اور شیریں آنٹی کی تحریر سالے کی بیوی بہت یونیک لگی۔ شیریں آنٹی ہمیشہ کچھ الگ سا لکھتی ہیں ویل ڈن۔ ساون تو ہر چھت پر برستا ہے عقیلہ حق نے بڑی خوب صورتی سے تین طبقوں کے مسائل کو اجاگر کیا۔ کہانی تھوڑی اداس مگر خوب صورت تھی۔ غزالہ عزیز کا وقت کی چال بھی اچھا تھا۔ مستقل سلسلے سب ہی اچھے تھے خاص طور پر پاکیزہ ڈائری اینڈ بہنوں کی محفل۔ سمجھ تو آپ گئی ہوں گی کہ کیوں۔ مجھے منہ سے بتاتے ہوئے شرم آرہی ہے۔ میں اکثر گنگناتی ہوں سکڑ سمٹ کر ایک صفحے کا رہ گیا ہے۔ ویری سیڈ۔ وہ آئے بزم میں عطیہ عمر کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور فارسی، اردو کے الفاظ کے بارے میں اپ ڈیٹ اچھی لگی۔ ٹائٹل سمیت پورا پاکیزہ دلکش تھا اور ہاں یاد آیا

بہنوں کی محفل میں سدرہ کلثوم لکی مروت نے بہنوں سے دوستی کی خواہش ظاہر کی تھی سو میں ان کا دوستی کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ پورے خلوص سے تھامتی ہوں۔ ویسے پاکیزہ کی سب ہی بہنیں ان کی دوست ہیں۔ سدرہ کلثوم اگر آپ فیس بک استعمال کرتی ہیں تو مجھے سیدہ علیشاہ 17 بہاول پور کا آپشن دے کر سرچ کرسکتی ہیں۔‘‘ (بے وقوف لڑکی، اب درجنوں لوگ سدرہ کے نام سے تمہیں سرچ کرسکتے ہیں)

٭ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ ’’سرورق کی خاتون آنٹی، آنٹی سی لگیں۔ ہماری دعا ہے کہ عتیقہ محمد بیگ کی والدہ، بشریٰ مسرور کی بہن ایم رفیق، شائلہ سہیل کے ماموں پروین یوسف کے والد کو اللہ تعالیٰ جنت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین۔ بہت خوشی ہوئی کہ امینہ عندلیب صحت یاب ہورہی ہیں ہماری دعا ہے فریدہ جاوید فری کو بھی اللہ تعالیٰ صحتِ کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ سلسلے وار ناولز تو ٹاپ پر جا ہی رہے ہیں ان کے علاوہ گمشدہ جنت تیسرا حصہ، سلوشن، انمول خزانہ، پیاری اماں اور چاندرات، آخری موقع، عید سے پہلے اور تتلی پسند آئے۔ اگر تحریر میں دم ہو تو پاکیزہ کی زینت بن ہی جاتی ہے چاہے اس کی باری سال دو سال بعد ہی آئے۔‘‘ (یہ تو ہے)

٭ اُمِ ایمان قاضی، کوٹ چھٹہ سے۔ ’’ہر ماہ بہنوں کی محفل پڑھتے ہی اس خوب صورت محفل کا حصہ بننے کی خواہش ہوتی ہے پر مصروفیات کا وہی عالم ہے جو ہر عورت کی زندگی کا حصہ ہیں۔ حالانکہ آپ کا افسانہ متاعِ جاں پڑھ کر کاغذ قلم ہاتھ میں بھی تھاما کہ پیارے ارضِ وطن میں ایک عورت کی اس قدر تذلیل پر دل دکھ سے تو بھر گیا پر اس دکھ کے اظہار کے لیے الفاظ پکڑائی نہ دیے۔ اس ماہ کا ٹائٹل بے حد خوب صورت ہے۔ رفعت سراج کے ناول میں اس دفعہ کچھ موڑ غیر حقیقی سے لگے خیر زندگی بعض دفعہ اس سے بھی زیادہ تلخ ہوجاتی ہے۔ عنیزہ سید کا ناول ہمیشہ کی طرح بہت سے کرداروں کو ساتھ لے کر تجسس اور آگہی کے در وا کرتا جارہا ہے ساتھ ساتھ دلچسپی کا تناسب بھی بڑھ رہا ہے۔ آپ نے میرا مراسلہ جو شائع کیا میری ہی لکھی گئی ایک کہانی کا اقتباس ہے مجھے پڑھ کر وہی مزہ آیا جو لکھتے ہوئے آیا تھا۔ اجے تمیں بنیا پاکستان نے بہت افسردہ کردیا۔ بے حسی کی جس چادر نے ہم سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اس کا انجام نہ جانے کیا ہوگا سوچ کر خوف آتا ہے۔ شیریں حیدر کا تتلی بہت حد تک حقیقت کا عکاس لگا۔ قانتہ رابعہ ہمیشہ کی طرح ایک سبق لے کر آئیں۔ گمشدہ جنت اچھا جارہا ہے تھوڑا تیز کریں اور جلدی سے پروفیسر صاحب کا ماضی کلیئر کریں۔ پیاری اماں اور چاندرات بہت اچھا لگا۔ سائرہ رضا کا سب سے زیادہ اچھا لگا۔‘‘ (شکریہ)

٭ صدف جاوید قریشی، ہری پور ہزارہ سے۔ ’’امینہ عندلیب کے لیے جس وقت مجھے خیال آتا ہے میں اس وقت ان کے لیے ضرور دعا کرتی ہوں۔ اللہ ان کو شفائے کاملہ نصیب فرمائے، آمین۔ باقی اگر سلسلے وار ناولوں کی بات کروں تو امانت بہت تھکی ہوئی تحریر ہے لیکن میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہوں گی اس لیے رفعت سراج صاحبہ نے ہمیں گزشتہ سالوں میں اپنی تحریروں کے ذریعے حد سے زیادہ انٹرٹین کیا ہے اور جہاں تک بات ہے شام شہر یاراں کی تو عنیزہ جی ہمیشہ سوچ کے دروازے پر دستک دیتی ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ بہت اچھا لکھا ہے۔‘‘ (پسندیدگی کا شکریہ)

٭ ظلِ شاہین، رحیم یار خان سے۔ ’’سب سے بہتر قانتہ رابعہ کی تحریر در رحمت لگی۔ اجے تمیں بنیا پاکستان بھی دل دہلا گئی۔ زاہدہ پروین کی عید آئی ہے، پڑھ کر دل خراب ہوگیا کہتے ہیں عشق مشک نہیں چھپتا تو کیا اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی قاری غلام غوث کو اپنی بیوی کے حالات کا علم نہیں ہوسکا۔ نوشین ناز کی کہانی بھی اصلاحی تھی۔ نہ جانے کون لوگ ہوتے ہیں جو بیٹوں کو بیٹیوں پر ترجیح دیتے ہیں معصوم بیٹیوں کو کیوں کمتر سمجھتے ہیں۔ محترمہ لبنیٰ عروج کی برسی کے موقع پر محترمہ غزالہ نگار کا مضمون پڑھا ان کی یادیں ان کی باتیں...... سب کچھ آنکھوں کے سامنے یوں آگیا جیسے ابھی کل کی بات ہو اللہ پاک لبنیٰ عروج کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ساون کے حوالے سے نوشی گیلانی کے کمنٹس اچھے لگے۔ (وہ تو ہمیں بھی خوب مزے کے لگے تھے) جلترنگ کے دونوں خاکے اچھے رہے۔ روحانی مشورے میں صبر کے فائدے بہترین تحریر جزاک اللہ۔‘‘ (تبصرے کا شکریہ)

٭ سنبل ملک اعوان، لاہور سے۔ ’’پاکیزہ میرے ہاتھ میں ہے ایک درخواست آنٹی جانی! اگر آیت کریمہ کا ترجمہ بھی لکھ دیا کریں تو شکریہ ہوگا۔ سرورق دیدہ زیب تھا۔ مجھے کچھ کہنا ہے...... ہر مرتبہ سیلوٹ پیش کرتے ہیں۔ امانت، آنٹی رفعت سراج کی پُراثر تحریر، کہیں دیپ جلے کہیں دل، قیصرہ حیات نے کئی بار رُلایا۔ باقی سارے افسانے بھی زبردست تھے میرا

خط شائع کرنے کا شکریہ، عنبر وسیم بھی غائب ہیں۔ زم زم وہاڑی بھی غائب۔ گمشدہ جنت منی ناول، صائمہ اکرم چوہدری کا مزہ دیتا ہے۔ دین کی باتوں سے ہمیشہ مستفیض ہوتی ہوں۔ میری سہیلی لکھنے والی غزالہ نگار اور کزئی آنٹی کو پہلے نہیں پڑھا مگر آنٹی لبنیٰ عروج کے حوالے سے ان کی تحریر لاجواب بلکہ بے مثال تھی۔ بارش کی آواز گھروں میں سرو ے دلچسپ تھا۔ خوش ذائقہ میں شیر خورمہ اور ایرانی قورمہ ٹرائی کیا مزے کی ڈش تھیں۔'' (بیٹی آیت کا ترجمہ بھی لکھ دیا اب خوش! ہاں ہم بھی تمام غیر حاضر بہنوں کو یاد کر رہے ہیں غزالہ نگار اور کزئی پاکیزہ کی دیرینہ اور پُرخلوص ساتھی ہیں۔ آج کل ملک سے باہر ہوتی ہیں، لبنیٰ عروج کے لیے ان کے جذبات قابلِ قدر ہیں دیگر تحریروں پر بھی تبصرے کا شکریہ)

جبیں ہاشمی، بھیرہ سے۔ ''آج کا تبصرہ میں امینہ عندلیب کے عید کے چاند سے کر رہی ہوں۔ امینہ باحوصلہ اور ہمت والی ہیں جو اپنی بیماری کا بہادری سے مقابلہ کر رہی ہے اور انشاء اللہ وہ بہت جلد صحت یاب ہوں گی اور آپی انجم جی آپ نے ایک رائے کا ذکر کیا ہے کہ جن کے بچے میڈیا کے اثرات سے خراب ہو رہے ہیں میری رائے یہ ہے کہ ان بچوں کو موبائل سے دور رکھا جائے۔ گھر میں کیبل، ڈش یا نیٹ سے چھوٹی عمر میں ہی ان سے دور رکھیں۔ نماز کی طرف توجہ دلائیں اسلامی کتابیں منگوا کر دیں جیسا کہ عطیہ عمر نے کہا کہ ان ننھے پودوں کی کاٹ چھانٹ، گوڈی دلجمعی سے کرنی چاہیے۔ ان کی آبیاری وقت پر کی جائے بہت اچھی بات کی انہوں نے۔ عطیہ عمر کی گفتگو دل پر اثر کر گئی ہے۔ ہر بات زبردست کی تھی۔ اللہ پاک ان کو اور زیادہ کامیابیوں سے نوازے، آمین۔ اب آتے ہیں مکمل ناول کی طرف۔ ناہید فاطمہ حسنین کا دھند کے اس پار کا اینڈ اچھا لگا۔ سبق آموز ناول ہے کسی نہ کسی پر اثر ضرور ہوگا جس کا مائنڈ قرت جیسا ہوگا۔ عالیہ حرا کا اب محبت کرنی ہے دل کو گنا شاہ کر کے۔ نسرین خالد کا ابھی تو روزے باقی ہیں نے فوراً اثر کیا۔ میں نے پڑھ کے فوراً اپنے کزن شبیر کو یہ افسانہ پڑھنے کو دیا وہ بھی سیم علی جیسا ہی ہے۔ انجم آپی جی آپ کا یقین دیکھ کر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی جلدی آپ کا ناول ہمارے سامنے ہوگا۔ آپ کی ہر تحریر زبردست ہوتی ہے۔ ماہ نور جیسی لالچی عورتوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ان جیسی عورتوں کا انجام برا ہی ہوتا ہے۔'' (تبصرے کا شکریہ)

شبنم کنول، حافظ آباد سے۔ ''آپی اس دفعہ مجھے کچھ کہنا ہے! بڑا ہی اچھا لگا آپ کے افسانے بہت ہی اچھے لگتے ہیں۔ اس ماہ بھی افسانہ بہت اچھا لگا پاکیزہ لیٹ ملا لیکن مل گیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی پوری ٹیم کو خوش رکھے۔'' (خط بھیجنے کا شکریہ، آپ کے مراسلے معیاری ہونے پر ضرور لگ جائیں گے۔ آپ کہانیوں پر بھی تبصرہ ضرور بھیجیں)

شائستہ محمد علی، حیدر آباد سے۔ ''پاکیزہ میں اپنا خط دیکھ کر بھی مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ میرا بھیجا گیا پہلا خط شائع ہو چکا ہے۔ میں آپ کی اس محبت اور اپنائیت کے لیے دل سے شکر گزار ہوں۔ مجھے اب سے پہلے اس بات کا قطعی احساس نہیں تھا کہ خط لکھنے اور پڑھنے میں اتنا چارم ہو سکتا ہے اور ایک بات میں ضرور مینشن کرنا چاہوں گی کہ عام طور پر یہ کونسیپٹ ہے کہ کسی بھی ادارے میں بھیجی گئی ڈاک کا مقدر ردی کی ٹوکری ہوتا ہے۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گی مجھے بھی یہ ڈر تھا مگر میری سوچ پہلی دفعہ میں ہی نیگیٹو سے پوزیٹو ہو گئی۔ میں یہ سمجھتی ہوں کہ کسی کی منفی سوچ کو مثبت کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے مگر میں آپ کو اور آپ کے ادارے کو اس بات کے لیے دل سے مبارک باد دیتی ہوں اور ہاں باجی آپ نے مئی کے پاکیزہ میں جس صاعقہ ریاض کی گمشدگی کا اعلان کیا تھا میں نے انہیں تلاش کر لیا ہے۔ لائیں میرا انعام۔ وہ میری سگی بہن نہیں مگر وہ میرے لیے سگی بہنوں سے بڑھ کر ہیں۔ صاعقہ باجی پوچھ رہی تھیں کہ میں ان کے لیے کیا لکھوں گی تو میں نے انہیں کہا کہ آپ دعا کریں کہ میرا خط شائع ہو جائے تو آپ اپنے بارے میں پاکیزہ میں پڑھنا کیونکہ اس کے ذریعے میرے لفظوں کی قیمت بڑھ جائے گی۔ باجی کے لیے میں کہوں گی کہ صاعقہ باجی آپ ایک باصلاحیت اور بااخلاق خاتون ہیں اور ہاں انجم باجی میرا انعام دینا مت بھولیے گا۔'' (پیاری شائستہ آپ کا انعام ہے کہ اب آپ اس محفل کی مستقل تبصرہ نگار ہو۔ اب غیر حاضر مت ہونا۔ صاعقہ کو پیار دینا)

ربیعہ حسن، میر پور آزاد کشمیر سے۔ ''مجھے لکھنے کا بے حد شوق ہے مگر لکھنا صرف شوق کے باعث ممکن نہیں ہوتا لکھنے کے لیے ہنر چاہیے، طریقہ، سلیقہ چاہیے جو میرے خیال میں ابھی مجھ میں ناپید ہے۔ پاکیزہ کی کہانیاں خاص طور پر افسانے اور ناولٹ بے حد سبق آموز ہوتے ہیں۔ چھوٹے سے بیان میں ایک بڑی بات ہوتی ہے اور بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ دوسرا پسندیدہ سلسلہ بہنوں کی محفل ہے اور پھر جلترنگ، جلترنگ تو واقعی جلترنگ ہے۔ انجم آپا! عکس child abuse پر تھا اور عمیرہ احمد نے بہت اچھا لکھا مگر میں اس سے بڑے اور اہم مسئلے کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتی ہوں کہ بات بے حد عجیب

ہے۔ آپا میں خود بھی اس چیز کے بارے میں اتنا نہیں جانتی تھی مگر پچھلے دنوں کسی لڑکی کا کوئی مسئلہ تھا اور اس کو حل کرنے کے لیے سرچ انٹرنیٹ کیا تو اس چیز کے بارے میں پتا چلا...... ایک term ہے self abuse آپ نے شاید سنا ہو کہ انسان اپنے ہی جسم کے حصوں سے کھیلے، اب کھیلنے کا کیا مطلب ہے؟ آپ سمجھ سکتی ہیں...... اس search کے دوران مجھے مستند احادیث ملیں اور ان کا حوالہ بھی کہ جو لوگ بھی ایسا کرتے ہیں ان کے ہاتھ کو قیامت کے دن pregnant کر کے پیش کیا جائے گا...... (ربیعہ آپ اس کے بارے میں مکمل معلومات اور حوالہ دیجیے کہ کہاں اور کس کتاب میں پڑھا تاکہ قارئین کی مکمل رہنمائی ہو) نہ ہی میں یہ بات جانتی تھی اور نہ ہی وہ لڑکی جس کا مسئلہ تھا اور وہ یہ حدیث پڑھ کر اتنا روئی کہ حد نہیں۔ ہم بچوں کو یہ تو سکھا دیتے ہیں کہ کوئی اجنبی ہو یا اپنا آپ کے جسم کے کسی حصے کو چھیڑے تو کیا کرنا ہے؟ لیکن ہم میں سے اکثر لوگ یہ نہیں جانتے کہ ہم نے اپنے بچوں کو یہ بھی سکھانا ہے کہ اپنے جسم کے بھی نازک حصوں سے...... خیر میرا قلم ساتھ نہیں دے رہا کہ میں تحریر کروں، میں یہ چاہ رہی ہوں کہ ہم یہ شعور بھی دیں لوگوں کو کہ وہ بچپن سے ہی بچوں کو بتائیں کہ اس کا کتنا گناہ ہے اور اپنے بچوں پر نظر رکھیں خاص طور پر 5 سال سے 12 سال کے بچوں پر اور یہ کہ وہ اکیلے میں بھی کوئی قابلِ اعتراض عمل تو نہیں کر رہے جب 5 سے 12 سال کے بچوں کو ہم مکمل ٹرینڈ کر دیں گے تو آگے کی عمر کے لیے ہمارے لیے مسئلہ نہیں ہوگا کہ بچے جان چکے ہوں گے کیا غلط اور کیا صحیح اور کس چیز کا کتنا گناہ ہے۔ یقین کیجیے کہ اس لڑکی کا مسئلہ اور اس کے متعلق جان کر مجھے اس بات کی سمجھ آئی کہ تنہائی میں بھی حیا کیا ہوتی ہے؟ آپا ایک تحریر اس چیز کے اوپر بھی ہونی چاہیے میں لکھ نہیں سکتی ورنہ ضرور لکھتی مگر آپ کسی سے ضرور لکھوائیں کہ خود سے بھی حیا کیسے کرنی ہوتی ہے؟ میں جانتی ہوں کہ یہ موضوع بہت نازک ہے اور میں نے اکثر websites، blogs اور emails میں پڑھا ہے کہ اکثریت لوگوں کی اس چیز کا شکار ہے، کم علمی، کم فہمی، دین سے دوری، اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے۔'' (پیاری ربیعہ، اس محفل میں خوش آمدید۔ میں نے تمہارے خط کا اہم حصہ اس وجہ سے شامل کیا ہے کہ بہت سے لوگ بہت کچھ سمجھ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک توفیق عطا فرمائے اور زندگی کا ہر معاملہ اللہ کی رضا کے تحت ہم حل کریں۔ اللہ ہم سب پر اپنا کرم، فضل اور رحم فرمائے، آمین)

مدیحہ عدنان، گوجرانوالہ کینٹ سے۔ ''بہت عرصے بعد اس محفل میں آنا ہوا ہے، ابا جان کی وفات نے دل کو گہرا رنج پہنچایا۔ میرا غم وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے اپنے والد کو کھو دیا ہو۔ یہ خط میں امینہ عندلیب کے لیے لکھ رہی ہوں ان کے معدے کے کینسر کے متعلق پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ امینہ ہمت نہ ہارنا، مجھے معلوم نہیں کہ تم کہاں سے علاج کروا رہی ہو لیکن میں تمہیں شوکت خانم کینسر اسپتال سے علاج کروانے کا مشورہ دوں گی۔ یہ تمہاری زندگی کا معاملہ ہے اس لیے ہمت بھی تمہیں کرنی ہوگی۔ میں ایسی خاتون کو جانتی ہوں جو بریسٹ کینسر کی مریضہ ہیں اور کوہاٹ میں رہتی ہیں، اپنا کیمو کروانے وہ اکیلی بس کے ذریعے لاہور شوکت خانم جاتی ہیں اور کیمو کروا کر واپس اکیلی آتی ہیں۔ زندگی بہت صبر و حوصلے سے گزاری جاتی ہے اگر ممکن ہو تو باہر سے علاج کروانا بھی بہتر ہوگا۔ اس کے لیے دیگر قارئین اور مصنفین اپنے اپنے وسائل کے مطابق مدد کریں تو مفید ہوگا۔ میری نظر میں انجم آپی آپ ہی ایسی شخصیت ہیں جو اس کارِ خیر کو شروع کر سکتی ہیں۔ اگر ہم اپنے ساتھیوں کے دکھ اور مشکل میں کام نہ آئیں تو کیا فائدہ۔ اسلام ہمیں ایک دوسرے کی مدد اور مشکل میں کام آنے کا حکم دیتا ہے۔ صرف وعظ کرنے اور زبانی کلامی افسوس کرنے سے کسی کی مشکل حل نہیں ہوتی۔ مجھے امید ہے دیگر قارئین کو بھی یہ مشورہ مناسب لگے گا۔'' (مجھے تمہاری رائے سے سو فیصد اتفاق ہے)

صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ سے۔ ''آپ کو بیٹے کی شادی بہت بہت مبارک ہو۔ فیس بک پر ساری تصاویر دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ بتا نہیں سکتی ایسا لگ رہا تھا کہ ہم آپ کے ساتھ فنکشن میں شامل ہیں، دولہا، دلہن دونوں بہت اچھے لگ رہے تھے۔ اللہ ان دونوں کو یونہی خوش و خرم شاد و آباد رکھے۔ (شکریہ) کہیں دیپ جلے کہیں دل قیصرہ حیات نے بازی پلٹا دی ہے اب دیکھتے ہیں شمیلہ جی کیا کرتی ہیں۔ (بالکل دیکھیے اور رائے دیجیے) شیریں حیدر نے نئے موضوع پر قلم اٹھایا۔ تتلی زبردست تحریر تھی اب انتظار رہے گا کہ کیا ہوگا۔ ایک نیا اور دلچسپ موضوع تھا ہمارے اطراف میں ایسے ہی واقعات ملتے ہیں مگر ان پر کوئی قلم نہیں اٹھاتا۔ نوشین اختر کا آخری موقع بھی اچھی تحریر تھی۔ سمجھنے والے اس درد کو جان سکتے ہیں۔ عورت تکلیف تو برداشت کر لیتی ہے لیکن زمانے کے طعنے اور طنز اسے کمزور بناتے ہیں۔ انجم باجی نئی رائٹرز کو موقع ملنا چاہیے ناں؟ آپ کیا کہتی ہیں۔'' (بالکل ملنا چاہیے...... گزشتہ شمارے میں اُم ثمامہ نئی رائٹر کا افسانہ کتنا

زیادہ پسند کیا گیا ہے)

قرۃ العین شکیل، گوجرانوالہ سے۔ ’’شیریں حیدر کا ناول تتلی پڑھا جو مجھے حقیقت سے خاصا دور لگا ہے ایک ماں کا سانولی رنگت کی بنا پر بیٹے کو قبول کرنے سے انکار اور تو اور اس کو جواز بنا کر پہلے شوہر سے طلاق لے کر دوسری شادی کر لینا، ویسے مجھے لگا ہی نہیں کہ میں امربیل والی شیریں حیدر کو پڑھ رہی ہوں...... ہوسکتا ہے آخری قسط پڑھ کر میری ان کے بارے میں رائے تبدیل ہو جائے...... سائرہ رضا کا ناولٹ سلوشن زبردست تھا ویسے آپ کب سے لکھ رہی ہیں؟ (کافی عرصے سے لکھ رہی ہیں) عتیقہ محمد بیگ کی والدہ اور قمر علی عباسی کی وفات کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ ان کے اہلِ خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ہمارے تین چار افسانے انتظار کی لائن میں کھڑے ہیں اب تو یہ یقین سا ہو گیا ہے کہ انہیں ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیا گیا ہوگا انجم آنٹی جب آپ کو یہ کہہ دیا جائے کہ آپ کی تحریر نا قابلِ اشاعت ہے مطالعہ کریں تو صبر آ جاتا ہے پر جب آپ کو یقین ہو کہ مدیرہ آپ کو as a writer تسلیم کر چکی ہیں صبر نہیں آتا سات آٹھ مہینے ہو چکے ہیں ہمارے پہلے افسانے کو چھپے ہوئے اور تب سے اب تک انتظار کر رہے ہیں کہ دوسرا بھی چھپے انجم آنٹی میں پوری یکسوئی کے ساتھ لکھنا چاہتی ہوں اور یہ تب ہی ممکن ہے جب آپ ہماری تحاریر کو فناٖفٹ قبولیت کی سند بخشیے۔‘‘ (گڑیا! میں نے آپ سے فون پر بھی یہی بات کی تھی کہ تمہارے افسانے جلد لگیں گے، نیا ناولٹ ابھی پڑھ نہیں سکی ہوں)

نفیسہ آرا، راس الخیمہ سے۔ ’’میں ملک سے دور ہونے کے باوجود آپ کا رسالہ بہت شوق و ذوق سے پڑھتی ہوں...... بس کبھی کبھی ملنے میں دیر ہو جاتی ہے تو ایک ماہ کا رسالہ اگلے ماہ ملتا ہے۔ عرض یہ ہے کہ آپ اشعار اگر موضوع کے حساب سے دینا شروع کریں تو بہت سے لوگوں کا بھلا ہوگا جو اپنی ڈائریز مرتب کرتے ہیں اس کے علاوہ مشہور اور اساتذہ شاعروں کی غزلیں ضرور دیا کریں تا کہ معیاری شاعری پڑھنے کو ملے۔ اس کے علاوہ افسانے اور کہانیاں تو متنوع ہوتے ہیں، کبھی اچھے کبھی اداس۔ آپ سے عرض ہے کہ اپنے شعبوں کی نمایاں خواتین سے بھی ملاقات کروائیں آج کل پاکستانی فوج میں خواتین بھی اچھی کارکردگی دکھا رہی ہیں، میں نے اخبار میں پڑھا اور نیٹ پر بھی دیکھا آپ بھی ان کے انٹرویو شائع کریں۔ عمیرہ احمد کے عکس کے بعد ان کا دوسرا ناول جلد شروع کریں ہمیں شدت سے انتظار ہے۔‘‘ (پیاری نفیسہ! ہم تاخیر سے ملنے والے خطوط بھی اپنی اس محفل میں شامل کرتے ہیں، پاکیزہ ڈائری اور دیگر شعبوں سے بھی اچھی تحریروں کی ہمیشہ جگہ رہتی ہے...... آپ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہیں۔ انٹرویو کے سلسلے میں ہاں عمیرہ احمد کا نیا ناول آپ جلد ہی پڑھیں گی)

✉ کاجل شاہ، پنجاب۔ گڑیا آپ نے منیر نیازی کی شاعری اپنے نام سے بھیج دی۔ بھئی ایسا غضب نہ کیا کریں میں تمام نئی شاعرات سے استدعا کروں گی کہ اپنی شاعری بھیجیں اور اساتذہ کا کلام بھیجتے وقت ان کا نام ضرور لکھیے۔

فضہ بتول، بہارہ کہو سے۔ ’’میں رسالہ تو باقاعدگی سے پڑھتی ہوں مگر تبصرہ نہیں لکھ پاتی۔ ہاں بہنوں کی محفل جلدی جلدی پڑھ لیتی ہوں۔ میں نے ایک دفعہ کنواری لڑکیوں کی شادی کے لیے وظیفے کے متعلق پڑھا تھا۔ کوئی بہن آسان اور جلدی حل کے لیے وظیفہ ضرور بتائیں۔ اس کے علاوہ بدقسمتی سے کوئی لڑکی کم عمری میں بیوہ یا مطلقہ ہو جاتی ہے آپ کے رسالے کے توسط سے میں سب بہنوں سے گزارش کرتی ہوں کہ ان کے لیے صرف شادی شدہ مرد ہی کیوں تجویز کیا جاتا ہے اور اگر کوئی مرد شادی شدہ ہو تو وہ کنواری لڑکی ڈھونڈتا ہے۔ آپ کے پچھلے کسی شمارے میں ایک کہانی پڑھی تھی کہ ماں اپنے بیٹے کے لیے طلاق یافتہ لڑکی کو بہو بنانے پر راضی ہے اسی سلسلے میں آپ رائٹرز ضرور کوئی نہ کوئی حل دے سکتے ہیں یا لوگوں کو شعور دیں کہ اس میں کوئی برائی نہیں۔ مجھے یقین ہے میری طرح بہت سی بہنیں صرف مشوروں کے لیے آپ کی محفل ضرور پڑھتی ہیں۔ اس پر دینی عالموں کی رائے کو بھی شامل کریں۔ مجھے فی الحال اتنا ہی کہنا ہے۔ ستمبر کے شمارے میں سائرہ رضا نے پوشیدہ الفاظ میں کافی اچھی طرح کافی بڑے مسئلے کا حل بتایا۔ اس کے علاوہ عرض ہے کہ خوش ذائقہ کے صفحات میں گھریلو ٹوٹکوں کو بھی جگہ دیں۔‘‘ (فضہ، آپ بالکل صحیح کہہ رہی ہیں، اس میں نہ کوئی برائی ہے اور نہ ہی کوئی شرعی طور پر رکاوٹ)

ثوبیہ ظہور، ضلع اٹک سے۔ ’’باجی میں رسالہ تو ہر ماہ پڑھ لیتی ہوں مگر خط نہیں لکھ سکتی۔ اس لیے کبھی کبھی فون کر لیتی ہوں۔ رسالے میں درج آپ کا ای میل ایڈریس میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اب اپنی کزن سے کہوں گی کہ وہ اس پر میل کر کے

دیکھے۔ اگست کے شمارے میں عطیہ عمر کی باتیں پڑھ کر دل بہت خوش ہوا...... آپ کے ساتھ بہت اچھی اچھی لکھنے والیاں ہیں، یہ ہر ماہ کہانی کیوں نہیں دیتیں۔ خدا انہیں اولاد کی دولت بھی عطا کرے۔ (آمین) شامِ شہر یاراں کافی گمبھیر کہانی ہے، میرا خیال ہے فہد بھی کسی کا رشتے دار نکلے گا، ابھی تو واضح نہیں ہے۔ امانت میں کہانی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے مگر انسپکٹر جابر علی کے گھر کا منظر نہیں بڑھتا۔ کہانی پڑھتے وقت عجیب سی ٹینشن رہتی ہے۔ صائمہ اکرم نے گمشدہ جنت میں اچھی کہانی پیش کی مگر الماس بیگم کا رویہ ٹو مچ اوور ہے۔ یہ اور کتنے حصوں میں ہے؟ اس کے علاوہ سلسلے بھی اچھے ہوتے ہیں دین کی باتوں کا فارمیٹ اب کچھ بدلنا چاہیے ویسے تو اچھا ہے مگر چینج کے لیے۔‘‘ (تبصرے کا شکریہ...... ہاں آپ اور دیگر بہنیں ہمیں ضرور بتائیں کہ دین کے صفحے کا فارمیٹ کیسا ہونا چاہیے۔ تجاویز ضرور ارسال کریں)

مسز عظمیٰ خورشید، لاہور سے۔ ’’ستمبر کا پاکیزہ شاندار رہا۔ تمام افسانے اور ناول شاندار رہے۔ عمیرہ احمد کا انتظار ہو رہا ہے کہ وہ کب آتی ہیں۔ (یہ انتظار تو ہمیں بھی ہے اور امید رکھتے ہیں کہ وہ جلد ہی آئیں گی) عنیزہ سید کا ناول شاندار جا رہا ہے اور روحانی مشورے اور جلترنگ فرسٹ کلاس۔‘‘ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

صفیہ بیگم، لالہ موسیٰ سے۔ ’’بہت عرصے بعد آئی ہوں، خط نہیں بھیج سکی مگر مطالعہ بدستور کرتی رہی...... اور جب آپ نے مجھے شہزادی بنایا تو میں خوش بھی ہوئی اور ہنستی بھی رہی۔ ستمبر کا شمارہ اچھا ہے...... مجھے اپنی سینئر رائٹرز کے افسانے اور ناول بہت اچھے لگتے ہیں اور ہر ماہ رائٹرز کی تصویریں دیکھنے کو بھی بہت دل چاہتا ہے۔‘‘ (اس ماہ آپ خوب ساری رائٹرز کی تصویریں دیکھیے اور ہاں آئندہ ماہ بھی دیکھنے کو خوب ملیں گی)

✉ شبانہ شریف، لاہور...... اور دیگر وہ تمام بہنیں جو پاکیزہ کے لیے لکھنا چاہتی ہیں...... یا وہ اپنی کہانیاں ہمیں بھیج چکی ہیں، ان سب سے میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں...... کہ آپ ہمیں معاشرتی موضوعات پر کہانیاں ارسال کیجیے...... کہانی کی فوٹو اسٹیٹ اپنے پاس رکھیے اور یہ بات یاد رکھیے کہ پاکیزہ ایک بڑی اشاعت کا پرچہ ہے اس میں شامل ہونے کے لیے آپ کو انتظار تو کرنا ہی ہوگا...... مگر آپ کی تحریر بھی ایسی ہونی چاہیے جس میں نیا پن بھی ہو...... اگر آپ نے کوئی عام سا واقعہ مضمون کے انداز میں ہمیں لکھ کر بھیج دیا...... بے شک وہ سچا ہی کیوں نہ ہو...... مگر اسے شائع کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم ان صفحات کے توسط سے اپنی بہنوں کو زیادہ سے زیادہ معلومات پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں...... اس لیے افسانوں کا انتخاب خاصا کڑا ہوتا ہے۔ میری بات کا آپ یہ ہرگز مطلب نہ لیں کہ ہم نئی مصنفات کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے ہیں۔ آپ یہ بات خود ہی نوٹ کر سکتی ہیں کہ پاکیزہ ہر ماہ ہی نئی مصنفات کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ جب آپ کی تحریر کو قابلِ اشاعت کی سند مل جاتی ہے تو...... اُف...... پھر تو اکثر بہنیں...... ہمیں پریشان کر دیا کرتی ہیں بھئی جب قابلِ اشاعت کہہ دیا گیا ہے تو آپ کی تحریر تو یقیناً لگے گی ہی...... آپ کی معلومات کے لیے ایک اور بات کہ آپ اپنے مسودے پر اپنا پورا ایڈریس اور رابطہ نمبر بھی ضرور لکھا کریں کیونکہ ہمارے ہاں ہر قابلِ اشاعت کہانی کا اعزازیہ بھی ضرور روانہ کیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ میری اس وضاحت سے بہت سی بہنوں کی تشفی ہو گئی ہوگی۔

☆ بہنوں کی محفل کے صفحات کا کوٹا ختم ہوا۔ آیئے اب ہم سب مل کر دعا مانگتے ہیں۔ یا اللہ یا رحمٰن یا رحیم میرے جسم کو شفا، دل کو یقینِ کامل اور آنکھوں کو نورِ بصیرت عطا فرما اور جب تک زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے۔ یا ربّ العالمین تو مجھ سے میری آل اولاد سے ہمیشہ ہمیشہ راضی رہنا اور ان سب میں پیار و محبت اور یک جہتی عطا فرمانا اور قبر کی منزل آسان کرنا۔ بے شک میرا ربّ ہر چیز پر قادر ہے۔ میرا رب برکت اور بلندی والا ہے۔

یا مجیبُ یا مجیبُ یا مجیبُ

دعا گو
آپ کی اپنی باجی
انجم انصار



پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید



حمدِ باری تعالیٰ

اس نے لکھنے کو مجھے لفظ کے گوہر بخشے
میری گفتار کو اوصافِ سخنور بخشے
میری دنیا بھی سنور جائے اگر وہ چاہے
آخرت میں مجھے انجام بھی بہتر بخشے
نظرانداز کرے میری خطائیں ساری
میری توبہ کو ہمیشہ وہ کھلے در بخشے
ہجر کی شام مجھے ضبطِ مسلسل دے کر
شبِ تنہائی میں آنکھوں کو سمندر بخشے
اپنی رحمت کے سب ہی رنگ سخن میں رکھ دے
میری آنکھوں کو کبھی طور کا منظر بخشے
ضبطِ گریہ بھی دیا قوتِ گویائی بھی
جس پہ سب رشک کریں ایسا مقدر بخشے
کس طرح شکر کا حق مجھ سے ادا ہو اس کا
اپنی امت کو جو احمدؐ سا پیغمبر بخشے

کلام: حجاب عباسی

مرسلہ: ناہید بنتِ نور، واہ سیمنٹ ورکس

نعت رسولِ مقبول ﷺ

میرے ارمان کے تارے کو نسبت آپؐ ہی سے ہے
کوئی امکانِ پیغامِ بشارت آپؐ ہی سے ہے
مدینہ بھی منور ہوگیا تھا آپؐ کے دم سے
جو سنتے ہیں کہ جنت ہے وہ جنت آپؐ ہی سے ہے
میں کیسے بھول سکتی ہوں اس احسانِ مبارک کو
کہ بیٹی سے محبت کی روایت آپؐ ہی سے ہے
ہم اپنے وقت سے آگے کے منظر دیکھ لیتے ہیں
زمانے سے سوا نورِ بصارت آپؐ ہی سے ہے
مجھے غم سے بھری دنیا میں بھی خوشیاں میسر ہیں
یہ جتنی بھی مسرت ہے عبارت آپؐ ہی سے ہے
خدائے لم یزل کے جس قدر فرمان ملتے ہیں
رسولِ پاک ان سب کی وضاحت آپؐ ہی سے ہے
مدینہ بارہا دیکھا کہ میرا بخت یاور ہے
چمکتی جگمگاتی ایسی قسمت آپؐ ہی سے ہے

کلام: نورین طلعت عروبہ

مرسلہ: صبا نور، لیہ

سلام

حضور آپؐ کے پیارے سلام کہتے ہیں
فلک کے چاند ستارے سلام کہتے ہیں
جو آج ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں غریب
دکھوں کے درد کے مارے سلام کہتے ہیں
شجر حجر بھی ہیں حاضر، کلی و پھول بھی خم
افق کے پار کنارے سلام کہتے ہیں
سجے ہوئے ہیں جو تخلیقِ کائنات میں رنگ
وہی حسین نظارے سلام کہتے ہیں
سلام بھیج رہے ہیں تمام جنّ و بشر
بیک زبان وہ سارے سلام کہتے ہیں
سلام پہنچے جو میرا سکون مل جائے
جنونِ عشق کے مارے سلام کہتے ہیں

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی

جنت میں محل بنانے کا نبویؐ نسخہ

حضرت سعید بن مسیب نقل کرتے ہیں کہ رسولؐ اللہ نے ارشاد فرمایا۔ ”جو سورۂ اخلاص دس بار پڑھے اس کے لیے جنت میں ایک محل بنایا جاتا ہے۔ اور جو شخص بیس بار پڑھے اس کے لیے دو محل بنائے جاتے ہیں اور جو شخص تیس بار پڑھے اس کے لیے تین محل بنائے جاتے ہیں۔“ لسانِ نبوتؐ سے یہ بشارت سن کر حضرت عمر بن خطابؓ کہنے لگے۔ ”خدا کی قسم! اے اللہ کے رسولؐ پھر ہم (جنت) میں اپنے بہت زیادہ محل بنالیں گے۔“ رسولؐ نے ارشاد فرمایا۔ ”اللہ تعالیٰ اس سے بہت زیادہ فراخ ہے۔ لہٰذا اس بشارت پر تعجب نہ کرو بلکہ اس کے حصول کی کوشش کرو۔“

کتاب: بکھرے موتی (داری)

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

موتی مالا

☆حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا حرام باتوں سے بچو سب سے بڑے عابد بن جاؤ گے۔

☆اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تمہاری قسمت میں ہے اس پر راضی ہو جاؤ غنی بن جاؤ گے۔

☆تم سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔

☆اپنے والدین سے حسن سلوک کرو تمہاری اولاد تم سے حسن سلوک کرے گی۔

☆جو لوگ میانہ روی اختیار کرتے ہیں وہ کسی کے محتاج نہیں ہوتے۔

☆زیادہ نہ ہنسا کرو اس سے دل مُردہ ہو جاتا ہے۔

☆چلتے ہوئے یہ خیال رکھو کہ تمہارے قدموں کی دھول سے کسی کی منزل گم نہ ہو۔

☆جہاں جاؤ وہاں اپنی خوشبو چھوڑ کر آؤ تاکہ لوگ آپ کو اچھے الفاظ میں یاد کریں۔

☆قہقہے کے پیچھے آنسو اور آنسوؤں کے پیچھے زخموں اور آہوں کی جلن ہوتی ہے۔

☆کسی کو اتنا نہ چاہو کہ اس کی جدائی برداشت نہ ہو سکے۔

مرسلہ: نگہت غفار، کراچی

انٹرویو کارنر

ہم نے بہت ہی آسان سی زندگی گزاری۔ آج سوچتے ہیں تو لگتا ہے وہ مشکلیں تو مشکلیں ہی نہیں

تھیں۔ ایک بہت اچھی سوشل لائف گزاری۔ سوشل موبلائزر...... گاؤں، گاؤں کے مسئلے سن کر بھی رائٹر نہ بن سکی پھر منیجر بن گئی۔ وہاں چین نہیں آیا تو ایک پروجیکٹ میں پروجیکٹ آفیسر بن گئی مگر دو سال آفیسر بن کر خیال آیا چلو گھریلو زندگی گزار کے دیکھتے ہیں تو گھر کی طرف سدھارے مگر نصیب میں ابھی کچھ سفر تھا کہ میرے شوہر صاحب بیرونِ ملک سدھار گئے۔ دو سال کا انتظار تو سوچا ایک ادارہ اپنا شروع کرتے ہیں تو ”ستو ہی سجاگ“ عورتوں کو شعور دینے کے حوالے سے شروع کرلیا تو آج آپ کو بتادیں کہ خواتین کے خوب صورت ملبوسات پر کڑھائی کروانی ہو یا خوب صورت رُلیاں بنوانی ہوں میری ماہر ورکرز سے بنوا سکتی ہیں۔ میں تو انجم آنٹی کو کہوں گی کہ وہ بہنوں کے لیے پاکیزہ میں ایسی ہی کسی سرگرمی کا آغاز کریں کہ وہ اپنے لیے خود کچھ کرسکیں۔ میرا پیغام تمام بہنوں کے لیے یہ ہے کہ محبت سے اپنا آج بہتر بنائیں اور اپنا کل بھی۔

تحریر عائشہ خالد، میرپورخاص

پہلی بارش

کل موسم کی پہلی بارش برسی
میرے دل میں یہ خواہش جاگی
کہیں سے کوئی شخص انجانا سا
جو لگتا ہو دیوانہ سا
بارش سے بچنے کی خاطر
کچھ شرما کر کچھ گھبرا کر
میرے دروازے پر دستک دے
اور گھر میں آنے کی اجازت لے
اسے بٹھا کر کمرے میں
کھو جاؤں میں اپنے سپنے میں
وہ لہجہ اس کا گلابوں جیسا
آنکھوں کا رنگ شرابوں جیسا
جب دیکھے وہ نظریں اٹھا کر

رہ جاؤں میں پلکیں جھکا کر
میرے دل میں یہ خواہش ابھرے
یہ بارش قیامت تک نہ رکے
وہ یونہی سامنے بیٹھا رہے
باتوں کی خوشبو لٹاتا رہے
جب وہ واپس جانے لگے
میری آنکھ کا کاجل بہنے لگے
رک جائے وہ دروازے پر جاکر
دیکھے مجھے پھر نظریں اٹھاکر
کہے وہ، میں اِک راہی انجانا
مجھے کہتے ہیں لوگ دیوانہ
کیا دیوانے کو یاد کروگی
میری یاد سے دل آباد کروگی
میں آؤں گا پھر اگلے برس
جب برسے گی پہلی بارش
میں بارش میں بھیگا ہوا
دل تیری یاد سے مہکا ہوا
تیرے دروازے پر آؤں گا
اور ساتھ تجھے لے جاؤں گا

شاعرہ :مسز راحت وفا راجپوت، لاہور

غزل

تونے جتنے داغ دیے ہیں
دیوالی کے دیپ ہوئے ہیں
جیسے کہ تم آجاؤ گے
ایسے راستہ دیکھ رہے ہیں
لو وہ چاند گگن میں ڈوبا
آنکھوں سے آنسو چھلکے ہیں
دنیا اتنی ویراں کیوں ہے
جانے کب سے سوچ رہے ہیں
اُن سے بچھڑے تو یہ جانا
جیتے جی بھی لوگ مرے ہیں
بات کریں کس منہ سے وفا کی
ہم خود کب اب یار رہے ہیں

شاعرہ: عالیہ بشیر، اسلام آباد

ابلیس

☆80,000 سال تک ملائک کا ساتھی رہا۔
☆40,000 سال تک جنت کا خزانچی رہا۔
☆20,000 سال تک ملائک کو واعظ سناتا رہا۔
☆30,000 سال تک مقربین کا سردار رہا۔
☆14,000 سال تک عرش کا طواف کرتا رہا۔

پہلے آسمان پر اس کا نام عابد تھا، دوسرے پر زاہد، تیسرے پر بلال، چوتھے پر ولی، پانچویں پر تقی، چھٹے پر خزان اور ساتویں پر عزازیل ...... اور اب لوحِ محفوظ میں ابلیس۔ غرور اور تکبر نے کیا سے کیا بنادیا۔

مرسلہ: ہبینہ اکبر، سیالکوٹ

بارشوں کے دن بھی ہیں

کانچ سا میرا دل ہے کیسے اس کو سنبھالیں
پتھروں کی دنیا ہے سنگدل زمانہ بھی
اس نگاہِ قاتل کے وار ہم بھی سہہ لیں گے
ہم بھی ان کے سامنے تیر بھی نشانہ بھی
روز اِک نیا وعدہ اِک نئی کہانی ہے
آج پھر نہ آنے کا عذر ہے بہانہ بھی
بارشوں کے دن بھی ہیں بجلیوں کا ڈر بھی ہے
موسموں کی زد میں ہے اپنا آشیانہ بھی
کارواں بھی چلتے ہیں راہ رو بھی ملتے ہیں
دور کی مسافت ہے ڈھونڈ لے ٹھکانا بھی
دھوپ چھاؤں کے جیسے اپنے روز وشب گزرے
زندگی حقیقت ہے اور اِک فسانہ بھی

شاعرہ: فریدہ افتخار، پشاور

یقین

میں نے مانا
تقدیر کا لکھا اٹل ہوتا ہے
میں نے سنا وہ بدلتا نہیں، مٹتا نہیں
مگر یہ یقین ہے میرا
کہ جن کا ایمان پختہ ہو
ارادے اٹل ہوں
سجدوں میں ہو جن کے سچائی
دعاؤں میں ہو جن کی گیرائی
ان کی دعاؤں میں اثر ہوتا ہے
خدا سے مانگیں
اور یقین ہو اس پر
تو دعائیں بے اثر نہیں جاتیں
چھین لیتی ہیں تقدیر سے
اپنا حق
اور پا جاتے ہیں اپنی مرادیں

شاعرہ: نسیم نیازی، لاہور

اے ماں

مجھے اتنا پیار نہ دو ماں
کل جتنا مجھے نصیب نہ ہو
یہ جو ماتھا چوما کرتی ہو
کل اس پر شکن عجیب نہ ہو
میں جب بھی روتی ہوں ماں
تم آنسو پونچھا کرتی ہو
مجھے اتنی دور نہ چھوڑ آنا
میں روؤں اور تم قریب نہ ہو

مرسلہ: سنبل ملک، فیروز والہ

قولِ سقراط

اپنا قیمتی وقت دوسروں کی تحریروں کے ذریعے اپنی لیاقت بڑھانے میں صرف کرو۔ اس طرح تم ان چیزوں کو نہایت آسانی سے حاصل کرسکو گے جنہیں حاصل کرنے میں دوسروں کو سخت محنت کرنا پڑتی ہے۔

مرسلہ: سامعہ تبسم، ملتان

ڈر

نہ دشتِ تنہائی سے
نہ وحشتِ جنوں سے
نہ خوشبوِ بام و در سے
نہ صبحِ بے نور سے
نہ شامِ بے کیف سے
نہ نارسائی کے زہر سے
نہ شبِ ہجر کے عذاب سے
نہ ہی وصلِ عشق کی آگ سے
نہ غمِ بے حساب سے
نہ دردِ لاجواب سے
مجھے ڈر تھا اگر
بس
تیرے پیار سے......

شاعرہ: سیدہ علیشاہ، بہاول پور

نیت

انسان کو صرف اپنی نیت صاف اور سچی رکھنی چاہیے کیونکہ ہمارے اعمال ہماری نیتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں جیسی نیت ہوگی ویسا ہی عمل ہوگا اور اچھے عمل اور اچھی نیت کی روشنی ہمارے چہروں پر نور بن کر جھلکتی ہے اور ہمارے کردار کی مضبوطی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی بھی حاصل ہوتی ہے۔ ایک نیت کو سلجھا لینے سے زندگی کے سارے الجھاؤ اگر حل ہوجائیں اور آخرت بھی سنور جائے تو یہ سودا مہنگا تو نہ ہوا ناں؟

مرسلہ: اُمِ ایمان، ڈیرہ غازی خان

شوخ باتیں

ایک سردار جی نے ایک لڑکی سے کہا۔ ”آپ مجھ سے شادی کریں گی؟“

لڑکی بولی۔ ”میں آپ سے ایک سال بڑی ہوں۔“

سردار جی بولے۔ ”کوئی بات نہیں باجی میں ایک سال بعد آپ کا ہم عمر ہوجاؤں گا پھر شادی کرلوں گا۔“

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

☆☆☆

جلترنگ

انجم انصار



مختلف

مسز آصف کا دوسرے اسکول میں ٹرانسفر ہونے والا تھا۔ ہونے والا کیا تھا، وہ خود ہی کروانا چاہتی تھیں۔ اس وقت ہاتھ میں سفارش بھی اچھی تھی کہ جس سے کہہ کر اُن کا کام فوراً ہو جاتا۔ ان کے جانے کا اسٹاف ممبرز کو جو غم تھا وہ ایک علیحدہ بات تھی وہ اس سے زیادہ یہ سوچ کر ہلکان ہوئی جا رہی تھیں کہ ان کو الوداعی پارٹی میں کیا تحفہ دیا جائے۔

''میرے خیال سے ایک اچھا سا شعری مجموعہ دے دیا جائے۔ ایک تو وہ ہمیشہ کنوارے قسم کے شعر پڑھتی ہیں اور دوسرے بے موقع بھی۔ شادی شدہ خاتون کو کم از کم بال بچوں والے اشعار کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہ کنوارے شعر تو لڑکیوں بالیوں کا حق ہوتے ہیں۔'' ایک ٹیچر نے رائے دی۔

''نہیں بھئی، یہ مہنگا آئٹم ہے۔ اچھی قسم کا شعری مجموعہ ڈیڑھ دو سو سے کم میں کیا آئے گا۔'' گھاگ قسم کی ٹیچر نے صاف منع کر دیا۔

''کپڑے بہت بے ڈھنگے پہنتی ہیں۔ کتھئی قمیص پر جامنی شلوار اور سرخ دوپٹا اوڑھ لیتیں ہیں۔ کیوں نہ انہیں ایک ڈھنگ کا جوڑا دے دیا جائے۔''

''نہیں بھئی، جاپانی سوٹ بھی مہنگے ہیں اور ان کا جسم بھی اتنا بے ڈھنگا ہو چکا ہے کہ کچھ بھی پہن لیں اچھا نہیں لگتا۔'' بھٹا کھاتے ہوئے ایک معلّمہ نے واضح انکار کر دیا۔

''اللہ، یہ کرتے ہیں کہ انہیں ایک کلائی کی گھڑی دے دیتے ہیں۔ اب تو گھڑیاں خاصی سستی ہیں۔ اپنی صوفیہ کے فلیٹوں کی دکان پر سیل لگی ہوئی ہے۔ یہ وہاں سے سستی سی لے آئیں گی۔''

''یہ تحفہ مسز آصف کے لیے نہ سہی دوسروں کے لیے یقیناً فائدہ مند ہوگا۔ حد ہو گئی ہے ڈھٹائی کی ہمیشہ کلاس میں دیر سے جاتی ہیں اور پہلے نکل آتی ہیں۔''

''نہیں بھئی، الماس کا جب ٹرانسفر ہوا تھا تو اس کو بھی گھڑی دی گئی تھی۔ اس نے جب خراب کر دی تو بعد میں منہ پر مار گئی تھی۔ اب گھڑی کسی کو نہیں دی جائے گی۔ پہلے بھی ایک سو دس روپے ضائع ہو چکے ہیں۔ پان بہت کھاتی ہیں اور تمبا کو بھی بہت پھانکتی ہیں۔ ان کو الائچیاں اور دو چار قوام کی شیشیاں دے دو۔'' جونیئر ٹیچرز نے ہنس کر رائے دی۔

''ارے، جل جائیں گی اور لڑنے مرنے پر علیحدہ اتر آئیں گی۔ لڑاکا کس قدر ہیں، ویگن والے کو پیسے کم دینے کی فکر میں لگی رہتی ہیں ہمیشہ۔ خدا کے لیے ان کو ایک اچھا سا پرس دے دو...... کس قدر سڑا ہوا پرس ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ساری زپیں ٹوٹی ہوئی، پاکٹ کا استر باہر نکلا ہوا۔ نئے اسکول میں جائیں گی...... معلّمہ ہو کر اپنی شناختی علامت (پرس) تک کا خیال نہیں رکھتیں۔''

''ارے، وہ نئے پرس کا بھی یہی حشر کریں گی۔ انتہائی ہولٹ قسم کی خاتون ہیں۔ اسکول سے واپسی پر بدھ بازار میں ہبڑ دبڑ شاپنگ کرتی ہیں اور جب وہ آلو، پیاز اپنے پرس میں بھر کر گھر جائیں گی تو اس کا حشر بھی یہی ہوگا۔''

''للّٰہ صابن اور جھانواں دے دو۔ کس قدر ان کے پیر غلیظ رہتے ہیں۔ سارا چہرہ میک اپ سے لتھڑا رہتا ہے اور سردی، گرمی ہمیشہ دو پٹی کی چپل میں پیروں پر دس من خاک اٹی ہوتی ہے کیونکہ اگر

میک اپ پیروں پر کیا جاتا تو اس کی صفائی کا خیال بھی رکھتیں۔''

''ہاں یہ تو ہے، صابن اور جھانواں دینا بھی بیکار ہی رہے گا۔ وہ اس کو لے کر کونے میں ڈال دیں گی اور مڑ کر دیکھیں گی بھی نہیں کہ اسے کس کھو میں پھینکا ہے۔''

''اچھا کوئی سستا سا ڈیکوریشن پیس دے دیتے ہیں۔ چلو بھئی ٹیچرز پچاس، پچاس روپے سب نکالیں۔'' ایک ٹیچر لہرا کر بولیں۔

''پچاس روپے...... بائی گاڈ بہت زیادہ ہیں۔ اس ماہ تو میرا چیک بھی کیش نہیں ہوا۔ میری کمیٹی بھی ابھی نہیں ملی۔'' ایک معلّمہ رسان سے بولیں۔

''مجھے پانچ ٹیچرز نے ابھی تک چائے کے پیسے نہیں دیے۔'' اسٹاف روم کی چائے کی انچارج نے انتہائی غصے سے کہا۔

''بھئی دو چار دن بول دینا، آج ہم شاپنگ کرتے ہوئے گھر جائیں گے۔ اس میں بھی چندہ دو اور اب یہ الوداعی پارٹی کا آئٹم بھی ہونے والا ہے۔''

''دیکھنا، اب یہ چلی جائیں گی تو ان کی کلاس بھی سنبھالو اور ان کے پیریڈ بھی لو۔ دیکھنا انچارج خود تو ایک پیریڈ بھی زیادہ نہیں لیں گی۔''

''واقعی بہت پریشانی کی بات ہے، ویسے ہی بچہ بیمار ہے، ساس علیحدہ ہمارے گھر آئی ہوئی ہیں۔ ایمان سے بڑھیا نے دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے۔ میں خود پریشان ہوں۔ میاں کا کوئی خط نہیں آیا۔ اسکول دیکھوں، گھر دیکھوں، گھر سے باہر کی ذمے داریاں دیکھوں، اب نہیں ہوتا پورا۔ میڈم کو دیکھو تو آج کل مجھے ڈانٹ رہی ہیں۔ صرف دو پیریڈ لیٹ تھی جبکہ ان کی چہیتی روز تین پیریڈ لیٹ آتی ہے۔ اللہ مسز آصف سے کہو اپنا ٹرانسفر نہ کروائیں۔''

''ان کی جگہ پتا نہیں دوسری کیسی آئے۔ یہ کم از کم ہائی کلاسز کو تو بخوبی پڑھا لیتی ہیں جبکہ نئی آنے والیاں تو صرف اردو اور اسلامیات کے علاوہ کچھ پڑھانے کو تیار نہیں۔''

''ہاں، یہ بات تو ہے، کلاس ٹیچر ہمیشہ سے بن رہی ہیں۔ ہمارے دکھ سکھ میں بھی بہنوں کی طرح ساتھ دیتی ہیں۔''

''ہاں یہ بھی ہے، نئی ٹیچر نہ جانے کیسی آئے۔ ان کو تو بارہ سال سے دیکھ رہے ہیں۔ ان کے وجود کے عادی ہو گئے ہیں۔ ایمان سے واپسی پر میرا ٹکٹ ہمیشہ لیتی ہیں۔''

''ہاں بھئی، یہ تو ماننا پڑے گا۔ وہ کم از کم ہم جیسی ہیں۔''

''ہاں اور کیا ہم کون سے ان سے مختلف ہیں۔'' مسز رشید نے پان کھا کر تمبا کو کی پھنکی مارتے ہوئے کہا اور مسز ستار اپنا بھٹا اور پرس سنبھال کر انچارج سے لڑنے چل دیں۔ آج بھی ان کا فری پیریڈ لگا دیا گیا تھا۔

راز کی بات

اگر لوگوں کی باتیں سن کر پریشان ہونے لگیں...... تو ہم سب بہنیں ہمہ وقت ہی پریشان رہیں۔

لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ بات مار کر خوش ہوا کرتے ہیں۔ باتیں کس طرح چوٹیں پہنچاتی ہیں...... اس کا انہیں اندازہ تک نہیں ہوتا...... مگر جس طرح بعض لوگوں کے لیے یہ کہا گیا ہے...... ہنس کر ٹالی...... تو ہم بھی لوگوں کی باتوں کو ہنس کر ٹال دیتے ہیں۔

مگر جو بات ہم سے ٹالی نہیں جاتی...... وہ یہ ہے کہ جب خاندان کی خواتین ہم بہنوں سے یہ کہتی ہیں کہ تم بہنیں اپنی اس بیماری کا علاج کیوں نہیں کرواتیں...... تو اس وقت ہم بہنیں آنکھوں میں

آنسو لیے چپ ہو جاتی ہیں...... کہ ہم بہنیں...... اس بیماری کو بیماری ہی نہیں سمجھتیں...... تو علاج کیوں کروائیں، پیسہ ضروریات پوری کرنے کے لیے نہ ہو...... تو ڈاکٹروں پر جا کر کیوں لٹا دیں۔

پتا نہیں غریب ملکوں میں صحت کے شعبے کے لیے بجٹ میں پیسہ کیوں دکھایا جاتا ہے۔ اس مد میں تو کوئی پیسہ ہی نہیں رکھنا چاہیے۔ خواہ مخواہ کی دریا دلی اور فضول خرچی ہے۔

ہاں تو ذکر ہو رہا تھا بیماری کا...... ہم سب بہنوں کو راتوں کو جاگنے کی بیماری ہے، پوری رات یونہی آنکھوں ہی آنکھوں میں بسر ہو جاتی ہے، ہاں دن میں ہم سب سوتے ہیں...... نہ ناشتا بناتے ہیں اور نہ ہی دوپہر کا کھانا...... شام ڈھلے جب اٹھتے ہیں تو چائے پی کر اپنے آپ کو فریش کرتے ہیں...... کھانا پکاتے ہیں جو ساری رات کھاتے رہتے ہیں۔

اکثر لوگ حیران ہوتے ہیں کہ راتوں کو کیوں جاگا جاتا ہے...... اب یہ راز کی بات سب کو نہیں بتائی جا سکتی مگر آپ کو بتا رہی ہوں، یہ آپ سب کو بتا دیجیے گا...... ورنہ ذہنی آلودگی کسی بیماری کا سبب ہی بن جائے گی۔ (سچی گل اے)

اب بڑی آپا عشق کر رہی ہیں اور اپنے عاشق کی یاد میں تارے وہ صرف رات کو ہی گن سکتی ہیں...... اب رہی ان کی تعلیمی کیفیات تو فلم۔ ”تارے زمین پر“ ان کی قابلیت سے متاثر ہو کر بنائی گئی تھی۔

چھوٹی آپا جہاں بیاہ کر گئی ہیں...... وہاں راتوں کو ڈاکو بہت آتے ہیں...... کبھی کسی کے گھر، کبھی کسی کے گھر...... مطلب یہ کہ سب کی باری آتی ہے اور ہماری چھوٹی آپا کا دل ہے ننھا سا ڈرپوک بھی بہت ہیں۔ گھر میں بلی بھی کود جائے تو وہ ڈاکو سمجھ کر چیخ پکار مچا دیا کرتی ہیں...... ان کے پڑوس سے ڈاکو...... صرف ان کی چیخ پکار کی وجہ سے بھاگے اور جاتے وقت وہ اپنا پانی کا پستول تک بھول گئے۔

منجھلی آپا...... کراچی شہر کی مشہور و معروف بستی ”مچھر کالونی“ میں رہتی ہیں پورے شہر کے مچھر یہاں ڈیرا جماتے ہیں، یہاں اپنی تقاریب کرتے ہیں...... یہیں اپنے جلسے جلوس...... یوں ان کی ساری رات تالیاں بجانے میں گزر جاتی ہے اور دن میں اپنی وہ نیند مکمل کرتی ہیں۔

اب رہی میری بات، پہلے میں اچھی خاصی رات کو سو جایا کرتی تھی مگر اب تو عرصہ ہوا کہ ساری رات جاگتے بلکہ ٹہلتے ہوئے گزرتی ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے علاقے میں بجلی کے دفتر کا کوئی...... بڑا افسر نہیں رہتا اس لیے بجلی آنکھ مچولی کھیلتی رہتی ہے اور رات کو زیادہ کھیلتی ہے۔

اور دوسری بڑی بات یہ ہے کہ ہمارے علاقے میں پانی رات کے تین یا چار بجے کے قریب آتا ہے۔ اس لیے موٹر چلانے کے لیے میں جاگتی رہتی ہوں۔

ظاہر ہے کہ پانی نہیں بھروں گی تو پانی پی پی کر لوگوں کو کوسوں گی کیسے...... ہے ناں۔

مشکل کام

کسی کی برائی کرنا...... گو مسلمان کا شیوہ نہیں...... برائی ویسے بھی انتقام کی ایک مہذب شکل ہے مگر اس حقیقت سے کیسے آنکھیں چرائیں کہ جب ہم بحالتِ مجبوری کسی کی تعریف کرتے ہیں تو لگتا ہے جیسے ہم اپنی قیمت کم کر کے دوسرے کا بھاؤ چڑھا رہے ہیں۔ کسی کی تعریف کر کے نہ جانے کیوں ذہن پر ایک بوجھ سا آ جاتا ہے۔ ایک ناآسودگی کی سی کیفیت پوری شخصیت کی عمارت میں تخریب کاری کرنے لگتی ہے۔ شاید اسی لیے کسی کی برائی کر کے طبیعت کو جو خوشی اور شگفتگی سی محسوس ہوتی ہے وہ تعریف کرنے میں کہاں......!

☆☆☆

میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی



☆ فریدہ جاوید فری...... لاہور
زندگی تیرا بھی احسان کیوں کر رہ جائے
تو بھی لے جا اس خاک سے حصہ اپنا

☆ فصیحہ آصف خان...... ملتان
جونہی دیکھا چاند کو تو یاد تیری آ گئی
پھر ہوا یہ رات بھر نیند ڈھونڈتے رہے

☆ ڈاکٹر کومل عبدالستار...... جامشورو
تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رخسار وہ لب
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پر اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

☆ صائمہ بنگش...... کوہاٹ
بڑے نایاب لمحے تھے
کہ جب تم سے ملے تھے ہم

☆ عرشیہ جنید...... کراچی
جن کی باتیں پھول سی تھیں جن کا لہجہ شہد سا
وہ محبت کی صدائیں کس نگر میں سو گئیں
یاد کا ساون جو برسے اور بے چینی بڑھے
یہ ہوائیں ہر طرف کیوں بے کلی سی بو گئیں

☆ ممتاز خانم...... کراچی
کانٹوں کی رہ گزر پر تم ساتھ ہو تو ہمدم
ہر دکھ بھی خوب صورت ہر درد بھی حسیں ہے

☆ کائنات عبدالحلیم...... میرپور خاص
ختم ہو سکتا نہیں امید کا رنگیں سفر
ہر قدم پر جس نے اس دل کو بہلایا تو ہے

☆ نزہت جبیں ضیا...... کراچی
زندگی درد کی لذت کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک موہوم سی حسرت کے سوا کچھ بھی نہیں
چند لمحوں کی خوشی پاتے۔ فریبِ امید
دشتِ احساس کی وحشت کے سوا کچھ بھی نہیں

☆ نگہت آصف، اسلام آباد
ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

☆ نفیسہ آرا...... یو، اے، ای
امیدِ پرسشِ غم کس سے کیجیے ناصر
جو اپنے دل پہ گزرتی ہے کوئی کیا جانے

☆ ثوبیہ ظہور...... اٹک
لکھا تھا خون سے جو ہتھیلی پہ ان کا نام
اس نام کے حروف بھی ہم نے مٹا دیے
گزریں نہ دل کی راہ سے یادوں کے قافلے
سب طور مدارات کے ہم نے بھلا دیے

☆ طلعت حسن...... بحرین
زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

☆ نورین زبیر...... مانسہرہ
ہوائے دردِ ملی غم کی دھوپ ساتھ چلی
کیا ہے دشتِ محبت میں یوں سفر تنہا

☆ امبر صادق...... واہ کینٹ
یہ مشغلہ ہے رہِ زندگی میں اب اپنا
ہر ایک گام پہ گرتے ہیں پھر سنبھلتے ہیں

میں اکثر گنگناتی ہوں

☆فاطمہ بلال......کینیڈا
منتظر کب سے ہیں اوراقِ کتابِ ہستی
دل کا کچھ رنگ کرو نوکِ قلم کو چومو
ایک آواز بہت کافی ہے سوتے کے لیے
لوگ سمجھیں گے بنے لیٹے ہواب جاگ پڑو

☆انجم نگار......فیصل آباد
اس لہجہ خوشی میں افسانۂ شب غم
کچھ تم بھی بھولتے ہو کچھ میں بھی بھولتا ہوں

☆فرحت احمد......کراچی
بڑھ گیا اور بھی تنہائی کا میری احساس
اپنی تنہائی میں اک شخص کو شامل کرکے

☆اریبہ ضیا......سکھر
سب سمجھتے ہیں وہی رات کی قسمت ہوگا
جو ستارہ کہ بلندی پہ نظر آتا ہے

☆نوشین اقبال نوشی......گاؤں بدز مرجان
آج کل کس سے محبت ہے تمہیں
آج کل کس کے لیے پاگل ہو تم

☆پروین افضل شاہین...... بہاول نگر
کتابِ دل میں بھی رکھا تو تازگی نہ گئی
ترے خیال کا پیکر گلاب جیسا ہے

☆جبیں نیاز......ملتان
سانسوں میں بھی شامل ہولہو میں بھی رواں ہو
لیکن میرے ہاتھوں کی لکیروں میں کہاں ہوں

☆ایلیا عباس......لاہور
اک ناز بھرے دل میں یہ عشق کا ہنگامہ
اک گوشۂ خلوت میں یہ دشت کی پہنائی
اوروں کی محبت کے دہراتے ہیں افسانے
بات اپنی محبت کی ہونٹوں پہ نہیں آئی

☆صبا سجاد......دبئی
ہے آج بھی ترا شوقِ جفا وہی کہ جو تھا
ستم سے ہے ترا عہدِ وفا وہی کہ جو تھا
کرم نما ہے ستم اور ستم نما ہے کرم
ہر ایک میں ہے فریبِ وفا وہی کہ جو تھا

☆رعنا مشتاق......سرگودھا
ہم ہی تنہا نہیں ہیں میکدے میں بیٹھنے والے
رسائی حضرتِ واعظ کی بھی پیرِ مغا تک ہے

☆غزالہ شاہد......کراچی
اکیلا چھوڑ کر اس نے مجھے سمجھا دیا تھا یہ
پلٹتا ہے کہاں بیتا ہوا لمحہ بلانے سے

☆شائستہ اعجاز......کراچی
میرے حروف روشنی بانٹیں گے حشر تک
دنیا کرے گی یاد مجھے زندگی کے بعد

☆عنبر وسیم......گوجرانوالہ
جانے کتنوں کو رلایا ہے تبسّم تو نے
آج خود رونا پڑا ہے تو پریشاں کیوں ہے

☆فرحت ضمیر......راولپنڈی
آگ بھڑکائی ہوا نے، میں اسے سمجھا بہار
شعلہ بن کر داغ جب ابھرا خزاں کہنا پڑا
تھا غبارِ وہم وہ، میں نے بیاباں کہہ دیا
تھا گدازِ قطرہ بحرِ بے کراں کہنا پڑا

☆رعنا حسین......اوکاڑہ
حدودِ زیست میں بھی مل سکی نہ منزلِ زیست
نہ جانے کون سی ہم راہ گزر کو کھو بیٹھے

☆نگہت حسین......اسلام آباد
تینوں بڑی امید سے تکتے رہے مجھے
بجھتا ہوا چراغ، میرا گھر، اداس شام

☆عصمت فاطمہ......ملتان
ان سے جو ایک بار ملاقات ہوگئی
چاہا تھا دل نے جس کو وہی بات ہوگئی
وہ زندگی میں آئے گھٹا بن کے پیار کی
دل کے صحن میں خوشیوں کی برسات ہوگئی

☆شائلہ خان......رحیم یار خان
میں وحشتوں میں گھرے شہر کا ہوا باسی
میں کس کی آس پہ دیوار و در سجاؤں گا

☆☆☆

خوش ذائقہ

پاکیزہ بہنیں



سیخ کباب مچھلی

اشیا: مچھلی کا گوشت، ایک کلو۔ گھی، چار چائے کے چمچ۔ سفید زیرہ، دو چائے کے چمچ۔ گرم مسالا، دو چائے کے چمچ۔ ہری مرچیں، چھ عدد (باریک کاٹ لیں)۔ ہرا دھنیا، تھوڑا سا۔ نمک، حسب ذائقہ۔ بھنے ہوئے چنے، آدھی پیالی پیس لیں۔

ترکیب: مچھلی کو دھو کر خشک کرلیں، کھال اتار کر پھینک دیں پھر اس کے گوشت کا قیمہ بنالیں۔ اس میں ہری مرچیں، گرم مسالا، ہرا دھنیا، سفید زیرہ، گھی اور نمک ملا دیجیے۔ مسالا پیسنا ضروری ہے بعد ازاں ہاتھ گیلا کرکے قیمہ سیخوں پر چڑھاتے جائیں اور سیخوں کو ہلکی آنچ پر سینکیں جب کباب سرخی اختیار کرلیں تو ڈش میں اتار کر کسی بھی چٹنی کے ساتھ تناول فرمائیے۔ لطف ملے گا مچھلی کے سیخ کباب تیار ہیں۔

روما......لاہور

عربی توشہ

اشیا: کھویا، ایک کلو۔ میدہ، دو سو گرام۔ سوجی، پچاس گرام۔ میٹھا سوڈا، دس گرام۔ چینی، تین کلو۔ پانی، سوا لیٹر۔ انڈے کی زردی، ایک عدد۔

ترکیب: چینی اور پانی کو گرم کریں اور شیرہ بنالیں۔ سوڈا، کھویا، میدہ اور سوجی (سوجی کو تھوڑے سے پانی میں بھگولیں) اچھی طرح ملالیں۔ اگر مشکل ہو تو پانی کا چھینٹا دے لیں۔ اس آمیزے سے آدھ انچ موٹی روٹی بیل لیں اور اس میں سے چکور ٹکڑے کاٹ لیں اور ان پر زردی لگا دیں۔ دس منٹ بعد انہیں گھی میں تل لیں اور شیرے میں ڈال دیں، کچھ دیر بعد نکال لیں۔

احتیاط: گرم تیل ہو جائے تو چولھا بند کرکے ایک ٹکڑا تیل میں ڈالیں اگر پھٹ جائے تو آمیزے میں میدہ اور ملالیں۔ اگر ٹکڑا شیرے میں ڈال کر سکڑ جائے تو آمیزے میں تھوڑا گھی شامل کرلیں۔ گھی میں تلتے وقت جب عربی توشہ اوپر اٹھ آئے تو ایک منٹ بعد نکال کر شیرے میں ڈال دیں۔

اریبہ ظہیر، کراچی

سندھی مرغ مسلم

اشیا: مرغ، دو کلو گرام (ایک یا دو سالم مرغ اچھی طرح صاف کرلیں) نمک، حسب ذائقہ۔ سوڈا بائی کاربونیٹ، ایک چائے کا چمچ۔ گھی یا تیل، چھ کھانے کے چمچ۔ چاول، ڈیڑھ پیالی (ابال کر رکھ لیں) ٹماٹر، دو عدد (بڑے چھلکے اتار کر بیج نکال کر پیسٹ بنالیں) پیاز، ایک عدد (بڑے سائز کی چھیل کر باریک کترلیں) ادرک، ایک انچ کا ٹکڑا (کترلیں)۔ ہری مرچ، دو عدد (کتر کر رکھ دیں) سیاہ مرچ، چند دانے پیس کر رکھیں۔ انڈا، ایک عدد (ابال کر کاٹ لیں) دہی، 1/4 پیالی۔ مکھن پگھلا ہوا، دو کھانے کے چمچ۔

ترکیب: سوڈا اور نمک ملا کر مرغ پر ملیں اور ایک گھنٹا رکھ دیں پھر اچھی طرح دھو کر کپڑے خشک کرلیں۔ دیگچی میں مکھن ڈال کر پگھلائیں اور پھر اس میں مرغ فرائی کریں۔ کفگیر سے مسلسل پلٹتے رہیں تاکہ ہر طرف یکساں بادامی ہو جائے۔ اب اسے ٹھنڈا ہونے کو رکھ دیں جب تک مرغ ٹھنڈا ہو بھرنے کا مسالا تیار کرلیں۔ سب چیزوں کو چاولوں

میں ملا کر مرغ کے پیٹ میں بھر دیں اور موٹی سوئی سے سی لیں یا چائینیز اسٹک سے بند کر لیں۔ اب اسے گھی ڈال کر ککر میں بند کر دیں اور ہلکی آنچ پر بیس منٹ پکائیں پھر ککر کھول کر مزید الٹ پلٹ کر سرخ کر کے پھر اتار کر گرم گرم پیش کریں۔

فرزانہ عظیم، کراچی

کھوکھلے کوفتے

اشیا ۔ قیمہ، آدھا کلو۔ گھی، ایک پیالی۔ دہی، ایک پیالی۔ پیاز، تین گٹھی۔ لہسن، دس بارہ جوے۔ ادرک، دو انچ کا ٹکڑا۔ چنے بھنے ہوئے، دو چمچ۔ خشخاش، دو چمچ۔ پسا ہوا گرم مسالا، آدھا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ سرخ مرچ، حسب ذائقہ۔ ہلدی، آدھا چمچ۔ انڈے، دو عدد دو ہرا دھنیا۔

ترکیب ۔ چنے باریک پیس لیں۔ خشخاش اچھی طرح دھو کر نتھار کر باریک پیس لیں۔ یہ دونوں چیزیں باریک پسے ہوئے قیمے میں ملا دیں۔ ایک گٹھی پیاز کتر کر پیس لیں۔ نمک، مرچ حسب ذائقہ ڈال کر ہرے دھنیے کی پتیوں سمیت قیمے میں ملا دیں۔ ساتھ ہی رسوں کا پسا ہو چورا اور پھینٹے ہوئے انڈے ڈال کر گوندھ لیں (اس سے کوفتے ٹوٹنے نہ پائیں گے) اور اب کوفتے بنانے کا مسالا تیار کر لیں۔ جب مسالا تیار ہو جائے تو کوفتوں کے آمیزے میں برف کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں رکھ دیں اور تیار مسالے میں ساتھ ساتھ ہی ڈالتے جائیں تاکہ برف گھل کر نکل جائے اور کوفتہ کھوکھلا ہو جائے۔ بہتر ہو کہ دو خواتین کوفتے بنا کر جلدی جلدی مسالے میں رکھتی جائیں اور برف کے گرد قیمے کی تہ ذرا موٹی رکھیں۔ مسالے میں کوفتے چھپ جائیں گے اور مسالہ ان میں رچ جائے گا۔ آہستہ سے کفگیر سے ہلاتے رہیں۔ مسالا گھی چھوڑے تو اتار لیں اور گرم مسالا چھڑک دیں اور نوش فرمائیں۔ برف پگھل کر نکل جائے گی اور کوفتے اندر سے خالی اور کھوکھلے ہوں گے۔

نفیسہ آرا، یو اے ای

آلو قیمہ کارن کباب

اشیا ۔ ...... قیمہ، آدھا کلو (اُبلا ہوا) مکئی کے دانے، ایک کپ (اُبلے ہوئے) انڈے، دو عدد۔ میدہ، ایک کپ۔ بریڈ کرمبز، ایک کپ۔ پیاز، پودینہ، ہرا دھنیا کٹا ہوا۔ حسب ضرورت۔ سیاہ مرچ پاؤڈر۔ حسب ضرورت۔ زیرہ بھنا ہوا۔ ایک چائے کا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔

ترکیب ۔ آلوؤں کو ابال کر ان کا چھلکا اتاریں اور انہیں خشک کر لیں اس کے بعد میش کر کے اس میں قیمہ، نمک، پیاز، پودینہ، ہرا دھنیا، سیاہ مرچ پاؤڈر، زیرہ اور مکئی کے دانے ملا دیں۔ میدہ چھان کر ایک پلیٹ میں نکالیں، تیار کیے ہوئے آمیزے کو بڑے سائز کے کباب بنا کر پہلے میدے سے کوٹ کریں اس کے بعد انڈے میں ڈِپ کر کے بریڈ کرمبز سے کوٹ کر کے پہلے سے گرم تیل میں ڈال کر تل لیں۔ مزیدار آلو قیمہ کارن کباب تیار ہیں، کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔

راحیلہ، پنجاب

ڈرم اسٹکس

اشیا ۔ مرغ کے لیگ پیس، چار عدد۔ انڈا، ایک عدد۔ اجینو موتو، ایک چائے کا چمچ۔ میدہ، آدھا کپ۔ پیاز، ایک عدد۔ سفید سرکہ، دو کھانے کے چمچ۔ سفید مرچ، ایک چائے کا چمچ۔ کارن فلور، ایک چائے کا چمچ۔ ہری مرچیں، چند ایک (کٹی ہوئی)

ترکیب ۔ چکن لیگ پیس پر لگے گوشت کو اچھی طرح کانٹے سے گود دیں ان پر چھری سے ہلکے ہلکے کٹ لگائیں۔ اب ان پر سرکہ، اجینو موتو لگا کر دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں ایک چھوٹے پیالے ...... میں پیاز (باریک کٹی ہوئی) ہری مرچیں، نمک، سفید مرچ، کارن فلور، انڈا اور میدہ ڈال کر چمچ سے اس آمیزے کو مکس کر لیں۔ اس مرکب کو چکن لیگ پیس پر اچھی طرح سے لگا کر فریج میں ایک یا ڈیڑھ گھنٹے کے لیے رکھ دیں پھر کڑاہی میں زیادہ تیل میں درمیانی آنچ پر تل لیں۔ مزیدار سی ڈرم اسٹکس تیار ہیں۔

نورین...... حیدر آباد

روحانی مشورے



ادارہ

شُکر کی حقیقت

حضرت عطا بن یسارؓ سے روایت ہے کہ رسولِ پاک ﷺ منبر پر تشریف لائے اور اس آیت (اعْمَلُوا آلَ دَاوُدَ شُكْرًا) کو تلاوت فرمایا اور پھر ارشاد فرمایا: تین کام ایسے ہیں کہ جو شخص ان کو پورا کرلے تو جو فضیلت آلِ داؤد کو عطا کی گئی تھی وہ اس کو بھی مل جائے گی۔

صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: وہ تین کام کیا ہیں؟

آپ ﷺ نے فرمایا:

1 ۔ رضا اور غضب کی دونوں حالتوں میں انصاف پر قائم رہنا۔

2 ۔ غنا اور فقر کی دونوں حالتوں میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کرنا۔

3 ۔ خفیہ اور اعلانیہ دونوں حالتوں میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے ڈرنا۔

شکر کی حقیقت یہ ہے کہ محسن حقیقی کی نعمتوں کا اس طرح اقرار کرنا کہ اس سے دل میں محسن کی محبت اور اس کی اطاعت کا جذبہ پیدا ہو گویا ''شکر'' کے تین لازمی عناصر ہیں۔

1 ۔ احسانات کا اقرار اور اعتراف کہ جتنی نعمتیں مجھے حاصل ہیں وہ سب کی سب اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور اس نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھے عطا فرمائی ہیں۔

2 ۔ چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھ پر اپنے فضل و کرم کی بارشیں برسا رکھی ہیں اس لیے کائنات میں میرے لیے اس سے بڑا محبوب کوئی نہیں ہونا چاہیے۔

3 ۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے بے پایاں انعامات کا فطری تقاضا یہ ہے کہ میں اپنی زندگی میں اسی کی اطاعت کروں اور اس کے مقابلے میں کسی کی اطاعت نہیں کروں، بالفاظ دیگر جو نعمتیں اس نے مجھے عطا فرمائی ہیں، انہی کاموں میں خرچ کروں جو ربِ کریم کی مرضی کے مطابق ہوں اور ان کاموں میں خرچ کرنے سے بچوں جو اس کی مرضی کے خلاف ہیں۔

جب یہ تین جذبات کسی انسان کے دل میں پختہ ہو جاتے ہیں تو علما کی اصطلاح میں اسے کہا جاتا ہے کہ اس شخص نے مقامِ شکر کو حاصل کر لیا ہے پھر مقامِ شکر کو حاصل کرنے کے لیے ان تین جذبات میں سے بھی اصل الاصول پہلا ہی جذبہ ہے کیونکہ اگر کسی شخص کے دل میں یہ خیال کماحقہ راسخ ہو جائے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مجھ پر کتنی نعمتیں ہر آن متوجہ رہتی ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس ذاتِ باری تعالیٰ سے محبت اور اطاعت کا جذبہ خود بخود بیدار ہوگا لہٰذا اگر کسی وقت حقیقی محبت اور اطاعت میں کوتاہی محسوس ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتوں کا صحیح اقرار و اعتراف دل میں پیدا نہیں ہوا۔

پھر ظاہری شکر کے دو درجے ہیں، پہلا یہ کہ زبان سے شکر یعنی ہر ہر نعمت پر بار بار الحمدللہ کہنا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی تعریف و تسبیح اس قدر بیان کرنا کہ اس کی شیرینی سے زبان میٹھی ہو جائے، دوسرا یہ کہ اپنے بدن، مال سے شکر کرنا، اعضا جسم و جوارح کا شکر یہ ہے کہ پانچ وقت کی نماز اہتمام سے پڑھنا، مرد جماعت سے مسجد میں پڑھیں، عورتیں وقت داخل ہوتے ہی گھر میں پڑھیں، اسی طرح عورتوں کے لیے ایک بڑا شکر یہ ہے کہ اپنے جسم کی اس طرح حفاظت کرے کہ جسم کا کوئی ایک بال بھی نامحرم مرد نہ دیکھ سکے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں شکر کی توفیق نصیب فرمائے۔ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کے لیے نعمتیں

بہت زیادہ ہوں اور موجودہ نعمتیں بھی ہمیشہ رہیں تو اس کو چاہیے کہ بہت زیادہ شکر ادا کرے، اسی طرح جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کی پریشانیاں ختم ہوں اور مصیبتوں کے دروازے بند ہوجائیں اسے چاہیے کہ خوب شکر ادا کرے۔ شکر کی دولت اتنی عظیم دولت ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دعا سکھلائی ہے کہ مجھ سے اس طرح دعا کرو کہ ''اے اللہ! تو مجھے توفیق دے کہ شکر کی نعمت ہر وقت ہر آن میرے ساتھ رہے۔ کسی وقت بھی مجھ سے جدا نہ ہو۔''

تفسیر مظہری میں ہے کہ حضرت نوحؑ کو شکر گزار بندہ اس لیے کہا گیا کہ وہ جو بھی کام کرتے تھے چھوٹا یا بڑا بسم اللہ اور الحمد للہ کہا کرتے تھے، کچھ کھاتے یا پیتے یا کپڑا پہنتے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی تعریف بیان کرکے اللہ کا شکر ادا کرتے، اس لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے انہیں شکور کے لقب سے نوازا۔

ہمیں بھی چاہیے کہ ہم اتنا زیادہ شکر ادا کریں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نگاہ میں ہم شکر گزار بندے کہلانے کے لائق ہوجائیں۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب بھی ان سے پوچھا جائے کہ کاروبار کا کیا حال ہے؟

تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ بہت ہی پریشانی ہے، بالکل کاروبار ٹھپ ہے، اپنا سرمایہ ہی کھا رہے ہیں، پیمنٹ (ادائیگی) وصول نہیں ہورہی، فیکٹری چل نہیں رہی وغیرہ وغیرہ...... ایسے لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنی اس طرح کی عادات ختم کریں اور ہر حال میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ مالک نے جس حال میں رکھا ہے اس کا کرم ہے، ورنہ میں تو اس کا بھی مستحق نہیں تھا۔ اس طرح شکر کرنے کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ جو خراب حالات ہیں وہ انشاءاللہ تعالیٰ اچھے حالات میں ضرور تبدیل ہوجائیں گے۔

دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ قدرتی طور پر دل کو سکون ملے گا۔ تیسرا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ پروردگار راضی ہوگا اور جس سے اللہ راضی ہوجائے اس کی بگڑی بن جاتی ہے، اس طرح ملازم حضرات کو چاہیے کہ جتنی بھی تنخواہ ہے اس پر اپنے رب کا شکر ادا کریں، ہر وقت واویلا کرنے اور روتے رہنے سے تنخواہ میں اضافہ نہیں ہوتا بلکہ موجودہ تنخواہ میں ناشکری کی وجہ سے بے برکتی ہوجاتی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ معمولی سی تنخواہ پر بھی شکر کے کلمات دل و زبان سے کہتے رہتے ہیں تو وہ بہت خوش رہتے ہیں۔ آمدنی میں اضافے کی تدبیریں سوچنا اور اس کے لیے کوشش کرنا بہت ہی اچھی بات ہے لیکن موجودہ آمدنی پر ضرور شکر کرتے رہنا چاہیے۔

اسی طرح عورتوں کو چاہیے کہ کسی کے گھر جاکر وہاں کے فرنیچر اور چیزیں دیکھ کر دل میں ناشکری کے خیالات کو ہرگز جگہ نہ دیں بلکہ شکر ادا کریں کہ لاکھوں لوگ ہیں جن کے گھروں میں وہ چیزیں بھی نہیں جو الحمدللہ میرے گھر میں ہیں، اس طرح شکر ادا کرنے سے جو چیزیں نہیں ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ دے دے گا اور جو موجود ہیں اس میں برکت عطا فرمائے گا! لہٰذا ہر مسلمان مرد اور عورت کو جس حال میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے رکھا ہے اس کا شکر ادا کریں۔ اسی طرح اگر کسی میں کوئی جسمانی عیب ہے اور ہم مکمل صحت مند ہیں تو اس کا بھی شکر ادا کرنا چاہیے کہ خدا تعالیٰ نے تمام اعضا عطا کیے ہیں۔ آنکھوں کی روشنی کی قدر ایک نابینا ہی جان سکتا ہے یا ہاتھ پیر سے معذور شخص ہی اس نعمت کی قدر جان سکتا ہے۔ اس لیے ایک، ایک نعمت کو سوچ کر شکر کریں کہ مالک کے اتنے احسانات ہیں کہ ہم جب پیدا ہوئے اس وقت سے عمر بھر سجدے میں رہیں تو اس کی نعمتوں کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا خود بھی ناشکری سے بچیں اور سب کو بچائیں اور اس کے لیے ہر نماز کے بعد شکر کی توفیق کی دعا مانگیں۔

یاد رکھیں، جس طرح نفل پڑھنا، صدقہ دینا،

حسن سلوک سے پیش آنا عبادت ہے۔ اسی طرح شکر ادا کرنا بھی ایک عبادت ہے۔

مفتی محمد حسن صاحبؒ کا جب کسی عارضے کے سبب آپریشن ہوا اور لوگ عیادت کے لیے آتے اور پوچھتے کیا حال ہے، تو وہ فرماتے۔ ''الحمدللہ بہت ٹھیک ہوں، الحمدللہ میرے ہاتھ پیر ٹھیک ہیں، الحمدللہ پاؤں ٹھیک ہیں الحمدللہ آنکھیں ٹھیک ہیں......'' اور اس بیماری کا ذکر ہی نہیں کرتے۔ ہمیں بھی چاہیے کہ کسی بیماری کے وقت اس کا بار بار ذکر نہ کریں، ہر ایک کو کہتے نہ پھریں بلکہ یہ سوچیں کہ ایک عضو میں تکلیف ہے لیکن الحمدللہ باقی اعضا تو ٹھیک ہیں۔

اسی طرح یہ سوچیں کہ میری عمر کے اتنے سال گزر چکے، اتنے سالوں تک میرے پاؤں ٹھیک رہے اب درد ہونا شروع ہوا ہے، اتنے سالوں تک جو میری صحت ٹھیک رہی اور میں نے امور دنیا انجام دیے تو اس کا میں نے شکر ادا کیا کہ آج تھوڑی سی بیماری سے میں پریشان ہوجاؤں اور بار بار بیماری کو روتا رہوں۔ اسی طرح ایسی کتنی نعمتیں ہیں جن کا ہم سے معمولی شکر بھی ادا نہیں ہوا۔ بلکہ اکثر اوقات ناشکری کی ہوگی پھر بھی کریم و رحیم مالک نے اس سے محروم نہیں فرمایا۔ اس لیے بعض مواقع پر اس طرح دعا کرنا بھی منقول ہے۔

''اے اللہ! بہت سی نعمتیں جو تو نے میرے اوپر عنایت فرمائیں اور میں نے ان کا شکر ادا نہ کیا اور کتنی مصیبتوں میں تو نے میری آزمائش کی اور میں نے ان پر کچھ صبر نہ کیا، اے وہ ذات! کہ جب میں نے تیری نعمتوں کا شکر ادا نہ کیا تو اس پر بھی تو نے مجھے محروم نہ رکھا اور جب تیری آزمائش پر میں نے صبر نہ کیا تو، تو نے مجھ کو رسوا نہ کیا اور اے وہ مہربان! کہ جب تو نے مجھے گناہ کرتے دیکھا تو بدنام نہ کیا۔ اے ایسی خوبیوں کے مالک! جو کبھی فنا نہ ہوں گی اور اے ایسے انعامات بخشنے والے جن کا کوئی شمار نہیں، میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ رحمت نازل فرما حضرت محمد ﷺ پر اور آپ ﷺ کی اولاد پر، اے اللہ! ہم دشمنوں اور ظالموں کو تیری ذات ہی کے سہارے سے دفع کرتے ہیں۔

اس لیے احادیث میں ہمیں یہ دعا بھی سکھلائی گئی ہے کہ یوں مانگو! ''اے اللہ! ہمیں نعمتوں پر شکر کرنے کے ساتھ ان نعمتوں کی تعریف کرنے والا بھی بنادے اور ہمارے اوپر نعمت کو مکمل فرمادے۔'' اور اس کے ساتھ یہ دعا بھی مانگو! ''اے اللہ! ہم بہت ہی عاجز بندے ہیں اور صرف تیری ہی نعمتوں کے محتاج ہیں، لہٰذا تو ہم پر اپنی تمام نعمتیں مکمل فرمادے۔ آمین۔''



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جا سکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

بریسٹ کی گلٹی

تسنیم احمد......کوہاٹ

سوال: امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں پاکیزہ کی پرانی قاری ہوں۔ پاکیزہ نے جو بورڈ کا سلسلہ شروع کیا ہے بہت اچھا ہے اس سے بہت

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

نومبر2013

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________

پتا: ____________

سے لوگ شفایاب ہوں گے۔ لیکن مجھے آپ ڈاکٹر حضرات سے ایک گلہ ہے کہ آپ ہمارے خط کا جواب نہیں دیتے۔

میرا مسئلہ یہ ہے کہ آج سے تقریباً پانچ چھ سال پہلے ایک دن نہانے کے دوران مجھے اپنی سیدھی طرف بریسٹ میں گلٹی محسوس ہوئی۔ یہ گلٹی سخت اور چوڑی سی ہے۔ اس میں کوئی خاص تکلیف وغیرہ محسوس نہیں ہوتی یہاں تک کہ گلٹی کو دبانے سے بھی کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ ہاں اگر بہت زیادہ دبایا جائے تو پھر کچھ تکلیف ضرور ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مینسز شروع ہونے سے کچھ دن قبل بریسٹ کے اردگرد کی جگہ میں ہلکی سی جلن، تکلیف اور بے چینی سی محسوس ہوتی ہے۔ کبھی گلٹی سخت ہوتی ہے اور کبھی نرم سی ہوتی ہے۔ یہ گلٹی جتنی پہلے دن نمودار ہوئی تھی آج بھی اتنی ہی ہے۔ یعنی چھوٹی بڑی کچھ نہیں ہوئی۔ گلٹی کے ارد گرد کی جگہ، بریسٹ کی اسکن بالکل صاف ستھری ہے باقی جسم کی اسکن کی طرح۔

تھوڑا بہت ہومیوپیتھک علاج کروایا ہے (ایلوپیتھک علاج میں کروانا نہیں چاہتی) کیونکہ

ایلو پیتھک میں سوائے چیر پھاڑ یعنی آپریشن کے اور کوئی علاج نہیں ہے اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ آپریشن کے بعد حالت بہت بگڑ جاتی ہے اس لیے میں آپریشن کروانا نہیں چاہتی۔ میں نے سنا ہے کہ ہومیوپیتھی میں ہر قسم کی گلٹیوں، رسولیوں اور گومڑ وغیرہ کا کامیاب علاج موجود ہے۔

میری آپ سے گزارش کہ ان تمام علامات کی روشنی میں میرے لیے کوئی بہت اچھا سا نسخہ تجویز کر دیجیے تاکہ میری گلٹی کوئی نقصان نہ کرے اور بغیر آپریشن کے صرف دوائیوں کی مدد سے ختم ہو جائے۔ مجھے معلوم ہے کہ گلٹی یکدم ختم نہیں ہو سکتی کچھ عرصہ تو ضرور لگتا ہے۔ مجھے جتنے عرصے بھی علاج کرنا پڑا میں کروں گی اور جو پرہیز وغیرہ ہو وہ بھی بتا دیجیے گا۔

جواب: محترمہ ہمیں آپ کا یہ پہلا خط ملا ہے جس کا ہم جواب دے رہے ہیں۔ جب خدمت کا یہ سلسلہ شروع کیا ہے تو جواب نہ دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بریسٹ میں ٹیومر / گلٹی کیوں ہو جاتی ہے اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ اکثر کا ہومیوپیتھی میں بہت اچھا علاج ہے۔ چھ سال سے آپ کو یہ تکلیف ہے لیکن آپ نے ٹھیک سے اس کا علاج نہیں کروایا ورنہ کب کی آپ ٹھیک ہو چکی ہوتیں۔ U/S Breast کروائیے یا پھر Memmograme کروائیے تاکہ موذی مرض کا خدشہ ذہن سے نکل جائے۔ ساتھ کسی لیڈی ڈاکٹر سے بھی چیک کروا کر ہمیں مکمل رپورٹ بھیجیے تاکہ آپ کا صحیح علاج تجویز کیا جا سکے۔

چھاتی کی نشوونما اور خارش

ل۔م..........ٹنڈو غلام علی

سوال: ڈاکٹر صاحب! میں نے پہلے بھی کافی مرتبہ ہومیو کلینک سے استفادہ کیا ہے امید ہے اب بھی آپ کا بورڈ میرے مسئلے پر غور فرمائے گا۔ مسئلہ میری بیٹی کے ساتھ ہے۔ میری بیٹی کی عمر تقریباً ساڑھے دس سال



ہے۔ میری بیٹی پر جوانی کے آثار بہت جلد نمایاں ہو گئے ہیں۔ مینسز وغیرہ تو ابھی نہیں آئے مگر اس کا سینہ تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ 13-14 سال کی بچی ہے۔ حالانکہ ابھی صرف ساڑھے دس سال کی ہے۔ پچھلے سال کی بات ہے کہ اسکول میں اس کو چھاتی کے دائیں طرف ایک لڑکی نے پن ماردی تھی۔ اس نے دو چار مرتبہ درد کی شکایت بھی کی مگر پھر نہیں کی۔ میں سمجھتی ہوں کہ شاید پن لگنے کی وجہ سے اس کے ہارمونز کا کوئی مسئلہ ہو گیا ہے جو چھاتی کے ابھار جلد ہو گئے ہیں۔ برائے کرم آپ کوئی ایسے ڈراپس یا ٹیبلٹ بتائیے گا جس سے اس کی چھاتی کی نشوونما نارمل انداز میں ہو اور اس کا جسم بے ڈول نہ ہو جائے اور یہ بھی بتائیے گا کہ کیا واقعی پن لگنے سے ایسا ہوا ہے یا پھر یہ قدرتی بات ہے۔

خارش

میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے تین سال سے خارش کی شکایت ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر سے دوائی وغیرہ بھی لی ہے جس سے وقتی فائدہ تو ہو جاتا ہے لیکن پھر خارش شروع ہو جاتی ہے۔ رات کو سوتے وقت زیادہ ہوتی ہے اور کبھی کبھی دن کو بھی شروع ہو جاتی ہے۔ دانے وغیرہ نہیں ہیں۔ خارش کر کر کے سر میں خون رسنے لگتا ہے پھر کنگھا کرنے سے چھلکے نکلتے ہیں۔

جواب: محترمہ آپ کی بیٹی کے ساتھ معاملہ قدرتی ہے پن وغیرہ چبھنے سے ہارمونز پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ البتہ ٹی وی اور انٹرنیٹ سے پڑ سکتا ہے۔ متوازن غذا دیں، ورزش کرائیں، صاف ستھرا ماحول دیں، وزن کنٹرول میں رکھیں، نارمل نشوونما ہو گی۔

آپ کا مسئلہ بغل اور زیرِ ناف خارش کی وجوہات کئی ہو سکتی ہیں۔ ہیئر ریموونگ کریم سے الرجی، یا پرانے بلیڈ کا استعمال، انڈر ویئر یا سینٹری پیڈز کا دیر تک استعمال، سر میں خارش کی ایک وجہ غیر معیاری صابن یا

شیمپو کا استعمال، کلر الرجی، میل کا برش یا کنگھے میں جمع ہوجانا۔ ہر دوسرے دن ان کو بھی دھویا کریں۔

ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ تک استعمال کریں اور مکمل تفصیل کے ساتھ حالات سے آگاہ کریں۔ Sulphur 200 کی ایک خوراک صبح نہار منہ لیں۔ اس کے ایک دن بعد Graphites30, Vinca Minor 30 کے 5,5 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔ کھٹی، ٹھنڈی، مرچ والی اور مرغن غذاؤں سے پرہیز کریں۔

بڑی عمر کی بیماریاں

والدہ عمران......کراچی

سوال:۔ سنسناہٹ، دل پر گھبراہٹ، بے چینی، ٹانگوں میں درد، رات کو نیند آتی ہے لیکن سو نہیں سکتی۔ پاؤں میں ایسا لگتا ہے جیسے کس کر باندھ دیئے گئے ہوں۔ اکثر پاؤں سن رہتے ہیں پاؤں اتنے سوجھے ہوئے ہیں کہ جب چلتی ہوں تو لگتا ہے جیسے فوم کے اُوپر چل رہی ہوں۔ زیادہ چلنے سے پاؤں مڑنے لگتے ہیں۔ پیر کی انگلیاں حرکت نہیں کرتیں، ہاتھ بھی سن ہوجاتے ہیں اور کبھی کبھی پورا جسم سن ہوجاتا ہے۔ کچھ کام کرنے سے بھی ہاتھ سن ہوجاتے ہیں اور مڑنے لگتے ہیں۔ تین سے چار گھنٹے بعد پیشاب آتا ہے اور پھر ایک گھنٹے بعد آتا ہے ..... وزن کم کرنے کی بھی دوائی دیں۔ ٹانگوں میں طاقت نہیں ہے، اپنے سہارے چل نہیں سکتی، واکر لے کر چلتی ہوں۔ بہت جلدی تھک جاتی ہوں، کمر میں گیپ ہوگئے ہیں، زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکتی۔

جواب:۔ کمر کا ایکسرے کرا کر اس کی رپورٹ بھیجیں۔ دل کی کیفیت بھی کمزور لگ رہی ہے Lipid Profile, Serun Calcium اور Echo کرا کر رپورٹ بھیجیں۔ فی الوقت Rhustox 30, Bryonia 30, Calc Carb 30 کے 5,5 قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال کریں اور Cactus Q کے تین قطرے اور Crata gus Q کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔ رپورٹوں کے ساتھ حال بتائیں۔ یاد رکھیں یہ تمام ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ہوں۔ غذا اور وزن آپ نے لکھا نہیں ہے بہرحال کیفیت کے مطابق تمام میٹھی، تلی ہوئی، بھنی ہوئی چیزوں سے پرہیز کریں۔ کولڈ ڈرنکس اور تمام اقسام کے شربت سے بھی پرہیز کریں اور جتنا آرام سے چل سکتی ہیں چلیں۔

رپورٹس پر علاج

اظہر بٹ......سیالکوٹ

سوال:۔ جناب! میں آپ کو میڈیکل رپورٹ ارسال کر رہا ہوں۔ آپ سے التماس ہے کہ اگر ہومیو پیتھک میں اس بیماری کا علاج مکمل ہے تو آپ ان کو پڑھ کر نسخہ لکھ دیں۔ تمام ادویات یہاں مل سکتی ہیں میں خریدلوں گا۔ آپ کی مہربانی ہوگی۔

ڈاکٹر صاحب میں کم پڑھا لکھا ہوں اور یہاں پر گلوز دستانے کی فیکٹری میں کام کرتا ہوں اور یہ جو رپورٹس ہیں فیکٹری کے چوکیدار کے بیٹے کی ہیں ہم اس کی مدد کریں گے۔ برائے مہربانی تحریر اردو میں لکھ کر دینا تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو۔ اگر ادویات انگلش میں لکھیں گے تو بھی ٹھیک ہے۔ آپ کی نوازش ہوگی۔

جواب:۔ صرف رپورٹوں پر علاج نہیں کیا جاسکتا۔ مرض اور مریض کی ہسٹری کا بھی معلوم ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا مریض کی کیفیت سے بھی آگاہ کریں۔

قد اور دیگر مسائل

نام نہیں لکھا......پتا نہیں لکھا

سوال:۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری بیٹی جس کی تاریخ پیدائش 16-09-2001 ہے اس کا قد تقریباً 8 انچ اور 4 فٹ ہے۔ اسے مینسز بھی 08-01-2013 کو شروع ہوگئے ہیں۔ میں نے بھی یہی سنا ہے کہ مینسز کے بعد قد نہیں بڑھتا۔ ہمارے خاندان میں سب لڑکیوں کے

قد لمبے ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ قد لمبا کرنے کے لیے کوئی دوا بتائیں۔

دوسرا مسئلہ:۔ سردی ہو یا گرمی اُس کے ہاتھ پاؤں پر پسینہ آتا ہے۔ ہاتھ اور پاؤں ٹھنڈے بھی رہتے ہیں۔

تیسرا مسئلہ:۔ رات کو بستر پر پیشاب کرتی ہے۔

چوتھا مسئلہ:۔ منہ سے بدبو آتی ہے اور دانت بھی پیلے رہتے ہیں اور مسوڑھے بھی سوجے رہتے ہیں۔

جواب:۔ قد بڑھنے کا مسئلہ خاندانی یا وراثتی ہوتا ہے جس میں ماں اور باپ دونوں کے خاندان کے لوگوں کے قد کے حساب سے ہوتا ہے۔ اچھا صاف ستھرا ماحول، متوازن غذا کا استعمال اور ورزش قد بڑھانے کے سلسلے میں بڑے مفید ومعاون ہوتے ہیں۔ بچی کو میٹھا کم کھلائیں، رات کو سوتے وقت دودھ نہ دیا کریں اور نہ پانی۔ پیشاب کر کے سلائیں۔ رات کو کمرا ٹھنڈا تو نہیں ہوتا؟ کمرے میں اندھیرا تو نہیں ہوتا۔ سوتے میں بچی ڈرتی یا ڈراؤنے خواب تو نہیں دیکھتی؟ رات کو سونے سے پہلے اور پھر کھانے کے بعد اچھے ٹوتھ پیسٹ سے برش کر کے سلائیں۔ جو بیماریاں آپ نے بیان کی ہیں اس کے لیے ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔

Calc Phos 30, Staphisagria 30, Merc Sol 6 کے 5, 5 قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال کریں اور ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

ٹانسلز

مسز نعیم......ملتان

سوال:۔ میرا بیٹا جس کی عمر تقریباً 17 سال ہے اس کا قد 5 فٹ اور 5 انچ ہے۔ وزن تقریباً 75 کلو ہے۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کا گلا ہر وقت خراب رہتا ہے جس کی وجہ سے تقریباً ہر ماہ اسے اینٹی بایوٹک دینی پڑتی ہیں۔ اس کی اسٹڈیز کا بھی حرج ہوتا ہے۔ ویسے وہ پڑھنے میں لائق ہے لیکن ہر ماہ اسے بیماری کی وجہ سے



چھٹیاں کرنی پڑتی ہیں۔ آج سے پانچ سال پہلے اسے ٹائیفائیڈ ہوا تھا لیکن ویکسین کے بعد دوبارہ نہیں ہوا۔ کیا اس دوا کو Repeat کر سکتے ہیں۔ کوئی ایسی دوا تجویز کردیں جس سے اس کا قد بھی لمبا ہو اور گلے بھی نہ بڑھیں۔

E.N.T ڈاکٹرز اس کے لیے آپریشن تجویز کرتے ہیں لیکن آپ کا کالم ہر ماہ پڑھ کر علم ہوا ہے کہ ہومیو پیتھک میں اس کا علاج موجود ہے۔ اس لیے آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔

بیٹی کا مسئلہ

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ بیٹی کی عمر تقریباً 20 سال ہے اور اس کا قد 5 فٹ ہے جبکہ اس کا وزن 50 کلو ہے۔ والد کا قد تقریباً 5 فٹ اور 5 انچ ہے اور میرا اپنا قد 5 فٹ اور 2 انچ ہے کیا اس کا قد بڑھ سکتا ہے تو دوا تجویز کردیں۔ پلیز اسی ماہ جواب دے کر شکریہ کا موقع دیں۔ آپ دکھی انسانیت کی جس طرح خدمت کر رہے ہیں اس کی وجہ سے سب سے دعائیں لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے گا۔

میری آپ سے گزارش ہے کہ انجم انصار آنٹی سے کہیں کہ وہ آپ کا ٹوکن ایسی جگہ پر رکھیں جہاں سے کٹنگ کے بعد قرآنی دعائیں وغیرہ نہ کٹیں تاکہ بے ادبی نہ ہو۔ شکریہ۔

جواب:۔ ٹانسلز بڑھنے اور خراب ہونے کی وجوہات پر اگر ہم قابو پالیں تو نہ صرف ہم اس مسئلے کا علاج بہ آسانی کرسکیں گے بلکہ یہ مسئلہ ہوگا ہی نہیں۔ (۱) ہر چیز کھا کر پانی پینے کی عادت ختم کریں خصوصاً مصالحے والی اور کھٹی چیزیں۔ (۲) برف اور اس سے بنی چیزیں۔ (۳) یخ ٹھنڈا پانی، شربت، کولڈ ڈرنکس۔ (۴) سردیوں کے موسم میں سر کو ٹھنڈی ہوا لگنا۔

لہٰذا ان چیزوں سے احتیاط کریں تو 50 فیصد مسئلہ پہلے ہی حل ہوجائے گا اور بقیہ 50 فیصد کے

لیے Baryta Carb 30 اور Merc Sol 30 کے 5,5 قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔ تین ماہ کے استعمال کے بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔ قد بڑھنے کی عمر 19 سال تک ہے۔ لہٰذا بیٹی کے لیے معذرت۔ اس خط کے ذریعے انتظامیہ تک آپ کی بات پہنچ جائے گی۔

بینائی کی کمزوری

حاجرہ خالد...... سیالکوٹ

سوال:۔ ڈاکٹر صاحب آپ جس طرح لوگوں کے مسائل حل کر رہے ہیں اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ میں بڑی امید کے ساتھ اپنے مسائل آپ کو بیان کر رہی ہوں۔ میری عمر 40 سال ہے۔ میرے دو بچے ہیں، بیٹی 14 سال کی اور بیٹا 12 سال کا ہے۔ میاں بیرونِ ملک ہیں۔ زندگی کے سارے مسائل خود دیکھنا پڑتے ہیں۔ میاں ادھر ہو یا نہ ہو۔ میں گھر کے اور باہر کے کاموں سے اتنا نہیں تھکتی ہوں جتنا کہ بچوں کو پڑھانے کے وقت ذہنی طور پر تھک جاتی ہوں۔ بچوں کو بہت دفعہ کہنا پڑتا ہے مگر وہ پڑھائی پر اس وقت تک توجہ نہیں دیتے جب تک ان کے پاس نہ بیٹھوں۔ میں ماں ہونے کا فرض ادا کرنا چاہتی ہوں مگر میرا دماغ، گردن، آنکھیں میرا ساتھ نہیں دیتیں۔ ہر وقت سر کے درمیان درد رہتا ہے۔ ذہنی دباؤ، طبیعت میں چڑچڑاپن، نیند نہیں آتی، نیند کے لیے گولی لینی پڑتی ہے۔ جسمانی، ذہنی اور اعصابی تھکاوٹ رہتی ہے۔ دماغی کمزوری بہت ہے۔ کوئی کیا بات کر رہا ہے اکثر غائب دماغ رہتی ہوں۔ یادداشت بہت کمزور ہے۔ رات کو گولی نہ لوں تو کانوں سے آوازیں آتی ہیں۔ سر بوجھل رہتا ہے۔ گردن میں کھنچاؤ اور درد ہر وقت رہتا ہے، چکر بہت آتے ہیں، آنکھوں کے سامنے جال سا رہتا ہے۔ دور اور نزدیک کی نظر کمزور ہے، عینک لگانے کو دل نہیں کرتا۔

مسائل بہت ہیں دوائیوں کے ذریعے چلتی پھرتی ہوں۔ ایک سال سے بلڈ پریشر بھی ہے۔ 160/90۔ دوائی سے کنٹرول رہتا ہے۔ سر کا مسئلہ بہت پرانا ہے۔ صبح کے وقت ایک گھنٹا واک کرتی ہوں۔ چلتے پھرتے دھکے لگتے ہیں، چکر آتے ہیں۔ میرا وزن 80 کلو ہے۔ پیٹ اور بازو پر چربی ہے، پیٹ بڑھا ہوا ہے اور بازو بھی بہت بھاری ہیں۔ طبیعت میں جلدی پن بہت ہے ہر کام وقت پر کرنے کی عادت ہے۔

جواب:۔ جب نظر کمزور ہے تو چشمہ فوراً لگائیے، کیونکہ اسی وجہ سے آپ کے سر میں درد اور دماغ پر بوجھ رہتا ہے۔ لہٰذا اپنی آنکھوں کو آرام دینے کے لیے چشمے کا استعمال بلا تاخیر کریں۔ نیند کی گولی کا استعمال بالکل نہ کریں، یہ دماغ، اعصاب پر بہت برا اثر ڈالتی ہے۔ اگر بہت زیادہ نیند کا مسئلہ ہو تو ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی VALEXAN کی دو گولیاں رات کو سونے سے آدھا گھنٹا پہلے تھوڑے سے پانی لیں۔ یہ دوا مضر اثرات سے پاک ہے۔ وزن کم کریں میٹھی و مرغن اشیا اور نمک سے پرہیز کریں۔ پھلوں، سبزیوں اور دالوں کا استعمال کریں اور ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات کا استعمال کریں۔

Staphysagria 30, Glonine 30, Gelsemium 30, Kali Phos 30 کے 5,5 قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔ اگر کبھی درد زیادہ ہو تو ان ادویات کو جلدی جلدی بھی لے سکتی ہیں۔ CRATEX کی بھی ایک گولی صبح و شام تھوڑے سے پانی کے ساتھ نگلیں۔ ذہنی صلاحیت بڑھانے کے لیے بہترین دوا ہے۔